غالب کا علمی سرمایہ

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن



غالب کا علمی سرمایہ

غالبؔ کا علمی سرمایہ

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج لاہور

الوقار پبلی کیشنز
335-K2 Wapda Town, Lahore.
www.alwaqarbublications.com

ناشر : سید وقار معین

0300-8408750

0321-8408750

042-35189691-35224607

سال اشاعت : 2013ء

طابع : گنج شکر پریس، لاہور

مندرجات:

"نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام ایزدِ توانا کی عنایت سے
خوب ہو چکا، اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و
نشان باقی و قائم رہے گا۔" ——— غالب

[عودِ ہندی، طبع اول میرٹھ، ۱۸۶۸ء، ص ۱۵۶]

مَیں ۱۹۶۵ء میں لاہور آیا، یہاں مجھے استعداد اور استحقاق
سے زیادہ عزت اور مہر و محبت میسر آئی۔ اب لوٹ کر دیکھتا اور سوچتا
تو، گھر سے باہر لاہور کے اس سارے زمانۂ قیام کی اپنی سب سے زیادہ
عزیز اور شفیق متاع، مَیں تنویر سنز پبلشرز کے

برادرم شیخ محمد شفیق

کو پاتا ہوں جن سے ناگہاں مَیں ۱۰-اپریل ۱۹۸۸ء کو محروم ہو گیا

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!

"وہ آسماں تھا —
ہر ایک کے سر پہ سایہ فگن،
ہر اک کی راہوں میں نور افشاں
ہر اک کی راتیں اُجالنے کو
ہر اک کی صبحیں نکھارنے کو
کرن کرن خود بکھر گیا وہ!
جیا ہر اک کی خوشی کی خاطر،
ہر اک کا غم لے کے مر گیا وہ"

[signature]

۱۹۸۹ء

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن :

پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، لاہور

علمی و تہذیبی مصروفیات :

۱۔ ممبر مجلس قائمۂ اردو کمیٹی برائے ذریعۂ تعلیم، حکومت پنجاب، لاہور
۲۔ ممبر مجلس علمی، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور
۳۔ ممبر منتظمہ، مجلس ترقیِ ادب، لاہور
۴۔ ایڈوائزر (اردو) پنجاب پبلک سروس کمیشن، لاہور
۵۔ ممبر اسکرپٹ کمیٹی، لاہور آرٹس کونسل، لاہور
۶۔ ممبر بورڈ آف اسٹڈیز (اردو) پنجاب یونیورسٹی، لاہور
۷۔ جج صدارتی اقبال ایوارڈ، حکومت پاکستان، اسلام آباد
۸۔ جج پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ، پشاور ۸۵۔۱۹۸۳ء
۹۔ ممبر بک سلیکشن کمیٹی، قائد اعظم لائبریری، لاہور
۱۰۔ کنوینر کمیٹی آف کورسز (اردو) اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ، لاہور
۱۱۔ ایڈوائزر، سلیکشن بورڈ برائے لیکچرارز (اردو) حکومت پنجاب، لاہور
۱۲۔ ممبر ایڈوائزری بورڈ برائے انتخاب و اشاعت کتب، پاکستان بینکنگ کونسل، کراچی۔

مطبوعات و مرتبات :

۱۔ بابائے اردو۔ احوال و افکار : طبع اول، کراچی ۱۹۶۴ء، باضافہ و ترمیم، لاہور ۱۹۷۶ء، طبع سوم؛ دہلی، سری نگر، گورکھپور، لکھنؤ، بمبئی ۱۹۷۹ء۔ طبع جدید، لاہور ۱۹۸۲ء

۲۔ سید وقار عظیم۔ سوانحی خاکہ : لاہور ۱۹۶۷ء۔ اشاعتِ اوّل، کراچی ۱۹۸۰ء

۳۔ نقدِ عبدالحق : لاہور، ۱۹۶۸ء

۴۔ خیالستان (یلدرم) : طبعِ اوّل، لاہور/کراچی ۱۹۶۸ء، باضافہ و ترمیم، لاہور ۱۹۷۶ء
باضافہ و ترمیم، لاہور ۱۹۸۳ء

۵۔ اشاریہ غالب : لاہور، ۱۹۶۹ء

۶۔ آپ بیتی۔ رشید احمد صدیقی : طبعِ اوّل، لاہور ۱۹۷۰ء، طبعِ دوم، لاہور ۱۹۷۴ء۔ طبعِ سوم،
دہلی، بمبئی ۱۹۷۷ء، باضافہ و ترمیم لاہور ۱۹۸۰ء، طبعِ جدید، لاہور ۱۹۸۲ء

۷۔ مطالعہ یلدرم : لاہور، ۱۹۷۱ء

۸۔ غالبیات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (پی ایچ۔ڈی کا مقالہ) : لاہور، ۱۹۷۲ء

۹۔ غالب اور انقلابِ ستاون : طبعِ اوّل، لاہور ۱۹۷۴ء، باضافہ و ترمیم لاہور ۱۹۷۶ء
طبعِ جدید، دہلی : ۱۹۸۸ء

۱۰۔ ذکرِ عبدالحق : لاہور ۱۹۷۵ء، باضافہ و ترمیم، طبعِ دوم، لاہور ۱۹۸۵ء

۱۱۔ قائدِ اعظم اور لائل پور : لاہور ۱۹۷۶ء

۱۲۔ دیوانِ غالب (ترتیب) : طبعِ اوّل، لاہور ۱۹۷۶ء، باضافہ و مقدمہ، زیرِ طبع

۱۳۔ جامعات میں اقبال کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ : لاہور، ۱۹۷۷ء

۱۴۔ اقبالیات کا مطالعہ (سید وقار عظیم) : لاہور ۱۹۷۷ء

۱۵۔ فرموداتِ عبدالحق : لاہور ۱۹۷۸ء

۱۶۔ تحقیقِ غالب : کراچی، لاہور ۱۹۸۱ء

۱۷۔ محمد نقوش۔ (نذرِ محمد طفیل) : ملتان، ۱۹۸۳ء

۱۸۔ فورٹ ولیم کالج (سید وقار عظیم) : لاہور، ۱۹۸۶ء، طبعِ دوم، لاہور ۱۹۸۸ء

۱۹۔ نثری ادب (ٹیکسٹ بک بی اے اردو) : پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۷ء
طبعِ سوم، ۱۹۸۸ء

۲۰۔ جدید اردو غزل (رشید احمد صدیقی) : لاہور ۱۹۸۷ء

۲۱۔ جاگیرِ غالب (پرتھوی چند) : لاہور ۱۹۸۹ء

۲۲۔ یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق : لاہور ۱۹۸۹ء

۲۳۔ غالب کا علمی سرمایہ : لاہور ۱۹۸۹ء

زیرِ طبع و ترتیب کتابیں :

۱۔ تحقیق و تلاش
۲۔ جہاتِ غالب
۳۔ تنقید و تحلیل
۴۔ اُدبیات و شخصیات
۵۔ یادیں اور یادگاریں
۶۔ جہانِ اقبال

علمی اور اَدبی اعزازات اور انعامات :

۱۔ "مطالعۂ سٹریلدرم" پر ثانوی تعلیمی بورڈ لاہور نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق و تصنیف کا انعام مالیتی پانچ ہزار روپے عطا کیا : ۱۹۷۴ء

۲۔ "اِشاریۂ غالب" پر ثانوی تعلیمی بورڈ لاہور نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق و تصنیف کا انعام مالیتی تین ہزار روپے عطا کیا : ۱۹۷۴ء

۳۔ "غالب اور انقلاب ستاون" پر پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے داؤد اَدبی انعام مالیتی پانچ ہزار روپے عطا کیا گیا : ۱۹۷۴ء

۴۔ "فرمودات عبدالحق" پر ثانوی تعلیمی بورڈ سرگودھا نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق کا انعام عطا کیا : ۱۹۷۸ء

۵۔ "آپ بیتی، رشید احمد صدیقی" ثانوی تعلیمی بورڈ سرگودھا سے عالمانہ تحقیق و تصنیف کے اعزاز کے لیے منتخب ہوئی : ۱۹۸۰ء

۶۔ "سید وقار عظیم — سوانحی خاکہ" پر ثانوی تعلیمی بورڈ سرگودھا نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق و تصنیف کا انعام مالیتی دو ہزار روپے عطا کیا : ۱۹۸۰ء

۷۔ "نقوش صدارتی ایوارڈ برائے تحقیق" مالیتی دس ہزار روپے : ۱۹۸۵ء

مستقل پتا :

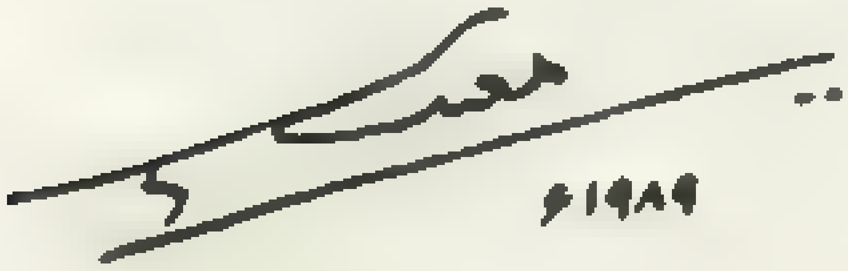
"الوقار" ۵۔ نونر مال، لاہور — ۵۴۰۰۰

تحدیثِ نعمت

مجھے اِس سال تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کے کارِ محبوبی سے وابستہ ہوئے، پچیس برس پورے ہو رہے ہیں ــــ ۱۹۶۴ء میں میری پہلی کتابی کاوش منظرِ عام پر آئی۔ اِسی برس مجھے گورنمنٹ کالج، بہاول نگر سے اُردو لیکچرار کے طور پر تدریسی سفر کے آغاز کا موقع ملا۔ ۱۹۶۵ء میں مجھے پنجاب یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور کے شعبۂ اُردو میں پروفیسر سیّد وقار عظیم اور دوسرے اکابر کے ساتھ کام کرنے کی سعادت میسّر آئی ــــ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۳ء تک میں ایف سی کالج، لاہور کے شعبۂ السنہ سے منسلک رہا۔

پنجاب پبلک سروس کمیشن سے براہِ راست اُردو کے سینیئر پروفیسر کے طور پر میرا انتخاب ہُوا تو اپنی نئی منصبی ذمہ داری پر مَیں جنوری ۱۹۷۴ء میں گورنمنٹ کالج فیصل آباد پہنچا، جہاں مجھے ایم۔اے کی کلاسز کی تنظیمِ نو اور اپنے ذی استعداد طلباء اور رفقاء کو ریسرچ کی طرف مائل کرنے اور اُنہیں علمی اور تحقیقی کاموں میں مصروف اور منہمک کر دینے میں کامیابی ہوئی ــــ فروری ۱۹۸۱ء سے مَیں شعبۂ اُردو اور پنجابی گورنمنٹ کالج، لاہور سے وابستہ ہوں۔ یہاں ایم۔اے اور پی ایچ۔ڈی کی سطح پر تدریس، تعلیمی منصوبہ بندی اور تحقیقی اُمور میں رہنمائی میرے فرائضِ کار کا حصّہ ہے۔

تدریس اور تحقیق میری تخصیص، میرا موضوع، میدان اور میری پہچان ہے اور اس حوالے سے مَیں اپنی زندگی کو پُرمایہ، بامعنی اور باثروت پاتا ہوں۔ اِن پچیس برسوں میں مجھ ایسے محدود بساط اور استعداد کے سے شخص کو اپنے بزرگوں، ہم کار ساتھیوں یا اپنے شاگردوں سے جو اَدب کے اعلیٰ درجوں میں میرے قریب رہے اور رفیق ہوئے، جیسی بے خلل اور بے دریغ عزّت اور محبت ملی، اُسے میں حاصلِ حیات خیال کرتا ہوں اور اِس پذیرائی کو اپنا استحقاق نہیں، انعام جانتا ہوں ــــ اپنی تحسین یا تعریف سے ہر کم عقل خوش ہوتا ہے، مجھے اس سے شرمندگی بھی ہوتی ہے! اللہ مجھے توفیقات سے نوازے اور اپنے محبت اور عزّت کرنے والوں سے سُرخرو رکھے ــــ



۱۹۸۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل الدین عالی

حرفے چند

غالب کے بارے میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی یہ انتہائی مفید اشاعت "غالب کا علمی سرمایہ" اس شکل میں پہلی بار پیش کی جا رہی ہے۔ متن پر فاضل مصنف نے اپنے پیش لفظ میں روشنی ڈالی ہے، ہم اُن کے ارشادات یہاں نہیں دہرائیں گے۔

لطیفہ دیکھیے کہ غالب صدی تک منائی گئی مگر غالب کے جملہ سرمائے پر (اسے مصنّف نے علمی سرمائے کا نام خود دیا ہے) اس ایک مقالے کے سوا نہ کوئی دوسری بڑی کوشش کی گئی نہ اشاعت سامنے آئی۔ ۱۹۷۲ء میں فاضل مصنف ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کو جامعہ سندھ سے اس مقالے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی آج ۱۹۸۸ء تک کسی اور فاضل محقق نے بات آگے نہیں بڑھائی۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے جس دیدہ ریزی اور سلیقے سے کام مکمل کیا ہے اس کا ثبوت یہ اشاعت خود ہے، ہمیں محاسن گنوانے کی ضرورت نہیں۔

اتفاق کہیے یا کوئی روحانی سلسلۂ واقعات کہ غالب پر مولانا حالی کی "یادگارِ غالب" ۱۸۹۷ء میں غالب کی ولادت کے پورے ایک سو سال بعد چھپتی ہے۔ اس کے کوئی پچیس برس بعد ۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر بجنوری کی کتاب "محاسن کلام غالب" آتی ہے۔ مولانا حالی کے شاگرد بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، وہ انجمن کے معتمد اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا مقالہ پہلی بار ہمارے جریدے "اُردو" کے پہلے شمارے (۱۹۲۱ء) میں چھپتا ہے —— اس طرح انجمن غالبیات میں ایک خاص ورثہ دار کی حیثیت سے اُبھرتی ہے۔ آگے چل کر انجمن ہی

ڈاکٹر شوکت سبزواری کی کتاب "فلسفۂ کلام غالب" کا (جو بجنوری کی کتاب کے پچیس برس بعد ۱۹۴۶ء میں پہلی بار چھپی) نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن، غالب صدی ۱۹۶۹ء کے موقع پر شائع کرتی ہے جبکہ مولوی صاحب مرحوم وفات پا چکے تھے مگر ڈاکٹر سبزواری حیات تھے اور انہی کے ایما پر انجمن نے اشاعتِ ثانی کی ٹھانی تھی۔

غالب کی ولادت (۱۷۹۷ء) پر ایک سو پچھتر برس گزرتے ہیں کہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے اس مقالے کو (۱۹۷۲ء میں) جامعہ سندھ پی ایچ ڈی دیتی ہے جو اب انجمن کے زیرِ اہتمام چھپ رہا ہے۔
ڈاکٹر صاحب موصوف کا بابائے اردو اور انجمن سے تعلق ان کی مطبوعات سے ظاہر ہے:

۱۔ بابائے اردو — احوال و افکار : طبع اول ۱۹۶۴ء، طبع دوم ۱۹۷۶ء
طبع سوم (دہلی) ۱۹۷۹ء، طبع چہارم ۱۹۸۲ء

۲۔ نقدِ عبدالحق : مطبوعہ : ۱۹۶۸ء

۳۔ ذکرِ عبدالحق : طبع اوّل ۱۹۷۵ء، طبع دوم ۱۹۸۵ء

۴۔ فرموداتِ عبدالحق : مطبوعہ : ۱۹۷۸ء

غالب پر بھی ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی دو تین اشاعتیں ہیں:

۱۔ اشاریۂ غالب، مطبوعہ : ۱۹۶۹ء

۲۔ غالب اور انقلابِ ستاون : طبع اوّل ۱۹۷۴ء، طبع دوم ۱۹۷۶ء
طبع سوم (دہلی) ۱۹۸۸ء

۳۔ تحقیقِ غالب : مطبوعہ ۱۹۸۱ء

انجمن ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی ممنون ہے کہ انہوں نے انجمن سے نہ صرف علمی تعاون کیا بلکہ کتابت بھی اپنی نگرانی میں کرائی ہے۔ انجمن کی گزشتہ چند کتابوں کی کتابت معیار کے مطابق نہیں ہوتی تھی اور غلطیاں بھی در آتی تھیں۔ وجہ مالی حالات بھی تھے اور شعبۂ اشاعت کی کوتاہی بھی، گو راقم الحروف اس طرح اپنی ذمہ داری کم نہیں کر سکتا۔
اب خدا کے فضل سے یہ کتاب معنوی کے ساتھ ساتھ حسبِ استطاعت صوری حسن سے بھی آراستہ ہے۔ اب یہ تقریباً یقینی لگتا ہے کہ غالب کی تمام تخلیقات کا احاطہ ہو چکا ہے

۲

اس موقع پر راقم الحروف ایک بات ریکارڈ پر لانا ضروری سمجھتا ہے۔ اگر یہ ایک ناقابلِ یقین امر لگے تو راقم بے بس ہے کہ اس کے پاس صرف اپنی آنکھوں اور یادداشت کی شہادتیں ہیں۔

نہ اس نسبت پر فخر ہے، نہ افسوس مگر، راقم کا تعلق خانوادۂ لوہارو سے ہے۔ اس خاندان سے غالب کی بیبی اور علمی اور محبتانہ نسبت معروف ہے۔ ۱۹۴۲ء میں عمر تقریباً سترہ برس تھی (سیکنڈ ائر ختم کر رہا تھا) گرمیوں کی تعطیلات گزارنے شملے جاتا تھا، کچھ رقم کی ضرورت پڑی، مدد لینے نواب صاحب لوہارو (نواب امین الدین احمد خاں ثانی) کے پاس گیا۔ چند روز وہاں گزارے ـــ بچپن سے غالب، غالب سنتا تھا، خاندان کے حوالے سے بھی۔ اب ایک دن لوہارو کے کتب خانے میں بیٹھا کچھ نظر آئے۔ دوسرے نوادر اور مسودات وغیرہ کا ذکر غیر ضروری ہے۔ راقم نے غالب کے کوئی ایک سو بیس، بہرحال ایک سو سے زیادہ خطوط فارسی اور اُردو دو چھوٹی چھوٹی بوریوں میں بند پائے۔ بوریاں ٹاٹ کی نہ تھیں، موٹے سفید کپڑے کی تھیں۔ تھیلے سمجھ لیجیے۔ وہ یقیناً ایک طرف محفوظ سی رکھی تھیں۔ کتب خانہ بہت چھوٹا تھا، اس کی صفائی ہو رہی تھی۔ میں سب خط نہ پڑھ سکا۔ فارسی تو اس وقت بالکل سمجھ میں نہ آئی، اُردو بھی پوری طرح نہ پڑھی گئی کہ اس وقت وہ رسم الخط پڑھنے کی عادت نہ ہوئی تھی، ہاں اکثر مطالب صاف سمجھ لیے۔ غزلیں شاید تھی ہی نہیں کہیں کہیں کوئی شعر فارسی اور اُردو کا ضرور آجاتا تھا۔

اُردو کے بیشتر خط غالب کی اہلیہ امراؤ بیگم کے چچازاد بھائی اور والی لوہارو میرے پردادا نواب امین الدین خاں کے نام تھے اور ان میں سے تقریباً سبھی کافی مختصر تھے۔ ان میں اکثر خطوط جوئے والے معاملے سے متعلق تھے۔ مقدمہ لڑنے کے لیے مالی امداد طلب کی گئی تھی۔ جیل کے خطوط بھی تھے۔ جیل کے بعد سخت برہمی کا اظہار بھی تھا ایک دو میں صاف صاف یہ تھا کہ تم نے میری خبر خود آکر نہ لی، لوگوں کو بھیجا۔ معلوم

ہوتا ہے یہاں سے یہ لکھا جاتا تھا کہ تم نے خاندان کو بدنام کیا وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ ایک میں واضح طور پر یہ تھا کہ اگر تم بھی اس مقدمے کی کارروائی کو سچ سمجھتے ہو اور میری سزا کو حق جانتے ہو اور خاندان کے لیے میری رشتے داری کو بدنامی کا باعث تو اپنی بہن کو بلا لو ——— معلوم ہوتا ہے یہاں سے لکھا گیا کہ اچھا انھیں بھیج دو۔ ایک فرستادہ کا بھی ذکر تھا غالب کا خط کہتا تھا کہ تمہارے آدمی خط لے کر آئے، تمہاری بہن جانے سے انکاری ہیں۔

فارسی کے کئی خطوط علاء الدین خاں علائی میرے دادا کے نام بھی تھے اور کسی اور بزرگ (غیر خاندانی) کے نام جو اس وقت لوہارو میں رہتے تھے۔ علائی کے نام اکثر خط تعلیمی لگتے تھے مگر ان میں کچھ اذکار خاندانی ضرور تھے۔ اردو کے کئی خطوط میں محض طلبِ زر یعنی صرف طلبِ زر اور عذر، گاہ گاہ پرسرزنش، رامپور کی تعریف، مرزا تفتہ اور شیفتہ کی حالیہ اور سابقہ خدمتوں بطورِ خاص "فتوح" کی تعریف، کچھ احباب کی شکایت بس مجملاً یاد ہے۔

میں نے ادباً نواب صاحب مرحوم کی توجہ اس طرف دلائی۔ انھیں استحضار نہ تھا۔ اُس وقت وہ ایک نوجوان والیٔ ریاست تھے۔ ریاست بہت چھوٹی سی (آج کے تناظر میں حالات سمجھنا مشکل بھی ہے) مگر تھے تو والیِ ریاست۔ صاحبِ تصنیف ہو چکے تھے (ایک ناول)۔ شعر بھی رسماً یا شوق گاہ گاہ کے طور پر کہہ لیتے تھے۔ (بعد میں آزادی کے بعد بہت لکھا) مگر اُس وقت اُن کا مزاج ادب دوست تو کسی حد تک تھا، اتنا غالب پرست نہ تھا، نہ وہ اتنے روشن خیال تھے۔ انھوں نے سرسری طور پر فرمایا۔ جی ہاں مجھے علم ہے کہ ان خطوط میں کیا ہے ان کی اشاعت ہمارے خاندانی وقار کے خلاف ہے۔ پچھلے زمانے میں بھی جو خطوط آپ کے (میرے) والد اور دادا نے دے دیے دیکھ بھال کر دینے چاہیے تھے۔ مرزا مرحوم نے ہمارے قبیلے کی ایک خاتون کیا بیاہی، اُن کی تمام فضولیات میں ہمارا خاندان ضرور ملوث ہوتا ہے آپ ذہن میں دیکھیے میں سوچوں گا۔ (نواب امین الدین خاں اول اور اُن کے چھوٹے بھائی نواب ضیاء الدین خاں نیر درخشاں کی اولاد کے مابین آمدنی کی تقسیم پر تنازعہ رہ چکا تھا۔ اس کے آوازے باہمی شادی بیاہ کے باوجود اُس زمانے تک گشت کرتے تھے۔ نواب ضیاء الدین خاں کی صاحبزادی بگہ بیگم کو غالب اپنی منہ بولی بہو بنا کر لائے تھے)۔

سچ کریں بھی نہ تو کوئی حیثیت رکھتا تھا، نہ اس وقت اس موضوع کا اتنا دیوانہ تھا۔
بعد میں ہمارے تعلقات میرے نظریات اور رویوں کی وجہ سے کسی حد تک ناخوشگوار ہو گئے۔
میرے خیالات بھی بدلتے رہے۔ میں نے اُن سے مزید گفتگو کی ضرورت سمجھی، نہ جرأت
کی۔ پھر ریاست (۱۹۴۷ء میں) ختم ہو گئی۔ وہ جے پور چلے گئے، بھاگ کر جانا پڑا،
قلعے پر کئی حملے ہو چکے تھے۔ ریاست میں اُس وقت (۱۹۴۷ء میں) کوئی مسلمان نہ رہا تھا، سب
بے سروسامان بھاگ گئے تھے۔

۱۹۵۷ء میں (پہلی بار) ہندوستان گیا۔ اور اُن سے ملنے اور اجمیر شریف کی زیارت
کرنے جے پور پہنچا تو اُن کا مزاج بھی بدل چکا تھا اور میں بھی بڑا ہو گیا تھا۔ ان خطوط
کی یاد دلائی — فرمایا سارا کتب خانہ رامپور کتب خانہ میں چلا گیا ہے، وہاں زیادہ
محفوظ رہے گا۔ لوہارو نہ کوئی آتا ہے نہ جاتا ہے۔ قلعہ بند، محلات تباہ، کتب خانہ
تھا ہی کیا، تباہ بھی ہوا اور قلعہ وغیرہ حکومتِ ہند کی تحویل میں آ گیا۔ وہ اسے تحصیل
کے دفتر کے طور پر استعمال کرتی ہے — اب آپ ان خطوط کو یاد دلا رہے ہیں تو میں خود
رامپور لکھ کر دیکھوں گا، کیا بنا، کیا ہوا — اس وقت تک ان کی صاحبزادی نور بانو
نواب رضا علی خاں مرحوم والیٔ رامپور کے چھوٹے صاحبزادے نوابزادہ ذوالفقار علی خاں
ممبر پارلیمنٹ کو بیاہ چکی تھیں۔ رامپور سے تعلق گہرا ہو گیا تھا۔

پھر اُن سے اس موضوع پر گفتگو تو کیا، کوئی خاص خط و کتابت بھی نہ ہوئی۔ میں ۱۹۸۷ء
تک ہندوستان بھی نہ گیا۔ اس دوران میں ہندوستانی فضلا آتے تھے اور ملاقات ہو جاتی
تھی تو میں ذکر کرتا تھا۔ مخدومی عرشی صاحب سے خاص طور پر کہا۔ یہ کوئی بیس برس
کی بات ہے۔ انہوں نے واپس جا کر مجھے خط لکھا (وہ محفوظ نہیں) کہ انھیں کچھ نہیں ملا

۱۹۸۲ء میں مخدومی مالک رام صاحب سے کہا۔ انہوں نے بڑی دلچسپی لی فرمایا
کہ اب میں جستجو کروں گا۔ خود نواب صاحب کو یاد دلایا۔ وہ اس وقت پنجاب
(ہند) کے گورنر تھے۔ انہیں یاد ہی نہیں رہا تھا۔ فرمایا آپ خود رامپور چلے جائیے
اور تلاش کیجیے۔ لیکن یہ گفتگو انہوں نے سرسری سی کی گو دلچسپی بہت دکھائی۔ اب

وہ اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ غالب کے وہ خطوط بھی ادب کا ایک عجیب و غریب سرمایہ ہوں گے اور خاندانی وقار وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے — پھر میں نے عرشی زادہ صاحب کو لکھا - اُن کا جواب بھی وہی آیا کہ وہ دستیاب نہیں ہے - میں رامپور کبھی گیا نہیں - اب جاتا بھی تو کیا مل جاتا - اب تو وہ کتب خانہ زیر تنقیح بھی بند ہے -

گویا وہ خط ضائع ہو گئے، ضائع نہ ہو گئے ہوتے تو اب تک کسی نہ کسی کو مل جاتے لیکن یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ غالب کے وہ خط راقم الحروف نے دیکھے ہیں - کیوں ضائع ہوئے، کب ضائع ہوئے، اب یہ بحث لاحاصل ہے -

اپنے چچا سے سُنا تھا کہ غالب کے سب سے زیادہ عاشق میرے دادا علاءالدین خاں علائی تھے جو ان کے درس و سخن کے شاگرد بھی رہے - اُن کے بعد میرے والد نواب امیرالدین فرخ مرزا — لیکن اُن کے زمانے میں یہ خطوط کیوں عام اشاعت کے لیے نہ گئے - اس کی وجہ بھی وہی خاندانی وقار ہو گا جو اُن کے پوتے (اور میرے بھتیجے نواب امین الدین خاں ثانی آخری والیٔ لوہارو کو ملحوظ تھا) واللہ اعلم بالصواب - اس ضمن میں اس وقار کی نسبت سے ایک اور واقعہ ہمیں ریکارڈ کر دوں کہ بہرحال یہ تمام اشاعت غالب سے متعلق ہے -

۳

غالب شناس جانتے ہیں کہ غالب نے اپنی سالی کے بیٹے زین العابدین خاں عارفؔ کے دو لڑکے پالے تھے - ان میں سے ایک باقر علی خاں کامل تھے - ان کی شادی نواب ضیاءالدین خاں نیّر ورخشاں کی صاحبزادی معظم زمانی عرف بگہ بیگم سے ہوئی (خطوطِ غالب میں ان کا ذکر آتا ہے) اور اُن کی بڑی صاحبزادی جندو بیگم کا بھی جنہیں غالب مرزا جیون بیگ کے خطاب سے یاد کرتے ہیں - یہ نیّر و رخشاں کے پوتے نواب شجاع الدین خاں تاباں برادرِ بزرگ نواب سراج الدین خاں سائل سے بیاہی -

دلہن بیگم کے نواسے اُن کی چھوٹی صاحبزادی کے بیٹے فخرالدین علی احمد مرحوم ایک وقت میں صدرِ ہندوستان ہوئے) آزادی سے پہلے ان دلہن بیگم سے پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے ایک تفصیلی انٹرویو لے کر شائع کیا تھا۔ وہ رشتے میں میرے والد کی پھوپھی ہوتی تھیں۔

ہم عید بقرعید پر اُن کے سلام کو جاتے تھے۔ بالکل پوپلی ہو گئی تھیں۔ میری شادی کے بعد غالباً ۱۹۴۵ء میں وفات پائی۔ بصارت تقریباً جا چکی تھی، سماعت جارہی تھی، ایک بار میں نے اُن سے خوب کھود کھود کر مرزا غالب کی شراب نوشی پر پوچھا۔ (وہ اُن کے آخری زمانے میں بہت چھوٹی عمر میں بیاہ کر آئی تھیں) بہت برافروختہ ہوئیں۔ فرمایا کم بخت میرے سُسر کو شرابی کہتا ہے۔ شراب سے کیا تعلق اُن کا — میں نے جوئے اور جیل کا ذکر کیا تو اور بھی زجر و توبیخ کی۔ یقیناً یہ واقعہ اُن کی پیدائش سے بہت پہلے کا تھا اور مرد بزرگوں نے ممکن ہے انھیں نہ بتایا ہو لیکن یہ تو ناممکن ہے کہ دادی اُمراؤ بیگم نے جو نہایت وفادار بیوی ہونے کے باوجود اپنے ہی خاندان کی ایک فرد، اپنی بہو کے سامنے (جو آخر ش اسی خاندان سے تھیں) کبھی مرزا صاحب کے یہ واقعات بیان نہ کیے ہوں۔

بہرحال میں نے ایک بار سے زیادہ یہ بات چھیڑی (اس وقت ہیرنگ ایڈز نہ تھیں مگر ہم ان کے کانوں پر ایک نلکی یا کپّی اُلٹی رکھ کر اپنی بات اُن تک خوب پہنچا دیتے تھے) اُنھوں نے کبھی اس امر کی تصدیق نہ کی بلکہ اُلٹا ڈانٹا۔ یہ باتیں اُس وقت کی ہیں جب میں اُنیس برس کا ہو چکا تھا، سب خوب یاد ہے۔

اس ماحول اور ان اقدار میں اگر وہ خطوط، نواب صاحب لوہارو مرحوم نے خود نہیں تو کسی اور خاندانی نے ضائع کر دیے ہوں تو کچھ عجب نہیں۔

دہرادوں کہ ان باتوں کا ذکر کئی ہندوستانی (اور پاکستانی) احباب و محققین سے کر چکا ہوں مندرجہ بالا بیان مختلف ادوار میں ہندوستان سے آنے والے کئی محققین و اہلِ علم کے سامنے دیا ہے۔ جناب امتیاز علی عرشی اور جناب عرشی زادہ

کو لکھا بھی ہے جن سے ذکر ہوا اُن میں ڈاکٹر نثار فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور ڈاکٹر مختار الدین احمد اور خصوصاً جناب مالک رام صاحب شامل ہیں۔ اپنی سوانح نہ معلوم کب لکھوں، یہ تحریر اسی مقدمے میں سہی ——

کاش مرزا غالب کے وہ خط موجود ہوتے اور ان کا حوالہ اُن کے علمی سرمائے کے پیشِ نظر جائزے میں جگہ پاتا۔

(۴)

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ملک کے پہلے ریسرچ اسکالر ہیں جنہوں نے غالب پر ڈاکٹریٹ کا اعزاز اور امتیاز حاصل کیا — غالب کے ایک سو پچھترویں جشنِ ولادت (۱۹۷۲ء) پر سندھ یونیورسٹی نے سید معین الرحمٰن صاحب کو اس مقالے پر پی ایچ۔ڈی کی سندِ فضیلت عطا کی تھی اور اب ہم اسے بڑے شوق اور فخر کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

جمیل الدین عالی

معتمدِ اعزازی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی

اس کتاب کی اشاعت کئی برس پہلے، انجمن ترقی اُردو (پاکستان)، کراچی نے قبول کی تھی۔ طے یہ پایا تھا کہ کتابت وغیرہ کا سارا کام' میں اپنی نگرانی میں کراؤں گا — اس میں بوجوہ اندازے سے بہت زیادہ تاخیر ہوگئی — اور جب کام، کسی نہ کسی طرح اتمام کو پہنچا تو میں چاہتا یہ تھا کہ کتاب، غالب کی ایک سو بیسویں برسی کی مناسبت سے ۱۹۸۹ء میں ضرور شائع ہو جائے — اس میں کچھ دفتری اور تکنیکی امور اور مسائل مزاحم ہوئے۔ کاش میں اپنے حصے کا کام بروقت پورا کرنے پر قادر ہو پاتا! بہرحال یہ اعتراف ضروری ہے کہ اصحابِ انجمن کی عنایات اور اپنی بد توفیقی، ہر دو کی کوئی حد نہیں: ایں را نہایتے است نہ آں را نہایتے! کتاب انجمن سے شائع ہوتی تو بجائے خود میرے لیے بڑی عزت اور مسرت کی بات ہوتی۔

(ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)

پیش لفظ

ڈاکٹر سید معین الرحمن

غالب نے کس عمر میں شعر گوئی شروع کی، اس بارے میں اُن کے اپنے بیانات میں کسی قدر تضاد ہے، جو کم سے کم عمر خود اُنھوں نے بتائی ہے وہ "دس برس" ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ انھوں نے آٹھ نو برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ یہ بہر حال طے ہے کہ آٹھ دس برس کی عمر (۷-۱۸۰۵ء) میں موزونیِ طبع کے جو آثار پیدا ہوئے تو پھر اُن کی ساری عُمر اسی شیوے کی ورزش میں گزری اور لکھنے لکھانے کا سلسلہ اخیر دم (فروری ۱۸۶۹ء) تک جاری رہا۔

○

سرسید احمد خاں نے غالب کے انتقال سے کوئی ایک چوتھائی صدی پہلے، ۱۸۴۶ء میں غالب کے سرمایۂ علمی کے بارے میں کہا تھا کہ یہ :

"حدِّ شمار سے افزوں اور ظرفِ حصر سے بیروں ہے[۱]"

لیکن عہدِ موجودہ کے ایک معروف غالب شناس مالک رام اب، کہ غالب کے انتقال پر دوسری صدی کی پہلی دہائی بھی گذر چکی ہے، یہ فرماتے ہیں :

"غالب نے اپنی ساٹھ سالہ ادبی زندگی میں چار کتابیں فارسی نثر میں اور دو نظم میں لکھیں۔ اُردو میں اُن کا سارا سرمایہ ایک مختصر دیوان اور خطوط کے مجموعوں کے علاوہ تین چار اور چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ ساٹھ سال کی لمبی مُدّت کا یہ ثمرہ بہ لحاظِ مقدار کچھ ایسا قابلِ توجّہ یا مہتم بالشّان نہیں ہے[۲]"

سرسید احمد خاں اور مالک رام کی یہ آراء باہم متناقض ہیں اور میری بہت سوچی سمجھی رائے

---

[۱] آثار الصنادید، طبع اوّل، مطبع سیّد الاخبار، دہلی ۴۷-۱۸۴۶ء، باب چوتھا، صفحہ ۱۲۸

[۲] ذکرِ غالب، طبع پنجم، دہلی فروری ۱۹۷۶ء، صفحہ ۱۸۷

یہ ہے کہ یہ دونوں ہی دُرست بھی نہیں۔

جہاں سرسید کی یہ بات پوری صداقت کو ظاہر نہیں کرتی کہ غالب کا سرمایۂ علمی "حدِ شمار سے افزوں اور ظرفِ حصر سے بیروں ہے" وہاں مالک رام کا یہ ارشاد بھی محلِ نظر ہے کہ: "غالب کی ساٹھ سال کی لمبی مُدّت کا یہ ثمرہ اور سرمایہ بہ لحاظِ مقدار کچھ ایسا قابل توجہ یا مہتم بالشان نہیں۔" حقیقت یہ ہے کہ غالب کا تصنیفی سرمایہ "حدِ شمار سے افزوں" اور "ظرفِ حصر سے بیروں" نہ سہی لیکن بہ لحاظِ مقدار یہ کچھ ایسا کم بھی نہیں ہے۔

⊙

ساٹھ برس سے متجاوز اپنی زندگی کے "طویل" دور میں غالب نے بہت کچھ کہا اور بہت کچھ لکھا، طبیعت کی اپج سے بھی، ضرورتاً بھی اور فرمائش پر بھی ـــ اُردو میں بھی لکھا اور فارسی میں بھی، بصورتِ نظم بھی اور بہ پیرایۂ نثر بھی۔ اور جو کچھ اُنھوں نے لکھا اُس پر اُنھیں اعتماد تھا۔

وہ بلا کے ذہین، ذکی، طبّاع اور بیدار مغز تھے اور قبل از وقت پختہ ہو جانے والی غیر معمولی فطرت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ خدا کی طرف سے اُنھیں وافر نورِ خرد عطا ہوا اور گنجِ سخن سے مالا مال کیا گیا۔ اُنھوں نے اپنی عہد آفریں شخصیت اور طبعِ ہمہ رساں کے بل پر شعر و ادب اور زندگی کے چلن کو نئے سانچے اور نئے مفاہیم دیئے لیکن جیسا کہ بالعموم "مجتہدین" کا مقدر رہا ہے، جیتے جی اُن کی شخصیت کی عظمت کا خاطر خواہ اعتراف نہیں ہوا اور اُن کے اسلوبِ حیات اور اندازِ فکر و سخن کی قدر و قیمت جیسی چاہیئے تھی آنکی نہیں گئی۔

خود غالب اس بات پر جہاں تہاں شکوہ سنج نظر آتے ہیں کہ لوگ اُن کے حسنِ گفتار کو پہچاننے سے قاصر رہے۔ نظم و نثر میں جو نظر افروز جلوہ آرائی اُنھوں نے کی وہ ابنائے روزگار پر سے بالا ہی بالا گزر گئی اور اپنے رُتبے کی بنا پر جس قدر و منزلت اور داد و تحسین کے وہ مستحق تھے، وہ اُنھوں نے نہ پائی:

"حیف کہ ابنائے روزگار حسنِ گفتار مرا نشناختند مرا خود دل بر آں می سوزد کہ کامیاب شناسائی ذرۂ ایزدی نہ گشتند و ازین نمایشہای نظر فروز کہ در نظم و نثر بکار بردہ ام سرگراں گزشتند۔"[لہ]

لہ "درفشِ کاویانی"، طبع اوّل، دہلی ۱۸۶۵ء، صفحہ ۳۱، ۲ بر بعد

انتقال سے کوئی چار برس پہلے کے ایک خط مرقومہ ۱۳- فروری ۱۸۶۵ء میں علائی کو لکھتے ہیں کہ:

"مجھے اپنے ایمان کی قسم، مَیں نے اپنی نظم و نثر کی داد بہ اندازۂ بائیست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا، آپ ہی سمجھا" (اُردوئے مُعلّیٰ طبع اوّل، دہلی، ۱۸۹۹ء، صفحہ ۲۹۷)

پہچان، پرکھ، تفہیم اور تحسین تو بعد کی بات ہے، اور پھر ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں ؛ ان سو سے زیادہ برسوں میں بتمامہٖ غالب کے تصنیفی سرمائے کا احصار اور احاطہ بھی ممکن نہیں ہو پایا—کوئی مستقل اور مفصل کتاب یا کوئی مبسوط مطالعہ ایسا نہیں، جو زمانی اور تاریخی ترتیب سے سلسلے وار صرف غالب کی تصانیفِ نظم و نثر کے تحقیقی اور توضیحی جائزے پر محیط ہو۔

زیرِ نظر مقالہ اسی خلاء کے پیشِ نظر تالیف کیا گیا ہے، لیکن دستیاب مآخذ اور محدود اور موجود وسائل کی حد تک جامعیت کی اپنی سی پوری کوشش کے باوصف، مقالہ اس اِدّعا سے پیش نہیں کیا جا رہا کہ یہ لازماً اس خلاء کو پُر بھی کرتا ہے۔

اس مقالے کے ذریعے غالب کے تصنیفی سرمائے کو "حدِّ شمار اور ظرفِ حصر" میں لانے کی مُخلصانہ کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ اس مقالے کے بعد، اب جہاں ایک طرف اِس بات کی کچھ حقیقت نہیں رہ جاتی کہ یہ "حدِّ شمار سے افزوں اور ظرفِ حصر سے بیروں ہے"۔ وہاں دوسری طرف یقین ہے کہ اب یہ بھی نہیں کہا جا سکے گا کہ "غالب کی ساٹھ سال کی لمبی مدت کا ثمرہ بہ لحاظِ مقدار کچھ ایسا قابلِ توجّہ یا مہتم بالشّان نہیں"۔ اور یہی میرا بنیادی مُوقف ہے۔ پیشِ نظر مقالے کے مطالعے کے بعد اگر آزادانہ اس نتیجے پر پہنچا جا سکے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت بار آور ہوئی۔

یہ مقالہ جس پر ۱۹۷۲ء میں سندھ یونیورسٹی، جام شورو نے پی ایچ ڈی کی سندِ فضیلت عطا کی تھی، تازہ مصادر سے استفادے کے بعد، اب کسی قدر ترمیم اور تخفیف کے ساتھ، غالب کی ایک سو بیسویں برسی کے موقع پر شائع ہو رہا ہے۔ یہ غالب کی اُن تصانیف کے جائزے پر مبنی ہے جو غالب کی زندگی میں یا مابعد منصّۂ شہود پر آئیں۔

کتاب کے پہلے دو ابواب میں نظم و نثرِ اردو کی کتابیں زیرِ بحث آئی ہیں۔ کتاب کے تیسرے اور چوتھے باب میں غالب کی مطبوعاتِ نظم و نثرِ فارسی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ غالب کے آخری چند برس "برہانِ قاطع" کی ایک ناخوشگوار بحث کی نذر ہوئے۔

پانچویں باب میں قضیۂ برہان کے سلسلے کی فارسی اور چھٹے باب میں اس سلسلے کی اردو مطبوعاتِ غالب زیرِ بحث آئی ہیں۔ ساتواں باب غالب کے اردو فارسی، شعری اور نثری انتخابات اور متفرقات سے بحث کرتا ہے۔

غالب کی نظم و نثر کے کچھ ذخائر ایسے بھی ہیں جن کے تملک کی نشاندہی کو برسوں گزر چکے ہیں لیکن یہ کسی معلوم یا مخفی رکاوٹ یا عدم توجہی کے باعث ابھی تک شائع نہیں ہو پائے۔ غالبیات کا ایک اور تکلیف دہ پہلو یہ بھی ہے کہ غالب کی بعض اہم تصانیف کا جہاں تہاں محض ذکر ملتا ہے۔ یہ تاحال دستیاب نہیں ہو سکیں۔ کتاب کے دو آخری باب انہی مباحث کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان میں معلوم غیر مطبوعہ ذخائر اور معدوم تصانیفِ غالب کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

مقالے میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ مناسب حدود میں جملہ تصانیفِ غالب کا تحقیقی تعارف پیش کر دیا جائے۔ اس تعارف میں یہ حد ملحوظ رہی ہے کہ صرف بنیادی مآخذ سے استفادہ کیا جائے اور صرف وہیں ثانوی مآخذ سے کام لیا جائے جہاں اساسی اور اصلی مآخذ خاموش یا مخدوش ہوں۔ چنانچہ ان تصانیف اور ان کی طباعت و اشاعت کے باب میں خود غالب کے اپنے بیانات اور تاثرات اور خطوطِ غالب کی شہادتیں ضرور سامنے رہی ہیں۔ انیسویں صدی کی مابعد یا بیسویں صدی کے قریب نصف اول تک کی بعض قابلِ ذکر اشاعتوں کا تذکرہ بھی ساتھ ساتھ آگیا ہے اور ہر اشاعت کو ستارے یا دائرے کے نشان سے ممیز کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس علمی کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

زیرِ نظر مقالہ پروفیسر سید وقار عظیم اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تجویز اور تائید کے ساتھ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کی نگرانی میں تحریر کیا گیا اور انجمن ترقیِ اردو پاکستان کی تحریک اور یونیورسل بکس کے برادرم شبیر احمد خاں کی توجہ سے شائع ہو رہا ہے۔ میں اس لطف و کرم کے لیے ممنون ہوں۔

محمد [signature]
۱۵- فروری ۱۹۸۹

شعبۂ اردو،
گورنمنٹ کالج، لاہور

پہلا باب

تصانیفِ غالب : نظمِ اردو

۱۔ دیوانِ غالب :	دہلی، ۱۸۴۱ء، ۱۸۴۷ء، ۱۸۶۱ء، ۱۸۶۲ء کانپور، ۱۸۶۲ء، آگرہ ۱۸۶۳ء
۲۔ دیوانِ غالب جدید (نسخۂ حمیدیہ) :	۱۸۲۱ء، مطبوعہ آگرہ، ۱۹۲۱ء
۳۔ بیاضِ غالب بخطِ غالب (نسخۂ لاہور) :	۱۸۱۶ء، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۹ء
۴۔ دیوانِ غالب بخطِ غالب (نسخۂ عرشی زادہ) :	۱۸۱۶ء، مطبوعہ رامپور، ۱۹۶۹ء
۵۔ قادر نامہ :	دہلی، ۱۸۵۶ء، ۱۸۶۱ء، ۱۸۶۳ء

دیوانِ غالب

غالب کی زندگی میں، اُن کا اُردو دیوان چھ بار شائع ہوا: پہلی بار، عمر کے چوالیسویں سال میں، اور آخری بار، انتقال سے چھ برس پہلے، جب اُن کی عمر سنہ عیسوی کے مُطابق چھیاسٹھ برس کی تھی۔ پاکستان میں، بڑے سے بڑا، کوئی کتاب خانہ، یا اچھے سے اچھا، کوئی شخصی ذخیرۂ غالبیات ایسا نہیں، جس میں غالب کی زندگی کے یہ سب کے سب ایڈیشن یک جا محفوظ ہوں۔ ذیل میں اِن اشاعتوں کے تفصیلی کوائف پیش کیے جاتے ہیں:

- طبع اوّل: مطبع سیّد الاخبار / سیّد المطابع، دہلی، اکتوبر ۱۸۴۱ء
  ضخامت: ۱۰۸ صفحات • مسطر: تیرہ سطری
  سائز: لگ بھگ ۸ × ۶ اِنچ (۴×۶ اِنچ)
  تعداد اشعار: ۱۰۹۴

"پنج آہنگ" (مطبوعہ، ۱۸۴۹ء) میں میر جان جاکوب (جیکب) کے نام، غالب کے کئی خط ہیں۔ باعتبارِ ترتیبِ اشاعت، آخری خط کا ایک ٹکڑا، کچھ یہ ہے:

"مطبع سیّد الاخبار کے مالک وکار فرما کہ 'یکی از دوستانِ روحانی منست' اِس 'غالبِ بے نوا' کا کلام چھاپ رہے ہیں۔ ازاں مجملہ "دیوانِ اُردو" کہ 'در نا تمامی تمام است' عجب نہیں کہ اِسی مہینے چھپ کر، آپ کی نظرِ عالی سے گزرے ۔۔۔"

مطبع سیّد الاخبار کے مالک سیّد محمد خاں، جنہیں غالب نے اپنے "دوستانِ روحانی" میں سے

بتایا ہے، سر سید احمد خاں کے بڑے بھائی تھے۔ غالب کا اُردو دیوان پہلی بار انھی کے قائم کردہ مطبع "سید المطابع" میں چھپا، جو اُن کے اخبار کے نام کی رعایت سے "مطبع سید الاخبار" بھی کہلاتا تھا۔

یہ دیوان، شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا ——

پہلے صفحے پر بترتیبِ ذیل پانچ سطروں میں یہ تفصیل درج ہے:

دیوان اسد اللہ خان صاحب غالب تخلص ٥

مرزا نوشہ صاحب مشہور کا دلی میں سید محمد خان بہادر کی چھاپہ خانے کے

لیتھو گرافک پریس میں تیرہویں شعبان

سنہ ۱۲۵۷ ہجری مطابق ماہ اکتوبر سنہ ۱۸۴۱ عیسوی کو سید عبد الغفور کے

اہتمام میں چھاپا ہوا

بتایا گیا ہے کہ تخلص پر مندرج نشان ٥ کی جگہ سید محمد خاں کے بہت خوش رقم قلمی دستخط ہیں۔[۱]

صفحہ ۲ سادہ ہے۔ صفحہ ۳ سے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا عنوان قائم کر کے غالب کا فارسی دیباچہ ہے، جو صفحہ ۵ کی پہلی تین سطروں پر تمام ہوتا ہے۔ اِس کے اوّل یا آخر کوئی تاریخ نہیں ہے۔ صفحہ ۵ کی چوتھی سطر "یا اسد اللہ الغالب" کے جلی عنوان پر مشتمل ہے۔ اس کے معاً بعد غزلیات شروع ہو جاتی ہیں۔ مالک رام لکھتے ہیں کہ: "یہ صفحہ ۹۵ تک چلی گئی ہیں، جہاں ان کے آخر میں "تمام شد غزلیات" کے الفاظ لکھے ہیں۔ صفحہ ۹۶ سے قصائد شروع ہوتے ہیں۔ پہلے قصیدے کا عنوان ہے: "منتخب قصیدۂ منقبت علی مرتضیٰ علیہ السلام"...... دیوان میں بس دو

۱۔ رسالہ، اُردوے معلیٰ، دہلی، غالب نمبر فروری ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۰۸

قصیدے ہیں۔ دوسرا قصیدہ صفحہ ۱۰۰ پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد "قطعات" کا عنوان ہے[1]۔

اِس سے قدرے مختلف، امتیاز علی عرشی کا بیان ہے کہ: "غزلیات صفحہ ۹۴ تک چلی ہیں اور اسی صفحے یعنی ۹۴ کی آخری سطر "تمام شد غزلیات" کے الفاظ پر مشتمل ہے۔ قصائد صفحہ ۹۵ سے شروع ہوتے ہیں۔ پہلے قصیدے کا عنوان ہے: "منتخب قصیدۂ منقبت علی مرتضیٰ علیہ السّلام" دیوان میں دو ہی قصیدے ہیں۔ دوسرا قصیدہ صفحہ ۹۹ پر ختم ہوتا ہے اور اسی صفحے یعنی ۹۹ کی سطر ۸ "قطعات" کے عنوان پر مشتمل ہے[2]۔"

مالک رام کہتے ہیں کہ قطعات کے بعد "صفحہ ۱۰۲ کے وسط سے "رُباعیات" کے عنوان کے تحت رُباعیاں شروع ہوتی ہیں .... اور صفحہ ۱۰۴ پر ختم ہوتی ہیں۔ اِسی صفحے سے نواب ضیاالدین احمد خان کی فارسی میں "تقریظ" کی ابتدا ہوتی ہے[3]۔" عرشی صاحب کے لکھنے کے مطابق قطعات کے بعد صفحہ ۱۰۱ کی سطر ۶ پر "رُباعیات" کا عنوان ہے، اور یہ صفحہ ۱۰۳ تک چلتی ہیں۔ اِسی صفحے یعنی ۱۰۳ کی سطر ۸ سے "تقریظ" نوشتۂ نواب ضیاالدین احمد خاں بہادر نیّر ہے[4]۔" ایک دوسرا ماخذ جو عرشی صاحب کے اِس بیان کے پہلے حصّے کے بارے میں خاموش ہے، بیانِ عرشی کے حصّۂ متوخر کی تائید میں ہے:

> "نواب ضیاء الدین احمد خاں کی فارسی تقریظ.....
> صفحہ ۱۰۳ سطر ۸ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۰۸ پر ختم
> ہوتی ہے[5]۔"

مالک رام کے بیان کے مطابق بھی یہ تقریظ صفحہ ۱۰۸ پر ختم ہوئی ہے۔ اس کے بعد ایک ورق "غلط نامہ" کے لیے وقف ہے، جس کے ذریعے پندرہ غلطیوں کی اِصلاح کی گئی ہے۔ اِس کی

---

[1] دیوانِ غالب، صدی ایڈیشن، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۵ و بعد

[2] دیوانِ غالب اُردو، نسخۂ عرشی، علی گڑھ، ۱۹۵۸ء، دیباچہ، صفحہ ۹۵

[3] دیوانِ غالب، مالک رام، ایضاً، مقدمہ، صفحہ ۱۶

[4] نسخۂ عرشی، دیباچہ، صفحہ ۹۵

[5] محمد ذاکر، اُردوئے معلّٰی، دہلی، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۰۵

پُشت خالی ہے، لیکن "غلط نامہ" کے اِس ورق پر کوئی نیا یا مُسلسل نمبر نہیں ڈالا گیا اور دیوان اصلاً صفحہ ۱۰۸ پر ختم ہو جاتا ہے۔ دیوانِ غالب، طبع اوّل میں کاتب سے ایک بڑا سہو یہ ہوا ہے کہ اُس نے ردیف الف میں ایک شعر کو اِس صورت سے درج کر دیا ہے :

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سُخن مجھے

کہتے ہیں جس کو عشق خَلَل ہے دماغ کا

"غلط نامہ" میں اس کی تصحیح اِس طرح کی گئی ہے کہ پہلے محذوف مصرعے، اشعار کی پوری قرأت کے ساتھ درج کئے گئے ہیں، اور اس کے بعد اس "سہو" کی توضیح کی گئی ہے :

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سُخن مجھے

تریاکیٔ قدیم ہُوں دُودِ چراغ کا

بُلبُل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل

کہتے ہیں جس کو عشق، خَلَل ہے دماغ کا

دریں جا، دو مصرعے، یعنی دوئیں و سوئیں از سہو کاتب ماندہ بودند۔

بنابریں ہر چہار مصرع دَر مدیح نوشتہ شد ـــــ"

اِسی طرح ایک بڑی غلطی یہ ہے کہ صفحہ ۵۹ پر ردیف الیاء کے ضمن میں ـــــ "کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں" والے معروف قطعے کے آخری تین شعر بھی چھپ گئے ہیں، جبکہ یہ اپنے صحیح محل پر (بر صفحہ ۹۹) درج ہیں۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر کی تقریظ مرقومہ یک ہزار و دو یست و پنجہ و چہار ہجریہ نبویہ (۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء) میں، تعدادِ اشعار کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"ہمگی اشعار شعری شعار غزل و قصیدہ و

قطعہ و رُباعی یک ہزار و نود و ہشت اند یافتم"

لیکن سر سیّد احمد خاں نے "آثار الصنادید" میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کے نمونۂ نثر کو نقل

کرتے ہوئے ۱۲۵۴ھ کے سنہ کے ساتھ اشعار کی تعداد "یک ہزار وہفتاد واند"[1] درج کی ہے۔ عرشی صاحب کے محاکمے کے مطابق "اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ترتیبِ دیوانِ ریختہ کے وقت' اشعار کی کل تعداد ۱۰۷۰ سے کچھ اوپر تھی۔ جب طباعت کے وقت' اس میں اضافہ ہو کر کل اشعار ۱۰۹۰ سے کچھ زیادہ ہو گئے تو تعداد میں ترمیم کر دی گئی۔ اصولاً، یہاں تاریخ بھی بدلنا چاہیے تھی لیکن کسی وجہ سے ایسا نہیں ہوا۔

اِس عبارت سے' یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ نیر نے اصل میں "ہزار و نود و اند" لکھا تھا، لفظ "ہشت" کتاب کے چھپ جانے کے بعد کاتب یا مصحح نے اشعار گِن کر ایزاد کیا ہے۔ اِس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ "اند" بمعنی "چند" مبہم اکائی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جب "ہشت" نے اکائی کی جگہ پُر کر دی' تو اِس لفظ کی ضرورت باقی نہیں رہتی' اور بے ضرورت' لفظ کا غلط استعمال نیر جیسے ادیب سے ناممکن ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خود اشعار کی یہ تعداد (۱۰۹۸) بھی درست نہیں۔ کتاب میں کل اشعار ۱۰۹۵ ہیں ــــ" (نسخۂ عرشی، دیباچہ، ص ۹۵ و بہ بعد)

حقیقتاً اِس اِشاعت کے کل اشعار کی تعداد، جیسا کہ خود عرشی صاحب نے ردیف وار پیش بھی کی ہے،[2] ۱۰۹۳ ہے۔ یہ عدد 'غلط نامے' کے مطابق، ایک شعر کے ایزاد اور ردیف الیا سے تین سوا مکرر چھپے ہوئے اشعار کے اِخراج کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ مالک رام نے دو جگہ[3] اشعار کی تعداد ۱۰۹۵، اور ایک موقع پر[4] ۱۰۷۰ بتائی ہے، جو صحیح نہیں۔ شیخ محمد اکرام، یہ تعداد ۱۰۹۲ بتاتے ہیں،[5] ظاہر ہے یہ بھی سہو ہے۔

---

[1] آثار الصنادید، طبع اول، مطبع سید الاخبار، دہلی ۴۷-۱۸۴۶ء، باب ۴، صفحہ ۱۵۸

[2] نسخۂ عرشی، دیباچہ، صفحہ ۹۴-۹۵

[3] (الف) دیوانِ غالب، صدی ایڈیشن، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۹ء، مقدمہ، صفحہ ۱۶
(ب) ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی، ۱۹۶۴ء، صفحہ ۲۰۴

[4] دیوانِ غالب، صد سالہ یادگار، غالب کمیٹی، دہلی، ۱۹۶۹ء، تعارف، صفحہ ۷

[5] غالب نامہ، طبع اول ۱۹۳۶ء، مابین صفحہ ۲۸۰ و ۲۸۱

مسطر :

امتیاز علی عرشی : ہر صفحے میں ۱۵ سطریں ہیں۔ ہر دو غزلوں کے درمیان کی ایک سطر کاتب نے سادہ چھوڑ دی ہے، جس کے باعث سے ہر صفحے میں مکتوبی سطریں پندرہ سے کم رہ گئی ہیں۔ (نسخۂ عرشی، دیباچہ، ص ۹۳)

مالک رام : (الف) پوری کتاب ۱۳ سطری مسطر پر لکھی گئی ہے۔

[صدی ایڈیشن، مقدمہ، ص ۱۶]

(ب) یہ نسخہ پندرہ سطری مسطر کے ۱۰۸ صفحات کو محیط ہے۔

[ذکرِ غالب، طبع چہارم، ۱۹۶۴ء، ص ۲۰۲]

محمد ذاکر : ہر غزل، ہر قطعہ اور رباعی کے ختم ہونے کے بعد، ایک سطر خالی چھوڑ دی گئی ہے۔ اس طرح ایک صفحے پر مکتوبی سطریں تیرہ سے بھی کم رہ گئی ہیں۔ آخری صفحے کے علاوہ، (جو تیرِ رخشاں کی فارسی تقریظ کا بھی آخری صفحہ ہے) کسی صفحے پر بھی ۱۳ سطروں سے زیادہ سطریں نہیں ہیں، اور اس صفحے پر بھی، محض ایک صفحہ بچانے کے لیے، کاتب نے مسطر کو ارادتاً توڑا ہے، اور بجائے تیرہ کے چودہ سطریں لکھی ہیں۔

[اردوئے معلیٰ، دہلی، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۴]

سائز / پیمائش :

اِمتیاز علی عرشی : کتاب کا طول و عرض ۸½ × ۵½ اور کتابت کا ۶½ × ۳½" ہے۔

[نسخۂ عرشی، دیباچہ، ص ۹۳]

مالک رام : کتاب ۸×۶ (۴×۶)" سائز میں ہے۔

[صدی ایڈیشن، مقدمہ، ص ۱۶]

محمد ذاکر: کتاب کی ناپ ۱۰ء۹ × ۶ ہے، اور کتابت کی ناپ ۶ × ۳½ ہے۔
[اُردوئے معلّیٰ، دہلی، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۳]

عرشی صاحب (محولہ فوق) کے مطابق کاغذ پرانی وضع کا دیسی بانس کا بنا ہوا ہے۔ خط بہت معمولی نستعلیق ہے اور پوری کتاب جدولوں سے خالی ہے۔ یہی بات محمد ذاکر نے دہرائی ہے۔ (اُردوئے معلّیٰ، ایضاً، ص ۱۰۳)

دیوانِ غالب، طبع اوّل کے نسخے بہت کمیاب ہیں۔ مالک رام کے بقول: "ایک کرم خوردہ نسخہ منشی مہیش پرشاد کے پاس تھا اور خدا معلوم اب کہاں ہے؟"[۱] اِس ایڈیشن کا ایک نسخہ صولت پبلک لائبریری، رامپور میں ہے۔ اِس کا ایک نسخہ خان بہادر سید ابو محمد مرحوم کے پاس بھی محفوظ تھا[۲]، جس کے ایک صفحے کا عکس شیخ محمد اکرام نے "غالب نامہ" (طبع اوّل ۱۹۳۶ء، مابین ص ۲۸۰-۲۸۱) میں دیا ہے۔ یہ نسخہ مرحوم ابو محمد کے بعد اُن کے صاحبزادے کی ملکیت میں رہا۔ اب یہ نسخہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے کتب خانے میں ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد لکھتے ہیں کہ:

> یہ نسخہ، خان بہادر ابو محمد کے پاس تھا، اب اُن کے ذخیرۂ کتب کے ساتھ، علی گڑھ آکر محفوظ ہو گیا ہے (رقم، اُردو ۱۷۳ یونیورسٹی) یہ ایڈیشن بہت کمیاب ہے۔ صولت پبلک لائبریری، رامپور، اور پیشِ نظر نسخے (مخزونہ، علی گڑھ) کے علاوہ ہندوستان میں کسی نسخے کے وجود کی ہمیں اطلاع نہیں —" (علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۴۸)

لیکن ہندوستان میں رامپور اور علی گڑھ کے علاوہ، دہلی اور الہ آباد میں بھی، اِس ایڈیشن کے کم از کم دو نسخوں کی موجودگی کے شواہد موجود ہیں۔

---

[۱] ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی، ۱۹۶۳ء، صفحہ ۲۰۳
[۲] نسخۂ عرشی، دیباچہ، صفحہ ۹۳

دہلی میں اس ایڈیشن کا ایک کرم خوردہ نسخہ، کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذخیرۂ قاضی شوکت حسین مرحوم (مراد آبادی)، میں محفوظ ہے، مگر اس میں غلط نامے والا ورق موجود نہیں[1]۔ الہ آباد والے نسخے سے، راقم الحروف کو رامپور سے اکبر علی خاں عرشی زادہ نے مطلع کیا ہے (تحریر: ۶ مئی ۱۹۶۹ء)۔ یہ، ڈاکٹر سید رفیق حسین، شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی کے پاس ہے۔ علی گڑھ کا نسخہ (نسخہ ابو محمد) اور الہ آباد والا (نسخہ رفیق حسین) دونوں، ناکمل ہیں، صرف رامپور والا (نسخہ صولت پبلک لائبریری) مکمل ہے۔

اِس ایڈیشن کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی پروفیسر آل احمد سرور (شملہ) کے ذاتی ذخیرۂ کتب میں[2] اور ایک عکسی اور ایک دستی نقل، رضا لائبریری، رامپور میں موجود ہے[3]۔ اِس دستی نقل کے بارے میں امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں کہ:

> اِس کی ایک نقل، جو کسی شوقین نے اپنے لیے کی تھی، کتاب خانۂ رامپور میں محفوظ ہے۔ خوش قسمتی سے ناقل نے سرورق سے نقل شروع کر کے نیر کی تقریظ پر کتاب کو ختم کیا ہے (صرف دیباچے کا ایک ابتدائی حصہ اور ردیف الیا کی چند غزلیں، کتاب کے اوراق گم ہو جانے کے باعث کم ہو گئی ہیں)۔ خط شکستہ ہے اور اشعار کو بیاض کے انداز پر لکھا گیا ہے۔ اصل مطبوعہ نسخے سے مقابلہ کرنے پر اندازہ ہوا کہ نقل کرنے والے نے بڑی احتیاط سے اِس کام کو انجام دیا ہے، اور اپنی طرف سے کسی طرح کی کمی بیشی نہیں (کی) ہے۔"

[علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، ص ۱۱۳]

---

[1] اُردوئے معلّیٰ، دہلی، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۲

[2] غالب ببلیوگرافی، ڈاکٹر محمد انصار اللہ، علی گڑھ ۱۹۷۲ء، ج ۱، ص ۱۵

[3] نسخۂ عرشی، دیباچہ، صفحہ ۹۶

حسن ابدال (پاکستان) میں بھی اس ایڈیشن کا ایک نسخہ "نہایت اچھی حالت" میں ہے۔[1] دیوانِ غالب اُردو، طبع اوّل کے صفحہ ۱، ۹۹، ۱۰۸ اور غلط نامے کی عکسی تصاویر، رضا لائبریری اور صولت پبلک لائبریری، رامپور کے حوالے سے "آج کل" دہلی، فروری ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی ہیں۔ صفحہ ۹۴ کا عکس "غالب نامہ" (شیخ محمد اکرام) طبع اوّل، ۱۹۳۶ء میں شامل ہے۔ صفحہ اوّل کا عکس، غالب کے اُس اُردو دیوان میں بھی شامل ہے، جو مالک رام کی ترتیب کے ساتھ فروری ۱۹۶۹ء میں، صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی، دلی کی جانب سے شائع ہُوا —— اس عکس میں "سید محمد خاں" کے قلمی دستخط نہیں ہیں —— دیوانِ غالب، طبع اوّل کے صفحہ ۷۶ کا عکس فروغِ اُردو، لکھنؤ کے غالب نمبر، شمارہ نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء میں چھپا ہے۔

دیوانِ غالب اُردو کے پہلے ایڈیشن کے بارے میں مندرجہ بالا سطور لکھی جا چکی تھیں کہ اس کا ایک عکسی ایڈیشن کالی داس گپتا رضا کے "پیش لفظ" کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔[2] "پیش لفظ" میں انھوں نے بتایا ہے کہ :

> "میرے کتب خانے میں اس ایڈیشن کے دو نسخے ہیں اور صولت پبلک لائبریری، رامپور والے نسخے کا عکس بھی ہے ..... یہ ایڈیشن اتنا کمیاب ہے کہ مدتوں اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے میری آنکھیں ترستی رہیں — اب اس سے پہلے کہ باقی دو چار نسخے بھی دیمک یا وقت کی بھینٹ چڑھ جائیں، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کا عکسی ایڈیشن شائع کرکے اسے عام کر دیا جائے ——"

کالی داس گپتا رضا کے شائع کردہ اس ایڈیشن کے علاوہ، اگست ۱۹۸۷ء میں مجھے ڈاکٹر مختارالدین احمد (علی گڑھ) کی عنایت سے صولت پبلک لائبریری، رامپور والے نسخے کا فوٹو عکس بھی میسر آگیا ——

---

[1] افاداتِ مہر، مرتبہ: ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی، لاہور، ۱۹۷۳ء، صفحہ ۱۰۰

[2] دیوانِ غالب (مطبوعہ اکتوبر ۱۸۴۱ء) عکسی، پیش کش: کالی داس گپتا رضا، محدود اشاعت (تعداد دو سو)، ویل پبلیکیشنز، بمبئی ۱۹۸۶ء، قیمت: دو سو روپے۔

دیوانِ غالب اُردو، طبع اوّل میں صفحات کا اندراج صفحہ نمبر ۹۲ تک درست ہے۔ صفحہ ۹۲ کے بالمقابل صفحہ ۹۳ کے بجائے سہواً بارِ دگر صفحہ ۹۲ ہی درج ہوگیا ہے اور مابعد یہ غلطی صفحہ ۱۰۳ تک چلی ہے ـــــ پھر چھپے ہوئے اس ایڈیشن میں صفحہ ۱۰۴ کا اندراج نہیں ہوا اور اس طرح صفحہ ۱۰۵ سے تا آخر صفحہ ۱۰۹ تک صفحات کا اندراج درست ہوگیا ہے[1] ـــــ

مالک رام اور مولانا امتیاز علی عرشی نے طبع اوّل کے جو کوائف دیے ہیں، ان میں صفحات کا اختلاف ؟ اسی طباعتی غلطی کا نتیجہ ہے

اِس دیوان کی طباعت کے زمانے میں غالب نے میجر جان جاکوب کو لکھا تھا کہ یہ چھپ جائے تو آپ کی "نظرِ عالی سے گزرے گا"، اس کا حوالہ شروع میں آچکا، اِس بنا پر کہا جا سکتا کہ غالب نے دیوان کے شائع ہونے پر اسے بالضرور، میجر جان جاکوب کو بھیجا ہوگا، لیکن "پنج آہنگ" میں موجود کسی خط سے اِس کی واقعی شہادت نہیں ملتی۔ "پنج آہنگ" میں امین الدولہ آغا علی خاں کے نام شامل، واحد خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اِس ایڈیشن کا ایک نسخہ خوش وقت علی خاں کے ہاتھ اُنھیں بطور ہدیہ کانپور بھیجا تھا۔

نوابِ عالی جناب معلی القاب را بہ تازگی تماشا نوید کہ جگر پارہای اَز رگِ کلک فرو ریختہ فراہم آوردہ ام و بدان ملکش انجمن بہ گلدستگی میغرستم .... غبارِ راہ کاروان و گردِ نمناک گذرگاہِ سیل یعنی منتخب دیوانِ ریختہ کہ ورقے چند بیش نیست، اَز جانبِ خاکسار ہدیۂ آن بارگاہ ست ..... دیوانِ فارسی نیز بہ نظرگاہِ التفات خواہ

---

[1] کالی داس گپتا رضا نے اپنے "پیش لفظ" میں اس طباعتی سہو کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے، "دیوان ۱۰۹ صفحوں کو محیط ہے .... صفحات میں ۹۲ کا عدد دو دفعہ آگیا ہے مگر ص ۱۰۳ کے بعد ص ۱۰۴ چھوٹ گیا ہے۔ اس طرح پلڑے برابر ہوگئے ہیں۔"

گذشت۔ حالیا ہم از آں اوراق نگاشتہ می شود تا از
سوزِ درونِ نامہ نگار، خبر تواند داد ــــ"

[(کلیاتِ نثرِ غالب' طبع دوم، لکھنؤ، ۱۸۷۱ء، ص ۱۸۱، ۱۸۲)]

اِس خط کے علاوہ، دیوانِ غالب' طبع اوّل کے بارے میں' غالب کی نگارشات میں کوئی حوالہ نظر سے نہیں گزرا۔

○ طبع دوم : مَطبع دار السّلام / مَطبع صادق الاخبار، واقع محلہ حوض قاضی، دہلی، مئی ۱۸۴۷ء

ضخامت : ۹۸ صفحات   مسطر: پندرہ سطری

سائز : ۱۰¾ × ۷ انچ (۷¾ × ۴½ انچ)

تعداد اشعار : ۱۱۵۸

غالب کے اُردو دیوان کا دوسرا ایڈیشن مئی ۱۸۴۷ء میں مَطبع دار السّلام، دہلی سے نورالدین احمد لکھنوی کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور میں اس کا ایک مکمل نسخہ محفوظ ہے (۴۳۱۴ء/۸۹۱/غ ۱۵ ع)۔ یہی نسخہ اس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔ اس کے سرورق کی تیرہ سطری عبارت ۷×۴ انچ کے ایک بیضے میں رقم کی گئی ہے۔ عبارت یہ ہے:

دیوان اردو تصنیف

مشتری اوج حق پژوهی و خدادانی

رصد بند فلک البروج معارف سبحانی

افصح فصحائی دوران شاهنشه شعرائی ممالک

ایران و هندوستان دقائق غوامض و رموز

سخن سنجی و نکته دانی خلاق مضامین و معانی

سرآمد ارباب فضل و کمال مهر سپهر نبالت

واجلال جناب مستطاب منیع الالقاب میرزا اسد الله خان

بهادر ادام الله برکاتهم و حسناتهم المتخلص بغالب و اسد

بتصحیح و مقابله جناب مصدر المدح در مطبع دار السلام

دهلی واقع محله حوض قاضی بسعی اقل العباد عنایت حسین

در ماه مئی سنه ۱۸۴۷ع باهتمام نورالدین احمد لکهنوی

حلیه الطباع پوشید

اِس سَرورق کی پُشت، صفحہ ۲ سے سادہ لوح کے بعد "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے زیرِ عنوان غالب کا فارسی دیباچہ ہے۔ دوسرے صفحے پر دیباچے کی آٹھ سطریں آئی ہیں۔ آخری ٹکڑا یہ ہے: "آتش پرست را"۔ صفحہ ۳ پر یہ دیباچہ آخری / پندرھویں سطر پر ختم ہو جاتا ہے۔

صفحہ ۴ سے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے نئے عنوان سے غزلیات شروع ہو جاتی ہیں، جن کا سلسلہ صفحہ ۸۶ کے قریب وسط تک چلتا ہے۔ طبع اوّل میں کسی غزل پر عنوان نہیں تھا، البتہ غزلوں کے درمیان ایک ایک سطر کی خالی جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ پیشِ نظر ایڈیشن میں ایک آدھ استثنیٰ کے علاوہ ہر جگہ "غزل" یا "ولہ" کا عنوان درج ہے ——— دو جگہ اکیلے شعر سے پہلے "فرد" کا عنوان بھی قائم کیا گیا ہے (دیکھیے: صفحہ ۴ اور ۱۲) طبع اوّل میں ایک ردیف کی غزلوں کے ختم ہونے پر ردیفوں کے عنوانات دیے گئے تھے، اِس ایڈیشن میں ردیفوں کے یہ اعلانات و عنوانات حذف کر دیے گئے ہیں۔

صفحہ ۸۶ کے نصف آخر سے قصائد کا آغاز ہوا ہے۔ پہلے قصیدے کا دو سطری جلی عنوان یہ ہے:

"افزایشِ آبروئے گوہرِ سخن بہ ثنائے
ابو الائمہ حضرت علی مُرتضیٰ علیہ التحیہ والثنا"

یہ قصیدہ صفحہ ۸۸ سطر ۹ پر ختم ہوا ہے، مُتابعد دوسرا قصیدہ "ایضاً فی المنقبت" کے جلی عنوان سے شروع ہو جاتا ہے۔ یہ صفحہ ۹۰ تک چلتا ہے، صفحہ ۹۰ ہی کے بقیہ حصّے سے قطعات کے لیے جگہ نکالی گئی ہے۔ صفحہ ۹۰ پر پہلے قطعے کا محض دو سطری جلی عنوان آیا ہے۔ اِس ایڈیشن میں اوّل وہی تین قطعات ہیں، جو پہلے ایڈیشن میں تھے۔ اِس کے بعد "ولہ" کے زیرِ عنوان (صفحہ ۹۲) بیسنی روٹی والا قطعہ مزید ہے۔ قطعات کے بعد دس رُباعیات میں، الگ الگ ہر ایک پر، سوائے آغاز کے، جس کے عُنوان میں "رُباعیات" درج ہے، "رُباعی" کا عُنوان قائم ہے۔ یہ تعداد میں طبع اوّل کے مطابق، لیکن ترتیب میں مُختلف ہیں۔ دیوان، صفحہ ۹۴ پر ختم ہوتا ہے۔ آخری رُباعی یہ ہے:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل! | سن سن کے اسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش | گویم مشکل وگر نگویم مشکل

اس رباعی کے فوراً بعد صفحہ ۹۴ ہی سے لمبے چوڑے تقدیمی کلمات کے تین سطری عنوان کے بعد نیر رخشاں کی فارسی تقریظ شروع ہو جاتی ہے ـــ یہ صفحہ ۹۸ کے نصف پر ختم ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی "تمت تمام شد" کے الفاظ پر یہ نسخہ بھی تمام ہو جاتا ہے۔

اس تقریظ میں طبع اول کے مطابق تاریخ ۱۲۵۴ مقدسہ ہجریہ نبویہ، درج ہے (صفحہ ۹۷) لیکن اشعار کی تعداد "یک ہزار و یک صد و اند" بتا دی گئی ہے (صفحہ ۹۸، سطر اول)[۱]

امتیاز علی عرشی، طبع اول میں اشعار کی تعداد ۱۰۹۵ مانتے ہیں[۱] طبع دوم میں ان کے نزدیک صرف چودہ (۱۴) اشعار کا اضافہ ہوا۔ دیوانِ غالب طبع اول ۱۸۴۱ء کے مقابلے میں:

> چھ برس کے اندر میرزا صاحب نے اردو کے کل چودہ شعر کہے تھے، جو اس نسخے میں بڑھا دیے گئے۔ دونوں ایڈیشنوں کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نواب تجمل حسین خاں کی مدحیہ غزل کا اضافہ ہوا ہے، جس کے چودہ شعر تھے ـــ"

[نسخۂ عرشی، دیباچہ، صفحہ ۹۷]

اس طرح عرشی صاحب کے نزدیک طبع دوم میں اشعار کی کل تعداد گویا ۱۱۰۹ ہوئی۔
سید اسد علی انوری ۱۰ اس ایڈیشن میں اشعار کی کل تعداد ۱۱۹۰ بتاتے ہیں[۲]
مالک رام کے بقول:

---

[۱] نسخۂ عرشی، دیباچہ، صفحہ ۹۶

[۲] جامعہ، دہلی، مئی ۱۹۷۲ء، صفحہ ۳۴۷

اِس نسخے میں ایک ہزار ایک سو گیارہ (۱۱۱۱) شعر ہیں[۱] یعنی طبع اوّل
سے سولہ زیادہ - ایک بیسنی روٹی والا دو شعروں کا قطعہ ہے --- دوسری
"جان کے لیے" کی آخری غزل، جس میں نواب تجمل حسین خاں کی مدح
کا قطعہ ملتا ہے - اس میں چودہ شعر ہیں۔"

[دیوانِ غالب، صدی ایڈیشن، دیباچہ، صفحہ ۱۹]

لیکن میری اَشعار شماری کے مُطابق، دیوانِ غالب طبع دوم میں اشعار کی کُل تعداد ۱۱۵۸ ہے، یعنی طبع اوّل کے ۱۰۹۳ اشعار کی جگہ ۶۵ اَشعار زیادہ -

غزلیات کا گوشوارہ

صفحہ ۴ سے ردیف الف کی مجموعی غزلیں : ۳۸ ، تین یا تین سے کم اشعار کی غزلیں : ۸ ، تعداد اشعار : ۲۴۰

صفحہ	ردیف	مجموعی غزلیں	تین یا تین سے کم اشعار کی غزلیں	تعداد اشعار
۴	الف	۳۸	۸	۲۴۰
۲۲	ب	۱	–	۱۲
۲۲	ت	۴	۲	۱۹
۲۴	ج	۲	۲	۴
۲۴	چ	۱	–	۶
۲۵	د	۱	–	۹
۲۵	ر	۶	۲	۳۹
۲۸	ز	۴	۲	۲۰
۳۰	س	۱	–	۷
۳۱	ش	۱	۱	۲
۳۱	ع	۲	۱	۸

[۱] مالک رام نے ذکرِ غالب طبع سوم، صفحہ ۱۶۵ پر اسی ایڈیشن کے اشعار کی تعداد ۱۱۵۹ بتائی ہے، لیکن ذکرِ غالب طبع چہارم صفحہ ۲۰۵ اور دیوانِ غالب (صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی ہوتی) کے تعارف صفحہ ۶ پر وہ اشعار کی تعداد ۱۱۱۱ ہی بتاتے ہیں۔

۳۱	ف	۱	۲	۲
۳۲	ک	۲	-	۱۵
۳۳	گ	۱	۲	۲
۳۳	ل	۱	-	۹
۳۴	م	۳	۲	۸
۳۴	ن	۲۷	۷	۱۴۱
۴۷	و	۶	۲	۳۷
۵۰	ہ	۲	۲	۳
۵۱ تا ۸۶	ی	۸۱	۲۹	۴۵۳

کُل غزلیں : ۱۸۵ ★ ۶۴ تعداد اشعار : ۱۰۵۶

دیگر اصناف کا گوشوارہ

صفحہ ۸۶ سے قصائد[1] ← ۲، تعداد اشعار : ۶۱

صفحہ ۹۰ سے قطعات ← ۴، تعداد اشعار : ۲۱

صفحہ ۹۲ سے رُباعیات ← ۱۰، تعداد اشعار : ۲۰

کُل تعداد اشعار : ۱۰۲

اِس ایڈیشن میں ۱۸۵ غزلیں ہیں اور اِن غزلوں کے اشعار کی تعداد ۱۰۵۶ ہے، ۱۰۲ اشعر دیگر تین اصناف : قصائد، قطعات اور رُباعیات کے ہیں۔ اِس طرح اِس ایڈیشن کے اشعار کی مجموعی تعداد ۱۱۵۸ بنتی ہے۔ سید اسد علی انوری فرید آبادی کے نزدیک غزلیات کی تعداد ۱۸۸، غزلوں

★ سید اسد علی انوری فرید آبادی نے تین یا تین سے کم اشعار کی غزلوں کی تعداد ۶۵ بتائی ہے جو صحیح نہیں۔
[جامعہ، دہلی، مئی ۱۹۴۲ء، صفحہ ۳۴۷]

[1] سید اسد علی انوری کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس ایڈیشن میں تین قصیدے ہیں۔
[جامعہ، دہلی، مئی ۱۹۴۲ء، صفحہ ۳۴۷]

کے اشعار کا شمار ۱۰۵۸، اور اِس نُسخے کے کُل اَشعار ۱۱۶۰ ہیں[۱]، جو صحیح نہیں ــــ اِمتیاز علی عرشی نے ردیف وار طبعِ اوّل کے اَشعار کا جو نقشہ دیا ہے[۲]، اُس کے مُقابلے میں، اِس ایڈیشن میں ردیف الف اور دال میں ایک ایک، اور ردیف نون اور ی میں بالترتیب ۴۵ اور ۱۵ شعر زیادہ ہیں۔ تین اَشعار کا اضافہ قصیدۂ اوّل میں ہوا ہے۔ "بیسن کی روغنی روٹی" والا، ایک دو شعری قطعہ بھی، جس کے عنوان میں "ولہ" درج ہے (صفحہ ۹۲)، اِس ایڈیشن میں پہلی بار آیا ہے۔

اِس طرح، اِس ایڈیشن میں زائد اشعار کی تعداد ۶۷ ہے، لیکن، بمقابلۂ طبعِ اوّل، اِس میں ردیف ن اور ردیف واؤ کا ایک ایک شعر کم ہے، یوں زائد اشعار کی تعداد ۶۵ رہ جاتی ہے۔

<u>سائز / پیمائش:</u>

اِمتیاز علی عرشی: یہ نُسخہ ۱۰½ × ۷، ۸¼ × ۴½" سائز کے ۱۵ سطری، ۹۸ صفحوں پر چھپا تھا۔ [نُسخۂ عرشی، دیباچہ، صفحہ ۹۷]

سید اسد علی انوری: یہ نُسخہ ۹½ × ۶" سائز پر ہے۔ [جامعہ، دہلی، مئی ۱۹۴۲ء، صفحہ ۳۴۷]

مالک رام: کتاب کا سائز ۱۰ × ۷، ۷½ × ۴½" ہے، اور یہ پندرہ سطری مسطر پر کتابت ہوئی ہے۔ [دیوانِ غالب صدی ایڈیشن، مُقدمہ، ص ۱۹]

میری پیمائش یہ ہے: ۱۰¾ × ۷، ۷¾ × ۴¼ انچ

پیمائش کا معمولی فرق، اِس وجہ سے ہے کہ حوضہ ہر جگہ، ایک ناپ کا نہیں ہے۔ مسطر پندرہ سطری؛ کاغذ، انگریزی ہے ــــ باریک اور سفید۔ کاتب بدنویس نہیں، غلط نویس بھی نہیں اور طباعت کا معیار بھی بُرا نہیں۔

دیوانِ غالب اُردو، پہلی بار ۱۸۴۱ء اور پھر ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے بارہ برس بعد کے ایک خط، مرقومہ ۴، اپریل ۱۸۵۹ء میں، غالب نے قاضی عبدالجمیل جُنوں کو اپنے

---

۱ جامعہ، دہلی، مئی ۱۹۴۲ء، صفحہ ۳۴۷

۲ نُسخۂ عرشی، دیباچہ، صفحہ ۹۴-۹۵

اُردو دیوان کے بارے میں لکھا تھا کہ :

دیوانِ ریختہ، چھاپے کا، یہاں کہیں کہیں ہے[1]

دیوان کے دوسرے چھاپے پر بارہ برس گزر چکے تھے۔ دیوان، ہر چند دلّی میں چھپا تھا، لیکن اَب دلّی میں، بھی بس "کہیں کہیں" ہی رہ گیا تھا، اس کی بارِ سوم طباعت کی ضرورت تھی، اور اس کی نوبت ۱۸۶۱ء میں آئی :

○ طبعِ سوم ، مطبعِ احمدی، واقع شاہدرہ، دہلی،
۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ / ۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء

ضخامت : ۸۸ صفحات مسطر: پچیس سطری

سائز : ۱۰×۷ انچ (۸¾×۴¾ انچ)

تعدادِ اشعار : ۱۷۹۶

غالب کا کلام، کیا نظم، کیا نثر، کبھی اُن کے پاس نہیں رہا۔ نواب ضیاالدین احمد خاں اور ناظر حُسین میرزا کے پاس جمع ہوتا تھا۔ اِنقلاب ۱۸۵۷ء کے دنوں میں غالب کا گھر لوٹ اور غارت سے محفوظ رہا، لیکن اس میں اُن کے اکتسابات کا ایک بڑا حصّہ غارت ہو گیا۔ غالب نے اپنے خطوں میں اِس آفت کا ذکر، اکثر بڑے درد اور حُزن اور رقت کے ساتھ کیا ہے :

میرا کلام، کیا نظم، کیا نثر، کیا اُردو، کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں
میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اِس کا التزام
تھا کہ وُہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے، سو
اُن کے لاکھوں روپے کے گھر لُٹ گئے، جس میں ہزاروں روپے

---

[1] اُردوئے مُعلّیٰ، طبع اوّل، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۹ء، صفحہ ۲۱۲

کے کتاب خانے بھی گئے۔ اس میں وہ مجموعہ ہاے پریشاں بھی غارت ہوئے۔

[بنام: عبدالغفور سرور، جولائی ۱۸۵۹ء]

میرا کلام: کیا نظم، کیا نثر، کیا اُردو، کیا فارسی، کبھی میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کی فکر تھی۔ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے؛ سو اُن دوستوں کا، زمانۂ غدر میں گھر ہی لٹ گیا۔ نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا، پھر میں اپنا کلام نظم و نثر کہاں سے لاؤں؟

(بنام: تمنا مرزا پوری، ۱۲ر جولائی ۱۸۶۷ء)

حضرت! اِس عزیب کا مجموعۂ نظم و نثر غدر میں لٹ گیا ــــ

(بنام: نواب کلب علی خاں، ۲ر ستمبر ۱۸۶۶ء)

بھائی! تم کیا فرماتے ہو؟ جان بوجھ کر انجان بنتے ہو؟ واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا، مگر میرا کلام، میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا؟ بھائی ضیأالدین احمد خاں صاحب بہادر اور ناظر حسین مرزا ہندی اور فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے؛ سو اُن دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا، پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں؟

(بنام: یوسف علی خاں مرزا، ۱۸۵۹ء)

میرا کلام، میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ ضیأالدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے، جو میں نے کہا، اُنہوں نے لکھ لیا۔ اُن دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہو گئے۔ اب میں اپنا کلام دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے

کہ ایک فقیر، کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے،
ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اُس نے جو وہ کاغذ مجھ کو دکھایا،
یقین سمجھنا کہ رونا آیا۔

(بنام: مرزا حاتم علی بیگ مہر، نومبر ۱۸۵۸ء)

میرا ایک سبی بھائی ہے نواب ضیاؑ الدین خاں سلمہٗ اللہ تعالیٰ۔ وہ
میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ مجموعۂ نثر اور کلیاتِ
نظمِ فارسی اور کلیاتِ نظمِ اُردو، سب نسخے اُس کے کتب خانے
میں تھے۔ وہ کتب خانہ، ڈر کر عرض کرتا ہوں، بیس ہزار روپے کی
مالیت کا ہوگا، لٹ گیا، ایک ورق نہیں رہا۔

(بنام: صاحب عالم، جولائی ۱۸۶۱ء)

کیا کہوں تم سے ـــــ ضیاؑ الدین خاں جاگیر دار لوہارو، میرے سبی بھائی
اور میرے شاگردِ رشید ہیں ـــــ جو نظم و نثر میں، مَیں نے کچھ لکھا، وہ انھوں نے
لیا اور جمع کیا چنانچہ "کلیاتِ نظمِ فارسی" چون پچپن جزو اور "پنج آہنگ"
اور "مہرِ نیمروز" اور "دیوانِ ریختہ" سب مل کر سَو، سوا سو جزو مُطلا
اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ، کوئی ڈیڑھ سو
دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب
یک جا فراہم ہے۔ پھر ایک شہزادے نے اس مجموع نظم و نثر کی نقل
لی۔ اَب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور
شہر لُٹے۔ وہ دونوں جگہوں کا کتاب خانہ، خوانِ یغما ہو گیا ہر چند مَیں
نے آدمی دوڑائے، کہیں سے، اُن میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ
سب قلمی ہیں۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ .... اگر کہیں ان

میں سے کوئی نسخہ بِکتا ہوا آوے تو اُس کو میرے واسطے خرید کر لینا
اور مجھ کو اِطلاع کرنا، مَیں قیمت بھیج کر منگوالُوں گا۔

[بنام : شیو نرائن آرام، ۱۱ دسمبر ۱۸۵۸ء]

ہنگامہ فرو ہونے پر غالب نے اپنے مُتعدد دوستوں کو لکھا کہ، کہیں لُوٹ کے مال میں یہ قلمی کتابیں بِکتی نظر آجائیں تو میرے لیے خرید لی جائیں، لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ خُوش قسمتی سے ۱۸۵۷ء کے اِنقلاب کے آغاز سے ایک یا دو روز پہلے یعنی ۹ مئی اور تاریخِ آغازِ آشوب، ۱۱ مئی کے درمیان کسی وقت، غالب نے اپنے اُردو دیوان کا ایک قلمی نُسخہ، نواب یوسف علی خاں ناظم، والیٔ رامپور کی خدمت میں بھیجا تھا، یہ محفوظ رہا[۱] اور آئندہ کم از کم ایک بار ضرور، اِس نُسخے کی بنیاد پر دیوان کی طباعت عمل میں آئی —

والیٔ رامپور کی بار بار کی دعوت اور خواہش پر غالب پہلی بار ۲۷ جنوری ۱۸۶۰ء کو رامپور پہنچے[۲]۔ غالب کے دِلّی سے رامپور کے لیے روانہ ہوتے وقت[۳] نواب ضیاؔ الدین احمد خاں نیّر رخشاں نے اُن سے فرمائش کی تھی کہ وہاں سے اُردو دیوان نقل کرواکے مجھے بھیج دیجیے گا۔ چنانچہ غالؔب نے ایسا ہی کیا، لیکن وہ ابھی رامپور ہی تھے کہ میرٹھ کے کسی کتاب فروش عظیم الدین احمد نے اُن سے اُردو دیوان کے چھاپنے کی اِجازت مانگی، بوجوہ غالب کو یہ درخواست قبول کرنا پڑی —

غالب کے ایک شاگرد اور قدر دان اور آگرہ میں مطبع مفید خلایق کے مالک و مہتمم منشی شیو نرائن آرام کو، جو نومبر ۱۸۵۸ء میں "دستنبو" کی، غالب کے حسبِ خواہ عجلت اور صحت کے

---

[۱] غالؔب کے دیوانِ اُردو کا یہ نُسخہ : "رامپور کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ سائز ۱۱½ × ۷¾، اوراق ۷۳ اور فی سطر پندرہ سطریں ہیں، خط صاف اور روشن نستعلیق، اور اِبتدائی دو صفحے طلاکار ہیں۔ ہر غزل کے خاتمے پر رنگین بیل بوٹے اور تمام صفحات کی جدولیں رنگ آمیز ہیں"۔

[اِمتیاز علی عرشی، مکاتیبِ غالب طبع دوم ۱۹۴۳ء، حواشی، ص ۳]

[۲] اِمتیاز علی عرشی، مکاتیبِ غالب، طبع دوم، ۱۹۴۲ء، دیباچہ، صفحہ ۸۹

[۳] دِلّی سے روانگی ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو جمعرات کے دن، صبح کے وقت عمل میں آئی۔

[اِمتیاز علی عرشی، مکاتیبِ غالب طبع دوم، دیباچہ، ص ۸۷]

ساتھ اشاعت سے سُرخرُو ہو چکے تھے، یہ اطلاع ملی کہ میرٹھ میں دیوان کی اشاعت عمل میں آرہی ہے تو اُنھیں شکایت پیدا ہوئی کہ گھر کا مطبع چھوڑ کر، دیوان چھپنے کے لیے میرٹھ میں کسی کو کیوں دیا گیا؟

آرام کے خاندان کے، غالب اور اُن کی ننھیال کے ساتھ بہت پُرانے اور گہرے تعلقات تھے اور اِس حوالے سے غالب، آرام کو "فرزند دل بند" بھی سمجھتے اور لکھتے تھے[1]، اِس لیے آرام کی شکایت کو اُنھوں نے مبنی بر حق سمجھا، اور اسے اہمیت دی، چنانچہ میرٹھ میں اشاعت کے لیے دیوان کو دینے کی حقیقت اُنھوں نے اپریل ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں آرام کو تفصیل کے ساتھ لکھی ہے:

میاں! دیوان کے میرٹھ میں چھاپے جانے کی حقیقت سُن لو، تب کچھ کلام کرو۔ مَیں رامپور میں تھا کہ ایک خط پہنچا، سرنامے پر لکھا تھا: "عرضداشت عظیم الدین احمد، من مقام میرٹھ" ــــ وَاللہ باللہ، اگر مَیں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے؟ بہر حال پڑھا، معلوم ہوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور فائدہ اُٹھانے کے واسطے چھاپا چاہتے ہیں۔ خیر چُپ ہو رہا جب مَیں رامپور سے میرٹھ آیا، بھائی مُصطفیٰ خاں صاحب کے ہاں اُترا، وہاں منشی ممتاز علی صاحب، میرے دوست قدیم، مجھ سے ملے، اُنھوں نے کہا کہ اپنا اُردو دیوان مجھ کو بھیج دیجے گا، عظیم الدین، ایک کتاب فروش، اس کو چھاپا چاہتا ہے۔ اب تم سنو! دیوانِ ریختہ اتم واکمل کہاں تھا، مگر ہاں، مَیں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیج دیا تھا۔ اب جو مَیں دلی سے رامپور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوانِ اُردو

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے آرام کے نام غالب کا خط مرقومہ ۱۹، اکتوبر ۱۸۵۸ء؛ نیز: مئی ۱۸۶۳ء

لے کر، اُس کو کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا۔ مَیں نے رامپور
میں کاتب سے لکھوا کر، بہ سبیل ڈاک ضیاالدین خاں کو دلّی بھیج دیا تھا۔
آمدم بر سرِ مدعاے سابق، اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے
کہا، تو مجھے یہی کہتے بن آئی کہ، "اچھا، دیوان میں ضیاالدین خاں سے
لے کر بھیج دوں گا، مگر کاپی کی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے؟ نواب مصطفیٰ خاں
نے کہا کہ "میں!" اب کہو، میں کیا کرتا؟ دلّی آکر ضیاالدین خاں سے
دیوان لے کر، ایک آدمی کے ہاتھ نواب مصطفیٰ خاں کے پاس بھیج دیا۔
اگر مَیں اپنی خواہش سے چھپواتا تو اپنے گھر کا مطبع چھوڑ کر، پرائے
چھاپے خانے میں کتاب کیوں بھجواتا[1]؟"

اِس عُذر و معذرت اور بیانِ حال کے بعد غالب نے اِسی خط میں شیو نرائن آرام کو مژدہ
سُنایا ہے اور بتایا ہے کہ:

آج اسی وقت مَیں نے تم کو یہ خط لکھا اور اسی وقت بھائی
مصطفیٰ خاں کو ایک خط بھیجا ہے اور اُن کو لکھا ہے، اگر چھاپا شروع
نہ ہوا ہو تو نہ چھاپا جائے اور دیوان جلد میرے پاس بھیجا جائے۔ اگر
دیوان آگیا تو فوراً تمھارے پاس بھیج دوں گا، اور اگر وہاں کاپی شروع
ہوگئی ہے تو مَیں ناچار ہوں۔ میرا کچھ قصور نہیں ہے — اگر سرگزشت
کو سُن کر مجھ کو گنہ گار ٹھہراؤ تو اچھا میرا بھائی، میری تقصیر معاف
کیجیو، رمضان اور عید کا قصہ لگا ہوا ہے، یقین ہے کہ کاپی شروع
نہ ہوئی ہو اور دیوان میرے پاس آئے اور تم کو پہنچ جائے[2]۔"

---

[1] اُردوے معلیٰ، طبع اوّل، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۹ء، صفحہ ۳۸۱ – ۳۸۲

[2] اُردوے معلیٰ، طبع اوّل، ۱۸۶۹ء، صفحہ ۳۸۲

غالب نے اپنے اُردو دیوان کا یہ مسودہ سکندر شاہ نامی کسی شخص کے ہاتھ، جو یوسف مرزا کے شناسا تھے، نواب مصطفیٰ خاں کے پاس میرٹھ بھیجا تھا اور اوائل مئی ۱۸۶۰ء تک بہ سبیل ڈاک، اُنہیں اس کی رسید مل چکی تھی —— ۱۷ شوال ۱۲۷۶ھ/ ۹ مئی ۱۸۶۰ء کے ایک خط موسوم یوسف مرزا سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے۔ اس خط کا متعلقہ جملہ یہ ہے:

> میرا اُردو کا دیوان میرٹھ کو گیا، سکندر شاہ لے گئے — مصطفیٰ خاں کو دے آئے۔ ڈاک میں اس کی رسید آگئی۔[1]

۱۱ جون ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں غالب نے سیّاح کو لکھا ہے کہ:

> دیوان کا چھاپا کیسا؟ وہ شخص ناآشنا موسوم بہ عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا، آدمی نہیں ہے، بھوت ہے، پلید ہے، غول ہے۔ قصہ مختصر، سخت نامعقول ہے مجھ کو اُس کے طور پر انطباع دیوان نامطبوع ہے۔ اب میں اُس سے مانگ رہا ہوں اور وہ نہیں دیتا۔ خدا کرے ہاتھ آجائے، تم، دعا مانگو —— زیادہ کیا لکھوں۔[2]

بالآخر کسی نہ کسی طرح جون ۱۸۶۰ء کے آخری ہفتے میں دیوان کا مسودہ میرٹھ سے واپس آگیا۔ پیر کے دن ۲۵ جون ۱۸۶۰ء کو اس کا پارسل، آرام کو بھیجتے ہوئے غالب نے لکھا ہے کہ:

> صاحب! میں تمہارا گناہ گار ہوں۔ تمہاری کتاب میں نے دبا رکھی ہے۔ بڑی کوشش اور محنت سے اس کو وہاں نہ چھپنے دیا اور منگوا لیا۔ آج پیر کے دن ۲۵ جون کو پارسل کی ڈاک میں روانہ کیا ہے لو، اب میری تقصیر معاف کرو اور مجھ سے راضی ہو جاؤ اور اپنی رضامندی کی مجھے اطلاع دو۔ یہ کتاب، یعنی دیوان ریختہ، تم کو

---

[1] اُردوئے معلیٰ، طبع اول: ۱۸۶۹ء، صفحہ ۳۳۲

[2] اُردوئے معلیٰ، طبع اول، ایضاً، صفحہ ۱۶

میں نے دے ڈالا - اب اس کے مالک تم ہو- میں نہیں کہتا کہ چھاپو
میں نہیں کہتا کہ نہ چھاپو ــــ جو تمہاری خوشی ہو، سو کرو اگر چھاپو تو
بیس جلد کا خریدار مجھ کو لکھ لو ــــ اور اچھا میرا میاں! ذرا تصیح
کا بہت خیال رکھیو[1] ــــ"

اور شنبہ روزِ عید، ۳۰ جون ۱۸۶۰ء کو دلی مسرت کے ساتھ میاں داد خاں سیاح کو مطلع کیا:

میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ اردو کا دیوان غاصب
ناانصاف سے ہاتھ آگیا ــــ، اور میں نے نورچشم منشی شیو نرائن
کو بھیج دیا۔ یقین کُلّی ہے کہ وہ چھاپیں گے جہاں تم ہو گے، ایک
نسخہ تم کو پہنچ جائے گا[2] ــــ"

دو دن بعد کے ایک خط مرقومہ دوشنبہ ۲ جولائی ۱۸۶۰ء میں علائی کو لکھا ہے کہ:

اردو کا دیوان، رامپور سے لایا ہوں اور وہ آگرے گیا ہے، وہاں
منطبع ہوگا- ایک نسخہ تمہارے پاس پہنچ جائے گا[3] ــــ"

غالب نے دیوان کے مسودے کا پارسل، اشاعت کی غرض سے ۲۵ جون ۱۸۶۰ء کو آگرہ بھیجا تھا- اوائل جولائی ۱۸۶۰ء میں انہیں اس کی رسید مل گئی- لیکن آرام نے اس کی جامعیت کے بارے میں استفسار کیا اور لکھا کہ کچھ غزلیں جو میرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں، وہ اس میں موجود نہیں ہیں ــــ نیز شیو نرائن آرام نے غالب سے تصویر کی فرمائش بھی کی، غالباً وہ اسے دیوان کے ساتھ چھاپنا چاہتے ہوں گے- سہ شنبہ ۳ جولائی ۱۸۶۰ء کے خط میں جواباً غالب لکھتے ہیں کہ:

میاں! تمہاری باتوں پر ہنسی آتی ہے- یہ دیوان، جو میں نے تم
کو بھیجا ہے، اتم و اکمل ہے، اور وہ کون سی دو چار غزلیں ہیں جو

---

[1] خطوطِ غالب (مالک رام)، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، صفحہ ۴۴۴

[2]،[3] اردوئے معلیٰ، طبع اول، ۱۸۶۹ء، صفحہ ۲۹، ۴۳۶ (علی الترتیب)

میرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں' اور اِس دیوان میں نہیں؟
اِس طرف سے آپ اپنی خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مفرع میرا، اس دیوان
سے باہر نہیں۔ مَع ہٰذا، اُن سے بھی کہوں گا اور وُہ غزلیں اُن سے منگوا
کر دیکھ لوں گا۔ تصویر میری لے کر کیا کرو گے؟ بے چارہ عزیز کیوں کر
کھچوا سکے گا؟ اگر ایسی ہی ضرورت ہے تو مُجھ کو لکھو۔ مَیں مصوّر سے
کھچوا کر تم کو بھیج دوں گا۔ نہ نذر درکار ہے' نہ نیاز۔ مَیں تم کو اپنے فرزندوں
کے برابر سمجھتا ہوں اور شُکر کی جگہ ہے کہ تم فرزندِ سعادت مند ہو۔ خُدا
تم کو جیتا رکھے[لے]۔"

یہ خط، ۳۰ جولائی ۱۸۶۰ء کا ہے۔ اس کے بعد غالب کے دستیاب خطوں میں شیو نرائن آرام کے نام غالب کا دُوسرا خط، ۱۰ جنوری ۱۸۶۲ء کا ہے۔ گویا قریب ڈیڑھ برس' طرفین کے درمیان' اگر کچھ خط ضائع نہیں ہو گئے تو خاموشی رہی ___

غالب کا یہ خیال رہا ہو گا کہ مُنشی شیو نرائن نے بصد شوق دیوان منگوایا ہے اور اُنھوں نے اسے بصد اہتمام فراہم کیا ہے تو وُہ اسے بعجلت چھاپ بھی دیں گے لیکن شیو نرائن خاموش ہو گئے اور اُن کی طرف سے طباعت میں تاخیر ہوئی ___ غالب کو صبر کہاں! چنانچہ کچھ اقتضائے طبع کے باعث اور کچھ آرام کی خاموشی کے سبب' غالباً اِس گُمان پر کہ آرام نے اِسے چھاپنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ غالب نے دہلی ہی میں مطبع احمدی کے مالک محمد حُسین خاں کو دیوان چھاپنے کی اجازت دے دی۔ چونکہ رامپور کے نُسخے کی وُہ نقل' جو نیرّ رخشاں کے لیے غالب نے کرائی تھی، آگرے بھیجی جا چکی تھی' اس لیے مطبع احمدی والوں کو طباعت کے لیے کسی دوسرے قلمی یا مطبوعہ نُسخے کی نقل فراہم کی گئی ہو گی۔

اِمتیاز علی عرشی کا قیاس ہے کہ نیرّ ہی نے اپنا مسوّدہ' جس کی تکمیل نُسخۂ رامپور سے کی جا چکی

لے اُردوئے مُعلّیٰ' طبع اوّل ۱۸۶۹ء، صفحہ ۳۸۴ — ۳۸۵

تھی، مطبع احمدی والوں کو عطا کیا[1] لیکن اِس قیاس کی جو وجوہ عرشی صاحب نے پیش کی ہیں، اُن سے بجائے خود عرشی صاحب کے قیاس کی تائید نہیں ہوتی۔ نیر کے پاس نُسخۂ رامپور کی نقل تھی۔ اگر مطبع احمدی کے لیے نیر نے اپنا نُسخہ یا اس کی نقل فراہم کی تھی تو مطبع احمدی والے مطبوعہ ایڈیشن کو، نُسخۂ رامپور کے مُطابق ہونا چاہیے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ خُود عرشی صاحب لکھتے ہیں کہ:

۱۔ نُسخۂ رامپور کی ترتیب مضامین: احمدی ایڈیشن کے بَرخلاف ہے۔

۲۔ غزلوں کی ترتیب بھی بَدل ہوئی ہے۔

۳۔ احمدی ایڈیشن میں لفظ 'کسی' کی جگہ 'کسو' لکھا گیا ہے، جس کے خاتے میں، غالب نے شکایت بھی کی ہے؛ اِس کے بَرخلاف نُسخۂ رامپور میں ہر جگہ 'کسی' استعمال ہوا ہے، بجز مقاماتِ قافیہ کے۔

۴۔ احمدی ایڈیشن میں یہ شعر پایا جاتا ہے:

"مُنقطع سلسلۂ .... حرم ہے ہم کو"

نُسخۂ رامپور میں یہ شعر نہیں ہے۔[2]

(نُسخۂ عرشی، دیباچہ، حاشیہ، ص ۱۰۲)

مالک رام لکھتے ہیں:

میرا خیال یہ ہے کہ مطبع احمدی والوں نے دیوان کو اُس قلمی نُسخے کی بنا پر شائع کیا جو ناظر حُسین مِیرزا نے دسمبر ۱۸۶۰ء میں مُرتب کیا تھا اور جو اَب بھی (زمانہ، کانپور، فروری ۱۹۴۰، ص ۸۳) اُن کے خاندان میں موجود ہے —" (دیوانِ غالب اصدی ایڈیشن، مُقدمہ، صفحہ ۲۱)

---

[1] نُسخۂ عرشی، دیباچہ، صفحہ ۱۰۲۔

[2] "علاوہ بریں احمدی ایڈیشن اور نُسخۂ رامپور میں دیگر لفظی اختلافات بھی جا بجا پائے جاتے ہیں۔" (امتیاز علی عرشی، جامعہ، دہلی، ستمبر ۱۹۴۲ء، ص ۱۵۷)

اگر ناظر حسین میرزا کے مملوکہ قلمی نسخے سے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اب وہ اُن کے نسبتی عزیزوں میں سے کسی کے پاس کراچی میں ہے[1]، احمدی ایڈیشن کا تقابل کرکے دیکھا جا سکے تو صحیح صورت سامنے آسکتی ہے۔

دیوانِ غالب طبع سوم کے کتابیاتی کوائف مالک رام نے دیوانِ غالب صدی ایڈیشن کے مقدمے میں (صفحہ ۲۱ تا ۲۵) بہت تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ امتیاز علی عرشی نے بھی اپنے نسخے کے دیباچے میں[2] (صفحہ ۱۰۲-۱۰۴) اِن سے بحث کی ہے — یہ نسخہ کہ اب عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا، اس لیے ان اصحاب ہی کی پیش کردہ تفصیلات سے استفادہ کرتے ہوئے، یہاں ضروری کوائف پیش کیے جاتے ہیں۔

صفحہ اوّل پورے کا پورا پھولدار ہے۔ اُوپر کی تختی میں لکھا ہے:

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ

یہ سورۃ الشعرا، کی آیت ۲۲۴ ہے، جس کے معنی ہیں: "اور شعرا، تو گمراہ لوگ ہی اُن کی پیروی کرتے ہیں —" ظاہر ہے کہ اِس سے شعرا کی مذمّت مقصود ہے۔ خدا معلوم، یہ ستم ظریفی کس نے کی کہ سرِ دیوان یہ آیت چھاپ دی! صفحے کے وسط میں لکھا ہے: "دیوانِ غالب" — نیچے کی تختی میں یہ عبارت ہے:

در مطبع احمدی باہتمام اموجان طبع شد

صفحہ ۲ کی پیشانی بھی پھولدار ہے۔ اِس کے نچلے حصّے میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" اور صفحے کے تقریباً درمیان سے غالب کا فارسی دیباچہ شروع ہوتا ہے۔ اس کی آخری دو سطریں صفحہ ۳ پر ہیں۔ اس کے بعد غزلیات کا عنوان ہے۔ غزلیات صفحہ ۷۰ پر ختم ہوتی ہیں اور اسی صفحے کی سولھویں سطر سے قصائد شروع ہوتے ہیں۔ یہ تعداد میں چار ہیں اور صفحہ ۷۷ تک گئے ہیں —

---

[1] فکر و نظر، علی گڑھ، جنوری ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۳۹

[2] نیز دیکھیے، جامعہ، دہلی، ستمبر ۱۹۴۲ء، صفحہ ۱۵۷ و بہ بعد

قصیدوں کے بعد صفحہ ۷۷ کی بارہویں سطر سے صفحہ ۸۰ کی سطر ۲۲ تک بغیر عُنوان کے آموں والی مثنوی ہے۔ اس کے بعد قطعات ہیں جو صفحہ ۸۴ کی دوسری سطر پر ختم ہو گئے ہیں۔ ان کے بعد سب سے آخر میں سولہ رُباعیاں ہیں، جن میں سے آخری رُباعی کا دوسرا شعر صفحہ ۸۶ کی پہلی سطر پر ہے۔

اس کے بعد لفظ "خاتمہ" دے کر چار سطروں میں نیرِ رخشاں کی تقریظ کا عُنوان ہے۔ یہ عنوان جلی قلم سے ہے اور پھر تقریظ ہے جو صفحہ ۸۸ کے قریب نصف اوّل تک گئی ہے۔ اِس میں تاریخ تقریظ ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۴ء اور تعدادِ اشعار "یک ہزار و شش صد و نود و پنج و اند" درج کی گئی ہے لیکن "غلط نامے" میں لفظ "پنج" کو حذف کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ تاہم، اِس نُسخے میں اَشعار کی تعداد ۱۶۹۵ کی جگہ ۱۷۹۶ ہے۔

صفحہ ۸۸ کے تقریباً وسط میں تقریظ کے بعد نیرِ رخشاں ہی کا "قطعہ تاریخِ انطباعِ دیوان" ہے۔ آخری شعر جس سے تاریخ حاصل ہوتی ہے، یہ ہے:

بِنائے ریختہ ایک، اور دوسری تاریخ ٭ 'بذہنِ نیرِ رخشاں' بیانِ ریختہ ہے
۱۲۷۸ ۱۲۷۸

دوسری تاریخ، غالب کے شاگرد: "شاعرِ نغز بیان مرزا یوسف علی خاں المخاطب بہ سُلطان الذاکرین والمُتخلص بہ عزیز" کی ہے۔ اس کا تاریخ کا شعر ہے۔

لکھی عزیزِ خستہ نے تاریخِ انطباع ٭ حاسد کے سر کو کاٹ کے دیوان ریختہ
۸ — ۱۲۸۶

اِن قطعات کے بعد "عبارت خاتمہ دیوان" کے تحت غالب کی ایک تحریر ہے، جس کی توثیق کے لیے اُنھوں نے اپنی خطابی مہر بھی لگائی ہے۔ آخر میں ایک صفحہ، جس پر نمبر نہیں ہے، غلط نامے کے لیے وقف ہے، لیکن یہ کتاب کی جُملہ غلطیوں کو مُحیط نہیں۔ جن غلطیوں کی اِصلاح کی گئی ہے، اُن کے علاوہ بھی مُتعدد غلطیاں دیوان میں موجود ہیں۔

اِس ایڈیشن میں غالب نے اپنے کلام میں کچھ ضروری ترمیم بھی کی ہے اور وہ ترمیم غالباً

طباعت کے بعد ذہن میں آئی ، اِس لیے، اُسے غلط نامے میں ظاہر کرنا پڑا. مثلاً متن میں غالب کا ایک مصرع اس طرح چھپا ہے:

دُود کی طرح رہا سایہ گُریزاں مجھ سے

غلط نامے میں اِس کی یہ مُتبدلہ صورت بتائی گئی ہے :

صورتِ دُود رہا سایہ گُریزاں مجھ سے

غلط نامے کے آخر میں "المذنب محمد مُقصود" چھپا ہے، جو بظاہر کاتب کا نام ہے۔ کاتب اگرچہ بَدخط نہیں ہے، لیکن بے حد غلط نویس ہے اور اس پر طُرّہ یہ کہ اُسے لفظوں کو ملا کر لکھنے کا جنُون ہے ــــ بے تکلف اُن لفظوں کو بھی ملا کر لکھتا چلا جاتا ہے، جن کے جمع کرنے کا رواج نہیں؛ مثلاً : بیاتسلک، آنکھوںسے، گلشنمیں، روزنمیں، وصلمیں، بیجاصلمیں وغیرہ۔

جہاں ایک غزل ختم ہوئی ہے ، اُس کے بعد ایک سطر کی جگہ خالی چھوڑ کر، دوسری غزل شروع کردی ہے۔ صرف ایک جگہ صفحہ ۲ پر غزل کے آغاز میں لفظ "غزل" بھی لکھا ہے، باقی سارے دیوان میں محض خالی جگہ چھوڑ دینے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ردیف کے ختم یا شروع ہونے پر بھی کسی قسم کی عبارت نہیں ملتی۔

پوری کتاب، نہایت درجہ سپاٹ طور پر، کسی طرح کے حُسنِ ترتیب کا خیال رکھے بغیر لکھی گئی ہے۔ غالب کو دیوان کا اِس طرح لکھنا اور چھپنا پسند نہیں تھا۔ وُہ چاہتے تھے کہ کتابت اِس سے کُھلی ہو اور زیادہ دیدہ زیب، تاکہ کتاب کا حجم بڑھ جائے، لیکن یہ نہ ہوسکا ــــ غالب نے دیوان کے خاتمے کی عبارت میں (صفحہ ۸۸)، اپنی ناپسندیدگی کا اظہار، اِن لفظوں میں کیا ہے :

> دادا کا طالب ، غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوانِ اُردو تیسری بار چھاپا گیا ہے۔ مخلص دداد آئین، میر قمرالدین اور خان صاحب الطاف نشان محمد حسین خاں کی دانائی مقتضی اِس کی ہوئی کہ دس جُزو کا

رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ہوا۔ اگرچہ یہ انطباع، میری خواہش سے نہیں، لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے، اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔ یقین ہے کہ کسی جگہ حرف غلط نہ رہا ہو، مگر ہاں ایک لفظ میری منطق کے خلاف نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے، کہاں تک بدلتا، ناچار یوں ہی چھوڑ دیا۔ یعنی کسو بہ کاف مکسور و سین مضموم و واؤ معروف۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں، البتہ یہ فصیح نہیں۔ قافیے کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں، ورنہ فصیح بلکہ افصح "کسی" ہے، واؤ کی جگہ یائے تحتانی میرے دیوان میں ایک جگہ قافیۂ کسو بہ واؤ ہے اور سب جگہ "کسی" بہ یائے تحتانی ہے۔ اس کا اظہار ضرور تھا، کوئی یہ نہ کہے کہ یہ کیا آشفتہ بیانی ہے، اللہ بس، ماسوئی ہوس ــــ"

اس کے بعد لکھا ہے: "مطبع احمدی میں واقع دلہای امو جان کے اہتمام سے بیسویں محرم الحرام سنہ ۱۲۷۸ھ کو مطبوع ہوا ــــ" اور آخر میں سید قمر الدین سے اجازت لیے بغیر اس کتاب کو چھاپنے کی ممانعت درج ہے۔ آخری صفحے یعنی ۸۸ پر حاشیے کے نیچے غالب کی خطابی مُہر ہے: "نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ"

یہ نسخہ، مالک رام کے لفظوں میں ۱۰×۶ (۴½×۸½) سائز کے ۸۸ صفحات پر مشتمل ہے (صدی ایڈیشن، مقدمہ، ص ۲۱)۔ اِمتیاز علی عرشی نے اسی بات کے لیے یہ لفظ استعمال کیے ہیں: "یہ نسخہ ۸½×۴½ انچ ناپ کے ۲۵ سطری مسطر پر ۸۸ صفحات میں طبع ہوا ہے ــــ"

(نسخۂ عرشی، دیباچہ، صفحہ ۱۰۲)

اس ایڈیشن کی طباعت مکمل ہونے پر غالب نے جولائی ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں مجروح کو لکھا تھا کہ:

کُلّیاتِ اُردو کا چھاپا تمام ہوا۔ اغلب ہے کہ اسی ہفتے میں غایت
اِسی مہینے میں ایک نسخہ بہ سبیلِ ڈاک تم کو پہنچ جائے گا۔"

(اُردوئے معلّیٰ طبع اول ۱۸۶۹ء، ص ۱۸۶)

غالب نے اِس ایڈیشن کے خاتمے کی عبارت میں اِس یقین کا اظہار کیا تھا کہ اِس میں کوئی لفظ غلط نہ رہا ہوگا، لیکن جب دیوان چھپ کر اُن کے پاس آیا اور انہوں نے اسے دیکھا تو اس میں موجود غلطیوں پر وہ بے حد جھلّائے۔ اِس جھلّاہٹ اور ناراضی اور اِس ایڈیشن سے اُن کی بیزاری کا اندازہ ۱۸ اگست ۱۸۶۱ء کے ایک خط بنام مجروح سے کیا جا سکتا ہے:

دیوانِ اُردو چھپ چکا ہے۔ ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا، اُس کو آسمان پر چڑھا دیا، حُسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلّی پر اور اُس کے پانی پر اور اُس کے چھاپے پر لعنت! صاحبِ دیوان کو اس طرح یاد کرنا، جیسے کوئی کُتّے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں، کاپی نگار اور تھا؛ متوسط، جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا، وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے؛ حق التصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں۔ یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا، وہ چھپا۔ بہر حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا۔ اگر خدا چاہے تو اسی ہفتے میں تین مجلّد اصحابِ ثلٰثہ کے پاس پہنچ جائیں۔ نہ میں خوش ہوا ہوں، نہ تم خوش ہو گے۔[۱]

دیوانِ اُردو کا یہ ایڈیشن غالب نے اگست ۱۸۶۱ء میں نواب مختار الملک نائب والیِ حیدرآباد کی خدمت میں موم جامے میں لپیٹ کر بطور ارمغان ارسال کیا تھا۔ مختار الملک کے منشی مولوی محمد حبیب اللہ کا خط آیا اور مجموعہ نظم فارسی بھیجنے کی فرمائش ہوئی۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۶۱ء کے خط میں

---

[۱] اُردوئے معلّیٰ طبع اوّل ۱۸۶۹ء، صفحہ ۱۵۴

غالب منشی صاحب سے پوچھتے ہیں کہ میں نے پچھلے مہینے اگست میں نواب صاحب کی خدمت میں اپنا اردو دیوان کہ تازہ چھپ کر آیا تھا، بھیجا تھا، اس کی رسید نہیں، اور فارسی کلیات طلب فرمایا ہے، اس میں یہ اشارہ تو مخفی نہیں کہ سرکار میں دیوانِ اُردو بیکار سمجھا گیا؟ بہر حال اُردو دیوان کے پہنچنے یا نہ پہنچنے کی رسید کا طالب ہوں[1]۔

مجروح کے نام محولہ بالا خط (مورخہ ۸، اگست ۱۸۶۱ء) کے ایک حصّے سے اس ایڈیشن کے بارے میں بعض دیگر جزئی امور روشنی میں آتے ہیں:

> اور یہ جو لکھتے ہو کہ یہاں خریدار ہیں، قیمت لکھ بھیجو — میں دلّال نہیں، سوداگر نہیں، مہتمم مطبع نہیں — مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں، مہتمم مرزا امو جان، مطبع شاہدرہ میں، محمد حسین خاں دلّی شہر، رائے مان کے کوچے میں، معتوروں کی حویلی کے پاس۔ قیمت چھ آنے، محصول ڈاک خریدار کے ذمّے۔ طالبانِ کتاب کو اطلاع دو۔ دو چار، دس پانچ جلدیں جس کو منگانی ہوں محمد حسین خاں کے نام پر، "دلی رائے مان کے کوچے معتوروں کی حویلی" کا پتا لکھ کر ڈاک میں بھجوا دو۔ کتاب ڈاک میں پہنچ جائے گی۔ قیمت چاہو نقد، چاہو ٹکٹ ارسال کرو، مجھ کو کیا، اور تم کو کیا — جو کہے اُس کو یہ جواب دے دو —"
> (اُردوئے مُعلّیٰ، طبع اوّل ۱۸۶۹ء، ص ۱۵۲)

---

[1] غالبؔ کے اصل لفظ یہ ہیں:

"در ماہ گذشتہ کہ بہ فصلِ عمر فزای سال اگست چیشا پیش وصفر از پس ہمی گذشت، منتخب دیوانِ ریختہ کہ تازہ بہ کالبدِ انطباعش فرو ریختہ اند در موسمیں جامہ نہادہ بہ نظرگاہ رُوشنانِ گذرگاہ حضرت فلک رفعت آصف سُلیمان منزلت فرستادہ ام ..... مگر این نگارش حسبُ الحکم پیشگاہِ وزارت بودہ است و بمیان نمیدان سخن از رسیدِ سفینۂ اُردو و خواہش مجموعۂ نظم فارسی در گیرندہ بدین اشارت بودہ است کہ این بیکار نباید، پیش کش آن باید .... خواہم کہ رسیدن و نارسیدن دیوان اُردو باز دانم۔"

(کلیاتِ نثرِ غالب، طبع دوم: مطبع نولکشور، لکھنؤ، جنوری ۱۸۷۱ء، ص ۲۷-۲۴۶)

○ طبع چہارم : مطبع نظامی، کانپور ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ مطابق،
مئی، جون ۱۸۶۲ء

ضخامت : ۱۰۴ صفحات مسطر: اکیس سطری

سائز : ۶×۹½ انچ (۸ × ۴½ انچ)

تعداد اشعار : ۱۸۰۲

دیوانِ اُردو طبع سوم جس غلط سلط انداز میں چھپا تھا، غالب اُس سے بہت برہم اور بددل ہوئے تھے۔ تلافی کی یہ شکل نکالی گئی کہ مطبع احمدی کے مالک محمد حُسین کسی دوسرے مطبع سے اس کی نئی طباعت کا اِنتظام کرائیں۔ چنانچہ اِس قرار داد کے مُطابق غالب نے فوراً چھاپے کے ایک نُسخے کی تصحیح کی[۱] اور اسے تازہ اشاعت کے لیے مطبع احمدی کے مالک کے حوالے کیا، جنھوں نے یہ تصحیح شدہ نُسخہ (مسودہ) مطبع نظامی، کانپور کے مالک محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن خاں کے پاس اشاعت کے لیے بھیج دیا۔

دیوانِ غالب کا چوتھا ایڈیشن کانپور کے مطبع نظامی سے ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ مطابق مئی جون ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس کا "خاتمۃ الطبع" مالکِ مطبع کی جانب سے ہے، جس سے یہ سارے اُمور سامنے آتے ہیں:

---

[۱] زمانے کے حادثات سے یہ نُسخہ ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء، لکھنؤ کے نخاس میں چند پیسے میں بکا۔ (ہندوستانی، الہ آباد، جلد ۳، شمارہ جنوری ۱۹۳۳ء، صفحہ ۹۷) اس کے آخری صفحے کے حاشیے پر پہلی چھپی ہوئی عبارت قلمزد کر کے غالب نے اپنے ہاتھ سے محمد حُسین خاں کے نام، یہ خط لکھا ہے:

دو رات دن کی محنت میں مَیں نے اِس نُسخے کو صحیح کیا ہے۔ غلط نامہ بھی اسی میں درج کر دیا ہے، گویا اب غلط نامہ بیکار محض ہو گیا ہے۔ خاتمے کی عبارت، کیا میرا بیان، کیا میر فخرالدین کا اظہار، اب کچھ ضرور نہیں — کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھاپی جائے گی۔ یہ جلد، گویا مسودہ ہے، اسی کو بھیج دیجیے —"

یہ نُسخہ، آج کل کُتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد دکن میں موجود ہے: دیوان نمبر ۹۹۸ — [مالک رام، دیوانِ غالب، صدی ایڈیشن، مُقدمہ ۲۵۰] مگر رشید حسن خان کے بقول "یہ کہنا کہ غالب نے جس نسخے کی تصحیح کی تھی وہ حیدر آباد کی آصفیہ لائبریری میں موجود ہے، درست نہیں —"
[ادبی تحقیق — مسائل اور تجزیہ، علی گڑھ، ۱۹۷۸ء ص ۱۵۹]

بخدمت اربابِ سخن عرض کرتا ہے اُمیدوارِ رحمت وغفران محمد عبدالرحمٰن
بن حاجی محمد روشن خاں طیب اللہ ثراہ، کہ اس سے پہلے دیوانِ بلاغت
نشان جناب نواب اسد اللہ خاں غالب کا دہلی میں چھپا، لیکن بسبب
سہو و نسیان کے بعض مقام میں تغیّر و تبدل ہوا، اِس لیے جناب
مجمع لطف بیکراں، محمد حُسین خاں صاحب دہلوی نے بعد نظرِ ثانی اور
تصحیح جناب مُصنف کے ایک نُسخہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے بافضال
ایزدی مُطابق اُس نُسخے کے شہرِ ذی حجہ سنہ ۱۲۷۸ھ مطبع نظامی واقع
کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھاپا۔ اُمید کہ جب ناظرین
اس کے مُطالعے سے حلاوت سخن کی پائیں، مہتمم کو دُعاے خیر سے یاد
فرمائیں، فقط۔" [صفحہ ۱۰۴، سطر ۱--۸]

اِس نُسخے کے سرورق کی جدول پُھولدار ہے اور سفید زمین پر جس کے چاروں کونوں میں ایک ایک، خوب صورت ابری پتی بنائی گئی ہے، صفحے کے وسط میں پھولوں کی ایک بیضوی مالا کے درمیان خوش خط، جلی قلم سے "دیوانِ غالب" لکھا ہے۔ اُوپر ایک چوڑی تختی میں "مَا شَآءَ اللّٰہ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ" ثبت ہے اور نیچے کی تختی میں یہ لفظ ہیں: "در مطبع نظامی واقع کانپور مطبوع گردید" اِن لفظوں کے درمیان ہی میں سالِ طباعت ۱۲۷۸ درج ہے۔

صفحہ ۲ کی پیشانی سادہ ہے اور "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے بعد غالب کا پندرہ سطری دیباچہ فارسی ہے۔ پندرھویں سطر یہ ہے: "کارنجنی مدفن تیز باد" صفحہ ۳ سے "غزلیات" کے زیرِ عنوان دیوان شروع ہو جاتا ہے۔ باستثناے ردیف الف (آغاز صفحہ ۳) اور ز (صفحہ ۲۶)، ہر ردیف کے ختم پر اگلی ردیف کا جلی عنوان ہے اور ہر ردیف کو باب قرار دیا گیا ہے، مثلاً: "باب البا" (ص ۱۹)، "باب التا" (ص ۲۰)، "باب الجیم" (ص ۲۱)، "باب جیم فارسی" (ص ۲۲)، "باب الدال" (ص ۲۲)، وقس علیٰ "باب الیا" (ص ۴۸ تا ۸۳)۔

غزلیات صفحہ ۸۲ پر ختم ہوگئی ہیں۔ آخری شعر یہ ہے :

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

اس کے بعد ایک پوری سطر میں جلی قلم سے کھینچ کر لفظ "تمت" لکھا ہے، مقابل صفحے کی آخری سطر، اس عبارت پر مشتمل ہے :

"تمام ہوئیں یہاں تک غزلیں دیوانِ غالب کی، اب آگے قصائد اور قطعات ہیں"

لیکن آگے صرف قصائد اور قطعات ہی نہیں، ایک مثنوی اور کچھ رُباعیات بھی ہیں —

صفحہ ۸۴ پر "قصائد" کا عنوان ہے، جس کے تحت صفحہ ۹۲ تک چار قصائد ہیں :

۱۔ سازِ یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار	صفحہ ۸۴ تا ۸۵،	اشعار : ۲۸
۲۔ دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں	۸۵–۸۷،	اشعار : ۲۳
۳۔ ہاں مہِ نو سُنیں ہم اُس کا نام	۸۷–۹۰،	اشعار : ۵۸
۴۔ صُبحدم دروازۂ خاور کُھلا	۹۰–۹۲،	اشعار : ۴۳

اس کے بعد صفحہ ۹۲ ہی سے مثنوی "در صفت انبہ" ہے۔ ۳۳[۱] اشعار کی یہ مثنوی صفحہ ۹۴ کی سطر ۶ پر تمام ہوتی ہے۔ اس کے بعد "قطعات" کا عنوان ہے، جس کے تحت بہ تفصیلِ ذیل سولہ (۱۶) قطعات ہیں:

۱۔ اے شہنشاہِ فلک منظر....	صفحہ ۹۴—۹۵،	تعدادِ اشعار : ۱۷
۲۔ گئے وہ دن کہ نادانستہ....	۹۵	: ۲
۳۔ کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں...	۹۵	: ۴
۴۔ در مدح ڈلی	۹۵ — ۹۶	: ۱۳
۵۔ نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے...	۹۶	: ۲
۶۔ بیانِ مصنف	۹۶ — ۹۷	: ۱۴

---

[۱] عرشی صاحب نے سوا اشعار کی تعداد ۳۵ بتائی ہے (نسخۂ عرشی، دیباچہ، ص ۱۰۶)

٧. نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے	٩٧ [1]	٧ :
٨. ہے چار شنبہ آخر ماہِ صفر چلو	٩٨	٥ :
٩. در مدح شاہ: (اے شاہ جہانگیر ....)	٩٨ [2]	١١ :
١٠. افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو	٩٩	٢ :
١١. گزارش مصنف بحضور شاہ	٩٩ — ١٠٠	٣٠ :
١٢. سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے	١٠٠ [3]	٢ :
١٣. سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی	١٠٠	٢ :
١٤. قطعہ تاریخ: (خجستہ انجمن طوے ....)	١٠١	٢ :
١٥. قطعہ تاریخ دیگر: (ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی)	١٠١	٢ :
١٦. گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں	صفحہ ١٠١، سطر ٩	٢ :
کل تعداد اشعار :		١١٥

قطعات کے بعد صفحہ ١٠١ کے وسط سے "رُباعیات" کا عنوان ہے، جس کے تحت صفحہ ١٠٣ کے آخر تک سولہ (١٦) رُباعیاں ہیں۔ رُباعی ٢ تا ١٦ کے عنوان میں "ایضاً" درج ہے۔

اِس ایڈیشن کے آخر میں نیر رخشاں کی وہ فارسی تقریظ نہیں ہے، جو پہلی اشاعت سے غالب کے اُردو دیوان کا جُزو بنی آرہی تھی۔ آخری صفحے ١٠٤ پر اوّل، مہتمم مطبع کی جانب سے "خاتمۃ الطبع" کی آٹھ سطری عبارت ہے جو شروع میں پیش کی جا چکی؛ پھر خواجہ طالب کا ایک قطعہ تاریخ ہے، جس کا ایک سطری جلی عنوان یہ ہے: "قطع تاریخ طبع دیوان مذکور ریختہ قلم فصاحت بیان خواجہ طالب حُسین طالب سلمہ اللہ تعالیٰ" قطعہ تاریخ یہ ہے:

کیا ہی دیوان چھپا غالب کا — دیکھ کر سب نے کہا خوب ہے یہ
بسکہ ہر ایک کو مرغوب ہوا — ٹھہری تاریخ کہ "مرغوب ہے یہ"
١٢٧٨

---

[1] صفحہ ٩٧ کی آخری سطر "متفرقات" کے لبتاً جلی عنوان پر مشتمل ہے۔
[2] صفحہ ٩٨ کی آخری سطر "قطعہ" کے جلی عنوان پر مبنی ہے۔
[3] صفحہ ١٠٠ کی پندرھویں سطر "قطعات" کی سرخی پر مشتمل ہے۔

اِس قطعۂ تاریخ کے بعد جلی قلم سے ایک عنوان ہے: "وجہ مہر کی خاتمے پر" اور اس کے تحت ایک سطری عبارت ہے: "واسطے سند اس بات کے کہ یہ کتاب چھپی ہوئی مطبع نظامی کی ہے، دستخط اور مہر کی گئی ـــــ" دستخط اور مہر کا چربہ یہ ہے:





اِمتیاز علی عرشی لکھتے ہیں کہ:

> "ایک بات اِس (نظامی ایڈیشن) میں یہ ... مُفید نظر آتی ہے کہ غزلوں پر مُسلسل شُمار کے ہندسے ڈالے ہیں، لیکن اِس شمار میں "کیونکہ اُس بُت سے رکھوں جان عزیز" پر نمبر شمار چھوٹ گیا ہے ـــــ" (نُسخۂ عرشی، دیباچہ، ص ۱۰۶)

یہ بیان مُغالطہ انگیز ہے اور پوری صداقت کو ظاہر نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مُتعدد اور غزلوں پر بھی نمبر شمار چھوٹ گیا ہے۔ مثلاً یہ غزلیں:

۱۔ قیامت ہے کہ سُن ۔۔۔۔ زمانے میں	صفحہ ۳۸،	شعر نمبر ۱۵، ۱۶ : ۲ شعر
۲۔ ہے سبزہ زار ۔۔۔۔ خزاں نہ پوچھ	۴۸	۳، ۴ : ۲
۳۔ باغ پا کر خفقانی ۔۔۔۔ نظر آتا ہے مجھے	۷۷ ۷۸	۱۸ تا ۲۰ ۱، ۲ : ۵
۴۔ روندی ہوئی ہے ۔۔۔۔ سَرِ رہگذار کی	۷۸	۳ تا ۵ : ۳

مُفردات کو بالعموم شُمار نہیں کیا گیا، مثلاً غزل کے اِن اَشعار پر نمبر شمار درج نہیں ہے:

۱۔ جراحت تحفہ ۔۔۔۔ درد مند آیا	صفحہ ۳،	شعر : ۶
۲۔ اَسد ہم وہ جنوں ۔۔۔۔ خار اپنا	۱۱	۱۱

۳۔ مُند گئیں کھولتے ہی۔۔۔ پر کس وقت	صفحہ: ۲۱	شعر: ۳
۴۔ لو ہم مریضِ عشق ۔۔۔۔۔ کا کیا علاج	۲۲	۲ :
۵۔ پیشکشِ مصلحت سے ۔۔۔۔ رقیب آخر	۲۶	۶ :
۶۔ یہ نالہ حاصلِ دلبستگی۔۔۔ جُز صدا معلوم	۳۱	۶ :
۷۔ لوں وام بخت سے ۔۔۔۔ ادا کروں!	۳۱	۹ :
۸۔ زمانہ سخت کم آزار ۔۔۔۔۔ رکھتے ہیں	۴۰	۱ :
۹۔ گھر میں تھا کیا ۔۔۔۔۔ سو ہے	۴۹	۱۴ :
۱۰۔ پینس میں گزرتے ۔۔۔۔ نہیں دیتے	۵۲	۱۱ :
۱۱۔ زندگی اپنی جب ۔۔۔ خدا رکھتے تھے	۵۴	۲ :
۱۲۔ آگ رہا ہے ۔۔۔ بہار آئی ہے	۵۵	۱۸ :
۱۳۔ لبِ عیسیٰ کی ۔۔۔۔ خواب سنگیں ہے	۷۹	۱ :
۱۴۔ سو میں بھی ۔۔۔۔ مطلب بر آوے	۷۹	۴ :
۱۵۔ سیاہی جیسے ۔۔۔۔۔ ہجراں کی	۷۹	۵ :

لیکن چار مختلف مواقع پر غزل کے مُفرد اشعار کو شمار بھی کیا ہے :

۱۔ جادہ رہ خور کو ۔۔۔ آغوشِ وداع	صفحہ ۲۸ ،	شعر ۱۰ ،	نمبر شمار، ۶۹
۲۔ مت مُردمکِ دیدہ ۔۔۔۔ میں آئیں	: ۳۴	: ۱۷	۸۶
۳۔ ہو گئی ہے غیر کی ۔۔۔ بے زبانوں پر نہیں	: ۳۸	: ۱۴	۹۷
۴۔ از مہر تا بہ ذرہ ۔۔۔۔ مقابل ہے آئینہ	: ۴۸	: ۲	۱۲۰

دیوانِ غالب طبع سوم (مطبع احمدی، دہلی، جولائی ۱۸۶۱ء) کے ۱۷۹۶ اشعار کے مُقابلے میں اِس ایڈیشن میں چھ اشعار کی دو غزلوں کا اِضافہ ہوا ہے :

۱۔ کیوں کر اُس بُت سے ۔۔۔۔ جانِ عزیز صفحہ ۲۷ ، شعر ۸ تا ۱۰

۲۔ بہت سہی غم گیتی ..... کیا ہے   صفحہ ۷۷ :   شعر ۱۵ تا ۱۷

اس طرح اس ایڈیشن میں اشعار کی کل تعداد ۱۸۰۲ ہے ۔

غزلیات کا گوشوارہ

صفحہ ۳ سے (باب الالف) کی غزلیں : ۴۹ ،   تعداد اشعار : ۳۰۵

۲۰	باب البار	۱	۱۲
۲۰	باب التار	۴	۱۹
۲۱	باب الجیم	۲	۴
۲۲	باب جیم فارسی	۱	۶
۲۲	باب الدال	۱	۹
۲۳	باب الرار	۹	۶۹
۲۶	(باب الزار)	۵	۲۳
۲۸	باب سین مہملہ	۱	۷
۲۸	باب شین معجمہ	۱	۲
۲۸	باب عین مہملہ	۲	۸
۲۹	باب الفار	۱	۲
۲۹	باب کاف تازی	۲	۱۵
۳۰	باب کاف فارسی	۱	۲
۳۰	باب اللام	۱	۹
۳۰	باب المیم	۱	۸
۳۱	باب النون	۳۳	۲۲۵
۴۳	باب الواو	۱۱	۸۱
۴۸	باب الہا	۲	۳
۴۸ تا ۸۳	باب الیار	۱۰۵	۶۵۱

کُل غزلیں : ۲۳۵   غزلیات کے کُل اشعار : ۱۴۶۰

ان ۲۳۵ غزلوں میں سے ۷۷ غزلیں، بہ تفصیلِ ذیل تین یا تین سے کم اشعار پر مبنی ہیں:

باب الالف کی سہ شعری غزلیں : ۴ ، دوشعری : ۷ ، یک شعری : ۲

باب التاء	۱	-	۱
باب الجیم	۳	-	۱
باب الراء	-	۱	۱
باب الزاء	۲	۱	-
باب شین معجمہ	-	۱	-
باب عین مہملہ	-	-	۱
باب الفاء	-	۱	-
باب کاف فارسی	-	۱	-
باب المیم	-	۱	۱
باب النون	۲	۳	۴
باب الواو	۲	۱	-
باب الہا	-	۱	۱
باب الیاء	۱۴	۱۲	۷
کُل غزلیں :	۲۸	۳۰	۱۹ = ۷۷

دیگر اصناف کا گوشوارہ

صفحہ ۸۴ تا ۹۲	قصائد : ۴ ،	تعداد اشعار :	۱۶۲
صفحہ ۹۲ — ۹۴	مثنوی : ۱		۳۳
صفحہ ۹۴ — ۱۰۱	قطعات : ۱۶		۱۱۵
صفحہ ۱۰۱ — ۱۰۳	رُباعیات : ۱۶		۳۲
		کل تعداد اشعار :	۳۴۲

غزلوں کے اشعار ۱۴۶۰ + دیگر اصناف کے شعر ۳۴۲، حاصل جمع : ۱۸۰۲ اشعر

امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں کہ اس نسخے میں :

"اشعار کی تعداد ۱۷۹۹ ہے[1]، جن میں ۱۴۵۷ غزلوں کے.... اور

۲۵ مثنوی .... کے ہیں۔" (نسخۂ عرشی، دیباچہ، ص ۱۰۶)

یہ صحیح نہیں —— جیسا کہ پچھلے گوشواروں سے ظاہر ہے، اِس نسخے میں اشعار کی کُل تعداد ۱۸۰۲ ہے، جن میں ۱۴۶۰ غزلوں کے ہیں، اور ۳۳ مثنوی کے۔ عرشی صاحب نے لکھا ہے کہ اِس ایڈیشن میں : تین تین شعر کی دو غزلیں اِضافہ کی گئی ہیں جو احمدی ایڈیشن میں نہیں پائی جاتیں (نسخۂ عرشی، دیباچہ، ص ۱۰۶) عرشی صاحب احمدی ایڈیشن کے اشعار کی تعداد ۱۷۹۶ بتاتے ہیں (نسخۂ عرشی، ص ۱۰۲) اِس میں چھ اشعار کا اضافہ کیا جائے جو نظامی ایڈیشن میں زیادہ ہیں تو کُل تعداد ۱۸۰۲ ہی حاصل ہوتی ہے۔ اِس لیے ۱۷۹۹ کی جو کُل تعداد عرشی صاحب نے بتائی ہے، اُسے سہو سمجھنا چاہیے۔

اِس ایڈیشن کا ایک صحیح وسالم نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں (S ui VI-19) اور اس کا مُثنیٰ، راقم الحروف کے ذاتی ذخیرۂ غالبیات کی زینت ہے۔

احمدی ایڈیشن میں، غالب نے اپنے کلام میں کچھ ضروری ترمیم بھی کی تھی۔ مثلاً "دُود کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے" میں "دُود کی طرح" کو "صورتِ دُود" سے بدل دیا تھا، لیکن احمدی ایڈیشن میں ایک رُباعی میں "کا غذباد کی طرح" ہی باندھا تھا (نسخۂ عرشی، دیباچہ، ص ۱۰۲) —— زیرِ نظر ایڈیشن (نسخۂ نظامی) میں غالب نے اس کی اصلاح کر دی ہے :

---

[1] عرشی صاحب نے اصناف وار اشعار کی جو تعداد بتائی ہے، اس کے مطابق اشعار کی کل تعداد ۱۷۹۹ کی جگہ ۱۷۹۱ ہی رہ جاتی ہے (دیباچہ، ص ۱۰۶) اصل یہ ہے کہ عرشی صاحب کو غزلوں کی اشعار میں سہو ہوا ہے۔ اُنھوں نے تین اشعار کم جوڑے ہیں۔ اسی طرح مثنوی کے اشعار ۳۳ ہیں ۲۵ نہیں، آٹھ شعر یہاں کم شمار ہوئے ہیں —— گویا گیارہ اشعار کا شمار رہ گیا ہے۔ انھیں ۱۷۹۱ میں جوڑ لیا جائے تو ۱۸۰۲ کا عدد حاصل ہوتا ہے۔ یہی اصلاً اِس ایڈیشن کے کُل اشعار کی صحیح تعداد ہے۔

یعنی ہر بار صورتِ کاغذ باد،　　ملتے ہیں یہ بدمعاش اڑنے کے لیے

[ص ۱۰۲، شعر ۴]

اس ایڈیشن میں آخری غزل کے ساتویں شعر کا مصرع اولیٰ (صفحہ ۸۳) بایں صورت چھپا ہے: "گدا سمجھ کے وُہ چُپ تھا مری خوشامد سے" ظاہر ہے یہ کتابت کی غلطی ہے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس مصرع کی صحیح شکل یہ ہے: "گدا سمجھ کے وُہ چُپ تھا، مری جو شامت آئے" نیز کچھ اور اور غلطیاں بھی رہ گئی ہیں جو عرشی صاحب کے بقول:

"اس بات کا ثبوت ہیں کہ پروف اور کاپی کی تصحیح غور سے نہیں کی گئی —" [نسخۂ عرشی، دیباچہ، ص ۱۰۶]

مولانا غلام رسول مہر نے بالکل سچ کہا ہے کہ:

"ہمارے ہاں طباعت کے انتظامات ابھی تک اس اعلیٰ پیمانے پر نہیں پہنچ سکے کہ صحتِ متن کے متعلق فارغ البالی کا وثیقہ حاصل کر لیا جائے —" [نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، ص ۲۱۴]

مالک رام نے نسخۂ نظامی کے حُسنِ کتابت کی داد دی ہے:

"کتابت بہت خوش خط اور تقسیم و ترتیب دیدہ زیب ہے۔"

[صدی ایڈیشن، مقدمہ، ص ۲۷]

خط اور قلم کے مدّاح عرشی صاحب بھی ہیں:

"خط قدرے جلی اور نسبتہً عمدہ نستعلیق ..... ہے۔"

[نسخۂ عرشی، دیباچہ، ص ۱۰۶]

حقیقت یہ ہے کہ دیوان بہت خوش وضع لکھا گیا ہے۔ "نمونۂ کتابت" کے طور پر غزلیات کا آخری شعر دیکھیے:

ادای خاص سی غالب ہوا ہی نکتہ سرا
صلای عام ہی یاران نکتہ دان کی لیے

سائز / پیمائش

امتیاز علی عرشی : اس نسخے کا سائز احمدی کے برابر (۸ ۳/۴ × ۴ ۱/۲")،
مگر کتابت کا مسطر اکیس سطری ہے۔
(نسخۂ عرشی، دیباچہ، ص ۱۰۶)

مالک رام : یہ ایڈیشن ۱۰ × ۷" (۸ × ۴") سائز پر ... ہے
(صدی ایڈیشن، مقدمہ، ص ۲۵)

میری پیمائش : ۹ ۱/۲ × ۶ انچ (۸ × ۴ ۱/۲ انچ)، ۲۱ سطری مسطر۔

سید شاہ عالم مارہروی کے نام ایک خط مرقومہ ۶، نومبر ۱۸۶۵ء سے اتنا پتا چلتا ہے کہ نظامی ایڈیشن اُس وقت تک نہیں نکلا تھا، یعنی دستیاب تھا، لیکن اس خط سے نظامی ایڈیشن کے بارے میں، غالب کے اپنے تاثر پر کوئی روشنی نہیں پڑتی :

"حضرت! میرے پاس میری تصنیفات کچھ نہیں .... کلیاتِ اُردو
مطبع کانپور میں .... موجود (ہے) جو صاحب .... مشتاق ہوں
اُس مطبع سے منگوالیں اور اگر مجھ کو یہ خدمت بجالانی چاہیے تو
بشرطِ حیات .... منگوا کر بھیج دوں گا۔"

(اُردوئے معلّیٰ، صدی ایڈیشن، فاضل لکھنوی، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۰۹)

سید بدرالدین احمد فقیر کے نام ستمبر ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں بھی مطبع نظامی کانپور والے ایڈیشن کا ذکر آیا ہے، لیکن اس سے بھی مُطلق یہ نہیں کُھلتا کہ یہ طباعت غالب کو پسند آئی یا نہیں۔ مذکورہ خط کے لفظ یہ ہیں :

"رہا دیوان، اگر ریختہ کا منتخب کہتے ہو تو وہ اس عرصے میں دلّی اور
کانپور چھاپا گیا ہے، تیسری جگہ آگرے میں چھپ رہا ہے۔"

(اُردوئے معلّیٰ، طبع اوّل، ۱۸۶۹ء، ص ۱۳۰)

○ طبع پنجم : مطبع مُفید خلایق، آگرہ، مابعد : ستمبر ۱۸۶۳ء
ضخامت : ۱۴۶ صفحات مسطر : پندرہ سطری
سائز : ۱۰½ × ۶½ انچ (۸¾ × ۵ انچ)
تعداد اشعار : ۱۷۹۵

سید بدرالدین احمد فقیر کے نام غالب نے اپنے اُردو دیوان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ دلّی اور کانپور دو جگہ چھاپا گیا اور "تیسری جگہ آگرے میں چھپ رہا ہے۔" آگرے میں چھپنے کا قصّہ کسی قدر، مطالب سابق کا اعادہ چاہتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے اِنقلاب میں غالب کے مجموعہ ہائے نظم و نثر غارت ہوئے۔ یہ بالکل خدا ساز بات ہے کہ اس انقلاب سے ایک دو روز پہلے اپنے اُردو دیوان کا ایک اہتمامی قلمی نسخہ اُنھوں نے بطور اَرمغان والیِ رامپور کی نذر بھیجا تھا، یہ محفوظ رہا — اور غالب جب رامپور کے پہلے سفر پر روانہ ہوئے (۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء) تو نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں نے نسخۂ رامپور کی نقل لینے کی فرمائش کی۔ غالب نے رامپور کے قیام کے دوران ہی میں، نیّر کو یہ نقل بھجوا دی۔

اِسی زمانۂ قیامِ رامپور میں میرٹھ کے ایک صاحب نے، جن سے غالب کا سابقہ تعارف بھی نہیں تھا، دیوان کے چھاپنے کی اجازت حاصل کر لی۔ غالب کے عزیز شاگرد اور مُطبع مُفید خلایق، آگرہ کے مالک، منشی شیو نرائن آرام کو یہ معلوم ہوا تو اُنھوں نے اپنے حقوق معرفت جتائے۔ غالب نے منشی شیو نرائن کی خواہش پر میرٹھ میں دیوان کے چھاپے جانے کی تجویز فسخ کر دی — بمشکل؛ دیوان کا مسوّدہ جو میرٹھ جا چکا تھا، واپس منگایا اور ۲۵ جون ۱۸۶۰ء کو اس کا پارسل، شیو نرائن کو آگرہ بھیجتے ہوئے لکھا :

"دیوانِ ریختہ، تم کو مَیں نے دے ڈالا، اب اس کے مالک تم ہو۔
مَیں نہیں کہتا کہ چھاپو، مَیں نہیں کہتا کہ نہ چھاپو — جو تمہاری

خوشی ہو، سو کرو۔ اگر چھاپو، تو بیس جلد کا خریدار مجھ کو لکھ لو۔۔۔"

[خطوطِ غالب، مرتبہ : مالک رام، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص ۲۴۴]

عید کے دن ۳۰ جون ۱۸۶۰ء کو سیاح کو لکھتے ہیں کہ :

میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ اردو کا دیوان ... میں
نے نورِ چشم منشی شیونرائن کو بھیج دیا۔ یقینِ کُلّی ہے کہ وہ چھاپیں گے۔"

[اردوئے معلّی، طبع اول ۱۸۶۹ء، صفحہ ۲۶]

پھر دو ہی روز بعد علائی کو مطلع کیا :

اردو کا دیوان، رامپور سے لایا ہوں اور وہ آگرے گیا ہے۔ وہاں منطبع ہوگا"

[اردوئے معلّی، طبع اول ۱۸۶۹ء، صفحہ ۴۳۶]

غالب کا یہ خیال رہا ہوگا کہ منشی شیونرائن نے باصرار دیوان منگایا ہے تو وہ اسے چھاپنے میں دیر نہ لگائیں گے، لیکن غالباً، اُن کی طرف سے اِس باب میں خاموشی کے باعث غالب نے دیوان کو طباعت کے لیے مطبعِ احمدی، دہلی کو دے دیا، جہاں یہ اواخر جولائی ۱۸۶۱ء میں چھپ گیا۔ "غلط نامہ" بنتے اور لگتے کچھ وقت لگا، اور اگست ۱۸۶۱ء میں یہ منصۂ شہود پر آیا۔

منشی شیونرائن کو اِس کی اطلاع ہوئی تو اُنھیں شکایت پیدا ہوئی، اِس لیے کہ پہلے کی قرارداد کے مطابق اُنھوں نے اپنے ہاں دیوان کی طباعت کا کام شروع کر دیا تھا، گو بروقت اِس کی اطلاع غالب کو نہ دے سکے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں کے ہاتھ منشی شیونرائن نے فرمہ بھی بھجوایا، لیکن اُس سے پہلے دہلی میں دیوان کی طباعت شروع ہو چکی تھی۔ غالب نے میر نیاز علی کی معرفت، معذرت کی لیکن شیونرائن کی خفگی قائم رہی۔۔۔۔ چنانچہ ۱۰ جنوری ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں غالب نے شیونرائن پر اپنا موقف واضح کیا، اور اُن کی خوشنودی چاہی :

میاں! میں جانتا ہوں کہ مولوی میر نیاز علی صاحب نے وکالت
اچھی نہیں کی۔ میرا مدعا یہ تھا کہ وہ تم پر اِس امر کو ظاہر کریں کردتی

میں ہندی دیوان کا چھپنا، پہلے اُس سے شروع ہوا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب تمہارا بھیجا ہوا نسخہ مجھ کو دیں اور وہ جو مَیں نے یہاں کے مطبع میں چھاپنے کی اجازت دی تھی، یہ سمجھ کر دی تھی کہ اب تمہارا ارادہ، اُس کے چھاپنے کا نہیں ——— غور کرو میرٹھ کے چھاپے خانے والے محمد عظیم (عظیم الدین) نے کس عجز و الحاح سے دیوان لیا تھا، اور مَیں نے نظر تمہاری ناخوشی پر، بہ جبر اُس سے پھیر لیا۔ یہ کیوں کر ہو سکتا تھا کہ اور کو چھاپنے کی کی اجازت دوں؟ تم نے جو خط لکھنا موقوف کیا، مَیں سمجھا کہ تم خفا ہو——— مَیں نے مولوی نیاز علی صاحب سے کہا کہ برخوردار شیو نرائن سے 'میری تقصیر معاف کروا دینا۔ بھائی خُدا کی قسم مَیں تم کو اپنا فرزند دلبند سمجھتا ہوں۔ اُس دیوان اور تصویر کا ذکر کیا ضرور ہے۔ رامپور سے وہ دیوان صرف تمہارے واسطے لکھوا کر لایا ———' دلّی میں تصویر بہ ہزار جستجو بہم پہنچا کر مول لی اور دونوں چیزیں تم کو بھیج دیں، وہ تمہارا مال ہے، چاہو اپنے پاس رکھو، چاہو کسی کو دے ڈالو، چاہو پھاڑ کر پھینک دو۔ تم نے "دستنبو" کی جدول اور جلد بنوا کے ہم کو سوغات بھیجی تھی، ہم نے اپنی تصویر اور اُردو کا دیوان تم کو بھیجا ——— میرے پیارے دوست ناظر، بنسی دھر کے تم یادگار ہو:

اے گُل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

خوشنودی کا طالب، غالب

(اُردوئے مُعلیٰ، طبع اول ۱۸۶۹ء، ص ۲۸۵-۲۸۶)

آگرے میں دیوان کی طباعت، اِس خط کے لفظ "فرمے" کے مُطابق، گو اُسی وقت شروع ہوگئی تھی، جب دہلی میں احمدی ایڈیشن چھپنا شروع ہُوا، یعنی ۱۸۶۱ء میں — لیکن جب آگے پیچھے، ایک برس میں دہلی اور کانپور، دو جگہ سے دیوان شائع ہوگیا تو مُنشی شیو نرائن نے غالباً عمداً تاخیرِ مزید سے کام لیتے ہوئے، اِس کی طباعت ۱۸۶۳ء میں ختم کی، اور بالآخر اِسے شائع کیا۔

اِمتیاز علی عرشیؔ[1] اور مالک رامؔ[2] نے اِس ایڈیشن کے تعارف میں جو کچھ لکھا ہے، اُس سے اِستفادہ کرتے ہوئے، ذیل میں اِس نُسخے کے کتابیاتی کوائف پیش کیے جاتے ہیں:

اِس ایڈیشن (مطبوعہ آگرہ) کا سرورق پھولوں سے مُزیّن ہے۔ اِس کی پیشانی پر لکھا ہے "العلم قوۃ"[3] درمیان میں "دیوانِ غالب ۱۸۶۳ء" کے لفظ ہیں اور نیچے کی پٹّی میں یہ عبارت ہے: "مَطبع مُفید خلایق، آگرہ میں باہتمام مُنشی شیو نرائن کے چھپا"۔

صفحہ ۲ کے وسط سے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے تحت غالب کا فارسی دیباچہ شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۳ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۴ سے دیوان کا آغاز ہوتا ہے —— اوّل قطعات ہیں جن کے عُنوان میں بعض جگہ لفظ "قطعہ" ملتا ہے، ورنہ یہ مُعرّیٰ ہیں اور صفحہ ۱۲ پر ختم ہوتے ہیں۔ صفحہ ۱۲ سے ۱۵ تک مثنوی "در صفتِ انبہ" ہے اس پر صرف "مثنوی" کا عنوان دیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۵ سے جہاں مثنوی ختم ہوتی ہے قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔ قصیدے تعداد میں چار ہیں اور صفحہ ۲۶ تک چلتے ہیں۔ صفحہ ۲۷ سے ۱۳۹ تک غزلیات ہیں اور ان کے بعد صفحہ ۱۴۲ تک ۱۶ رباعیات ہیں۔

---

[1] (الف) جامعہ، دہلی، ستمبر ۱۹۴۲ء، صفحہ ۱۶۲ — ۱۶۳

(ب) نُسخۂ عرشی، دیباچہ، صفحہ ۱۰۷ — ۱۰۹

[2] دیوانِ غالب، صدی ایڈیشن، مقدمہ، صفحہ ۲۹ — ۳۰

[3] "العلم قوۃ" مُنشی شیو نرائن سے خاص معلوم ہوتا ہے۔ نومبر ۱۸۵۸ء میں "دستنبو" اُن کے مطبع سے شائع ہوئی۔ اس کی پیشانی کے لیے مُنشی شیو نرائن نے "العلم طاقۃ" تجویز کیا اور غالب کی توثیق پر اسے چھاپا تھا، دیکھیے: [اُردوئے مُعلّیٰ، طبع اوّل ۱۸۶۹ء، صفحہ ۳۵۴]

خاتمہ میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں کی فارسی تقریظ (ص ۱۴۲ - ۱۴۶) ہے۔
اس تقریظ میں سالِ ہجری ۱۲۷۱ (مطابق: ۱۸۵۴ء) اور تعدادِ اشعار : یک ہزار و ہفصد و نود واند" درج ہے مگر اس ایڈیشن میں اشعار کی واقعی تعداد ۱۷۹۵ ہے جو نسخۂ رامپور کے مطابق ہے۔ اِس تعداد میں احمدی ایڈیشن کے مقابلے میں ایک عدد کی کمی اس وجہ سے ہے کہ نسخۂ رامپور میں یہ شعر نہیں ہے :

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

زیرِ بحث ایڈیشن مطبوعہ آگرہ سے بھی یہ ساقط ہے۔

اس ایڈیشن کی ترتیب (دیباچۂ غالب، قطعات، مثنوی، قصائد، رُباعیات، تقریظِ نیّر) غالب کے اُردو دیوان کے پچھلے سب مطبوعہ نسخوں سے مختلف اور بالکل اُس قلمی دیوان کے مُطابق ہے جو غالب نے ۹ اور ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کے درمیان کسی وقت والیِ رامپور کی خدمت میں بھیجا تھا[1] اور جس کی نقل سے یہ (نسخہ آگرہ) شائع ہوا ہے۔ منشی شیونرائن غالباً اس دیوان کے ساتھ غالب کی تصویر بھی چھاپنا چاہتے تھے، لیکن یہ شامل نہیں ہے۔

کاتب اچھا، خوش خط ہے، خط قدرے جلی نستعلیق ہے۔ مسطر پندرہ سطری، سائز پچھلے مطبوعہ نسخوں کے لگ بھگ اور کاغذ دیسی مشین کا بنا ہوا ہے ـــ سید بدر الدین احمد فقیر کے نام غالب نے جس محولہ فوق خط میں لکھا ہے کہ دیوانِ ریختہ تیسری جگہ آگرے میں چھپ رہا ہے، وہ ستمبر ۱۸۶۳ء کا ہے، گویا یہ اس کے بعد لیکن ۱۸۶۳ء ہی میں جیسا کہ سرورق پر مذکور ہے، شائع ہوا۔
غالب کا اُردو دیوان، اُن کی زندگی میں آگرہ والے اِس ایڈیشن سے کوئی سال بھر پہلے ۱۸۶۲ء میں ذوق اور مومن کے کلام کے ساتھ ایک مجلد میں بھی شائع ہوا، اسے چھٹی اشاعت مانا جاسکتا ہے ـــ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے : مکاتیبِ غالب، عرشی، طبع دوم، ۱۹۴۳ء، حواشی صفحہ ۳

○ طبع ششم در "نگارستانِ سُخن" : ۲۴، اگست ۱۸۶۲ء

طباعت در مطابع : (الف) مطبع العلوم، سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی

(ب) مطبع احمدی، واقع شاہدرہ، دہلی

مُرتب : ظہیرالدین ظہیر، شاگرد؛ ذوق دہلوی

ضخامت : ۱۷۶ صفحات تعداد اشعار ۱۵۲۵ سے متجاوز

غالب کی زندگی میں، اُن کا اُردو دیوان، ذوق اور مومن کے کلام کے ساتھ، "نگارستانِ سُخن" نام کے ایک مجموعے میں بھی شائع ہُوا۔ اِس مجموعۂ انتخاب دیوانِ ثلاثہ کی اشاعت کا کام لالہ جی (ہے؟) نرائن، سوداگر کُتب کی فرمائش پر قاسم علی کے زیرِ اہتمام مطبع العلوم سینٹ اسٹیفن کالج میں شروع ہُوا، لیکن یہاں اس کے پہلے تین جُزو چھپے تھے کہ کچھ بجوگ پڑ گیا اور پھر اس کا باقی حصہ امتو جان کے، مطبع احمدی، دہلی میں، اُن کے اہتمام میں شائع ہُوا۔ یہ سارے اُمور سرورق اور خاتمۃ الطبع کی عبارت سے احاطۂ علم میں آتے ہیں۔ سَرورق کی عبارت یہ ہے :

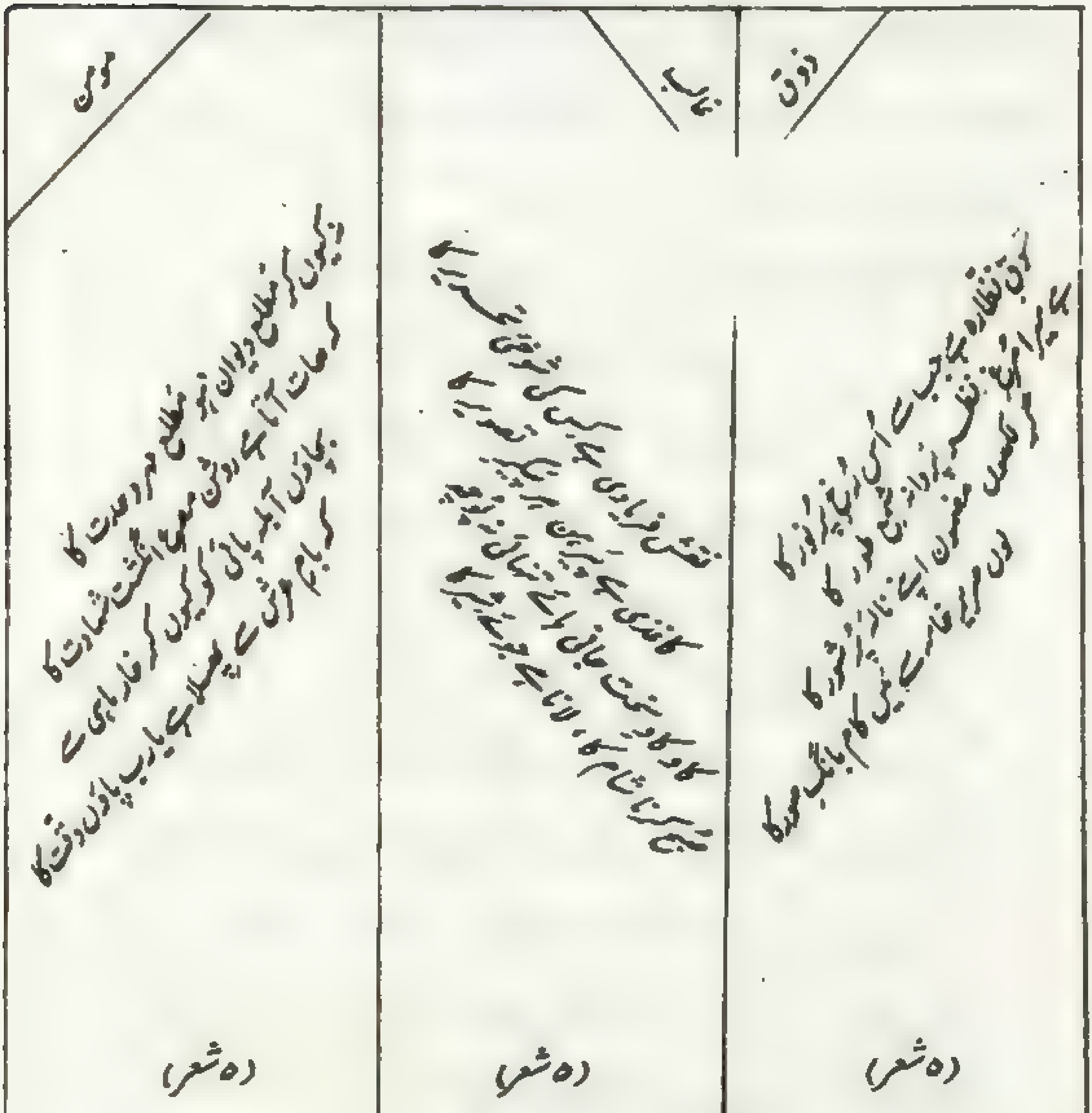
"ماشاء اللہ لا قوۃ الّا باللہ ـــــ بعونِ خالقِ ارض وسما قادرِ بے چون وچرا مجموعۂ اِنتخابِ دواوین شُعرائے غرا، اعنی ذوق و غالب و مومن، مُسمّیٰ بہ "نگارستانِ سخن" حسب فرمائش لالہ جی (ہے؟) نرائن صاحب دَر مطبع، منبع العلوم سینٹ سٹیفن کالج، دہلی ـــــ باہتمام بندہ قاسم علی طبع شُد ـــــ"

خاتمے کے لفظ برصفحہ ۱۷۶ یہ ہیں :

"دَر خدمتِ ہمہ صاحبان عرض اَست کہ سہ جُزو کتاب ہٰذا از جانب شروع، دَر مطبع دیگر اَوّلاً طبع شُدہ بود، بعد از سہ جُزو ناتمام، دَر مطبع بندہ طبع گردید۔ فقط بندہ امتو جان، مہتمم مَطبع احمدی ـــــ"

سَرورق کے بعد دوسرے صفحے سے "اِنتخاب دواوین" شروع ہو جاتا ہے پہلے چوڑی پیشانی

پر نقش ونگار ہیں، پھر تین کالم ہیں۔ ہر صفحے پر تینوں شاعروں کا کلام تین کالموں میں ترچھا لکھا گیا ہے۔ صفحہ بہ صفحہ پہلے کالم میں ذوق، پھر غالب اور آخری کالم میں مومن کی غزل درج ہوئی ہے۔ یعنی ہر صفحے کی صورت یہ ہے کہ درمیان میں غالب کا کلام ہے اور دائیں بائیں ذوق اور مومن کا:



غزلیات صفحہ ۱۶۰ پر ختم ہو جاتی ہیں۔ غزلوں کے بعد (صفحہ ۱۶۱ — ۱۶۲) بغیر عنوان کے نصرت الملک کی مدح والا قطعۂ غالب ہے۔ اس کے بعد (صفحہ ۱۶۳ — ۱۶۴) ظہیرؔ ذوق اور غالب کے لکھے ہوئے سہرے ہیں[۱]۔

غالب کا یہ سہرا مارچ ۱۸۵۲ء میں لکھا گیا اور سب سے پہلے مولوی محمد باقر دہلوی کے : دہلی اُردو اخبار، جلد ۱۴، نمبر ۱۳، مورخہ ۶، جمادی الآخرۃ سنہ ۱۲۶۸ ہجری، مطابق ۲۹، مارچ ۱۸۵۲ء [۲۸، مارچ ۱۸۵۲ء، نسخۂ عرشی، ص ۲۲۳] میں شائع ہوا، اور ہر چند کہ، اس کے بعد غالب کی زندگی میں ایک سے زیادہ بار، دیوانِ اُردو کے ایڈیشن چھپے، لیکن اس سہرے کو کسی ایڈیشن میں جگہ نہیں ملی۔ کتابی صورت میں یہ "نگارستانِ سخن" ہی میں شامل ہوا۔

یہ سہرے صفحہ ۱۶۴ پر ختم کر کے مثلث میں یہ عبارت لکھی گئی ہے :

"الحمد للہ و المنۃ کہ بیمن تائید ایزد منان انتخاب دیوان ہر سہ شعرائے جادو بیان، شہسواران عرصۂ سخندانی، شہریارانِ شہرستان نکتہ آرائی کہ گوئی سبقت از قدما، و مُتاخرین ربودہ و علم اُستادی در میدانِ فصاحت و بلاغت افراشتہ اند، اولا کلامِ مُعجز نظام خداوندِ سُخن خاقانی ہند، شیخ محمد ابراہیم ذوق اُستاد حضور والا ثانیا طوطی شکرستانِ معانی، چراغ افروز شبستانی زبان دانی، نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں غالب، نظام جنگ بہادر، ثالثا فلاطونِ زمانہ، سحبانِ دوران، حکیم محمد مومن متخلص بہ مومن خاں دریں چند اوراق حسب فرمایش لالہ جی (رجے؟) نرائن صاحب سوداگر کُتب در مطبع احمدی واقع شاہدرہ دلہائی، بحسنِ اہتمام میرزا اُمّو جان حُلیۂ طبع پوشید ——— بتاریخ بست و ہفتم صفر ۱۲۷۹ ہجری تمام شد ———"

۱۔ جہاں تک میرا علم ہے، سہرا ردیف کے ساتھ غالب سے پہلے کسی نے کوئی نظم نہیں لکھی تھی۔ اگر یہ صحیح ہے تو میرزا (غالب) صاحب، اس نوع کی نظم کے موجد قرار پاتے ہیں۔" (امتیاز علی عرشی، نسخۂ عرشی، صفحہ ۳۸۲)

اِس عبارت سے اِس "انتخابِ دیوانِ ہر سہ شعرائے جادو بیان" کی تاریخِ اتمامِ انطباع "بست و ہفتم صفر ۱۲۷۹ ہجری" حاصل ہوتی ہے جو مطابق ہے: ۲۴ اگست ۱۸۶۲ عیسوی کے۔ مالک رام نے اِسے ۱۲ اگست ۱۸۶۳ء کے مطابق بتایا ہے[1]، جو صحیح نہیں۔ اِسی غلط مطابقت پر اُنہوں نے "نگارستانِ سخن" کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ "اگست ۱۸۶۳ء میں طباعت مکمل ہو کر شائع ہوئی" (صدی ایڈیشن، مقدمہ، صفحہ ۲۸) ظاہر ہے یہ بیان درست نہیں۔

صفحہ ۱۶۵ سے ۱۷۴ تک مومن، غالب اور ظہیر کے قصائد ہیں۔ ظہیر کے قصیدے سے پہلے یہ عبارت ملتی ہے:

"قصیدۂ سراپا تقصیر ظہیر الدین مؤلف تذکرہ ہذا از تلمیذان شیخ محمد ابراہیم ذوق، در مدح حضور، لامع النور بہادر شاہ بادشاہ"

"تذکرۂ ہذا" سے اگر "نگارستانِ سخن" ہی مراد ہے تو گویا اِس "تذکرے" کو جسے "انتخاب" بھی کہا گیا ہے، ظہیر الدین نے ترتیب دیا ہے ــــــ "سراپا تقصیر" کا انکساری سابقہ بھی اِس اَمر پر دال ہے کہ اس مجموعے کی جمع و ترتیب سے اُن کا تعلق ہے۔

صفحہ ۱۶۵ سے ۱۷۱ تک "قصیدہ .... در تہنیتِ عید در مدح حضورِ اقدس" کے عنوان سے غالب کا قصیدہ ہے: "ہاں مہِ نو سُنیں ہم اُس کا نام" صفحہ ۱۷۱ کے بقیہ حصّے سے صفحہ ۱۷۵ تک غالب کا دوسرا قصیدہ ہے: "صُبحدم دروازہ خاور کھلا" صفحہ ۱۷۶ "نگارستانِ سخن" کا آخری صفحہ ہے۔ اِس کے پہلے کالم میں مومن کا مخمس ختم ہوتا ہے، دوسرے میں غالب کا قطعۂ چہار شنبہ (جو صفحہ ۱۷۵ سے شروع ہُوا ہے) اور آخری کالم میں ظہیر دہلوی کا قطعہ ہے۔ اِس کے بعد خاتمے کی وُہ عبارت ہے جو اوّل نقل کی جا چکی۔

سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی لکھتے ہیں: "میرا خیال ہے کہ یہ دیوان، نظامی ایڈیشن کی نقل ہے ــــــ" اِس خیال کی تائید میں اُنہوں نے دو وُجوہ پیش کیے ہیں:

---

[1] دیوانِ غالب، صدی ایڈیشن، مقدمہ، صفحہ ۲۸

۱۔ ایک تو یہ کہ یہ دیوان' نظامی پریس میں جون ۱۸۶۲ء میں چھپا، اور یہ
۲۴، اگست ۱۸۶۲ء میں ــــ"

۲۔ دوسرے یہ کہ" اِس انتخاب میں وہی غلطیاں ہیں جو نظامی پریس کانپور کے
نُسخے میں تھیں، بلکہ کچُھ زیادہ ــــ"

(اورینٹل کالج میگزین، لاہور، فروری ۱۹۵۲ء ص ۵۶)

پہلی دلیل زیادہ قوی نہیں۔ نظامی ایڈیشن، جون ۱۸۶۲ء میں، کانپور میں چھپا، اس کے بعد شائع ہوا ہوگا۔"نگارستان سخن" کا چھاپا ۲۴، اگست ۱۸۶۲ء کو تمام ہُوا۔ اگر" نگارستان" نظامی ایڈیشن کی بنیاد پر ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اِس کی ترتیب، کتابت اور طباعت کے سارے مراحل گویا جون یا اس کے بعد سے ۲۴، اگست ۱۸۶۲ء تک مختصر مدت اور مہلت میں طے پاگئے، لیکن اس مجموعے یعنی" نگارستانِ سُخن" کا اِس سُرعت کے ساتھ چھپنا ثابت نہیں۔ اِس کے پہلے تین جزو اوّلاً ایک مطبع میں چھپے؛" بعد از سہ جزو ناتمام" اس کی طباعت ایک دوسرے مطبع میں ہوئی اور یہاں اِس کی طباعت ۲۴، اگست ۱۸۶۲ء کو ختم ہوئی۔" ناتمام" کے لفظ سے مُترشح ہے کہ پہلے مطبع میں چھپائی رُک گئی تھی، دوسرے مطبع میں ناتمام فرمے لے جانے اور وہاں طباعت کا انتظام کرنے میں بھی کچُھ وقت لگا ہوگا ــــ

" نگارستانِ سُخن" کی طباعت کا کام مطبع احمدی، دہلی میں پُورا ہوا، جہاں سے قبل ازیں " دیوانِ غالب" کا ایک ایڈیشن ۲۹، جولائی ۱۸۶۱ء کو شائع ہوچکا تھا ــ اغلب ہے کہ" نگارستانِ سخن" کے مرتب کے سامنے مطبع احمدی والا ایڈیشن رہا یا کم از کم" نگارستانِ سخن" کا جو آخری اور زیادہ حصّہ مطبع احمدی میں چھپا۔ اس کی کاپی کے مقابلے اور تصحیح وغیرہ کے لیے مطبع احمدی والے ایڈیشن سے کام لیا گیا ہو۔ مالک رام کی ترجیحی رائے یہ ہے کہ" نگارستانِ سُخن" کا:

" سارا کلام، مطبع احمدی کے ۱۸۶۱ء والے نسخے سے نقل ہوا ہے۔ اِس لیے اِس کی تمام غلطیاں (کچھ اضافے کے ساتھ) جُوں کی تُوں' اِس میں موجود ہیں[۱]ــ"

---

[۱] دیوانِ غالب، صدی ایڈیشن، مقدمہ، صفحہ ۲۸

فاضل لکھنوی لکھتے ہیں کہ " نگارستانِ سخن " میں :

" فردیات و غزلیات کے اشعار کی تعداد چودہ سو سات ہے اور نظامی ایڈیشن میں ۴۹ شعر زیادہ ہیں ـــــ "

(اورینٹل کالج میگزین ، فروری ۱۹۵۲ ء ، ص ۵۶)

نظامی ایڈیشن میں فردیات و غزلیات کے اشعار کی تعداد ۱۴۶۰ ہے ، گویا فاضل لکھنوی ، " نگارستانِ سخن " میں غزل کے اشعار کی تعداد ۱۴۱۱ بتاتے ہیں ۔

مالک رام لکھتے ہیں کہ :

" دیوانِ غالب کی تقریباً تمام غزلیں ، اس انتخاب میں آ گئی ہیں ، صرف ۳۵ شعر حذف کیے گئے ہیں ـــــ "[1]

(دیوانِ غالب ، صدی ایڈیشن ، مقدمہ ، ۲۸)

مالک رام کے نزدیک ، " نگارستانِ سخن " ، دیوانِ غالب کے احدی ایڈیشن پر مبنی ہے ، جس میں غزلیات کے اشعار ، نظامی ایڈیشن سے ۶ کم ، یعنی ۱۴۵۴ ہیں ۔ ۳۵ اشعار حذف ہونے کی صورت میں " نگارستانِ سخن " میں مالک رام کے شمار کے مطابق ، گویا غزلیات کے ۱۴۱۹ شعر ہوئے ۔

غزلوں کے علاوہ ، " نگارستانِ سخن " میں غالب کے دو قصیدے ، دو قطعے اور ایک سہرا بھی شامل ہے ۔ اگر ان کے کچھ شعر حذف نہیں ہوئے تو بہ تفصیلِ ذیل ، ان کی کل تعداد ۱۲۵ ہونی چاہیے :

۱ ۔ صفحہ ۱۶۱ - ۱۶۲	قطعہ : نصرت الملک بہادر ،		تعداد اشعار : ۷
۲ ۔ صفحہ ۱۶۳ - ۱۶۴	سہرا ،		: ۱۲
۳ ۔ صفحہ ۱۶۵ - ۱۷۱	قصیدہ : در تہنیتِ عید		: ۵۸

---

[1] دیوانِ غالب ، صدی ایڈیشن ، مقدمہ ، صفحہ ۲۷

۴۔ صفحہ ۱۷۱۔۱۷۵، قصیدہ : صُبحدم دروازۂ خاور کُھلا، تعداد اشعار : ۴۳

۵۔ صفحہ ۱۷۵۔۱۷۶ قطعہ : چہار شنبہ ، : ۵

کل تعداد اشعار : ۱۲۵

اس طرح "نگارستانِ سُخن" میں غالب کے اشعار کی مجموعی تعداد :

بحوالہ، فاضل لکھنوی : ۱۴۱۱ + ۱۲۵ = ۱۵۳۶

اور مالک رام کے مُطابق : ۱۴۱۹ + ۱۲۵ = ۱۵۴۴

لہٰذا یہ ایک بات طے ہے کہ اس میں غالب کے اشعار کی تعداد ۱۵۳۵ سے مُتجاوز ہے۔

فاضل لکھنوی، بمقابلہ نظامی ایڈیشن، "نگارستانِ سُخن" میں غزلیات کے ۴۹ شعر کم بتاتے ہیں، جس کی وجہ فاضل لکھنوی ہی کے بقول :

> مُمکن ہے کہ اِنتخاب ہو لیکن زیادہ تر قرائن اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ کاتب کی غلطی ہے، اِس لیے کہ کہیں کہیں فقط ایک مصرعہ ہی نقل کیا گیا ہے۔ مثلاً ص ۲۹ پر "دیکھ کر غیر کو کیوں نہ ہو کلیجہ ٹھنڈا" لکھا ہے اور دوسرا مصرع "نالہ کرتا تھا، ولے طالبِ تاثیر بھی تھا" ندارد ـــ"

[اورینٹل کالج میگزین، لاہور، فروری ۱۹۵۲ء، ص ۵۶]

لیکن محض کاتب کی غلطی سے لگ بھگ پچاس شعر رہ جانا زیادہ قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ "نگارستانِ سُخن" کے نُسخے کمیاب ہیں۔ راقم الحروف کو ایک مختصر سی صحبت میں سیّد مُرتضیٰ حُسین فاضل لکھنوی کے مخزونہ نُسخے سے استفادے کا موقع ملا ـــ

غرض، یہ ہے غالب کی زندگی میں، اُن کے اُردو دیوان کی مُختلف اشاعتوں کی ایک رُوداد ـــ غالب کے انتقال کے بعد ان کا اُردو دیوان اتنی بار، اتنے مختلف مقامات اور مطابع سے طرح طرح کی جلوہ نمائیوں کے ساتھ اس کثرت اور تواتر کے ساتھ چھپتا رہا ہے کہ بلا شبہ اسے اُردو کی مقبول ترین شعری کتاب کا مقام دیا جا سکتا ہے۔ پہلی

"غالب صدی" (۱۹۶۹ء) تک کے بعض قابلِ ذکر ایڈیشن :

۱۔ دیوانِ غالب، نظامی ایڈیشن، بدایوں : ۱۹۱۵ء، ۱۹۱۸ء، ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۲ء، ۱۹۲۳ء، ۱۹۲۷ء

۲۔ دیوانِ غالب، شیخ عبدالقادر، لاہور، ۱۹۱۹ء

۳۔ دیوانِ غالب، ڈاکٹر ذاکر حسین، برلن، جرمنی، ۱۹۲۵ء

۴۔ مُرقعِ غالب، مصوّر، عبدالرحمٰن چغتائی، لاہور، ۱۹۲۸ء

۵۔ نقشِ چغتائی، مصوّر، عبدالرحمٰن چغتائی، لاہور، ۱۹۳۵ء

۶۔ دیوانِ غالب، آغا محمد طاہر، دہلی، ۱۹۳۶ء

۷۔ دیوانِ غالب عکسی رنگین، تاج ایڈیشن، تاج کمپنی، لاہور، ۱۹۳۸ء

۸۔ ارمغانِ غالب، شیخ محمد اکرام، بمبئی، ۱۹۴۴ء

۹۔ دیوانِ غالب، مالک رام ○ آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۷ء

○ آزاد کتاب گھر، دہلی، صدی ایڈیشن، ۱۹۶۹ء

○ صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی، دلی، ۱۹۶۹ء

۱۰۔ دیوانِ غالب اُردو، نسخۂ عرشی، امتیاز علی عرشی، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۵۸ء

۱۱۔ دیوانِ غالب (اُردو/ہندی)، علی سردار جعفری، بمبئی، ۱۹۵۸ء

۱۲۔ دیوانِ غالب مصور عکسی، مکتبۂ شاہراہ، دہلی، فروری ۱۹۵۸ء

۱۳۔ دیوانِ غالب، مصور، حنیف رامے، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۶۵ء

۱۴۔ مُرقعِ غالب، پرتھوی چندر، دہلی ۱۹۶۹ء

۱۵۔ دیوانِ غالب، عکسی، مولانا غلام رسول مہر، لاہور، ۱۹۶۷ء

۱۶۔ دیوانِ غالب، مولانا حامد علی خاں، ○ لاہور، ۱۹۶۹ء

○ علی گڑھ، ۱۹۸۰ء

۱۷۔ دیوانِ غالب، غالب یادگار کمیٹی، بمبئی، ۱۹۶۹ء

۱۸۔ غالب کا منسوخ دیوان، مسلم ضیائی، کراچی، ۱۹۶۹ء

دیوانِ غالب جدید، نُسخہ حمیدیہ:

غالب نے دس بارہ کی عمر سے پچیس کی عمر تک دس بارہ برس میں جو اشعار کہے، اس کا ایک نسخہ مکتوبہ ۱۸۲۱ء میاں فوجدار محمد خان بہادر، بھوپال کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔ ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم ریاست بھوپال، مفتی محمد انوار الحق نے اس کو پہلی بار ۱۹۲۱ء میں "دیوانِ غالب جدید المعروف بہ نسخہ حمیدیہ" کے عنوان سے شائع کیا[1]۔ یہ نسخہ بھوپال کے نواب محمد حمید اللہ خان سے انتساب پاکر جو اُس وقت "نواب زادہ" اور ریاست بھوپال کے "چیف سیکرٹری" تھے، نسخۂ حمیدیہ کہلایا۔

مفتی محمد انوار الحق نے "تمہید" میں نسخۂ حمیدیہ کے خطّی نسخے کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں، اس کے مطابق اس قلمی نسخے کو محفوظ رکھنے کا شرف کتب خانۂ حمیدیہ بھوپال کو حاصل ہے۔ یہ تو یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دیوان یہاں کیونکر پہنچا، لیکن تاریخِ کتابت اور مہروں وغیرہ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ غالباً رئیسِ وقت نواب غوث محمد خاں صاحب کے بیٹے میاں فوجدار محمد خاں صاحب کے لیے لکھا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے

---

[1] طبع اول : مفیدِ عام اسٹیم پریس، آگرہ، ۱۹۲۱ء
مرتبہ : مفتی محمد انوار الحق
ضخامت : ۱۳۹ + ۳۴۲ صفحات، سائز : ۲۲ × ۲۹/۸
سرنامہ از : محمد حمید اللہ خان، صفحہ ۱
تمہید : مفتی محمد انوار الحق، صفحہ ۳ - ۲۴
تذکرہ "عبدالرحمٰن مرحوم" : مفتی محمد انوار الحق، ۲۵ - ۳۱
مقدمہ : عبدالرحمٰن بجنوری، صفحہ ۳۳ - ۱۳۹
دیوانِ غالب جدید (متن) : ۱ - ۳۴۲

شروع میں ایک صفحہ پر یہ لکھا ہوا ہے " دیوانِ ہٰذا من تصنیف مرزا نوشاہ دہلوی المتخلص بہ اسد از کتب خانہ سرکار فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں فوجدار محمد خان بہادر دام اقبالہٗ، قلمی، خوش خط " اور اس کے سامنے اُن کی مہر ہے اور خاتمے پر کاتب کے قلم کی یہ تحریر موجود ہے: " دیوان من تصنیف مرزا صاحب قبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلمہم ربہم علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر ۱۲۳۷[1] من الہجرت النبویہ صورت اتمام یافت " اس کا خط نہایت پاکیزہ اور نظر فریب ہے۔ شروع میں خوبصورت طلائی کام ہو رہا ہے اور تمام صفحات پر سنہری جدول ہے جگہ جگہ میاں فوجدار محمد خاں صاحب کی مہریں ثبت ہیں جن میں سے بعض ۱۲۳۸ھ (۱۸۲۲ء) اور بعض ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) کی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا ہے اور ان کی نظر سے گزرا ہے اور انھوں نے خود اس میں جابجا اصلاحیں کی ہیں کیونکہ اگرچہ ان اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ ہے لیکن پھر بھی اس میں اور غالب کے طرز تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے ... خود ان اصلاحوں کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کو مصنف کے سوا اور کسی کے قلم کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے۔"

(نسخۂ حمیدیہ، طبع اوّل ص ۹-۵)

نسخۂ حمیدیہ، جس بیش بہا مخطوطے سے شائع ہوا ہے، وہ اب ناپید ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ۱۷ جون ۱۹۵۴ء کے ایک خط میں ڈاکٹر مختار الدین احمد کو لکھتے ہیں:

> " یہ سُن کر آپ کو بے حد قلق ہو گا کہ نسخۂ حمیدیہ مطبوعہ کی اصل، بھوپال سے غائب ہو گئی۔ لائبریرین کہتے ہیں کہ نواب صاحب کے کتب خانے میں منتقل ہو گئی اور خود نواب صاحب فرماتے ہیں کہ وہ، وہیں حمیدیہ لائبریری سے غائب ہو گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔"

(نقوش لاہور، خطوط نمبر ۱۹۶۸ء، جلد ۳، صفحہ ۱۵۹

---

[1] مطابق ۳۱۔ اکتوبر ۱۸۲۱ء

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے، نسخۂ حمیدیہ مطبوعہ کی اصل، صرف وہ نسخۂ بھوپال مکتوبہ ۱۸۲۱ء ہی نہیں ہے جو اولاً نواب فوجدار محمد خان کے ذاتی کتب خانے میں اور پھر بھوپال کی اسٹیٹ لائبریری میں محفوظ رہا اور اب غائب ہو چکا ہے حقیقت یہ ہے کہ نسخہ حمیدیہ مطبوعہ: نسخہ بھوپال، غالب کے متداول دیوان اور ان کے کچھ دوسرے مطبوعہ کلام کا مجموعہ ہے۔ اسے مفتی محمد انوار الحق کے وسائل کی حد تک کلیاتِ اُردو سمجھنا چاہیئے۔ نسخۂ حمیدیہ (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن کاش خطّی نسخہ بھوپال، اپنی جُداگانہ شکل میں چھپتا یا نسخۂ حمیدیہ (مطبوعہ) میں اسے سختی کے ساتھ مشخص کر دیا جاتا۔ نسخۂ حمیدیہ (مطبوعہ) کے مرتب نے اس کی اہمیت اور بحیثیت مرتب اپنی ذمہ داری کو جیسا محسوس کرنا چاہیئے تھا، نہیں کیا ہے۔

"نسخۂ حمیدیہ" پر ڈاکٹر ابو محمد سحر نے قابلِ قدر کام کیا ہے۔ یہاں اُن کے ایک مضمون "کچھ نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں" (مطبوعہ، شاعر، بمبئی، غالب نمبر فروری مارچ ۱۹۶۹ء صفحہ ۹۶ - ۱۰۲) سے بعض ضروری امور پیش کیے جاتے ہیں:

"نسخۂ بھوپال کی دریافت اور نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب و اشاعت کے ساتھ کچھ ایسے حالات وابستہ رہے اور ان کے اظہار میں مفتی انوار الحق نے کچھ اتنے رمز و ایماء سے کام لیا کہ چند ضروری امور جو مرتب کے معمولی بیانات سے واضح ہو سکتے تھے بظاہر عقدۂ لاینحل بن کر رہ گئے۔ صحیح معلومات اور نتائج تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے بعض محققین نے ان کے بارے میں اتنی قیاس آرائیاں کی ہیں کہ ان سب کا جائزہ غیر ضروری طوالت کا باعث ہوگا۔ اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان امور سے بحث کرنے میں صرف فیصلہ کُن شواہد کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

نسخۂ بھوپال کی دریافت کے بارے میں نسخۂ حمیدیہ طبع اول کی "تمہید" میں یہ الفاظ ملتے ہیں:

"زمانے نے بقائے اصلح کے اصول کو شعر و سخن میں بھی ثابت کر ہی دیا اور غالب کے انتقال کے پورے پچاس برس کے بعد اس صحیفے کو دُنیا

میں رونما کیا جو پوری ایک صدی سے گوشۂ خفا میں پڑا تھا۔[1]"

اس بیان کے پہلے ٹکڑے سے نسخۂ بھوپال کی دریافت کا سال ۱۹۱۹ء قرار پاتا ہے اور دوسرے ٹکڑے میں "پوری ایک صدی" کی ابتدا، اگر نسخۂ بھوپال کی تاریخ کتابت یعنی ۱۸۲۱ء سے شمار کی جائے تو ۱۹۲۱ء کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ ایک واقعہ کی دو تاریخوں کو تسلیم کرنے میں جو قباحت ہے وہ ظاہر ہے۔ اگر ۱۹۱۹ء کو صحیح تاریخ فرض کر لیا جائے تو اس میں ایک دوسری دقت سامنے آتی ہے مفتی محمد انوار الحق نے اپنی تمہید میں تو اس کا ذکر نہیں کیا لیکن "عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم" کے عنوان سے اُنھوں نے جو تعزیتی تعارف سپردِ قلم کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی طباعت کا اہتمام ڈاکٹر بجنوری کر رہے تھے لیکن موت نے ان کو اس کی تکمیل کا موقع نہ دیا۔ مفتی محمد انوار الحق رقمطراز ہیں :

> " آہ کیا انقلاب لیل و نہار، کیسی گردشِ روزگار ہے کہ یہ کتاب جسے فخرِ قوم جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری ایسے شوق سے چھپوانے کی تیاری کر رہے تھے، آج اُن کی یادگار کے طور پر شائع ہو رہی ہے اور یہ ورق جو اُن کے رشحاتِ قلم سے روکش گلزار ہونے والا تھا، اس وقت معنًا اُن کا کتابۂ مزار ہے۔[2]" (نسخۂ حمیدیہ، طبع اول، صفحہ ۲۵)

ڈاکٹر بجنوری کا انتقال ۷ نومبر ۱۹۱۸ء کو ہوا۔ اگر وہ نسخۂ حمیدیہ کے چھپوانے کی تیاری کر رہے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال اس سے پہلے دستیاب ہو چکا تھا اور اس کی دریافت کی وہ پہلی تاریخ بھی جو مفتی انوار الحق کے قول سے نکلتی ہے، غلط ہے

۱؎ نسخۂ حمیدیہ، تمہید از مفتی انوار الحق، ص ۳

۲؎ مفتی محمد انوار الحق کی اس عبارت کی روشنی میں مولانا امتیاز علی عرشی کا یہ قول صحیح نہیں ہے کہ انھوں نے کہیں اس کا اظہار نہیں کیا کہ نسخۂ بھوپال بجنوری کی زندگی میں دستیاب ہو چکا تھا بلکہ ان کی عبارتوں سے اس کے خلاف مترشح ہوتا ہے۔ دیکھیے: نسخۂ حمیدیہ اور بجنوری از امتیاز علی عرشی، مطبوعہ نیا دور، لکھنؤ مئی ۱۹۶۱ء، ص ۳

لیکن یہ محض مفتی انوار الحق کا سہو ہے کہ انھوں نے ایک ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا جو واقعے کے خلاف تھا۔ اس سے یہ شبہہ کرنا صحیح نہیں کہ اُنھوں نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے نسخۂ بھوپال کی دریافت کا سال قصداً غلط بتایا ہے، کیونکہ حقیقت کا اظہار تو انھوں نے خود اپنے دوسرے بیان میں صاف طور سے کر دیا ہے۔ مفتی صاحب مرحوم کے دوسرے بیان کی تائید کچھ اور شواہد سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً معارف بابت ستمبر ۱۹۱۸ء کے "شذرات" سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ نو دریافت نسخۂ بھوپال اس زمانے میں ڈاکٹر بجنوری کے مطالعے میں تھا۔ مولوی عبدالحق "محاسنِ کلامِ غالب" طبع اوّل (۱۹۲۱ء) کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> " انجمن ترقیِ اُردو کا ایک مدّت سے ارادہ تھا کہ مرزا غالب اُردو دیوان کا ایک نفیس ایڈیشن طبع کرے۔ چنانچہ بڑی کوشش اور تحقیق سے یہ دیوان مرتب کیا گیا ...... میری درخواست پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اس کے لیے بطور مقدمہ غالب کے کلام پر تبصرہ لکھنا شروع کیا .... اس اثنا میں اتفاق سے بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں مرزا صاحب کے قدیم دیوان کا مکمل نسخہ نکل آیا جس میں وہ تمام نظمیں درج تھیں جو بعد میں خارج کر دی گئی تھیں۔ علمی لحاظ سے یہ ایک بڑی نعمت اور بیش بہا خزانہ تھا۔ مرحوم نے انجمن کے لیے اسے ترتیب دینا شروع کیا لیکن افسوس اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ اس کی تکمیل ہو جاتی ... "

جہاں تک نسخۂ جدید کا تعلق ہے، اس تحریر سے مفتی محمد انوار الحق کے قول پر بس اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے نسخۂ بھوپال کو انجمن ترقی اُردو کے لیے ترتیب دینا شروع کیا تھا[1]۔"

اگرچہ مولوی عبدالحق نے اپنی اس تحریر میں جس کا اقتباس اس سے پہلے گزر چکا ہے، انجمن ترقی اُردو کے دیوانِ غالب کے مرتب کا نام ظاہر نہیں کیا، لیکن یہ مفتی انوار الحق کے بیان کی تردید کے لیے کافی نہیں ہو سکتا کیونکہ ڈاکٹر بجنوری اپنی وفات سے قبل کسی نہ کسی

---

[1] عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم از مفتی محمد انوار الحق نسخۂ حمیدیہ، طبع اوّل آگرہ ۱۹۲۱ء، ص ۲۸

حیثیت سے دیوانِ غالب کی تدوین میں مصروف تھے ۔ "محاسنِ کلامِ غالب" میں ان کے ایک خط کے کچھ حصّے کا جو عکس شائع ہوا ہے، اس میں یہ عبارت موجود ہے :

"تکیہ والی غزل بھی لکھ کر بھیجتا ہوں ۔ سید ہاشمی نے جو دیوان کا اپنا آؤٹ کیا ہوا نسخہ مجھے دیا ہے، اس میں یہ غزل نواب صاحب کے حوالے سے درج ہے ۔ اس کی تحقیق نواب صاحب سے مقصود ہے۔ جہاں تک میں مرزا صاحب کے کلام اُردو سے واقفیت رکھتا ہوں، زمین آسمان ٹل جائیں، لیکن یہ اُن کا کلام نہیں ہو سکتا ۔ اس کی تحقیق سخت ضروری ہے ۔ اگر یہ غزل اُن غزلوں میں جو بعد میں حاشیے پر اضافہ کی گئی ہیں، موجود ہے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ کس شخص کے خط میں لکھی ہوئی ہے ۔ آیا وہ خط تحقیق ہوتا ہے یا نہیں ؟ دوسرے نواب صاحب کو اس کے بارے میں ذاتی علم کیا ہے ؟ تیسرے نواب صاحب کی اس کے بارے میں رائے کیا ہے ؟ "طائرِ دل" جو قطعہ ہے، وہ بھی مرزا کا نہیں ہو سکتا، اس کے بارے میں بھی نواب صاحب سے جو کچھ مطابق یا مخالف معلوم ہو سکے نوٹ کر لیجیے گا[1]"

اس خط کے مکتوب الیہ کے نام و مقام اور تاریخ کتابت وغیرہ کے متعلق عکس سے کوئی واقفیت حاصل نہیں ہوتی، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسے صاحب کے نام لکھا گیا ہے جو اس وقت دہلی میں تھے ۔ نواب صاحب سے مراد نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں کے صاحبزادے اور غالب کے شاگرد نواب احمد سعید خاں طالب دہلوی ہیں، کیونکہ "تکیہ" کی ردیف کی غزل انھیں کی قلمی بیاض سے منقول ہے اور اُن کا انتقال ۱۹۲۵ء میں ہوا ۔ وہ کلام جس کے متعلق ڈاکٹر بجنوری نے اس خط میں استفسارات کیے ہیں، نسخۂ بھوپال کا نہیں ہے ۔ نسخۂ حمیدیہ میں بھی اس کا وجود نہیں ۔ تاہم ان کی یہ تحریر متداول دیوان کے سوا غالب سے منسوب کلام کے بارے میں ان کی چھان بین کا ثبوت ہے ۔ غالب

---

[1] عکس تحریر مطبوعہ "محاسنِ کلامِ غالب" طبع پنجم انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ، اپریل ۱۹۵۸ء ۔

کے نو دریافت کلام کو متداول دیوان کے نسخوں کے ساتھ شامل کرنے کا اس زمانے میں عام رجحان تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو نے ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں دیوانِ غالب کا ایک عمدہ ایڈیشن شائع کرانے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ کام پہلے پہل سید ہاشمی فرید آبادی کے سپرد کیا گیا تھا۔ انھوں نے ۱۹۱۵ء تک اس کا مسودہ تیار کر لیا تھا۔ اس دوران میں نظامی پریس بدایوں سے دیوانِ غالب کا نیا ایڈیشن شائع ہو گیا اور انجمن ترقی اردو کا منصوبہ سرد پڑ گیا۔ لیکن اسی زمانے میں ڈاکٹر بجنوری ولایت سے واپس آئے تھے۔ انھوں نے اس منصوبے سے اتنی دلچسپی دکھائی کہ انجمن ترقی اردو نے یہ کام ان کے سپرد کر دیا۔ نسخۂ حمیدیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے سید ہاشمی فرید آبادی جو ان امور سے براہِ راست واقفیت رکھتے تھے، لکھتے ہیں:

"انجمن ترقی اردو نے اول ہی اول ۱۳ء یا ۱۴ء میں دیوانِ غالب کا ایک نسخہ چھاپنے کا ارادہ کیا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ دیوانِ غالب کو عمدہ کاغذ پر خوشخط اور صحیح طبع کرایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، مرزا صاحب کا غیر مطبوعہ یا گمشدہ کلام بھی تلاش کیا جائے۔

دیوان کو صحیح اور جدید اصولِ تحریر کے مطابق لکھوانے اور غیر مطبوعہ کلام کو جمع کرنے کی خدمت راقم الحروف کے سپرد ہوئی تھی اور ۱۹۱۵ء تک کتاب کا مبیضہ تیار ہو گیا تھا۔ ... انجمن کی تجویز اسی منزل پر تھی کہ نظامی پریس بدایوں سے دیوانِ غالب کا نیا نسخہ چھپ کر شائع ہوا۔ صحت یا حسنِ طبع کے اعتبار سے یہ ایسا نہ تھا جیسا کہ انجمن چھاپنا چاہتی تھی لیکن مروجہ سے کہیں بہتر تھا۔ لہٰذا اس کی اشاعت نے انجمن کے ولولۂ طبع کو سرد کر دیا اور اگر اسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم ولایت سے تشریف نہ لاتے تو غالباً انجمن کی تجویز نسیاً منسیاً ہو جاتی، مگر ان مرحوم کو کلامِ غالب سے اس درجہ عقیدت تھی کہ بہت سی مصروفیتوں کے باوجود وہ انجمن کی تجویز کی عملی تکمیل پر آمادہ ہو گئے"

اور انجمن نے بڑی خوشی سے یہ کام ان (ان) کے سپرد کر دیا۔[1]"

ڈاکٹر بجنوری کے عکس تحریر مطبوعہ محاسن کلام غالب میں سید ہاشمی کے ایڈٹ کیے ہوئے نسخے کا جو ذکر ہے، اس سے دیوانِ غالب کا وہی نسخہ مراد ہے جسے سید ہاشمی نے انجمن ترقی اُردو کے لیے مرتب کیا تھا۔ اس نسخے اور دوسرے نسخوں کی مدد سے ڈاکٹر بجنوری متداول دیوانِ غالب مرتب کر چکے تھے کہ نسخۂ بھوپال دستیاب ہو گیا۔ سید ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں :

"ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے کلامِ غالب پر جو تبصرہ لکھا ہے، وہ رسالہ اُردو میں شائع ہو چکا ہے اور ان کے علمی کمالات کی ممتاز یادگار رہے گا لیکن اسے بھی مرحوم کے شوقِ مخلصانہ کا منجانب اللہ انعام سمجھنا چاہیے کہ جس وقت وہ غالب کے متداول دیوان کی طبع کا انتظام کر رہے تھے، حُسنِ اتفاق سے خود بھوپال میں مرزا صاحب مرحوم کا وہ گمشدہ کلام دستیاب ہو گیا جسے مرزا نے خود اپنے دوستوں کے مشورے سے تلف کر دیا تھا۔[2]"

نسخۂ بھوپال کے مل جانے کے بعد ڈاکٹر بجنوری دیوانِ غالب کو نئے طریقے سے چھپوانا چاہتے تھے۔ اُمید تھی کہ وہ اپنے تبصرے میں بھی ضروری اضافے کریں گے لیکن ان کی مرگِ ناگہاں نے اس کی مہلت نہ دی[3]۔ اس کی تفصیل سید ہاشمی فرید آبادی نے یوں بیان کی ہے :

"ڈاکٹر بجنوری مرحوم اس غیر مطبوعہ نسخے کو قدیم دیوان کے ساتھ اس طرح طبع کرانا چاہتے تھے کہ کتاب کے ایک صفحے پر قلمی نسخے کے اشعار ہیں اور

---

[1] اُردو، اورنگ آباد، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۳ - ۷۰۴

[2] اُردو، اورنگ آباد، اکتوبر، ۱۹۲۲ء ص ۷۰۴

[3] "۱۹۱۸ء کے وبائی انفلوئنزا میں پہلے ڈاکٹر بجنوری کی بیگم کا انتقال ہوا، چند روز بعد، ۷۔ نومبر ۱۹۱۸ء کو وہ خود بھی عین عالمِ شباب میں رہ گزرِ عالمِ بقا ہو گئے۔"
(مولانا غلام رسول مہر، سہ ماہی اقبال، لاہور، اپریل ۱۹۶۹ء، ص ۔۔)

مقابل کے صفحے پر متداول دیوان کی وہی غزلیں جن کے اشعار جا بجا سے مرزا صاحب نے خارج کر دیے تھے مگر اس قلمی نسخے میں محفوظ رہ گئے تھے اور مطبوعہ یا قلمی نسخے کی وہ غزلیں جو صرف ایک ہی میں پائی جاتی ہیں، ان کے سامنے کا صفحہ سادہ چھوڑ دیا جاتا کہ دیکھنے والے کو بلا دقت قدیم و جدید کلام کا فرق اور بعد کی اصلاح و تنسیخ کا حال معلوم ہو جاتا۔

یہ بھی اُمید تھی کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن اس نئے کلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اور پہلے تبصرے میں بہت کچھ اضافہ فرمائیں گے، لیکن دیوان کی کتابت کا ابھی آغاز ہوا تھا کہ ان کا تپ وبائی میں انتقال ہو گیا اور وہ سب اُمیدیں جو مرحوم کی ذات سے وابستہ تھیں، خاک میں مل گئیں [1]"

نسخۂ بھوپال ڈاکٹر بجنوری کی وفات سے کچھ پہلے دستیاب ہو چکا تھا۔ اُنھوں نے نہ صرف یہ کہ اسے دیکھا تھا بلکہ متداول دیوانِ غالب کے اشتراک کے ساتھ اس کو طبع کرانے کا ایک مخصوص خاکہ بھی بنا لیا تھا اور اس کے مطابق دیوان کی کتابت بھی شروع کرا دی تھی۔ اُنھوں نے غالب کے کلام پر اپنا تبصرہ صرف متداول دیوان کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا تھا۔ قابلِ قبول خارجی شواہد کے علاوہ اس کی سب سے بڑی داخلی شہادت یہ ہے کہ اس میں اُنھوں نے نسخۂ بھوپال یا غالب کے ابتدائی قلم و کلام کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ چونکہ یہ تبصرہ طوالت کے باوجود ابھی ناتمام تھا اور اسی اثنا میں نسخۂ بھوپال مل گیا، اس لیے یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی [2] کہ اُنھوں نے یہ تبصرہ نسخۂ بھوپال کے دستیاب ہونے کے بعد لکھا تھا۔

---

[1] اُردو، اورنگ آباد، اکتوبر ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۴-۷۰۵

[2] پروفیسر سید احتشام حسین کے پاس نسخۂ حمیدیہ کی ایک جلد تھی جو غالباً محمد احتشام الدین دہلوی کے پاس رہ چکی ہے۔ اس پر ڈاکٹر بجنوری کے مقدمے کے آخر میں محمد احتشام الدین دہلوی نے ۱۱ مئی ۱۹۳۷ء کو لکھا ہے کہ "یہ غلط ہے کہ بجنوری مرحوم نے یہ دیباچہ غالب کے نسخۂ دیوانِ معدوم کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا۔ نہیں، بلکہ دستیاب ہونے پر ان کو مکمل کلامِ غالب کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور یہ مقدمہ اس ارادے کی پیروی میں لکھا گیا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حالانکہ جب انھوں نے اس میں کسی نہج سے نسخۂ بھوپال کا ذکر نہیں کیا تو یہ غلط فہمی بے بنیاد ہی نہیں، بے نتیجہ بھی تھی۔ توقع تھی کہ نسخۂ بھوپال کی روشنی میں ڈاکٹر بجنوری اپنے تبصرے پر نظرِ ثانی کریں گے، لیکن قبل اس کے کہ ان کے ارادے پورے ہوتے یا کسی قدر آگے بڑھتے انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی وفات کے بعد ریاست بھوپال نے نسخۂ بھوپال کی ترتیب پر مفتی انوارالحق کو مامور کیا اور انھوں نے اسے اپنے طریقے سے سرانجام دیا۔ قطع نظر اس کے کہ انھوں نے ڈاکٹر بجنوری کے مجوزہ اندازِ ترتیب کی کیفیت نہیں لکھی، ان کے تمام بیانات اپنی تشنگی یا اُلجھاؤ کے باوجود صداقت پر مبنی ہیں۔

نسخۂ حمیدیہ پر ڈاکٹر بجنوری کی مرگِ ناگہانی کا سب سے بڑا اثر تو یہی پڑا کہ یہ دیوان ان کی ترتیب و تنقید سے محروم رہ گیا، لیکن ان کی موت اس دیوان کی اشاعت پر کچھ اور حیثیتوں سے بھی اثر انداز ہوئی۔ اس دیوان کو بجا طور پر اُن کی یادگار بنانے کا ارادہ کیا گیا۔ لیکن ڈاکٹر بجنوری کے اعزہ و احباب کے عدم تعاون کی وجہ سے مفتی محمد انوارالحق کو اُن کے حالاتِ زندگی فراہم کرنے میں بڑی دقت پیش آئی اور دیوان کی اشاعت میں کئی سال کی تاخیر کے باوجود اس سلسلے میں کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ چنانچہ ڈاکٹر بجنوری پر جو مضمون اُنھوں نے لکھا ہے، وہ اُن کے سوانح کے بجائے ان کے اعزہ اور احباب کی شکایتوں سے لبریز ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر بجنوری کے اس طویل تبصرے کو بھی نسخۂ حمیدیہ کا مقدمہ بنایا گیا جو صرف متداول دیوانِ غالب سے متعلق تھا۔

ڈاکٹر بجنوری کا تبصرہ رسالہ اُردو، اورنگ آباد جنوری ۱۹۲۱ء میں "محاسنِ کلامِ غالب" کے عنوان سے شائع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اسی سال انجمن ترقی اُردو نے اسے کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا تھا چنانچہ بقول سید ہاشمی فرید آبادی اس تبصرے کو نسخۂ حمیدیہ

(بقیہ حاشیہ از گذشتہ صفحہ) ... اس کے لکھنے کے بعد وہ ایک بار علی گڑھ آئے اور راقم کے پاس وہ ایک روز مہمان رہے۔ یہ مقدمہ پنسل سے لکھا ہوا کتابچہ ان کے پاس موجود تھا اور انھوں نے خود اپنی زبان سے اس کو پڑھ کر سنایا اور طباعت کے متعلق مشورے کیے۔" دیکھیے پروفیسر سید احتشام حسین کا مراسلہ مطبوعہ ہماری زبان، علی گڑھ، یکم مارچ ۱۹۶۱ء

میں شامل کرنا غیر ضروری، بلکہ کسی قدر ناموزوں ہوا۔" لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کے مرتب نے اسے اپنے طور پر شامل کیا تھا۔ نسخۂ حمیدیہ میں اس تبصرے کا کوئی عنوان نہیں ہے اور یہ تبصرہ اس مقطع پر ختم ہو جاتا ہے ؎

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

جبکہ "محاسن کلامِ غالب" میں اس کے بعد نو صفحات اور ہیں۔ مزید یہ کہ نسخۂ حمیدیہ میں مسئلہ وحدت الوجود پر ڈاکٹر بجنوری کے خیالات سے شدید اختلاف ظاہر کرتے ہوئے مفتی محمد انوار الحق نے ایک اتنا طویل حاشیہ لکھا ہے کہ وہ اس موضوع پر اچھے خاصے جوابی مضمون کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ یہ حاشیہ نسخۂ حمیدیہ طبع اول کے صفحہ ۴۰ سے شروع ہو کر صفحہ ۹۸ پر تمام ہوتا ہے۔

بعض شواہد سے اس دیوان کی طباعت و اشاعت کے مراحل میں بھی کچھ پیچیدگیوں کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً اس کے ایک ہی ایڈیشن کے تین سرورق ملتے ہیں۔ دو سرورق مفید عام اسٹیم پریس آگرہ کے چھپے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک سرورق میں جسے پہلا سرورق سمجھنا چاہیئے، دیوان کے نام کے بعد صرف :

بہ تدوین
خاکسار ضیاء العلوم مفتی انوار الحق ایم اے منشی فاضل
ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم
بھوپال

لکھا ہوا ہے۔ مقدمہ دیوان اور ڈاکٹر بجنوری کا ذکر نہیں ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ مطبع کے اندراج میں "اسٹیم" کے اوپر خفی قلم سے ۱۹۲۱ء درج ہے۔ اس سطر کے نیچے داہنی طرف "قیمت مجلد عہ" ۔ بائیں طرف "قیمت غیر مجلد عیؔر" اور درمیان میں "منتظر امروہوی کتابت نمود" لکھا ہوا ہے، لیکن مفید عام اسٹیم پریس آگرہ کے دوسرے

؎ اردو، اورنگ آباد، ۱۹۲۲ء، ص ۷۰۵

سرورق میں دیوان کے نام کے نیچے :

مع مقدمہ دیوان

فخر قوم جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری بی اے ایل ایل بی

بیرسٹرایٹ لا - ڈی جے

کا اضافہ کیا گیا ہے اور اس کے بعد :

مرتبہٗ

خاکسار ضیاء العلوم مفتی انوارالحق ایم اے منشی فاضل

ڈائرکٹر تعلیمات ریاست بھوپال

لکھا گیا ہے۔ مطبع کے اندراج میں ۱۹۲۱ء ندارد ہے اور مجلد کی قیمت پانچ روپے اور غیر مجلد کی چار روپے ہو گئی ہے۔[۱]

تیسرے سرورق میں "مفید عام اسٹیم پریس آگرہ میں باہتمام محمد قادر علی خاں صوفی طبع ہوا" کے بجائے "صرف ٹائمیش گورنمنٹ پریس بھوپال میں طبع ہوا" درج ہے اور کاتب کا نام نصیرالدین لکھا ہے۔ دیگر اندراجات مفید عام پریس آگرہ کے دوسرے سرورق کے مطابق ہیں۔ یہ سرورق تو محض سرورق کم پڑ جانے کی بنا پر بھوپال میں چھپوا لیا گیا ہوگا، لیکن مفید عام پریس آگرہ کے دوسرے سرورق کے چھپوانے کا سبب قیمت کے تغیر کے علاوہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سرورق میں ڈاکٹر بجنوری سے متعلق اندراج نہ تھا جس کا ہونا بعد میں ضروری سمجھا گیا۔[۲] سوء اتفاق کہ اس ردوبدل میں دیوان کی تاریخ طباعت نہیں برقرار

---

[۱] اس دوسرے سرورق کے حامل نسخۂ حمیدیہ کے دو مطبوعہ نسخے راقم الحروف کے ذخیرۂ غالبیات میں موجود ہیں اس فرق کے ساتھ کہ ایک سرورق سفید رنگ کے چکنے کاغذ پر چھپا ہوا ہے اور دوسرا فیروزی رنگ کے نسبتاً دبیز کاغذ پر طبع ہوا ہے۔

[۲] نسخۂ عرشی طبع اول کے دیباچے میں عرشی صاحب نے نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کی تقریبی تاریخ ۱۹۲۸ء لکھی ہے (ص ۱۱۹) لیکن اس کے بعد انھیں آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۹۲۱ء کے سرورق والا نسخہ مل گیا جس کا ذکر انھوں نے اپنے مراسلے مطبوعہ "ہماری زبان" (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

رکھی گئی اور چونکہ کسی دوسری جگہ بھی اس کا ذکر نہ تھا اس لیے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ نسخۂ حمیدیہ کی اکثر جلدوں سے اس کی تاریخ طباعت کا پتہ چلنا ناممکن ہو گیا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس نسخے کی تمام جلدیں مفید عام پریس آگرہ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خفیف تغیر و تبدل کا عمل متن کی طباعت میں بھی جاری رکھا گیا ہے اور اس طرح ایک ہی ایڈیشن کی جلدوں میں کہیں کہیں معمولی سا فرق ہو گیا ہے۔ اس کی دو پیشِ نظر جلدیں اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک جلد میں صفحہ ۱۹۱ پر آخری مصرع کے داہنی طرف "مطبوعہ" لکھا ہوا ہے لیکن دوسری جلد میں یہ اندراج غائب ہے۔ اس صفحے کے بعض خطوط کی کشش میں بھی دونوں جلدوں میں فرق ہے۔ اسی طرح صفحہ ۱۹۲ کے حاشیے کی عبارت میں بھی دونوں جلدوں میں لفظی اختلاف موجود ہے۔ اگرچہ یہ تغیرات معمولی ہیں اور شاید بہت کم کیے گئے ہیں لیکن کسی تحقیقی کتاب میں بغیر اظہار کے اس طرح کی تبدیلیاں سخت غلط فہمی کا باعث ہو سکتی ہیں کیونکہ کوئی محقق کسی مطبوعہ کتاب کے تمام نسخوں کا جائزہ نہیں لے سکتا۔

تصویروں کی اشاعت میں بھی نسخۂ حمیدیہ کچھ ایسی ہی صورتِ حال پیش کرتا ہے۔ مفتی محمد انوار الحق نے ڈاکٹر بجنوری پر اپنے مضمون میں شکایتاً لکھا ہے کہ "مرحوم کی ایک تصویر جس کو اس کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ تھا وہ بھی مجھ سے لے لی گئی اور اسی سبب سے اس دیوان کو تصاویر سے مزین کرنے کا خیال چھوڑنا پڑا۔ لیکن در اصل اس دیوان میں ڈاکٹر بجنوری غالب، اور نسخۂ بھوپال کے ایک صفحے کی تصویریں شائع کی گئیں[۵]۔ اس کے باوجود مفتی محمد انوار الحق نے نہ تو اس سلسلے میں اپنے بیان پر نظرِ ثانی کی اور نہ کسی اور طرح تصویروں کی شمولیت کا اظہار کیا۔ اب اگر کسی کو اس دیوان کا کوئی ایسا نسخہ ملے جس میں سے تصویریں غائب کر دی گئی ہیں اور آجکل عموماً اس کے ایسے ہی نسخے دیکھنے میں آتے ہیں تو مرتب

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ) .... علی گڑھ ۸۔ اگست ۱۹۶۱ء میں کیا ہے، تاہم چونکہ انھوں نے اس کو نظر انداز کر دیا کہ اس سرورق پر ڈاکٹر بجنوری کا نام نہیں ہے۔ اس لیے دوسرا سرورق چھپوانے کے اس سبب کی طرف بھی اُن کا خیال نہیں گیا۔

[۴] نسخۂ حمیدیہ، طبع اول، ص ۲

[۵] میرے کتاب خانے میں موجود نسخۂ حمیدیہ مطبوعہ میں بجنوری مرحوم کی تصویر "تمہید" کے خاتمے کے بعد ص ۲۴ اور ۲۵ کے مابین، غالب کی تصویر بجنوری کے مقدمے ص ۳۳ کے مقابل اور قلمی نسخے کے ایک صفحے کا عکس "دیوانِ غالب جدید" کے متن سے پہلے شامل ہے۔

نے بیان کے مطابق وہ یہی سمجھے گا کہ اس دیوان میں تصویریں سرے سے شامل ہی نہیں کی گئیں بلکہ اس کو اس پر تاسف بھی ہوگا کہ مرتب کو ڈاکٹر بجنوری کی تصویر سے محروم رکھا گیا، حالانکہ یہ باتیں خلافِ واقعہ ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی بے احتیاطیاں نسخۂ حمیدیہ کے ہر متجسس قاری کو بڑی اُلجھن میں ڈالتی ہیں اور اس کے لیے معاملات کی تہ تک پہنچنا آسان نہیں رہتا۔"

ڈاکٹر ابو محمد سحر کے اس تحقیقی جائزے کے علاوہ نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں بعض نسبتاً پہلے کے جائزوں میں قاضی عبدالودود[1]، مولانا امتیاز علی عرشی[2] اور شیخ محمد اکرام کی تحریریں[3] اہم ہیں۔

○ دیوانِ غالب جدید (المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ) طبع اول (۱۹۲۱ء) ۲۰×۳۰/۸ سائز پر شائع ہوا تھا۔ مدھیہ پردیش اُردو اکادمی بھوپال سے ۱۹۸۲ء میں اس کی ایک عکسی اشاعت REDUCE کر کے ۲۳×۳۶/۱۶ سائز پر عمل میں آئی ہے (صفحات ۴۸۸)۔ نسخۂ حمیدیہ (۱۹۲۱ء) کے بیک وقت تین سرورق پائے جاتے ہیں۔ زیرِ نظر اشاعت کے شروع میں تینوں قسم کے سرورق کے عکس دیے گئے ہیں۔

دیوانِ غالب، نسخۂ حمیدیہ

مرتبہ: پروفیسر حمید احمد خاں

نسخۂ حمیدیہ ۱۹۲۱ء میں مفتی انوار الحق کے زیرِ اہتمام بھوپال سے شائع ہوا۔ مفتی انوار الحق کا نسخہ شائع ہوا تو یہ حقیقت مخفی نہ رہی کہ مطبوعہ نسخہ،

---

[1] "دیوانِ غالب کے دو نسخے": معاصر، پٹنہ، حصہ ۱۲، صفحہ ۱-۴۷

[2] دیباچہ دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی، صفحہ ۷۵-۷۸۔

[3] ارمغانِ غالب، صفحہ ۶ و بہ بعد۔

قلمی نسخہ کی نقل نہیں ہے۔ اس بارے میں شاید سب سے بڑی قباحت یہ ہوئی کہ مفتی صاحب کے نسخے میں کئی جگہ حاشیے کے اندراجات اور متن کے درمیان ضروری امتیاز قائم نہیں رہ سکا۔" چنانچہ صحیح صورت حال کی دریافت کے لیے پروفیسر حمید احمد خاں (لاہور) نے دیوانِ غالب کے اصل نسخے کا معائنہ ضروری خیال کیا۔ اواخر اگست ۱۹۳۸ء میں حیدر آباد دکن کے ایک سفر سے لاہور واپس آتے ہوئے حمید احمد خاں نے بھوپال میں قیام کیا اور سرکاری کتب خانے میں بیٹھ کر مطبوعہ نسخے اور قلمی نسخے کے اندراجات کے مقابلے کا ذمہ دارانہ کام انجام دیا۔ اس موقع پر انہیں اندازہ ہوا کہ حواشی اور متن کا فرق ملحوظ نہ رہنے سے قطع نظر مطبوعہ نسخے میں ایک بڑا فتور یہ پیدا ہوا ہے کہ قلمی نسخے میں غزلیات کی ترتیب مطبوعہ نسخے تک پہنچتے پہنچتے کچھ کی کچھ ہو گئی ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر حمید احمد خاں نے یہ لازم کیا کہ وہ اپنی پوری توجہ دو باتوں پر مرکوز رکھیں:

۱۔ قلمی نسخے کے مندرجات کی صحیح ترتیب معین کی جائے۔

۲۔ حاشیے اور متن کے اندراج کے معاملے میں قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے درمیان جہاں جہاں اختلاف ہے، اس کے متعلق مفصل یادداشتیں لے لی جائیں۔

۱۹۷۱ء کا نسخۂ حمیدیہ، بھوپال کے قلمی دیوان کی پہلی مطبوعہ نقل ہے۔ حمید احمد خاں کا بیان ہے کہ:

"قلمی دیوان سے انحراف کی جتنی مختلف قسمیں تصور میں آسکتی ہیں وہ مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخہ میں موجود ہیں، بجز اس ایک صورت کے کہ قلمی دیوان کا شاید کوئی شعر مطبوعہ نسخے سے حذف نہیں ہوا ہے۔"

(دیباچہ نسخۂ حمیدیہ، ص ۲۲)

ترتیب منظومات کی تصحیح اور حواشی کی تنقیح کرتے ہوئے جا بجا مطبوعہ نسخے کے مطابق لفظی فروگزاشتیں بھی حمید احمد خاں کی نظر سے نہ بچ سکیں۔

نسخۂ حمیدیہ ۱۹۲۱ء میں جس بیش بہا مخطوطے سے شائع ہوا تھا، وہ اب محفوظ نہیں رہا ہے۔[1]

اس پس منظر میں کہ نسخۂ حمیدیہ کا اصل مخطوطہ غائب ہو گیا ہے، پروفیسر حمید احمد خاں کی وہ تحریری یادداشتیں جو تیس بتیس برس پہلے محض ذاتی حوالے کے لیے نسخۂ حمیدیہ کی اصل اور مطبوعہ کے تقابلی مطالعے سے تیار کی گئی تھیں اور خوش قسمتی سے اب تک ان کے پاس محفوظ بھی چلی آ رہی تھیں، ایک مشترک قومی تہذیبی میراث کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے غالب کے ذہنی و فکری ارتقاء کے اس اہم ذاتی ذخیرۂ معلومات میں سب کو شریک کر لینے کے لیے اپنی ان قیمتی یادداشتوں کی بنا پر نسخۂ حمیدیہ کے ایک صحیح اور مطابقِ اصل متن کی ترتیب و اشاعت کا اہتمام کیا۔[2]

غالب کی وفات کے پچاس برس بعد محض بھوپال میں دستیاب ہونے کی رعایت سے یہ نسخہ بھوپال کے نواب زادہ حمید اللہ خاں سے منسوب ہو کر نسخۂ حمیدیہ کہلایا۔۔۔۔ نسخۂ حمیدیہ کی اس اولین ناقص اشاعت کے کوئی پچاس برس بعد ایک دوسرے "حمید خاں" کے ہاتھوں، جو اس نسخے کے حق میں واقعی مسیحا نفس ثابت ہوئے، اسے پہلی بار حسن و صحت کے ساتھ چھپنا نصیب ہوا۔۔۔ ۔۔۔ اس نسبت سے اس نسخے کی عرفیت اب زیادہ متعلق، حسبِ حال اور معنویت کی حامل ہو گئی ہے۔

۱۔ اس سلسلے کی معلومات کے لیے دیکھیے ڈاکٹر گیان چند کا مضمون "غالب اور بھوپال" مطبوعہ اردوئے معلی، دہلی فروری ۱۹۶۰ء، ص ۹۲-۹۴

۲۔ مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۹ء دیباچہ مرتب ۲۹ صفحات، متن ۲۹۰ صفحات، طبع دوم لاہور ۱۹۸۳ء

بیاضِ غالب بخطِ غالب:

غالب صدی کی اہم ترین دریافت، غالب کا وہ پہلا مجموعۂ کلام ہے جو خود غالب کے قلم سے لکھا ہوا، ۱۹۶۹ء میں منصۂ شہود پر آیا اور پاکستان میں "بیاضِ غالب نسخۂ لاہور" کے عنوان، رسالہ "نقوش" کے غالب نمبر کے طور پر شائع ہوا[۵] بھارت میں غالب کا یہ نادر مجموعۂ کلام "دیوانِ غالب بخطِ غالب نسخۂ عرشی زادہ" کے عنوان سے چھپا لیکن بوجوہ اس کی اشاعتِ عام کی نوبت نہیں آئی۔

"نسخۂ لاہور" نقوش (شمارہ ۱۱۳) کے غالب نمبر حصہ دوم کے ساتھ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں منظرِ عام پر آیا، گو یہ پہلے سے محمد طفیل کے پاس پہنچ چکا تھا۔ "نقوش" کا غالب نمبر حصہ اول فروری ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا "اس شمارے میں" کے تحت محمد طفیل نے اعلان کیا تھا کہ:

> "آئندہ شمارہ بھی غالب ہی سے متعلق ہوگا اور وہ شمارہ موجودہ شمارے سے مختلف ہوگا۔ موجودہ شمارے میں غالب کی شخصیت و فن پر دوسرے نامور اہلِ قلم کے مضامین ہیں، آئندہ شمارے میں صرف غالب کی تحریریں ہوں گی، کچھ کمیاب، کچھ نایاب، کچھ غیر مطبوعہ! غالب نمبر کا دوسرا حصہ بھی تقریباً مکمل ہے، وہ بھی انھی دنوں پیش ہوگا، مارچ میں نہ سہی اپریل میں سہی۔" (صفحہ ۹)

محمد طفیل "نقوش" کے غالب نمبر حصہ دوم شمارہ اکتوبر ۱۹۶۹ء کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"میں نے دوسرے حصّے کے سلسلے میں اعلان یہ کیا کہ اس میں صرف غالب کی

۵۔ اشاعت در: نقوش، لاہور، شمارہ ۱۱۳، غالب نمبر حصہ دوم، اکتوبر ۱۹۶۹ء
پیش کش: محمد طفیل، مدیر "نقوش"، متعارفہ: نثار احمد فاروقی
ضخامت متن: ۲۵۰ صفحات، سائز ۲۰ × ۳۰

کمیاب، نایاب اور غیر مطبوعہ تحریریں پیش کروں گا۔

میرے اس اعلان کو جب ایک غالب شناس نے پڑھا تو اُنھوں نے لکھا:

"غالب کی تو ایک ایک سطر چھپ چکی ہے، اس لیے اب آپ دوسرے جصے میں کیا چھاپیں گے؟"

قدرت کو میرے اعلان اور جذبے کی لاج رکھنا تھی، سو رکھی۔ وہ کام جو قریب قریب ناممکن تھا، ممکن ہو گیا، اب اگر میں یہ کہوں کہ پوری ایک صدی میں غالب پر جو کچھ چھپا ہے، اس میں یہ سب سے قیمتی دستاویز ہے، تو اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہ ہوگا، کیونکہ اس نمبر میں غالب کی اولین بیاض کو پہلی بار عکسی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے ....." (صفحہ ۴)

بلاشبہ یہ نودریافت دیوان، بیاضِ غالب، غالب صدی کا بیش قیمت خزینہ اور بے بہا گنجینہ ہے جسے بقول کسے "گنجِ شایگان" کہنا چاہیے۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ:

"میرا احساس یہ ہے کہ یہ میرزا غالب کے متعلق آخری بڑی دریافت ہے کیونکہ بظاہر یہ میرزا کے مستند اُردو کلام کا پہلا مجموعہ ہے جس کے بعد وہ فارسی کی طرف متوجہ ہو گئے اور اردو میں گنتی کی نئی غزلوں کے سوا کچھ نہ کہہ سکے۔ البتہ کہے ہوئے کلام میں جزوی ترمیمیں ضرور کرتے رہے یا ممکن ہے، انھوں نے کہیں کہیں چند شعروں کا اضافہ کر دیا ہو۔ یہی "نسخہ حمیدیہ" کی اصل و اساس بنا اسی میں تھوڑا سا اضافہ ہوا تو نسخہ شیرانی کہلایا۔ پھر خاصی لمبی مدت تک وہ اپنے آپ کو اردو کی بجائے فارسی ہی کا شاعر سمجھتے رہے، یہاں تک کہ بادشاہ (ظفر) کے دربار سے وابستگی کے بعد اُردو شعر کہے۔[1]"

پروفیسر سید وقار عظیم کی رائے یہ ہے کہ:

"نقوش کے ایک دو نہیں، سبھی شمارے ہماری سمیٹی ہوئی دولت کے

---

[1] نقوش ۱۱۴، جولائی ۱۹۷۰ء، ص ۱۴

بیش بہا جواہر ہیں اور بلا شبہ سب سے بڑی قیمت والا، غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا، اُن کا وہ دیوانِ اُردو ہے جس کے مطالعے سے فکر، تنقید اور تفتیش کے نئے ابواب کھلیں گے اور ہمارے دل سے اس مجاہد کے حق میں دعائیں نکلیں گی جس کی لگن اور دلسوزی کی بدولت یہ گوہرِ آبدار ہم تک پہنچا۔[1]"

یہ نادر نسخہ اپریل ۱۹۶۹ء کے شروع میں بھارت کے شہر بھوپال میں دریافت ہو کر امروہہ پہنچا، محمد طفیل نے پاکستان میں "نقوش" کی اشاعت اکتوبر ۱۹۶۹ء میں اُسے حسنِ طباعت کے مثالی معیار کے ساتھ شائع کیا۔ اس اشاعتِ خاص کی افتتاحی تقریبات اعلیٰ پیمانہ پر راولپنڈی (۲۹۔ نومبر ۱۹۶۹ء) اور لاہور (۶۔ دسمبر ۱۹۶۹ء) میں منائی گئیں۔ راولپنڈی کی افتتاحی تقریب میں پروفیسر سید وقار عظیم نے ان تأثرات کا اظہار کیا کہ غالب صدی پیہ:

"جب سب کچھ ہو چکا تو ایک ڈراما شروع ہوا، ۷ اپریل ۱۹۶۹ء کو (دہلی کے اخبار) "الجمعیۃ" میں اس مضمون کا ایک اشتہار چھپا کہ کسی صاحب کے پاس غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا، دیوانِ اردو کا مخطوطہ ہے جو نسخۂ حمیدیہ سے پہلے کا ہے۔ اس خبر پر کسی کو یقین نہ آیا، لیکن پھر ایک دن یکایک ہندوستان کے کئی اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ دیوانِ غالب کا وہ مخطوطہ واقعی غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ..... اور جس کسی نے اس خبر کو پاکستان میں پڑھا تو یوں محسوس کیا، گویا ع فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو!

ہماری زمینوں کا محرم پہلے کون کون رہا ہے، اس کی داستان بڑی دلچسپ بھی ہے اور طولانی بھی، لیکن آج کی بات ہمیں معلوم ہے اور وہ یہ کہ "نقوش" والے محمد طفیل ایسی کوئی راز کی بات سُن پائیں تو اپنے اوپر کھانا اور سونا حرام کر کے اس بات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور پھر ایک دن اچانک

---

[1] نقوش ۱۱۹، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، ص ۵۰۱

معلوم ہوتا ہے کہ جو راز پہلے صرف محمد طفیل کا راز تھا وہ اب ہزاروں جاننے اور پڑھنے والے کا راز ہے اور آج اس راز کے انکشاف کا دن ہے ــــ "نقوش" کے اس غالب نمبر کی داد آنے والا زمانہ دے گا اور کل جب اخبارات میں یہ خبر چھپے گی کہ نسخۂ امروہہ "نسخۂ لاہور" بن گیا ہے تو معلوم نہیں حسرت اور حیرت سے دلوں کی کیا کیفیت ہو[1]"

لاہور میں منائی گئی نودریافت نسخۂ دیوانِ غالب پر مشتمل "نقوش" کی افتتاحی تقریب میں مولانا غلام رسول مہر نے اس نسخے کی دریافت کے اعلان سے اس کی اشاعت تک کے مرحلوں پر اپنی بے پایاں لیکن استعجاب در استعجاب مسرت و نشاط کا اظہار کیا:

" جس نسخۂ نادرہ کا افتتاح ہمیں یہاں لایا ہے، اس کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں، لیکن انتہائی تعجب کا مقام ہے کہ یہ نسخہ بھی بھوپال پہنچا، جہاں اس سے پہلے یا بعد، وہ نسخہ پہنچ چکا تھا، جو اب "نسخۂ حمیدیہ" کہلاتا ہے۔ "نسخۂ حمیدیہ" ۱۹۲۱ء میں چھپ کر شائع ہو گیا، لیکن یہ نسخہ .... بدستور گوشۂ خمول میں پڑا رہا۔ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر تعجب اس امر پر ہے کہ جس شخص کے پاس یہ نسخہ موجود تھا، وہ اس کی حقیقی حیثیت اور قدر و قیمت سے کلیتاً نا آشنا رہا....

پھر تعجب کا آخری مرحلہ پیش آیا جس کے سامنے پہلے دو مرحلے بے حقیقت رہ گئے ..... جب اس نسخے کی دریافت کا اعلان ہوا تھا، اس کی اشاعت کے لیے ہماری نگاہیں ہندوستان پر جمی ہوئی تھیں انتظار میں تھے کہ دیکھیں یہ کب چھپے ؟ کہاں چھپے ؟ کون چھاپے ؟ پھر اس کی زیارت سے کیونکر شرف اندوز ہوں ؟ کیونکہ پاک و ہند کے تعلقات میں جو گرہیں پڑی ہوئی ہیں، اُن کے پیشِ نظر، ایک ملک میں کسی کتاب کا چھپ جانا ہی کافی نہیں دوسرے ملک میں رہنے والوں کے لیے اس کا حصول بھی ہفت خوانِ رستم

---

[1] نقوش ۱۱۹، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، ص ۱۰

سے کم نہیں ۔۔۔۔ حالانکہ اس مدت میں ہمارے عزیز دوست محمد طفیل صاحب مدیر "نقوش" نہایت اطمینان و دلجمعی سے بیٹھے ہوئے انتہائی اہتمام کے ساتھ اسے چھاپ رہے تھے!

۔۔۔۔ اتنی بڑی دولت اُن کے قبضے میں تھی مگر صاحب! ان کے ضبط و ہضم کی داد کے لیے الفاظ مساعدت نہیں کرتے، بھنک تک سنائی نہ دی۔ لبوں پہ مہر سکوت، دل و دماغ اور کام و زبان پر پورا قابو!

۔۔۔۔۔ ایک روز یکایک اخبار میں پڑھا کہ راولپنڈی میں اس نسخے کی طباعت پر ایک تقریب منائی گئی۔ یقین رکھیے کہ یقین نہ آیا کہ یہ وہی نسخۂ نادرہ ہوگا جس کے انتظار میں نگاہِ شوق ہمسائے ملک پر جمی ہوئی تھک کر لڑکھڑانے لگی تھی۔ تاہم، آج وہ سب کچھ اسی طرح ہمارے سامنے حقیقتِ ثابتہ کی صورت میں پیش ہے، جس طرح اپنے متعلق میرزا غالب کے پیشگویانہ تصورات و تاثرات، حقیقتِ ثابتہ بن چکے ہیں۔"

(نقوش ۱۱۴، جولائی ۱۹۷۰ء، ص ۱۳-۱۴)

"نقوش" میں غالب کی اس تازہ دریافتِ بیاض کے بارے میں نثار احمد فاروقی کا، ایک مضمون بھی شامل ہے جن کا نام ہندوستان کے غالب شناسوں میں، اس بیاض کی زیارت کرنے والوں میں سرِ اول ہے۔ "نقوش" کے اس نمبر میں فاروقی صاحب کا یہ مضمون جیسا کہ انھوں نے اس مضمون میں بیان کیا ہے اپنی کتاب "تلاشِ غالب" کے لیے لکھا تھا جو اپریل ۱۹۶۹ء میں لاہور میں زیرِ طبع تھی۔ "تلاشِ غالب" ادارہ "کتابیات" لاہور کے سلسلۂ مطبوعات نمبر ۱۹ کے تحت مئی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے "پیش لفظ بہر سخن" میں نودریافت بیاض سے متعلق، اپنے اس مضمون کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"اس مجموعے کا سب سے زیادہ قیمتی بلکہ، کہنا چاہیے کہ حاصلِ کتاب مضمون (یہی) ہے۔ یہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے سب سے پہلے آنا چاہیے مگر ترتیب میں آخری یوں ہو گیا ہے کہ دیوانِ غالب کا یہ نسخہ اپریل ۔۔۔۔ میں دریافت ہوا اور

ٹھیک پندرہ دن کے اندر اندر میں نے یہ مضمون لکھ کر کتاب کی طباعت کے دوران، اس مجموعے میں شامل کیا ہے .... جبکہ زیرِ نظر کتاب، تقریباً کل چھپ چکی تھی ۔ مَیں نے اس نسخے کا تعارف اتنی قلیل مدت میں سب سے پہلے اسی کتاب کے ذریعے پیش کیا ہے ۔ غالب کے جو متفرق غیر مطبوعہ اشعار (اس) نسخے میں ہیں، ان کا تو احاطہ نہیں کیا جا سکا ہے، لیکن اس کی غزلیں جو نسخۂ حمیدیہ سے خارج کر دی گئی تھیں، یہاں پیش کی جا رہی ہیں:"

(تلاشِ غالب، پیش لفظ، صفحہ ح/ط)

"نقوش" میں بیاضِ غالب سے متعلق فاروقی صاحب کے مضمون کا متن اسی کتاب کے مطابق ہے ۔

عجلت کے باعث اس مضمون میں نثار احمد فاروقی سے جو جزوی فروگذاشتیں ہوئیں اُن سے قطعِ نظر، اس مضمون کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ اس کی تسوید کے وقت تک انہیں، اس نسخۂ نادرہ سے استفادے کا پورا موقع نہیں ملا تھا، ورنہ غالبیات پر فاروقی صاحب کی جیسی نظر ہے اُس کے پیشِ نظر، اُن کے اس مضمون میں ایسی بعض صریح واقعاتی غلطیاں نہ رہ جاتیں، جن کی صحت بعد میں انہیں "نقوش" (شمارہ ۱۱۴، جولائی ۱۹۷۰ء) کے ذریعے بیاضِ غالب کا باطمینان اور بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد[1] کرانی پڑی ۔

نثار احمد فاروقی نے، اس خود دریافت دیوان کے ذریعے پہلی بار منظرِ عام پر آنے والے کلام کی نشاندہی کرتے ہوئے انیس غزلوں اور تیرہ رباعیوں (بارہ اُردو، ایک فارسی) کو "غیر مطبوعہ" قرار دیا ہے ۔ حالانکہ بیاض میں ایسی غزلوں کی صحیح تعداد پچیس ہے ۔ اس نسخے میں جو متفرق اشعار غیر مطبوعہ ہیں، اُن کا فاروقی صاحب سرے سے احاطہ ہی نہیں کر پائے جبکہ ایسے مفرد اشعار ایک دو نہیں، بیس پچیس ہیں ۔ ایک دو اشعار کی حد تک صرفِ نظر ہو جاتا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن فاروقی صاحب ایسے غالب شناس کی نظر سے بنیتیس

---

[1] نقوش، بیاضِ غالب نمبر، ص ۲۰

اشعار پر مشتمل پوری چھ غزلوں اور اس پر مستزاد چھبیس مفرد اشعار کا رہ جانا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ دیوانِ غالب کا یہ نسخۂ نادرہ بہت کم وقت کے لیے انہیں میسر آیا ہو۔
معلوم ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب نے ایک نظر میں، بعجلت کچھ نوٹس تو لے لیے لیکن اپنی ان یادداشتوں کی بنا پر جب ان سے کچھ نتائج اخذ کیے تو وہ ان مطالعاتی نتائج کا مقابلہ اور موازنہ کرنے کے لیے اصل بیاض پر دوسری نظر ڈالنے کی پوزیشن میں نہ رہے لیکن "نقوش" بیاضِ غالب نمبر" کے ذریعے جب یہ دیوان شائع ہو کر سامنے آیا اور فاروقی صاحب کو اس کے تفصیلی مطالعے کا موقع ملا تو انھیں اپنے مضمون میں راہ پا جانے والی غلطیوں کا احساس ہوا۔ چنانچہ "نقوش" کے شمارہ ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) میں ضمیمۂ غالب نمبر کے تحت فاروقی صاحب نے اپنے سقیم بیانات کی صحت کرتے ہوئے اپنے مضمون کے بارے میں لکھا کہ:

> "مضمون کی تسوید بہت مختصر مدت میں ہوئی اور بوجوہ اس پر نظرِ ثانی نہ ہو سکی اس لیے بعض غلطیاں رہ گئیں جن کی تصحیح یا وضاحت ضروری ہے (صفحہ ۱۹) مضمون میں لکھا گیا ہے کہ (اس نسخے) کے ذریعے ۱۹ غیر مطبوعہ غزلیں اور ۱۳ رباعیاں پہلی بار سامنے آئی ہیں۔ یہ تعداد درست نہیں ہے۔ افسوس میری عجلت کے باعث یہ غلطی رہ گئی، (دراصل اس نسخے) میں ۲۵ غزلیں اور ۱۴ رباعیاں، غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کے علاوہ ۲۲ مفرد اشعار ہیں۔ یہ سب کلام "نقوش" کے "بیاضِ غالب نمبر" میں شامل ہے۔ ان میں سے صرف چند غزلوں کی اور ایک رباعی کی نشاندہی نہ ہو سکی تھی۔ یہ چھ غزلیں، ۲۲ مفرد اشعار اور ایک رباعی یہاں دوبارہ پیش کی جا رہی ہے تاکہ جن حضرات کے پاس بیاضِ غالب نمبر محفوظ ہے، وہ اس وضاحت کی روشنی میں میرے سابقہ

لہ پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی نے بھی دعوے کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ چیز ہماری نظر میں واضح ہے کہ "انیس غزلیں اس نسخے میں زائد ہیں۔" مقدمہ گلِ رعنا، مرتبہ عابدی، لاہور ۱۹۶۹ء ص ۳۰) لیکن ظاہر ہے کہ عابدی صاحب کا یہ بیان درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نسخے میں زائد غزلوں کی صحیح تعداد چھبیس ہے۔

بیان کی صحت کر لیں"۔ (نقوش ۱۱۴، جولائی ۱۹۷۰ء، ص ۲۰)

جن ۲۲ مفرد اشعار کو فاروقی صاحب نے غیر مطبوعہ بتایا ہے، ان میں ایک شعر یہ بھی درج ہے:

ذوق سرشار سے بے پروا ہے طوفاں میرا
موج خمیازہ ہے ہر زخم نمایاں میرا

(نقوش، جولائی ۱۹۷۰ء، صفحہ ۲۱)

یہ شعر نقوش، بیاض غالب کی اُنتالیسویں غزل کا دوسرا شعر ہے (ص ۸۹، ۹۰) اور غیر مطبوعہ نہیں ہے۔ یہ دیوان غالب اُردو نسخۂ عرشی (۱۹۵۸ء) کے صفحہ ۲۱، دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ (پروفیسر حمید احمد خاں، ۱۹۶۹ء) کے صفحہ ۱۸ اور نسخۂ شیرانی کے ورق ۲۱ الف پر موجود ہے۔ اسی طرح فاروقی صاحب نے اس شعر کو بھی غیر مطبوعہ قرار دیا ہے:

کرتا ہے گل، جنونِ تماشا کہیں جسے
گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

(نقوش، جولائی ۱۹۷۰ء، ص ۲۴)

اس شعر کا صرف مصرع اولیٰ نیا ہے، ورنہ یہ نسخۂ عرشی، نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی یہاں تک کہ غالب کے مروج و متداول دیوان تک میں بصورت ذیل موجود ہے:

حسرت نے لا رکھا تری بزم خیال میں
گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

(ع: ۲۱۸، ح: ۲۷۴، ش: ۱۰۶ الف)

میرے مطالعے کے مطابق، غالب کے اس زیر بحث نو دریافت بیاضِ غالب میں غیر مطبوعہ کلام کی صحیح کیفیت یہ ہے:

(الف) پچیس اُردو غزلیں، تعداد اشعار:	۱۴۲
(ب) رباعیاتِ اُردو:	۲
(ج) رباعیاتِ فارسی:	۱۲
(د) متفرق مفرد اشعار (اُردو):	۲۵

(ک) مصرعے (سات اُردو، ایک فارسی) :

غزلیں، اور رباعیات (اُردو، فارسی) وہی ہیں، نثار احمد فاروقی صاحب جن کی دو قسطوں میں نشاندہی کر چکے ہیں۔ ۲۲ میں سے دو مزید اشعار کے بارے میں جنہیں فاروقی صاحب نے غیر مطبوعہ بتایا ہے، وہ نئے نہیں ہیں، مطبوعہ ہیں۔ یہاں زیرِ بحث بیاض سے تین ایسے شعر درج کیے جاتے ہیں جو پہلی بار اس بیاض کے ذریعے سامنے آئے ہیں لیکن فاروقی صاحب جن کی نشاندہی نہیں کر سکے :

(۱)

نہیں ہے حوصلۂ یا مردِ کثرتِ تکلیف جنونِ ساختہ، حرزِ فسونِ دانائی

(غزل نمبر ۱۹۲، شعر نمبر ۴، نقوش، بیاضِ غالب صفحہ ۲۳۴ - ۲۳۵)

(۲)

پوچھے ہے کیا معاشِ جگر تفتگانِ خاک جوں شمع آپ اپنی وہ خوراک ہو گئے

(۱۹۳ : ۵، ص ۲۳۴ - ۲۳۵ (حاشیہ))

(۳)

نقش، رنگینیِ سعیِ قلمِ مانی ہے بہ کمر، دامنِ صد رنگ گلستاں زدہ ہے

(۲۰۲ : ۳، ص ۲۲۴ - ۲۲۵)

زیرِ بحث بیاض میں دو شعر مزید ایسے ہیں جنہیں میں بمنزلۂ "نو دریافت" خیال کرتا ہوں، گو یہ نسخۂ حمیدیہ میں بہ تبدیلِ الفاظ موجود ہیں۔ حمیدیہ میں ان کا نظرِ ثانی شدہ متن شامل ہے۔ اصلاح کے بعد یہ اتنا بدل گئے ہیں کہ ان کی اولین شعری روایت، جو اب سامنے آئی ہے، نئے شعر کا لطف دیتی ہے :

نسخۂ حمیدیہ	بیاضِ غالب
صدف کی ہے ترے نقشِ قدم میں کیفیت	اسد یہ گوشۂ چشمِ عنایت اے آقا
سرشکِ چشمِ اسد کیوں نہ اس میں گوہر ہو	کہ یہ سرشکِ ز چشم افتادہ گوہر ہو
(نسخۂ حمیدیہ، ۱۶۶)	(۱۷۰ : ۵، ص ۱۸۲ - ۱۸۳)

جنونِ عیش ہے یارب سرو سامانِ آزادی
کروں یک گوشۂ دامن تر، گرآب ہفت دریا ہو
(۳۴ : ۹، ص ۱۸۲-۱۸۳)

بہ قدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوقِ[۱] معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آب ہفت دریا ہو
(نسخۂ حمیدیہ، ص ۱۹۸)

ابتداً عرض کیا جا چکا، کہ اس بیاض کی شعری روایت متداول دیوان کی شعری روایت سے مختلف ہے۔ یہ فرق اور اختلاف، اصلاحاتِ غالب کا نتیجہ ہیں۔ ان اصلاحات کے نتیجے میں جہاں تہاں شعر اور مصرعے معنوی یا لفظی ترقی پا کر اتنا بدل گئے ہیں کہ شعر یا مصرعے کی پہلی اور دوسری متبدلہ قراءت، تازہ شعر یا مصرعے کا لطف بہم پہنچاتی ہے۔ یہاں اس طرح کے آٹھ "نئے" مصرعے (سات اُردو/ ایک فارسی) پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی، بلا استثنیٰ، ان اشعار کے مصرعۂ اولیٰ میں ہوئی ہے جو بجائے خود ایک حد اگانہ قابلِ غور پہلو ہے۔

بیاضِ غالب	دیگر مآخذ
(۱)	(۱)
"غنچہ کا دل خوں ہوا لیکن زباں پیدا نہ کی"	ہم نے سوزِ زخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی
گل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہانِ داد	گل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہانِ داد
(۹۲ : ۲، ص ۱۱۲-۱۱۳)	(نسخۂ حمیدیہ، ص ۹۷)
(۲)	(۲)
نورِ خوباں سے یدِ بیضا ہے آج	نورِ حیدر سے ہے اس کی روشنی[۲]
ورنہ تھا خورشید یک دستِ سوال	ورنہ ہے خورشید یک دستِ سوال
(۹۳ : ۵، ص ۱۲۲-۱۲۳)	(نسخۂ حمیدیہ، ص ۱۳۳، نسخۂ شیرانی، ص ۳۹ ب)

---

[۱] پروفیسر حمید احمد خاں لکھتے ہیں کہ "عیش" کو کاٹ کر "ذوق" لکھا ہے (حاشیہ نسخۂ حمیدیہ، ص ۱۹۸)۔ یہ شعر نسخۂ شیرانی میں شامل ہے، شیرانی کے متن میں "عیش" بجائے "ذوق" درج ہے (نسخۂ شیرانی، ص ۵۷ الف)

[۲] پروفیسر حمید احمد خاں لکھتے ہیں کہ "یہ مصرع یوں بدلا ہے: (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(۳)

"حسرت اے آغاز و انجام سیہ شام شباب"
ماہ کی مانند کاہش روز افزوں ہے مجھے
(۱۳۶ : ۴، ص ۲۱۰-۲۱۱، ۲۱۲-۲۱۳) ۔

(۳)

دیکھ لی جوشِ جوانی کی ترقی بھی کہ اب
بدر کی مانند کاہش روز افزوں ہے مجھے
(نسخۂ حمیدیہ، ص ۲۲۰، نسخۂ شیرانی، ص ۸۳ ب)

(۴)

"اسد کو کیوں نہ ہو امیدِ لطف بندہ نوازی"
علی ولی اسد اللہ جانشینِ نبی ہے
(۱۸۱ : ۵، ص ۲۲۴-۲۲۵)

(۴)

امام ظاہر و باطن، امیر صورت و معنی
علی ولی اسد اللہ جانشینِ نبی ہے
(نسخۂ حمیدیہ، ص ۱۹۰، نسخۂ شیرانی، ص ۶۹ ب)

(۵)

"کرتا ہے گل، جنونِ تماشا کہیں جسے"
گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے
(۲۰۷ : ۱، ص ۲۴۸-۲۴۹)

(۵)

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے
(نسخۂ حمیدیہ، ص ۲۴۲، شیرانی، ۱۰۶ الف)

(۶)

"طراوت جوشی طوفانِ آب و گل سے ممکن ہے"
کہ ہر یک گردبادِ گلستاں گرداب ہو جاوے
(۲۱۷ : ۴، ص ۲۵۶، ۲۵۹)

(۶)

زبس طوفانِ آب و گل ہے غافل کیا تعجب ہے
کہ ہر یک گردبادِ گلستاں گرداب ہو جاوے
(نسخۂ حمیدیہ، ص ۲۴۴، شیرانی، ۸۹ ب)

(۷)

"در طلسم عاجزی اے اضطراب آرام کر
پر فشانی ہا فریبِ خاطرِ آسودہ ہے

(۷)

دام گاہِ عجز میں سامانِ آسائش کہاں؟
پر فشانی بھی فریبِ خاطرِ آسودہ ہے

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ) ... نور سے تیرے ہے اس کی روشنی" اس اصلاح کا عالم یہ ہے کہ یہ بجنسہ غالب کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔" (حاشیہ نسخۂ حمیدیہ، ص ۳۳۳) نسخۂ شیرانی کے متن میں حمیدیہ کی اصلاحی شکل درج ہے یعنی "نور سے تیرے ہے اس کی روشنی"۔ نسخۂ عرشی میں بھی مصرعے کی یہی صورت ضبط میں آئی ہے (ص ۵۱)۔

(۲۲۷ : ۲ ، ص ۲۷۲ — ۲۷۳)	(نسخۂ حمیدیہ، ص ۲۳۹؛ شیرانی، ۲، الف)
(۸)	(۸)
"شاہیم وجنون ماز تمکین دلتنگ"	شاہیم زبانہ افسر داغ اورنگ
داریم بہ بحر و بر زوحشت آہنگ	داریم بہ بحر و بر زوحشت آہنگ
مرجان رویم زادۂ پشت نہنگ۔	مرجان دو رویم زادۂ پشت نہنگ
برکوہ زنیم سکّہ از داغ پلنگ	برکوہ زنیم سکہ از داغ پلنگ
(فارسی رباعی نمبر ۱۱، ص ۷۹۲-۷۹۳)	(دیوان غالب فارسی، طبع اول، ص ۴۹۱)

محمد طفیل نے بتایا ہے کہ مروجہ دیوان اور :

"اس بیاض میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہی فرق اس بیاض کی فضیلت ہے اور اس پر طرہ یہ کہ (بہت سا غیر مطبوعہ کلام الگ!) ۔"

(نقوش بیاض غالب، اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۴)

بلا شبہ، بیاض کی فضیلت اس میں بھی ہے کہ اس کی روایت، غالب کے مروّجہ دیوان کی شعری روایت سے مختلف ہے۔ اس کے تقابلی مطالعے سے غالب کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور کہ یہ روایت دستیاب متون میں قدیم ترین بھی ہے اس لیے اس سے کلام غالب کی تاریخی حدبندی، اب زیادہ متعین بنیادوں پر ممکن ہو گئی ہے --- اور سب پر مستزاد "بہت سا غیر مطبوعہ کلام" جو دلدادگانِ غالب کے لیے نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے -- اس غیر معروف روایت کو پڑھ لینا محالات میں سے نہ سہی، لیکن یہ کچھ ایسا آسان بھی نہیں تھا. محمد طفیل نے صفحہ بہ صفحہ بخطِ غالب متن کو نستعلیق قرأت میں پیش کرنے کا اہتمام کر کے، اس سے استفادے کے دائرے کو عام اور اہلِ علم کے لیے آسان بنا دیا ہے۔ ان کی اس سعی بلند اور اکتشافی اور اہتمامی اشاعت پر بے اختیار دل سے آفرین نکلتی ہے۔

بیاضِ غالب سے متعلق اپنے مضمون میں نثار احمد فاروقی نے ضمناً ایک بہت دلچسپ لیکن بے بنیاد مقدمہ قائم کیا ہے، اس کا ذکر لطف سے خالی نہ ہوگا۔ لکھتے ہیں کہ

بیاضِ غالب کے متن سے :

" نسخۂ حمیدیہ کے متن کا مقابلہ کیا جائے تو بہت دلچسپ غلطیاں بر آمد ہوں گی جو اس لیے شائع ہو گئیں کہ نسخۂ حمیدیہ (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) کا متن "محرفِ آخر" ہو کر رہ گیا تھا - ایک مثال "عمدۂ منتخبہ" سے بھی پیش کرتا ہوں -

یہ مطلع سرور نے درج کیا ہے :

جگر سے ٹوٹتے ہوئے مو کی ہے سناں پیدا

دہانِ زخم سے آخر ہوئی زباں پیدا

تذکرۂ سرور کے قلمی نسخہ لندن کا عکس (مملوکہ جناب مالک رام) میری نظر سے گزرا ہے - اب یاد نہیں کہ اس میں مطلع کے یہی الفاظ ہیں یا ان سے کچھ مختلف ہیں ، مگر دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے جو تذکرۂ سرور کا متن مسخ کیا ہے ، وہ پیشِ نظر ہے - اس میں مطلع اسی طرح ہے - جناب مالک رام نے اپنے مرتبہ دیوان میں اور مولانا عرشی نے نسخۂ عرشی کے حصہ "یادگارِ نالہ" میں اسی طرح درج کیا ہے[1] اور مذکورہ بالا مصادر سے جہاں بھی نقل ہوا ہے اس کی یہی صورت ہے[2] - میں نے مطبوعہ تذکرۂ سرور کے نسخے پر غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ، اس کی قیاسی تصحیح یوں کی تھی :

" جگر سے ٹوٹی ہوئی ہو گئی سناں پیدا "

اب یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ نسخۂ امروہہ کا متن میرے قیاس کی پوری تائید

---

[1] " اسی طرح درج کیا ہے " کہنا درست نہیں - مالک رام (ص ۲۲۴) اور نسخۂ عرشی (ص ۲۹۳) میں " زخم سے " کے بجائے " زخم میں " درج ہے -

[2] " جہاں بھی نقل ہوا ہے ، اس کی یہی صورت ہے " یہ بات بھی ٹھیک نہیں - رسالہ معیار جلد ۱ ، نمبر ۳ ، ص ۱۴۳ اور علی گڑھ میگزین ، غالب نمبر ۶۹ - ۱۹۶۸ء ، ص ۱۰۴ میں تذکرۂ سرور کے حوالے سے یہ شعر شائع ہو چکے ہیں اور دونوں جگہ فاروقی صاحب کی روایت " زخم سے " کے برعکس " زخم میں " چھپا ہے -

کر رہا ہے ۔"   (نقوش، بیاضِ غالب نمبر، اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۵)

لیکن نثار احمد فاروقی کی یہ ساری ادّعائی کمائی اور منطق ان معنوں میں بے بنیاد اور مضحک ہے کہ دہلی یونیورسٹی شعبۂ اُردو کی جانب سے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے مقدمے کے ساتھ تذکرۂ سرور کا جو متن شائع ہوا ہے وہ میرے پیشِ نظر ہے (اشاعتِ اول مارچ ۱۹۶۱ء) اس کے صفحہ ۱۱۷ پر یہ شعر حرف بحرف صحیح شکل میں درج ہے یعنی :

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہو گئی سناں پیدا
دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

اور نو دریافت دیوانِ غالب (= بیاض) کے ذریعے بھی، اس شعر کی یہی قرأت سامنے آئی ہے۔ اس صورت میں "قیاسی تصحیح" کی کیا گنجائش رہ گئی تھی، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے!

بیاض کے بارے میں محمد طفیل کا یہ کہنا بجا ہے کہ "پوری ایک صدی میں غالب پر جو کچھ چھپا ہے، اس میں یہ سب سے قیمتی دستاویز ہے، یہ صرف اسی لئے "متبرک" یا اہم نہیں ہے کہ یہ ایک عظیم شاعر کی خود نوشت بیاض ہے 'جو ہمارے تہذیبی ورثے کا امین اور" ہند اسلامی تمدن کا آخری ترجمان" تھا بلکہ اس سے ہٹ کر اور بڑھ کر اس بیاض سے غالب کے فنی شعور، ان کے ذوقِ سخن اور ان کی عظمتِ شاعرانہ کے فہم و ادراک میں بڑی مدد ملتی ہے۔" ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ :

> " اس بیاض کی اہمیت محض تاریخی نہیں ہے ۔ یعنی وہ صرف، اس وجہ سے اہم نہیں کہ غالب کے ہاتھ کا ایک قدیم مخطوطہ ہے بلکہ اس کی دریافت سے غالب کے مرتبۂ شعری اور ادّعاتِ فن کے ثبوت میں بعض تازہ دلیلیں اور نئی تاویلیں بھی ہاتھ آتی ہیں۔" (نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، ص ۳۹۶)

ف تذکرۂ سرور (مطبوعہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی) کے مرتبین ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور رشید حسن خاں نے ذیلی حاشیے میں بمقابلہ نسخۂ عرشی، صاف اور صحیح اس مصرعے کا اختلافِ نسخ تک دے رکھا ہے۔

اس مخطوطے کی کتابت کی تاریخ، دن اور وقت کی تفصیل ترقیمے میں موجود ہے، لیکن سالِ کتابت یعنی سنہ ہجری کے اعداد کسی وجہ سے درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔ اس کمی نے محققین کے لیے موشگافیوں کے دروازے کھول دیے ہیں۔ نسخے کے ترقیمے کی عبارت یہ ہے:

تمت تمام شد

"بتاریخ چہاردہم رجب المرجب یوم سہ شنبہ سنہ ہجری وقت دوپہر روز باقی ماندہ فقیر بیدل اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد عفی اللہ عنہ از تحریر دیوان حسرت عنوان خود فراغت یافتہ بہ فکر کاوش مضامینِ دیگر رجوع بجناب روح میرزا علیہ الرحمہ آورد۔"

(بیاض نقوش، ص ۲۹۶-۲۹۷)

سنہ ہجری کے اعداد درج نہ ہونے کی بنا پر نثار احمد فاروقی نے دوسرے ذرائع سے ۱۲۳۱ ہجری مطابق ۱۸۱۶ء کا تعین کیا ہے لیکن اس کی قطعیت کے بارے میں وہ زیادہ پُر اعتماد نظر نہیں آتے:

"اس سنہ (۱۲۳۱ھ) کو تسلیم کر لینے میں کوئی تناقص یا تضاد نہیں ہے۔ اگر ۱۲۳۱ھ والے حساب کو ازراہِ احتیاط نہ بھی مانا جائے (اور بظاہر ہمیں کوئی مانع نظر نہیں آتا) تو اتنا بالکل بدیہی ہے کہ غالب کا یہ دیوان صفر ۱۲۳۵ھ سے پہلے لکھا گیا ہے اور اس کی کتابت کا زمانہ ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء سے ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء کے مابین کوئی سال ہو سکتا ہے۔"

(نقوش، بیاضِ غالب، ص ۱۶)

مولانا امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں کہ "ہم باطمینان یہ کہہ سکتے ہیں کہ نسخۂ مذکور میرزا صاحب نے منگل ۱۴ رجب ۱۲۳۱ ہجری کو تمام کیا ہو، جو ۱۱ جون ۱۸۱۶ء کے مطابق ہے[1]۔" اکبر علی خاں عرشی زادہ نے بھی بالیقین اسی تاریخ کا تعین کیا ہے[2] مولانا غلام رسول مہر

---

[1] ماہنامہ آجکل، دہلی جولائی، ۱۹۶۹ء، ص ۹

[2] مقدمہ دیوانِ غالب بخطِ غالب، نسخۂ عرشی زادہ، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۱۵

نے "چھان بین میں کچھ وقت صرف کرکے" جو رائے قائم کی، وہ یہ ہے:

"زیرِ غور نسخۂ نادرہ کی تکمیل تحریر ۱۴ رجب ۱۲۳۶ ہجری کو بروز شنبہ ہوئی یعنی ۱۷ اپریل ۱۸۲۱ء کو۔ جب تک کوئی دوسرا مستند ثبوت بروئے کار نہ آئے میرے نزدیک یہی تاریخ صحیح ہے۔"

(نقوش ۱۱۴، جولائی ۱۹۷۰ء، ص ۱۵)

غرض یہ کہ سالِ کتابت کے تعیّن کا باب ابھی بند نہیں ہوا، "اور یہ بحث و اختلاف اُردو کی ادبی تاریخ میں اچھے علمی اضافوں کا سبب بنے گا۔"

سلسلۂ غالب کے اس "گنجِ شائیگان" پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے او ابھی اس کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا جائے گا۔

اِس نسخے کے کتابیاتی کوائف یہ ہیں:

۱۔ طلوع (اداریہ) از: محمد طفیل	صفحہ	۲
۲۔ اس شمارے میں (تعارف) از: محمد طفیل		۴
۳۔ بیاضِ غالب (مضمون) از: نثار احمد فاروقی		۹-۴۸
۴۔ بیاضِ غالب (عکس و متن)		۴۹-۲۹۸
۵۔ تقریظات		۲۹۹-۳۱۲

محمد طفیل لکھتے ہیں کہ:

"غالب کی یہ نادر و بے بہا بیاض اپنے محدود وسائل اور بعض مجبوریوں کے باوجود کم سے کم وقت میں ممکن حد تک بہتر اور خوبصورت انداز میں چھاپ کر ہم نے واقعی فخر کا احساس کیا ہے.... غالب کے دیوان کو جو مقبولیت اور شہرت حاصل رہی ہے، اس کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ اس دیوان سے زیادہ مقبول و معروف اور اہم کتاب کی دریافت آئندہ بھی متوقع نہیں ہے.... "نقوش" نے جو نسخہ دریافت کیا ہے وہ (غالب کا) سب سے قدیم اور سب (معلومہ نسخوں) کی اساس ہے۔ گویا اب ہم

مرزا غالب کی شاعری کے منابع اور اس کے اوّلین نقوش کی بازیافت کے قابل ہو گئے ہیں۔ دوسرے تمام قلمی نسخے (ایک استثنیٰ، نسخۂ گل رعنا کے علاوہ) کاتبوں کے قلم سے لکھے گئے ہیں، اگرچہ بعض کی تصحیح یا حاشیوں پر اضافے مرزا کے قلم سے ہوئے ہیں، لیکن یہ نسخہ تمام تر غالب ہی کے قلم سے لکھا ہوا ہے..... ایسے بڑے شاعر کی ایک عظیم تصنیف کا اتنا اہم مخطوطہ، ایک ایسے اہم سال میں، اتنے ڈرامائی انداز سے دریافت ہو جانا اور چھپ جانا، کیا کوئی معمولی ادبی سانحہ ہے؟ پھر ہم اس پر فخر کرنے میں کیا حق بجانب نہیں ہیں؟"

(نقوش ۱۱۳، جولائی ۱۹۷۰ء، ص ۹)

"___ چونکہ یہ بیاض سب سے پہلے لاہور میں چھپی ہے، اس لیے میری خواہش ہے کہ اسے نسخۂ لاہور کے نام سے یاد کیا جائے۔" (ایضاً، ص ۴)

یہ کیسا عجیب اور نادر حسنِ اتفاق ہے کہ یہ نسخہ لکھے جانے کے ڈیڑھ سو برس سے بھی زیادہ تک گوشۂ جہول میں محفوظ رہنے کے بعد بھوپال میں نمودار ہوا، وہاں سے امروہہ کو منتقل ہوا لیکن اسے پہلی بار ہر خاص و عام کے سامنے پیش کرنے کی سعادت اور توفیق ارضِ لاہور کے حصے میں آئی، اس لیے محمد طفیل صاحب کی یہ خواہش سمجھ میں آتی ہے کہ اسے نسخۂ لاہور کے نام سے یاد کیا جائے[1]۔

---

[1] کہاں کا نسخۂ بھوپال اور کہاں کا نسخۂ امروہہ؛ "یہ مخطوطہ ۱۹۶۹ء میں ظاہر ہوا اور ۱۹۷۰ء میں پھر زیرِ زمین چلا گیا۔ (امروہے کے توفیق احمد قادری نے جو پرانی اشیاء اور قلمی کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں اور کتابوں کی کھوج میں بھوپال پہنچے تھے اور وہاں زیرِ بحث نادرۂ روزگار مخطوطہ ان کے ہاتھ آیا تھا) بھوپال کی عدالت میں بیان دیا کہ مجھ سے یہ مخطوطہ ..... صاحب نے لیا تھا لیکن اب مانگتا ہوں تو وہ انکار کرتے ہیں۔ توفیق نے مجھے بھی کئی خطوط میں یہ بات لکھی ہے۔ واللہ اعلم کیا حقیقت ہے۔ یہ یقینی ہے کہ عدالت میں انکار کی بدولت یہ مخطوطہ جس کے پاس بھی ہے وہ اسے کبھی منظرِ عام پر نہ لائے گا: ؎

خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود!" (ڈاکٹر گیان چند، نقوش، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، ص ۳۸)

"بیاضِ غالب" (نسخۂ لاہور) کی معنوی قدر و قیمت اپنی جگہ مُسلّم لیکن یہ طباعت و تزئین کے اعتبار سے بھی بے مثل ہے اور دربارۂ خاص، یہ خود محمد طفیل کے اپنے سابقہ معیارات و کمالات پر سبقت لے گیا ہے۔

دیوانِ غالب بخطِ غالب، نسخۂ عرشی زادہ

"دیوانِ غالب بخطِ غالب، نسخۂ عرشی زادہ[1]"، غالب کا وہ پہلا مجموعۂ کلام ہے جو انھوں نے ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) میں اپنی ابتدائی بیاض سے بہ ترتیب ردیف خود مرتب اور نقل کیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر انیس برس کی تھی "نسخۂ عرشی زادہ میں مخطوطے سے متعلق تحقیقی نوعیت کے مباحث شامل کیے گئے ہیں جن سے مخطوطے کے کوائف کا علم اور قدر و قیمت کا تعین" ہوتا ہے۔ اس کے بعد متن ہے، جس کو پیش کرنے کا سب سے بہتر انداز عکس ہی کی صورت میں شائع کرنا تھا"۔ عکسِ متن کے بعد ضروری حواشی درج کیے گئے ہیں۔

مندرجات کی ترتیب یہ ہے:

"تعارف"	:	پروفیسر آلِ احمد سرور	ص ۹، ۱۰
"مقدمہ"	:	اکبر علی خاں عرشی زادہ	۱۲ - ۳۱

---

[1] ترتیب، مقدمہ، حواشی : اکبر علی خاں عرشی زادہ
اہتمام اشاعت : ادارہ یادگارِ غالب، رامپور، یو پی (بھارت)
طابع : پربھات آفسٹ پریس، دریا گنج، دہلی
نقشِ اول : ستمبر ۱۹۶۹ء
تعداد اشاعت : ایک سو، قیمت فی جلد: تین سو روپے
ضخامت : ۴۰ + ۱۳۶ صفحات، سائز: ۹×۱۱ انچ
کتابت : بشیر احمد محمود آبادی
جلد سازی : انصاری بک بائنڈنگ ہاؤس، فراشخانہ، دہلی
تقسیم کار : کتاب کار پبلی کیشنز، رام پور، یو پی (بھارت)

"بادآورد" (نو دریافت کلام) : ۳۲ - ۳۰

عکس مخطوطہ : ۲ - ۱۲۶

"حواشی" : اکبر علی خاں عرشی زادہ ۱۲۷ - ۱۳۶

زیرِ نظر اشاعت میں ترتیب کے خیال اور مخطوطے کے زمانۂ ترتیب و نقل کی رعایت سے متن کے ہر صفحے پر ۱۲۳۱ھ کی تیار شدہ غالب کی دو مہروں کے عکس شائع کیے گئے ہیں اصل مخطوطے میں کہیں کوئی مہر نہیں پائی جاتی۔ ہر صفحے پر "دیوانِ غالب بخطِ غالب نسخۂ عرشی زادہ" کی عبارت مختلف، اصل تحریروں سے عکس کرا کے مرتب کی گئی ہے اور غالب کے اندازِ خط کی آئینہ دار ہے۔ حسنِ اتفاق سے غالب کے قلم سے لکھا ہوا : "اکبر علی خاں" بھی مل گیا، چنانچہ سرورق پر یہ بھی غالب کے خط ہی کا عکس ہے اور اسی طرح صفحہ ۱۱ پر لفظ "مقدمہ" بھی! "نسخۂ عرشی زادہ" کے صفحۂ اوّل پر انتباہی مزاج کی یہ عبارت درج ہے:

"زیرِ نظر نسخے کے نو دریافت اشعار، اختلافِ روایت اور ترتیبِ کلام کو کسی بھی شکل میں کوئی صاحب استعمال اور شائع کرنے کے مجاز نہ ہوں گے۔ جملہ حقوقِ ترتیب و طبع و نشر و اشاعت بحقِ اکبر علی خاں عرشی زادہ کلی اور دائمی طور پر محفوظ ہیں۔"

اس نسخے کے مرتب اکبر علی خاں عرشی زادہ نے جو اس نسخے کے ناشر بھی ہیں "مقدمہ" کے ابتدائیے کے طور پر لکھا ہے کہ:

"مجھے یقین ہے کہ اس حسین تحفے کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور اردو کی مقبول ترین کتاب کی یہ نادر اشاعت، جسے مصنف کے خط کا عکس ہونے کا شرف و امتیاز بھی حاصل ہے، ہر خوش ذوق فرد اور ہر علم دوست ادارے کے ذخیرۂ کتب کی زینت بڑھائے گی۔" (مقدمہ (ابتدائیہ) : ص ۱۳)

لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اردو کی اس "مقبول ترین کتاب" کا یہ ایڈیشن، عرشی زادہ نے صرف ایک سو کی تعداد میں چھپوایا ہے اور قیمت فی جلد تین سو روپے رکھی ہے۔ ان معنوں میں یہ "نادر اشاعت" "ہر خوش ذوق فرد اور ہر علم دوست ادارے کے ذخیرۂ کتب

کی زینت" کیوں کر" بڑھائے گی؟[۱] جس کے" جملہ حقوق" کلّی اور دائمی طور پر" انھوں نے اپنے نام محفوظ بتائے ہیں!

نسخۂ عرشی زادہ کے تعارف میں پروفیسر آلِ احمد سرور نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ:

" غالب کے اس نقشِ اول کے منظرِ عام پہ آجانے کے بعد، غالب کا ایک نیا عرفان شروع ہو گا" اور یہ بھی کہ" اکبر علی خاں نے اس عظیم دریافت کو جس دقتِ نظر اور حسنِ ذوق کے ساتھ پیش کیا ہے، اس پر ان کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ وہ اس شاندار کارنامے پہ دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔" (ص ا)

لیکن" نسخۂ عرشی زادہ" بوجوہ محض چھپا ہی، شائع نہیں ہو سکا اور اہلِ علم بالعموم" نقوش" کے ذریعے، اس گوہرِ بے بہا سے مستفید ہوئے۔ ۱۲ جنوری ۱۹۷۰ء کے ایک خط میں، ڈاکٹر گیان چند، بھارت سے، محمد طفیل کو لکھتے ہیں:

" برادرم! مجھے کوئی علم نہ تھا کہ نسخۂ عرشی زادہ پہلے ہی شائع ہو گیا ہے بعد میں معلوم ہوا کہ بھوپال کی عدالت نے نو دریافت مخطوطہ، اس کے عکس' نسخۂ عرشی زادہ وغیرہ کی فروخت پر حکم امتناعی جاری کر رکھا ہے۔ اس لیے گو نسخۂ عرشی زادہ چھپ گیا تھا، لیکن اس کی دو تین جلدیں باہر نکلی تھیں کر ان کا اجرا روک دیا گیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اس پر حکم امتناع اب بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کا تو ذکر کیا ہندوستان میں بھی ہر شخص محض" نقوش" ہی کے طفیل، اس نسخے کا مطالعہ کر سکتا ہے، نسخۂ عرشی زادہ میں نستعلیق قرارت نہیں دی جس کی وجہ سے وہ عام قاری کے مصرف کا نہیں"

(نقوش، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، ص ۳۷۵ و بعد)

---

[۱] پروفیسر عبدالقوی دسنوی' ۲۵ جنوری ۱۹۷۱ء کے ایک خط میں بھوپال سے محمد طفیل مدیر" نقوش" لاہور کو لکھتے ہیں:" شاید آپ کو علم نہیں کہ نسخۂ عرشی زادہ کو اب تک دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا ہے، نہ دستیاب ہے۔ قیمت صرف تین سو روپے رکھی گئی ہے۔! اگر یہ کتاب دستیاب بھی ہوتی تو ہماری ہمت تو خریدنے کی نہیں تھی۔ (نقوش، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، ص ۳۷۸

"نسخۂ عرشی زادہ" اپنی بے حد محدود تعدادِ طباعت کے باعث "عام قاری" کے لیے ہے بھی نہیں ڈاکٹر ابو محمد سحر جنھوں نے دیوانِ غالب بخط غالب کے دونوں مطبوعہ ایڈیشن دیکھے ہیں، لکھتے ہیں کہ :

"نسخۂ عرشی زادہ اور بیاضِ غالب مطبوعہ "نقوش" غالب نمبر حصہ دوم (جسے میں محمد طفیل صاحب کی خواہش کے مطابق نسخۂ لاہور کہوں گا) میری نظر سے گزر چکے ہیں ..... دونوں مطبوعہ نسخے ایک سے ایک بڑھ کر ہیں ۔ نسخۂ عرشی زادہ کی قیمت ..... تین سو روپے رکھی گئی ہے جو خواص او رادارون کی قوتِ خرید سے بھی عموماً باہر نکل گئی ۔ "نقوش" غالب نمبر بشمول نسخۂ لاہور کی قیمت تیس روپے ہے لیکن ہندوستان میں دیگر پاکستانی مطبوعات کی طرح اس کی فراہمی بھی آسان نہیں ۔ ذاتی کوششوں سے یا تو مفت ہاتھ آجاتا ہے یا کہیں زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے ۔

نسخۂ عرشی زادہ علاحدہ کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے ۔ نسخۂ لاہور "نقوش" غالب نمبر حصہ دوم کا ایک جزو ہے ۔ نسخۂ عرشی زادہ کا سائز نسبتاً زیادہ موزوں اور عکس زیادہ صاف اور دیدہ زیب ہیں .... نسخۂ لاہور میں .... قلمی نسخے کے ہر عکسی صفحے کے بالمقابل صفحے پر، مرتّب (دہندہ) کی قرأت کے مطابق مندرجات کو خوبصورت کتابت میں بھی چھاپا گیا ہے[۱]"

زیرِ نظر اشاعت (نسخۂ عرشی زادہ) اُس مخطوطے کا عکس ہے جو مولانا امتیاز علی عرشی کی رائے میں "مُطالعۂ غالب کے سلسلے کی اہم ترین کڑی اور تا حال معلومہ مخطوطوں میں سب سے پُرانا اور ہر لحاظ سے سرِ فہرست مخطوطہ ہے[۲]" ـــــ اور اسے پیش کرنے میں عرشی زادہ حتی الوسع تدوین اور طباعت کی ساری نفاستیں اور دلالتیں بروئے عمل لائے ہیں ۔

---

[۱] تحریک، دہلی، جولائی ۱۹۷۰ء، صفحہ ۱۰-۱۱
[۲] دیوانِ غالب بخطِ غالب، نسخۂ عرشی، مقدمہ، ص ۱۲

قادر نامۂ غالب

- طبع اوّل : مطبع سلطانی، واقع قلعہ مبارک، دہلی، ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء
- طبع دوم : مطبع العلوم سینٹ سٹیفنز کالج دہلی، باہتمام رام جی داس، ۳۰ نومبر ۱۸۶۱ء
- طبع سوم : مجمّس پریس، دہلی، باہتمام کنہیا لال، ۲۲ محرم ۱۲۸۰ھ/ ۹ جولائی ۱۸۶۳ء

تعداد اشعار : ۱۳۳

بچوں کے لیے "خالق باری" اور "آمد نامہ" کی طرح کا ایک منظوم درسی کتابچہ یا رسالہ جس میں غالب نے فارسی اور عربی کے تقریباً چار سو ہم معنی لغات ذہن نشین کرانا چاہے ہیں۔ یہ ایسے الفاظ ہیں جو اُردو میں بالعموم مستعمل ہیں۔ "قادر نامہ" میں غالب نے بارہ اشعار کی دو غزلیں بھی شامل کی ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر (غالب، طبع چہارم، لاہور، ۱۹۴۶ء، صفحہ ۳۸۳) اور مالک رام (ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی، ۱۹۶۴ء، صفحہ ۲۱۶) کا خیال ہے کہ چونکہ اس کا پہلا شعر:

قادر اللہ اور یزداں ہے خدا　　　ہے نبی مرسل، پیمبر رہنما

لفظ "قادر" سے شروع ہوتا ہے، اس لیے اس کا نام "قادر نامہ" رکھا گیا۔ تحسین سروری بھی اس قیاس سے متفق ہیں اُنھوں نے بعض مثالیں بھی پیش کی ہیں[1] کہ "خالق باری"، "رازق باری" اور "فیض جاری" کے پہلے شعر جن الفاظ سے شروع ہوئے ہیں، وہی اُن کے نام ہیں:

خالق باری، سرجن ہار	واحد ایک، بڑا کرتار	= خالق باری
رازق باری، حق ہے جان	اسی کا نور ہے پہچان	= رازق باری
فیض جاری رکھا ہے اس کا نام	تا ہوں سیراب اس سے تشنہ انام	= فیض جاری

عبد القوی دسنوی نے بھی اس خیال کی تائید اور بعض مثالوں سے اس خیال کو مستحکم تر کیا ہے۔

---

[1] قادر نامۂ غالب، تحسین سروری، مکتبہ نیا راہی، کراچی، ۱۹۵۹ء، صفحہ ۱۰ و مابعد

لکھتے ہیں[1]: جہاں تک قادر نامہ کے نام کا تعلق ہے، یہ صحیح ہے کہ پہلے شعر کی ابتدا چونکہ لفظ "قادر" سے ہوتی ہے، اس لیے اسے "قادر نامہ" کا نام دیا گیا ہے ..... شعبۂ اُردو سیفیہ کالج بھوپال میں اس سلسلے کی دوسری کتابیں ہیں جو بچوں کی عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے ہم معنی الفاظ سکھانے کے لیے لکھی گئی ہیں جن میں "قادر نامۂ فروغی" (مصنفہ حافظ غلام احمد فروغی) اور "حمد باری" (مصنفہ محمد عبدالسمیع پال) وغیرہ کے نام رکھنے کی وجہ یہی ہے جو "قادر نامہ" غالب کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

قادر اللہ، باری و یزداں کریم	کردگار ایزد خدا رحمٰن رحیم = قادر نامہ فروغی، دوسرا شعر
حمد باری لکھ کی اور نعت رسول	جو لکھی بیدل کرو دل سے قبول = حمد باری، پہلا شعر

غالب کی تحریروں میں کہیں "قادر نامہ" کا ذکر نہیں آیا، اس وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ "ہمارے" غالب کی تصنیف نہ ہو، کسی "دوسرے" غالب[2] کا نتیجۂ فکر ہو۔ لیکن یہ محض دور از کار قیاس ہوگا۔ کتاب کا کم از کم تین بار غالب کی حیات میں اور وہ بھی دہلی میں چھپنا ثابت ہے۔ طبع اوّل کے سرورق کی عبارت یہ ہے:

> "قادر نامہ: تصنیف کیا ہوا نجم الدولہ مرزا اسد خاں بہادر متخلص بہ غالب
> در مطبع سلطانی، واقع قلعہ مُبارک (دہلی)، ۱۲۷۲ھ میں چھپا ـــــ"

سنہ ۱۲۷۲ھ؛ ۱۳ ستمبر ۱۸۵۵ء سے ۱۳ اگست ۱۸۵۶ء پر پھیلا ہوا ہے، گویا یہ کتابچہ اس زمانے میں کسی وقت شائع ہوا۔

تحسین سروری نے طبع اوّل کا تعارف کرایا ہے اور اس پر مبنی متن شائع کیا ہے۔ (کراچی، ۱۹۵۹ء)۔ طبع اوّل ہی پر مبنی "قادر نامہ" ڈاکٹر سید سجاد کی مختصر تمہید کے ساتھ مجلۂ عثمانیہ، جلد سوم، شمارہ اوّل، بابتہ جون ۱۹۲۹ء میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ تحسین سروری نے ڈاکٹر سید سجاد کی یہ "تمہید" اپنی معنوی اہمیت کے باعث "قادر نامۂ غالب" کے اپنے مرتّبہ ایڈیشن کے دیباچے میں نقل کر دی ہے۔ ڈاکٹر سید سجاد لکھتے ہیں کہ:

---

[1] نقوش، لاہور، غالب نمبر ۲، ۱۹۷۱ء، صفحہ ۸۲

[2] "غالب" کے علاوہ غالب تخلص کے نو اُردو شعراء کے تراجم میں دیکھیے: غالب، شاعر امروز و فردا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، لاہور، ۱۹۷۰ء، صفحہ ۳۵-۴۷

"اس مہینے میں پُرانی کتابوں کا دہلی سے جو ایک پارسل میرے نام موصول ہوا اُس میں غالب کی ایک مطبوعہ نظم تھی۔ اس کا نام "قادر نامہ" ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ اس نظم کا ذکر نہ تو غالب کے سوانح نویسوں نے کہیں کیا ہے اور نہ خود غالب نے اپنے رقعات میں کیا۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ نظم غدر کے بہت بعد تک دہلی سے لکھنؤ تک مشہور تھی۔ چنانچہ عالی جناب نواب حیدر یار جنگ بہادر سے جب اس کا تذکرہ آیا تو انھوں نے فرمایا کہ اس کو انھوں نے اپنے ایامِ طفولیت میں پڑھا تھا۔ اسی طرح اور احباب بھی جن کا لڑکپن غدر کے بعد گزرا ہے، اس کتاب سے واقف ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طباطبائی نے اس کا نام تک نہیں سُنا۔ نظم کچھ طولانی نہیں، صرف بارہ صفحے پر ختم ہو جاتی ہے اس لیے ہم اس کو مجلّہ میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں تاکہ اس کی کثیر التعداد نقلیں اِدھر سے اُدھر پھیل جائیں۔ نظم پر کسی تنقید کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ غالب کی کوئی بات لطف سے خالی نہ تھی اور یہ غالب کا کلام ہے، بچّوں کے لیے لکھا گیا ہے لیکن بڑے بھی جو لٹریچر کا قدرے قلیل ذوق رکھتے ہیں اسے مزے لے لے کر پڑھیں گے ۔۔۔"

○ "قادر نامہ" کی ایک اشاعت مطبع العلوم، دہلی سے جمادی الاولیٰ ۱۲۷۸ ہجری مطابق نومبر ۱۸۶۱ء عمل میں آئی۔ اب تک کے معلومہ مطبوعہ نسخوں میں باعتبارِ تقدم زمانی مطبع سلطانی کے بعد اِسی کا نمبر ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس ایڈیشن کا تعارف کرایا ہے[۱]۔ اس کے کل ۱۶ صفحات ہیں۔ متن میں غالب کا "قادر نامہ" ہے اور حاشیہ پر فارسی میں "محمود نامہ" جسے سُلطان محمود غزنوی کی تصنیف بتایا گیا ہے۔ آخر میں (صفحہ ۱۳ تا ۱۶) غالب کا درج ذیل کلام ہے:

---

۱ دیکھیے مضمون، قادر نامہ: (الف) اُردو، کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۷۱ء، صفحہ ۵-۱۴
(ب) صحیفہ، لاہور، اپریل ۱۹۷۱ء، صفحہ ۱۳۱-۱۳۹

۱۔ مثنوی در تعریف انبہ ۲۔ روغنی روٹی والا قطعہ
۳۔ دال والی رُباعی ۴۔ ایک غزل: پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
۵۔ قطعہ در تہنیت آخری چہار شنبہ ۶۔ رُباعی: آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال

"قادر نامہ" کی اس اشاعت کے سرورق کی ہفت سطری عبارت یہ ہے:

پہلی سطر: و من یتوکل علی اللہ فہو حسبہٗ
دوسری سطر: الحمد للہ و المنۃ کہ نسخۂ کثیر المنفعت قلیل الحجم من تصنیف خاقانی زمان انوری دوران دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب مسمی بہ
تیسری سطر: قادر نامہ
چوتھی سطر: و بر حاشیہ
پانچویں سطر: محمود نامہ
چھٹی سطر: من تصنیف سلطان محمود غزنوی و بر اختتام متن و حاشیہ مثنوی در تعریف انبہ و دیگر اشعار برجستہ از تصنیفات مرزا صاحب موصوف
ساتویں سطر: در مطبع مطبع العلوم سینٹ سٹیفنز کالج باہتمام بندہ رام جی داس طبع شد۔

خاتمۃ الطبع کی عبارت سے بعض ضروری اُمور، احاطۂ علم میں آتے ہیں:

"الحمد للہ و المنۃ کہ نسخۂ کثیر المنفعت مُسمّیٰ بہ "قادر نامہ" و دیگر اشعار برجستہ من تصنیف نواب والا جناب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب نظام جنگ بہادر آدام اللہ اقبالہم و افضالہم و بر حاشیہ محمود نامہ من تصنیف سلطان محمود غزنوی در ساعت سعید و آوانِ حمید بتاریخ بست و ششم ماہ نومبر ۱۸۶۱ء روز دو شنبہ در مطبع، مطبع العلوم سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی بمکان اشرف بیگ مرحوم متصل دریبہ خورد، باہتمام بندہ رام جی داس پیرایۂ طبع پوشید۔"

"قادر نامہ" غالب کی یہ قیمتی اشاعت راقم الحروف کے ذخیرۂ غالبیات کی زینت ہے۔

"قادر نامہ" کی اس اشاعت کے بعد، اس کا تیسرا ایڈیشن مجیس پریس دہلی سے ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ

ہے، اس پر مبنی[1] "قادر نامہ" کا متن بطور مثنوی، دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، علی گڑھ ۱۹۵۸ء (صفحہ ۲۶۸-۲۷۵) میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی ایڈیشن کا ایک نسخہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے برٹش میوزیم کے کتب خانے[2] میں دیکھا ہے۔

غرض "قادر نامہ" کا غالب کی زندگی میں کم از کم تین بار دہلی سے چھپنا معلوم اور متعین ہے۔ یہ ایک جزو کا تو رسالہ ہے عجب نہیں غالب کی زندگی میں یہ اس سے بھی زیادہ بار چھپا ہو۔ "یادگارِ غالب" (۱۸۹۷ء) میں "قادر نامہ" کا تذکرہ رہ گیا تھا۔ اس پر حالی سے پوچھا گیا کہ کیا یہ مرزا صاحب کی تصنیف نہیں؟ حالی نے جواباً لکھا کہ "قادر نامہ یقیناً مرزا غالب کا لکھا ہوا ہے[3]۔"

امیر مینائی نے اپنے تذکرہ "انتخاب یادگار" میں تالیفات و تصنیفاتِ غالب کے نام لکھتے ہوئے "فارسی کلیات" کے بعد "قادر نامہ" کے ذیل میں لکھا ہے کہ "قادر نامہ جو خالق باری کی طرز پر موزوں کیا ہے[4]۔"

عبدالقوی دسنوی نے دو اور معاصر مآخذ کی نشاندہی کی ہے جن میں "قادر نامۂ غالب" کا مذکور ہے[5]۔ بھوپال کے مولانا محمد عباس رفعت شیروانی جو غالب کے تلامذہ میں سے تھے، اپنی کتاب "عباس نامہ" (مطبوعہ مفید پریس، آگرہ، ۱۳۰۶ھ/۸۹-۱۸۸۸ء) میں جو "قادر نامہ" کے تتبع میں ہے، لکھتے ہیں کہ:

از کرم ہائے الٰہی رفعتا	ختم شد عباس نامہ مرحبا
از کلامِ حضرت اوستادِ من	غالبِ سحر البیاں جادو سخن
ہست براں نہج قادر نامہ نظم	من تتبع کردہ ام اے نورِ چشم
آں کلام و ایں کلامم یاد گیر	ہر دو را انگار تنگ شہد و شیر

---

[1] نسخۂ عرشی، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۳۷۷

[2] غالب اور مطالعۂ غالب، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۸۳

[3] مکتوب حالی ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۹ء بنام مولوی حافظ شاہ حمید الدین رئیس اسلام پورہ، پٹنہ مطبوعہ: معارف، اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۱۸ء، صفحہ ۱۶۴

[4] انتخاب یادگار، تاج المطابع، رامپور، ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء، صفحہ ۲۴۰

[5] نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، صفحہ ۸۵ و مابعد

شیخ محمد صابر کی ایک کتاب ہے "چراغِ فوائد"، یہ ۱۳۰۵ھ / ۸۸-۱۸۸۷ء میں مطبع سفیر دکن سے شائع ہوئی۔ شیخ صابر لکھتے ہیں :

"..... پس اس نظر سے مَیں اس مطبوعۂ الفاظ کو جسے چودھویں صدی کی خالق باری کہنا چاہیے صرف افادۂ طلبہ کی غرض سے نظم کرکے اور "چراغ فوائد" (۱۳۰۵) تاریخی نام رکھ کر قدر دانوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور اُمید رکھتا ہوں کہ نظم میں، جو نثر کی نسبت قدرتی دلچسپی اور موزونیت خدا نے بخشی ہے، اس لیے غالب دہلوی کے "قادر نامہ" کی طرح جو بہ خلاف خالق باری کے ایک ہی بحر میں منظوم ہونے سے بچّوں اور بوڑھوں کی ذہن پر آسانی سے چڑھ سکتا ہے ــــ" (چراغ فوائد، صفحہ ۲)

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے حوالے سے مولانا غلام رسول مہر نے "قادر نامہ" کے ایک ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۷۳ء[1] کا ذکر کرتے ہوئے اپنی معروف کتاب "غالب" میں لکھا ہے کہ اس کے "پبلشر کا دعویٰ ہے کہ یہ کتاب غالب کی تصنیف ہے لیکن مجھے اس میں کلام ہے" (طبع چہارم، صفحہ ۳۸۳) بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے مولانا مہر کی کتاب "غالب" (طبع اول، ۱۹۳۶ء) پر تبصرہ کرتے ہوئے ضمناً لکھا ہے کہ :

"قادر نامہ، کے متعلق مہر صاحب نے شبہ ظاہر کیا اور اُنہیں اس میں کلام ہے کہ یہ مرزا صاحب کی تصنیف ہے لیکن میں نے میرن صاحب سے سُنا تھا کہ یہ مرزا صاحب نے عارف کے بچّوں کے لیے لکھا تھا ــــ"

[سہ ماہی اُردو، اورنگ آباد، جلد ۱۶، حصہ ۶۴، اکتوبر ۱۹۳۶ء، صفحہ ۷۰۵]

مولانا مہر نے "غالب" کے بعد کے ایک ایڈیشن (۱۹۴۶ء) میں اس پر یہ حاشیہ لکھا ہے :

"مولانا عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے میر افضل علی عرف میرن صاحب کے حوالے سے بیان فرمایا ہے کہ "قادر نامہ" غالب نے باقر علی خاں اور حسین علی خاں کی تعلیم کے لیے لکھا تھا۔ مالک رام صاحب مولف

---

[1] مطبوعہ : مطبع منشی مداری لال، لاہور، اکتوبر ۱۸۷۳ء

"ذکرِ غالب" فرماتے ہیں کہ "اس میں بعض ایسی شہادتیں ہیں جن سے یہ واقعی غالب کی تصنیف ثابت ہوتا ہے —" میں ان داخلی شہادتوں سے آگاہ نہیں ہو سکا —" (حاشیہ، صفحہ ۳۸۳)

مالک رام نے مولانا مہر سے اختلاف کرتے ہوئے اس پر الگ سے ایک مقالہ لکھا (قادر نامہ کا مصنف، اُردو، دہلی، جلد ۲۷، نمبر ۳، جولائی ۱۹۴۷ء، صفحہ ۲۹۱ - ۲۹۷) اور یہی نتیجہ اخذ کیا کہ یہ غالب کی تصنیف ہے۔ مالک رام کے مقالے کا "حاصلِ کلام" اُنھی کے الفاظ میں یہ ہے:

"اِس مختصر سے رسالے میں کتنی داخلی شہادتیں ایسی موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مرزا غالب ہی کی تصنیف ہے۔ اس میں بعینہٖ اُس نہج پر فارسی الفاظ کا موجود ہونا، جو وہ "پنج آہنگ" میں لکھے تھے، خالص پہلوی لغات کا استعمال جن سے مرزا کو خاص شغف تھا، اُن الفاظ کی موجودگی جو مرزا کی نگارش کی خصوصیات میں سے ہیں، یہ سب باتیں اسے مرزا کی تصنیف ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ابھی میں نے طرزِ کلام اور اسلوبِ بیان کا ذکر نہیں کیا ورنہ اس پہلو سے بھی ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ پس روایت و درایت دونوں کی رو سے یہ ثابت ہے کہ "قادر نامہ" غالب کے دماغ کی پیداوار ہے —"
(صفحہ ۲۹۷)

یہاں ضمناً مالک رام کی ایک غلط فہمی کی طرف اشارہ کر دینا شاید بے محل نہ ہو۔ مالک رام نے اپنے مقالے "قادر نامہ کا مصنف" کے آغاز میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"مولوی عبدالحق صاحب قبلہ نے میر افضل علی عرف میرن صاحب کے حالات میں (اُردو، ۱۹۳۶ء، ص ۵۰۷) میرن صاحب کی زبانی یہ روایت بیان کی ہے کہ مرزا غالب نے یہ رسالہ عارف کے دونوں صاحبزادوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو فارسی پڑھانے کے لیے لکھا تھا —"
[اُردو، دہلی، جولائی ۱۹۴۷ء، صفحہ ۲۹۱]

یہی بات مالک رام نے اپنی کتاب "ذکرِ غالب" میں بھی تحریر فرمائی ہے:

"میرزا نے عارف کے دونوں بچوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کی تعلیم کے
آٹھ صفحے کا ایک مختصر منظوم رسالہ 'قادر نامہ' تصنیف کیا تھا، بحوالہ: اُردو،
۱۹۳۶، ص ۷۰۵، مضمون "میرن صاحب" از مولانا عبدالحق ــــ"

(ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی ۱۹۶۴ء، صفحہ ۲۱۵)

میرن صاحب کے حالات میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق کا ایک اہم مضمون بعنوان: "میرن صاحب" رسالہ اُردو، اورنگ آباد، شمارہ جولائی ۱۹۳۶ء، صفحہ ۳۸۴-۳۷۰ میں شائع ہوا ہے، لیکن اس میں 'قادر نامہ' کے بارے میں میرن صاحب کی روایت مذکور نہیں ہے۔ میرن صاحب کی زبانی یہ روایت دراصل مولوی عبدالحق نے مولانا مہر کی کتاب "غالب" پر تبصرہ کرتے ہوئے' رسالہ اُردو' اورنگ آباد کے شمارہ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں بیان فرمائی ہے۔ اُن کے لفظ یہ ہیں:

"قادر نامہ" کے متعلق مہر صاحب نے شبہ ظاہر کیا، اور اُنہیں اس میں کلام
ہے کہ یہ مرزا صاحب کی تصنیف ہے۔ لیکن میں نے میرن صاحب سے سُنا تھا کہ یہ
مرزا صاحب نے عارف کے بچوں کے لیے لکھا تھا ــــ"

(اُردو، اورنگ آباد، اکتوبر ۱۹۳۶ء، صفحہ ۷۰۵)

مالک رام نے دونوں جگہ رسالہ اُردو، ۱۹۳۶ء، صفحہ ۷۰۵ کی حد تک حوالہ صحیح رقم فرمایا ہے لیکن اس روایت کے محل اظہار کے بارے میں اُنہیں التباس ہوا۔ حقیقتاً مولوی عبدالحق نے یہ روایت میرن صاحب کے حالات میں بیان نہیں فرمائی، اِس کا اظہار اُس تبصرے میں ہوا ہے جو اُنھوں نے مولانا غلام رسول مہر کی کتاب "غالب" پر تحریر فرمایا ہے۔

اِس ضمنی غلط فہمی کا ازالہ اِس لیے ضروری خیال ہوا کہ مالک رام کے اس سہو کی پیروی بھی شروع ہو گئی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد باقر نے ایک موقع پر اپنے مخصوص لہجے میں لکھا ہے کہ:

"مرحوم مولوی عبدالحق نے میر افضل علی عرف میرن کے حالات میں میرن کی
زبانی یہ بیان کیا ہے کہ غالب نے یہ رسالہ .... عارف کے دونوں بچوں .... کو
فارسی پڑھانے کے لیے لکھا تھا ــــ" بحوالہ، مجلّہ اُردو، ص ۷۰۵، اشاعت ۱۹۳۶ء"

(پیش لفظ، قادر نامہ، لاہور ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱)

ڈاکٹر محمد باقر نے مالک رام کا حوالہ نہیں دیا، لیکن ظاہر ہے، اُن کا ماخذ مالک رام ہی کا بیان ہے، اور اُنہوں نے براہ راست مجلّۂ اُردو کی اشاعت ۱۹۳۶ء کا صفحہ ۵۰۷ نہیں دیکھا —

بہر نوع اب تو مولانا غلام رسول مہر کو بھی "قادر نامہ" کو تصنیفِ غالب ماننے میں تکلف نہیں رہا۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے مرتبہ دیوانِ غالب، عکسی مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۶۷ء میں "قادر نامہ" کو شامل کر لیا ہے (صفحہ ۳۹۲-۴۰۱)۔ نیز ایک دوسرے موقع پر انہوں نے غالب کی تصانیف کا مختصر سا نقشہ پیش کرتے ہوئے "قادر نامہ" کو تصانیفِ غالب میں شمار کیا ہے[۱]

قاضی عبدالودود فرماتے ہیں:

"غالب نے برہان و جہانگیری وغیرہ کی طرح فرہنگ نہیں لکھی۔ "قادر نامہ" نصاب الصبیان، ابو نصر فراہی کے طور پر بچوں کے لیے منظوم ہوئی ہے —"

[علی گڑھ میگزین، غالب نمبر، ۱۹۴۹ء، صفحہ ۲۵۵]

مولانا امتیاز علی عرشی کا کہنا ہے کہ:

"مرزا صاحب کے اپنے کلام میں قادر نامے کا تذکرہ نہیں ملتا، لیکن اس کے کلام غالب ہونے میں کسی طرح کا شبہ نہیں کیونکہ یہ (مثنوی) اُن کی زندگی میں اُن کے نام سے شائع ہو چکی تھی —"

[دیوانِ غالب اُردو، نسخۂ عرشی، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۳۷۸]

اب تو شبے کا اظہار بھی زائد بات ہو کر رہ گئی ہے، اس سے قطع نظر کہ "قادر نامہ" کم از کم تین بار غالب کی زندگی میں اُن کے نام سے دہلی میں چھپا اور وہ معترض نہیں ہوتے اس کے منجملہ تصانیفِ غالب ہونے پر، ایک سے زیادہ معاصر شہادتیں موجود ہیں۔

تحسین سروری نے طبع اوّل کے مطابق "قادر نامہ" مرتب کیا ہے اس میں اشعار کی تعداد ۱۳۳ ہے، اس میں دو غزلوں کے بارہ شعر بھی شامل ہیں۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے طبع سوم کے پیشِ نظر، دیوانِ غالب اور نسخۂ عرشی میں "قادر نامہ" کو شامل کیا ہے، اس میں بھی اشعار

---

[۱] خطوطِ غالب، لاہور، بار چہارم ۱۹۶۸ء، مقدمہ، صفحہ ۱۳

کی ترتیب اور تعداد تحسین سروری کے پیش کردہ متن یعنی طبع اول کے مطابق ہے۔ مالک رام کے بقول "کل اشعار کی تعداد ۱۳۷ ہے آخر میں چار شعر کا ایک قطعہ ہے"[1] لیکن اس 'قطعہ' کی صراحت نہیں کی گئی کہ یہ قطعۂ تاریخ ہے؟ غالب ہی کا ہے؟ اور "قادر نامہ" کا جزو معلوم ہوتا ہے یا نہیں؟ تحسین سروری لکھتے ہیں کہ:

"ہمارے زیر بحث نسخے (مطبع سلطانی، ۱۲۷۰ھ) میں کل اشعار کی تعداد ۱۳۳ ہے اور اس کے آخر میں چار شعر کا وہ قطعہ نہیں ہے جس کا ذکر مالک رام صاحب نے اپنی کتاب "ذکرِ غالب" میں کیا ہے۔ اگر اس نسخے میں بھی مذکورہ قطعہ شامل رہتا تو دونوں نسخوں کے اشعار کی تعداد ایک ہی ہوتی۔ لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ قطعہ خود غالب کا کہا ہوا ہے یا اہلِ مطبع نے جیسا کہ دستور تھا کسی اور کا قطعہ خاتمے کے طور پر درج کر دیا۔" (قادر نامۂ غالب' کراچی، ۱۹۵۹ء، صفحہ ۱۹]

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس "قطعہ" سے بحث کرتے ہوئے فیصلہ کن رائے دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "قادر نامہ" کی عام اشاعتوں میں چار ابیاتِ فارسی، قطعے کے عنوان سے درج ہوئے ہیں۔ یہ ابیات "قادر نامہ" کی اشاعت مطبع العلوم، دہلی، ۲۶، نومبر ۱۸۶۱ء میں شامل نہیں اور نہ اُن دو اشاعتوں میں جو غالب کے زمانے کی ہیں (یعنی مطبع سلطانی، دہلی، ۱۸۵۶ء اور مجتبس پریس، دہلی، ۹، جولائی ۱۸۶۳ء کی اشاعتیں)۔ ان اشاعتوں میں فارسی ابیات کی عدم موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ یہ ابیات' غالب کے نہیں، الحاقی ہیں، بعد میں کسی نے کہہ کر "قادر نامہ" میں شامل کر دیے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ "قادر نامہ" اردو میں ہے اور یہ ابیات فارسی میں تو ہمارا شبہ قوی سے قوی تر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خود ان ابیات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غالب کے نہیں، کسی تیسرے درجے کے شاعر نے کہے ہیں۔

۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء کی ایک اشاعت میں مذکورہ ابیات کا آخری مصرع اس طرح درج ہوا ہے: "رام تابعدار، دُرِ گوہر شمار" بعد کے نسخوں میں اس کی شکل یہ ہے: "رام تابع، دُرِ گہر، گوہر شمار" یہ دونوں قراءتیں محلِ نظر ہیں۔ پہلی اس لیے کہ "تابعدار"

---

[1] ذکرِ غالب، طبع چہارم، صفحہ ۲۱۶

حال کی پیداوار ہے، غالب کے عہد میں اس کا چلن نہ تھا۔ دوسری اس لیے محلِ نظر ہے کہ "گہر" مستقل لغت نہیں "گوہر" کی تخفیف ہے۔ ان میں سے صرف ایک کا ذکر کافی تھا۔ اس کے علاوہ یہ ابیات مثنوی کے ہیں، انہیں قطعہ کا عنوان نہیں دیا جا سکتا۔"

[اُردو، کراچی جنوری مارچ ۱۹۷۱ء، صفحہ]

غالب کی زندگی کے بعد "قادر نامہ" کی انیسویں صدی کی پانچ سات مختلف اشاعتوں کے حوالے ملتے ہیں:

- مطبع منشی مداری لال، لاہور، اکتوبر ۱۸۷۳ء
- مطبع نظامی، کانپور: ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء
- مطبع نظامی، کانپور، ۲۸، فروری ۱۸۹۱ء
- مطبع فیض محمدی، لکھنؤ، ۱۸۹۲ء
- مطبع فیض محمدی، لکھنؤ، ۱۸۹۷ء

محولہ بالا پانچ اشاعتوں کے علاوہ راقم الحروف کے ذاتی ذخیرۂ غالبیات میں "قادر نامہ" کے دو قدیم نسخے ہیں جن پر سنہ اشاعت درج نہیں لیکن ان پر بعض قلمی اندراجات کے حوالے سے میں انہیں انیسوی صدی کے مطبوعہ مانتا ہوں:

- قادر نامہ، باہتمام سید علی حسین مالک مطبع یوسفی، دہلی،
  تیسری سہ ماہی سال ۱۸۸۴ء، ص ۸، سائز: "۱۰ × ۶½"
- قادر نامہ غالب، آئین ہند پریس، دہلی، کوچہ بلاقی بیگم، باہتمام منیجر ہیرا سنگھ،
  تیسری سہ ماہی سال ۱۸۸۵ء، ص ۱۶، سائز "۶½ × ۵"

بیسوی صدی کے نصف اوّل کی پانچ چھ اشاعتیں بھی معلوم ہیں:

- مطبع انوری، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۰۳ء
- ہلال اسٹیم پریس، ساڈھورہ، ۱۹۰۷ء

- مطبع مجیدی، کانپور، یکم فروری ۱۹۰۹ء
- مطبع قیومی، کانپور، ۱۹۱۱ء
- مطبع رزاقی، کانپور، اپریل ۱۹۱۶ء
- ابوالعلائی الیکٹرک پریس، دہلی، ۱۹۲۷ء
- ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور، مارچ ۱۹۳۸ء
- فیروز سنز پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۴۶ء

قادر نامہ" کی بعض نسبتاً جدید اور قابلِ ذکر اشاعتیں یہ ہیں:

- مُرتّبہ: تحسین سروری
  مکتبہ نیا راہی، کراچی، جنوری ۱۹۵۹ء
  دیباچہ مرتب ص۷ - ۲۵، متن ص۲۷ - ۶۳
- مُرتّبہ: ڈاکٹر محمد باقر
  مجلس یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۹ء
  پیش لفظ مرتب ص ۱ - ۵، متن ص ۷ - ۱۶
- مُرتّبہ: پروفیسر عبدالقوی دسنوی
  شعبۂ اُردو، سیفیہ کالج، بھوپال فروری ۱۹۷۱ء
  پیش لفظ مرتب ص۵ - ۱۲، متن ص۱۳ - ۳۱

لہ و لہ "قادر نامۂ غالب" کی یہ اشاعتیں 'فارسی نامۂ کلاں' کے ساتھ ہیں۔ 'فارسی نامۂ کلاں' (صفحہ ۱-۸)،
"قادر نامۂ غالب" (صفحہ ۹-۱۶)۔ مجموعے کا نام ہے "فارسی نامۂ کلاں مع قادر نامۂ غالب"۔

دوسرا باب

۱ : عودِ ہندی : میرٹھ ، ۱۸۶۸ء

۲ : اُردوئے معلّٰی : دہلی ، ۱۸۶۹ء
مع حصّہ دوم ، ۱۸۹۹ء
ہر دو حصّہ مع ضمیمہ ، ۱۹۲۲ء
حصّہ سوم ، ۱۹۷۰ء

۳ : مکاتیبِ غالب
امتیاز علی عرشی : بمبئی ، ۱۹۳۷ء ، رامپور ۱۹۴۹ء

۴ : نادراتِ غالب
آفاق حسین آفاق دہلوی : کراچی ، ۱۹۴۹ء

۵ : خُطوطِ غالب
مہیش پرشاد ،
ڈاکٹر عبدالستار صدیقی الہ آباد ، ۱۹۴۱ء
مالک رام : علی گڑھ ، ۱۹۶۲ء

۶ : خُطوطِ غالب
مولانا غلام رسول مہر : لاہور ، ۱۹۵۱ء ، ۱۹۶۹ء

۷ : غالب کی نادر تحریریں
ڈاکٹر خلیق انجم : دہلی ، ۱۹۶۱ء

۸ : نادر خُطوطِ غالب (جعلی)
سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی : لکھنؤ ، ۱۹۳۹ء

۹ : غالب کے خُطوط :
ڈاکٹر خلیق انجم : دہلی ، ۱۹۸۴ء - ۱۹۸۷ء

عودِ ہندی

غالب کے اُردو خطوں کا پہلا مجموعہ

وسط نومبر ۱۸۵۸ء میں منشی شیو نرائن آرام نے جو آگرے میں ایک مطبع کے مالک اور غالب کے شاگرد تھے، غالب کے اُردو خطوط کا مجموعہ چھاپنے کا ارادہ کیا تو غالب کے لیے یہ قطعی نئی اور زائد بات تھی۔ انھوں نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے بڑے واضح الفاظ میں شیو نرائن کو لکھا کہ :

"اُردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا کہ جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلافِ طبع ہے۔"[1] [محررہ : ۱۸، نومبر ۱۸۵۸ء]

اُردو خطوں کی اس اشاعت کی تجویز میں منشی ہرگوپال تفتہ بھی، شیو نرائن کے شریک تھے، اور بضد تھے کہ خط ضرور چھاپے جائیں۔ ۲۰، نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے تفتہ کو لکھا کہ :

"رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمھاری اسی میں خوشی ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلافِ رائے ہے۔"[2]

اسی روز ۲۰، نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک دوسرے خط میں غالب نے اپنے پچھلے خط کے حوالے سے منشی شیو نرائن کو لکھا کہ :

---

[1] اُردوئے معلیٰ، طبع اوّل : اکمل المطابع، دہلی، مارچ ۱۸۶۹ء، صفحہ ۳۶۱

[2] اُردوئے معلیٰ، طبع اوّل، ایضاً، صفحہ ۱۰۵

"رقعوں کے چھاپنے کے بارے میں ممانعت لکھ چکا ہوں، البتہ اس باب میں میری رائے پر تم کو عمل کرنا ضرور ہے۔" [اُردوئے معلیٰ، طبع اول، صفحہ ۳۶۱]

آرام اور تفتہ کی تحریک و تجویز نے، جسے ۱۸۵۸ء میں زائد بات کہہ کر جھٹک دیا گیا تھا، ۱۸۶۲ء میں چودھری عبدالغفور سرور[1] کے ہاتھوں عملی شکل اختیار کی اور بالآخر ۱۸۶۸ء میں یہ تجویز "عودِ ہندی" کے نام سے حقیقت بن کر ابھری[2]۔ اور اس کی خوشبو "ہندوسند" میں ہر چہار طرف پھیل گئی۔ "عودِ ہندی" بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی اور اس کے بعد غالب کے اُردو مکاتیب کی جمع و ترتیب کے کام کا ایک تار بندھ گیا، جس کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں عہدِ موجودہ تک چلا آتا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر کا یہ احساس بالکل بجا ہے کہ:

چودھری عبدالغفور خان سرور، میرزا غالب کے مخلص نیاز مندوں میں اس اعتبار سے بطور خاص ممتاز ہیں کہ انھیں سب سے پہلے (جب) اُردو مکاتیب کی جمع و ترتیب کا خیال آیا (تو)، میرزا تفتہ یا شیو نرائن آرام کی طرح (وہ) میرزا غالب سے اجازت لینے کے تکلف میں نہ پڑے، بلکہ اپنے نام کے، نیز حضرت صاحب عالم مارہروی اور حضرت شاہ عالم کے نام کے خطوط مرتب کر کے ان کا نام "مہرِ غالب" رکھا اور اس پر ایک دیباچہ بھی لکھ دیا۔ یہ مجموعہ صرف "عودِ ہندی" ہی کا جوہر نہ بنا بلکہ حقیقتاً اسی آغاز کے نتیجے میں مکاتیبِ غالب کے مختلف مجموعے مرتب کرنے کی طرف توجہ منعطف ہوئی۔ "عودِ ہندی"، "اُردوئے معلیٰ"، "مکاتیبِ غالب[3]"، "نادراتِ غالب[4]" وغیرہ "مہرِ غالب" ہی کی وجہ سے منظرِ عام پر آئے۔"[5]

"عودِ ہندی" کی جمع و ترتیب کے بارے میں چودھری عبدالغفور سرور کے دیباچے کے علاوہ

---

[1] چودھری عبدالغفور سرور کے حالات میں دیکھیے کتاب:
غالب اور سرور، مؤلفہ: ایم۔ حبیب خاں، کوہ نور پرنٹنگ پریس، دلّی، دسمبر ۱۹۷۵ء

[2] عودِ ہندی، طبع اوّل: مطبعِ مجتبائی، میرٹھ، اکتوبر ۱۸۶۸ء

[3] مکاتیبِ غالب، مرتبہ: مولانا امتیاز علی عرشی، طبع اوّل: مطبعۂ قیمہ، بمبئی ۱۹۳۷ء

[4] نادراتِ غالب، مرتبہ: آفاق حسین آفاق دہلوی، طبع اوّل: ادارۂ نادرات، کراچی ۱۹۴۹ء

[5] خطوطِ غالب، طبع اوّل: مجلس یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء جلد ۲، صفحہ ۵۱۹

صاحبِ مطبع، محمد ممتاز علی خاں کے ابتدائی کلمات سے جو کوائف سامنے آتے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ چودھری عبدالغفور سرور جو مارہرہ ضلع ایٹہ، یو۔پی کے رئیس تھے اور جن کے خانقاہ برکاتیہ مارہرہ کے سجادہ نشین، حضرت صاحب عالم سے گہرے روابط تھے، غالب کے نامہ ہائے اُردو کی عبارت کے گھائل تھے۔ سرور اپنے نام کے خطوط غالب سے تنہا متلذذ ہونے اور آپ ہی آپ مزہ اُٹھانے کو خلافِ انصاف جانتے ہوئے، انھیں احباب کو بھی سُنایا کرتے تھے اور غالب کے ان رقعات کے ضمن میں چودھری عبدالغفور سرور کا "دل مائل تمام بہ شہرت عام" تھا۔

ادھر میرٹھ کے رئیس اور مطبع مجتبائی کے مہتمم، محمد ممتاز علی خاں کو "مدت سے اس کا خیال" تھا کہ غالب کی "نثر اُردو، اوروں کی فارسی سے ہزار درجہ بہتر ہے، اسے بھی ترتیب" دیا جائے۔ حُسنِ اتفاق کہ ممتاز علی خاں، رونق افزائے مارہرہ ہوئے، اور سرور نے انھیں اپنے آمدہ رقعاتِ غالب سنائے؛ ممتاز علی خاں، غالب کی نثر اُردو ترتیب دیے جانے کے پہلے ہی مدت سے خواہاں تھے، اب جو انھوں نے سرور کی زبانی رقعاتِ غالب سُنے تو بے اختیار کہہ اُٹھے کہ "اگر وہ خطوط کہ بنام تمہارے آئے اور تم نے سنائے ہیں، جمع کرو تو میں بیڑا اٹھاتا ہوں" ان کے چھاپے کا ـــــ یہ پیش کش سرور کے عین حسبِ منشا تھی، انھوں نے خط ترتیب دیے، سالِ ترتیب کا قطعہ کہا، دیباچہ لکھا اور مجموعہ اشاعت کے لیے ممتاز علی خاں کے سُپرد کیا۔ اب ممتاز علی خاں صاحب کا بیان ہے کہ عرصے تک سرگرم تلاش رہے۔ "جابجا سے اور تحریریں مرزا صاحب کی بہم پہنچائیں، بڑی محنت اٹھائی، تب تمنّا بر آئی" اور یہ مجموعہ کہ "عودِ ہندی" اس کا نام ہے، مرتّب ہوا۔

چودھری عبدالغفور کا دیباچہ اہتمامی زبان میں ہے۔ لمبی چوڑی تمہید و گریز اور مدح و ثنا کے بعد لکھتے ہیں کہ میں آغازِ شعور سے اہلِ سخن کا طالب اور خواہاں تھا۔ جب غالب کا کلام دیکھا بہت متاثر ہوا۔

> "ترسیلِ مراسلات میں قدم بڑھایا، ہر کتابت کا جواب آیا..... کبھی جواب مراسلہ میں تساہل و درنگ اور اصلاحِ شعر و عبارت میں دریغ اور ننگ نہ فرمایا۔ جو نامہ کہ بنام میرے بہ عبارتِ اُردو تحریر کیا، مکتوب سادہ رویوں سے دل رباتر، اور ہر سطر اس کی سلسلہ مویوں سے تاب فرسا زیادہ ہے۔ جس کی آنکھ نے دیکھا وہ شیدا ہے۔

جس کان نے سُنا وہ شنوا ہے، پس تنہا متلذذ ہونا اور آپ مزہ اُٹھانا خلافِ انصاف جانا۔ دل مائل تمام بہ شہرتِ عام ہوا اور ہنوز یہ قصد ناتمام تھا کہ بہ حُسنِ اتفاق فخرِ زمان وحید دوراں جناب ممتاز علی خاں صاحب متوطن میرٹھ ...... رونق افزائے مارہرہ ہوئے۔ ...... ایک روز محفلِ ممدوح میں ذکرِ ہمہ دانی و شیوا بیانی جناب استاذی و مخدومی درمیان آیا۔ ارشاد کیا کہ کلامِ مرزا صاحب نسیمِ جاں فزا اور شمیمِ دل کشا ہے۔ فارسی کا کیا کہنا، اُردو بھی یکتا ہے۔ نظم و نثر تو محلّیٰ بہ حلیۂ انطباع ہوا، لیکن نثرِ اُردو زیورِ طبع سے عاری رہا۔ اگر وہ خطوط کہ بنام تمہارے آئے اور تم نے سُنائے ہیں، جمع کرو تو میں بیڑا اُٹھاتا ہوں۔ اس تقریر سے نسیمِ تاثیر نے غنچۂ دل کھلایا۔ نشاطِ خاطر ظہور میں آیا۔ وہ مکتوب کہ بنام میرے آئے تھے ترتیب دیے۔ گویا جواہرِ بے بہا کانِ قلم دان سے نکال کر کشتیِ اوراق میں جمع کیے چونکہ محبت جناب غالبؔ میرے حال پر بہت ہے، لہٰذا نام اس انشا کا "مہرِ غالب" (بکسرِ میم) مناسب ہے۔ سالِ ختمِ تالیف بھی اس نام سے مطابق پایا۔ طبیعت اور بڑھی، تحریرِ تاریخ کو دستِ قلم بڑھایا:

انشا مملو بہ صد مطالب لکھی — یعنی پئے دوستانِ طالب لکھی
موسوم کیا جو "مہرِ غالب" سے سرور — تاریخ بھی اس کی "مہرِ غالب" لکھی [1]

"مہرِ غالب" سے ۱۲۷۸ کا عدد حاصل ہوتا ہے جو ۶۲-۱۸۶۱ء سنہ عیسوی کے مطابق ہے۔ یہ اس اور اُتنے حصۂ کتاب کا سالِ اتمام ہے جسے چودھری عبدالغفور سرور نے مرتب کیا، لیکن بحیثیتِ مجموعی پوری کتاب کی ترتیب کا کام اگست ۱۸۶۶ء میں انجام پایا اور کتاب کی طباعت کہیں اکتوبر ۱۸۶۸ء میں جا کر مکمل ہوئی، اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

ابتداً ۶۲-۱۸۶۱ء میں سرور نے "مہرِ غالب" کے نام سے انشائے غالب مشتمل بر رقعات کا مجموعہ مرتب کر کے بغرضِ اشاعت محمد ممتاز علی خاں کے حوالے کیا، ممتاز علی خاں کا بیان ہے کہ:

"بندے سے خدا کی تعریف ہو کیا مجال ہے ..... بندہ سراپا عصیان محمد ممتاز علی خاں صاحب جب اپنے کو اس سے عاجز پاتا ہے تو حرفِ مطلب زبان پر لاتا ہے"

---

[1] "عودِ ہندی" طبع اول، ایضاً ۱۸۶۸ء، صفحہ ۵ و بعد

نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالبؔ ...... سارا ہند انھیں جانتا ہے۔ ایران تک اُن کی جادو بیانی کا چرچا ہے۔ مجھے مدت سے اس کا خیال تھا کہ فارسی تصنیفیں تو ان کی بہت مرتب ہوئیں اور چھاپی گئیں۔ لوگوں نے فیض اُٹھائے، تعویذ بازو بنائے مگر کلام اُردو نے سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پائی[1]۔ یہ دولت ارباب شوق کے ہاتھ نہ آئی۔ حالانکہ نثر اُردو ان کی اردوں کی فارسی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہ سلاست بیان، بشستگی زبان، روزمرہ کی صفائی اور ان کی شوخی کسی کو کب میسر ہے۔ اسے بھی ترتیب دیجیے۔ قدر دانوں پر احسان کیجیے ...... مرزا غالب کے شاگرد یکتا چودھری عبدالغفور صاحب سرورؔ تخلص سے یہ ذکر آیا تو انھوں نے جتنے خطوط مرزا صاحب کے ان کے نام آئے تھے، سب کو ایک، جا کر کے اور اس پر ایک دیباچہ لکھ کر وہ مجموعہ عنایت کیا۔

عرصے تک سرگرم تلاش رہا، جابجا سے اور تحریریں مرزا صاحب کی بہم پہنچائیں بڑی محنت اٹھائی تب تمنا بر آئی اور مجموعہ مرتب ہوا۔ آج پورا اپنا مطلب ہوا۔ خواجہ غلام غوث خاں بےخبرؔ تخلص جو نواب معلی القاب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی کے میر منشی اور میرے مخدوم خاص اور حضرت غالب صاحب کے مخلص باختصاص ہیں، اس تلاش میں میرے معین و مددگار رہے بہت کچھ ذخیرہ ان کی بدولت بہم پہنچا۔[2]

گویا سرورؔ نے "مہرِ غالب" کے نام سے جو خط جمع کیے تھے منشی محمد ممتاز علی خاں نے انھیں کافی نہ سمجھتے ہوئے مزید رقعات کی فراہمی کو ضروری خیال کیا، عرصے تک سرگرم تلاش رہے، جابجا سے کوشش کر کے اور تحریریں مرزا غالبؔ کی بہم پہنچائیں، تب ان کی تمنا بر آئی اور یہ مجموعہ مرتب ہوا۔ فراہمیٔ مکاتیب کی اس مہم میں محمد ممتاز علی خاں نے منشی غلام غوث بےخبرؔ کو اپنا معین و مددگار بتلاتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ "بہت ذخیرہ ان کی بدولت بہم پہنچا" لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتے

---

[1] یہ صحیح نہیں کہ "عودِ ہندی" کی اشاعت اکتوبر ۱۸۶۸ء تک غالب کا صرف اُردو دیوان ہی ترتیب و طباعت کی منزل سے گزرا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک دیوان کے علاوہ غالب کی اُردو نظم و نثر کی کئی متفرق چیزیں چھپ چکی تھیں۔

[2] عودِ ہندی، طبع اول ۱۸۶۸ء، صفحہ ۳۰۱

ہیں کہ :

"اس کتاب کی دو فصل اور ایک خاتمہ ہے۔ پہلی فصل میں چودھری صاحب کے مرتب کیے ہوئے خطوط اور ان کا لکھا ہوا دیباچہ، دوسری فصل میں میرے جمع کیے ہوئے رقعات اور خاتمے میں چند نثریں ہیں جو جناب غالبؔ نے اوروں کی کتابوں پر تحریر فرمائی ہیں"۔[۱]

۱۔ پہلی فصل میں چودھری صاحب کے مرتب کیے ہوئے خطوط اور ان کا لکھا ہوا دیباچہ۔

۲۔ دوسری فصل میں میرے (محمد ممتاز علی خاں کے) جمع کیے ہوئے رقعات۔

۳۔ خاتمے میں چند نثریں جو غالب نے اوروں کی کتابوں پر تحریر فرمائیں۔

یہاں منشی غلام غوث بے خبر درمیان سے بالکل نکل ہی گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مجموعے کی ترتیب و تدوین میں بے خبر کے انہماک اور ان کی محنت اور مساعی کو سب سے زیادہ دخل رہا ہے لیکن کتاب چونکہ ممتاز علی خاں اور چودھری عبدالغفور سرورؔ کے دیباچے کے ساتھ چھپی، اس لیے مرتب اصلی یعنی بے خبر پس منظر میں چلے گئے اور ممتاز علی خاں کے بیان میں صرف ضمناً ان کی معاونت کا ذکر آگیا جبکہ اصلاً یہ ذخیرہ بہت کچھ بے خبر ہی کی بدولت بہم پہنچا۔

سرور نے منشی ممتاز علی خاں کی فرمائش پر رقعاتِ غالبؔ جمع کیے اور اس پر دیباچہ لکھا۔ یہ مجموعہ اور دیباچہ خواجہ غلام غوث بے خبر کے پاس آیا اور مزید خطوط کی فراہمی اور ترتیب کے سلسلے میں کئی سال ان کی تحویل میں رہا۔ "فغانِ بے خبر" اور "انشائے بے خبر" کے نام سے خواجہ غلام غوث بے خبر کے خطوں اور تقریظوں وغیرہ کے دو مجموعوں میں غالب اور بعض دیگر اصحاب کے نام بے خبر کے خطوط، اس امر پر شاہد ہیں کہ حقیقتاً "عودِ ہندی" کی ترتیب کا کام صحیح معنوں میں انھی نے انجام دیا اور اس کارِ ضروری میں انھیں غالب کی تائید، استمداد اور مشورت و رہنمائی بھی حاصل رہی۔ "انشائے بے خبر" میں غالب کے نام ایک خط سے "عودِ ہندی" کی ترتیب و تدوین اور اس میں بے خبر کے دخل اور دلچسپی پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں :

---

[۱] عودِ ہندی، ایضاً، صفحہ ۳

"حضرت، نسخہ "عودِ ہندی" کا ممتاز علی خاں صاحب کی فرمائش سے مرتب ہو رہا ہے۔ چودھری عبدالغفور سرور صاحب کے پاس سے آپ کے خطوط اور ان کا دیباچہ آگیا۔ میں نے سوائے اس کے کہ آپ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ کالپی اور لکھنؤ اور بریلی اور گورکھپور اور اکبرآباد سے آپ کی تحریریں فراہم کیںؔ۔ خود سب کو دیکھا، جو مضامین لائق اعلان کے نہ تھے، ان کو نکال ڈالا، کاتب لکھ رہا ہے، میں مقابلہ کرتا ہوں اب تک بڑے ورقوں کے دس جزو مرتب ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ ادھر (اگست) کا آغاز ہو، ادھر اس مجموعہ کا انجام ہو۔ میں اپنے حق سے ادا ہوں چھپوانے کے لیے ان کے حوالے کروں۔ اس وقت بھی مقابلے میں معروف ہوں، پڑھتے پڑھتے آپ کو لکھنے کا خیال آیا کہ نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ، منشی حبیب اللہ صاحب ذکاؔ، میاں داد صاحب سیاحؔ، ان حضرات کے پاس بھی آپ کے رقعات ضرور ہوں

ؔ پنڈت مہیش پرشاد لکھتے ہیں:

"اس بنا پر یہ ضرور ہے کہ موصوف ذیل حضرات کے نام کے خطوط خواجہ صاحب نے خود جمع کیے، البتہ یہ ممکن ہے کہ ان کی فراہمی میں منشی محمد ممتاز علی صاحب سے (کچھ) مدد ملی ہو:

انورالدولہ شفق (کالپی)، مہر (آگرہ)، عبدالرزاق مچھلی شہری، اس زمانے میں گورکھپور میں مقیم تھے، جنون (بریلی)، مفتی عباس (لکھنؤ)، مولوی عزیزالدین، رعنا، شیفتہ وغیرہ

خواجہ صاحب چونکہ اس صوبے کے اعلیٰ حاکم کے میر منشی تھے اور ادیب بھی تھے، لہٰذا اس صوبے سے تعلق رکھنے والی تحریروں کو وہ بآسانی اِک جا کرسکے۔ باقی جس طرح مولوی عبدالغفور نساخ کے نام کے خط کا مسودہ خواجہ بے خبر صاحب کے پاس غالب نے خود بھیجا تھا، اسی طرح ممکن ہے کہ ان حضرات کے خطوط کی نقلیں بھی مرزا غالبؔ ہی نے خواجہ بے خبر صاحب کو بھیجی ہوں، جیسا کہ خود لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب سے "بہت کچھ حاصل کیا"۔ مجروحؔ، سرفراز حسین، علائی، تفتہ، مرزا یوسف علی عزیزؔ اور ظہیرالدین کی طرف سے خط۔"

[مہیش پرشاد، ہندوستانی، الہ آباد، اکتوبر ۱۹۳۵ء، صفحہ ۷۳-۳۷۲]

میرزا رحیم بیگ میرٹھی کے نام طویل خط پہلے ہی الگ رسالے کی صورت میں چھپ چکا تھا (نامۂ غالب، مطبع محمدی، دہلی ۱۸۶۵ء) بے خبر کو آسانی سے مل گیا ہوگا۔ نساخ کے نام کا خط خود غالب نے بے خبر کو بھیجا۔ انورالدولہ کے نام کا کم از کم ایک خط تو یقیناً غالب کے ایما پر غالب کو ملا اور خود بے خبر کے نام کے ۲۵ خط بھی بے خبر کے ہاتھوں شاملِ کتاب ہوئے۔ غرض یہ کہ "عودِ ہندی" کی ترتیب اور فراہمیٔ مکاتیب میں بے خبر شریکِ غالب معلوم ہوتے ہیں۔

گے۔ آپ انھیں ایسا کریں کہ جس کے پاس جو کچھ ہو، بسبیل ڈاک میرے پاس بھیج دیں۔ رامپور تو میں نے خود لکھا ہے، شاید وہاں سے بھی کچھ آجائے۔ جب تک کتاب تمام ہو، اور جس قدر خطوط ہاتھ آویں اور اس میں شامل ہوں غنیمت ہے۔"[۱]

اتفاق سے اس خط کا جواب بھی محفوظ ہے، غالب لکھتے ہیں :

"آپ کو معلوم رہے کہ منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب مصطفیٰ خاں (شیفتہ) حسرتی کو کبھی اردو خط نہیں لکھا۔ ذکا کو غزل اصلاحی کے ہر شعر کے تحت میں منشار اصلاح سے آگہی دی جاتی ہے۔ نواب صاحب (شیفتہ و حسرتی) کو یوں لکھا جاتا ہے:

" کہار آیا، خط لایا، آم پہنچے، کچھ بانٹے، کچھ کھائے، بچّوں کو دُعا، بچّوں کی بندگی، مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام —— " یہ تحریر اس ہفتے میں گئی ہے' غرض کہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب یہ عبارت، جو تم کو لکھ رہا ہوں، یہ لائق شمول مجموعۂ نثرِ اُردو کہاں ہے؟ یقین جانتا ہوں کہ ایسی نثروں کو آپ خود نہ درج کریں گے۔"[۲]

مولانا غلام رسول کے بقول :

"غالب کا یہ بیان صحیح نہیں، اغلب ہے کہ میرزا غالب کو یاد نہ رہا ہو۔ حبیب اللہ ذکا کے نام کم و بیش پندرہ خط مجموعۂ مکاتیب میں شامل ہیں۔ ان کی ابتدا جولائی ۱۸۶۲ء سے ہوئی اور یہ سلسلہ جنوری ۱۸۶۸ء تک برابر جاری رہا۔ نواب صاحب مصطفیٰ خاں کے نام بھی کم از کم ایک خط مجموعے میں موجود ہے۔ اغلب ہے کہ میرزا غالب کا خیال یہ ہو کہ نواب صاحب کو عموماً ایسے خط اُردو میں نہیں لکھے گئے جو مجموعے میں شامل ہونے کے لائق ہوں۔ ان میں سے ایک خط کی عبارت بھی مثالاً درج کر دی۔ مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی کو غالباً کوئی تازہ خط اس مضمون کا بھیجا گیا تھا۔"[۳]

۱۔ انشائے بے خبر، صفحہ ۱۱

۲۔ خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء، جلد ۱، صفحہ ۳۹۱، و بہ بعد

۳۔ خطوطِ غالب، طبع اوّل، مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء، جلد ۱، صفحہ ۳۹۱ و بہ بعد۔

خواجہ غلام غوث بے خبر کے مذکورہ خط اور غالب کے جواب خط سے دو اہم باتیں سامنے آتی ہیں :

۱ ۔ غالب کے خطوں میں سے ایسے مضامین کو نکال دیا گیا ، جنہیں بے خبر نے اعلان کے لائق نہیں سمجھا ۔

۲ ۔ غالب نے بے تکلف دوستانہ خطوط کو جنہیں وہ بہ عبارت " عامیانہ " بتاتے ہیں مجموعے میں درج کرنے سے منع کر دیا تھا ۔ گویا صرف ایسے خطوں کے شمول کی اجازت تھی جو علمی و فنی مباحث پر مبنی ہوں یا جن میں بطریق انشا پردازی ، عبارت آرائی کی گئی ہو ۔

لیکن " عودِ ہندی " کے نام سے جو مجموعہ سامنے آیا ، معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اس دوسری بات کا سختی سے لحاظ نہیں رکھا گیا اور بے تکلف دوستانہ خطوط کو بھی جنہیں دراصل خطوطِ غالب کی جان سمجھنا چاہیے ، اس مجموعے میں کسی قدر جگہ مل گئی ہے ۔ غالب نے ' بے خبر کے نام اپنے مذکورہ بالا خط کے آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ :

" جناب کیمسن صاحب بہادر افسرِ مدارس غرب و شمال کا ، باوجود عدم تعارف ، خط مجھ کو آیا ..... نظم و نثرِ اردو طلب کی تھی ، مجموعۂ نظم بھیج دیا ۔ نثر کے باب میں تمہارا نام نہیں لکھا ، مگر یہ لکھا کہ مطبع الہ آباد میں وہ چھاپا جاتا ہے ۔ بعد انطباع و حصول اطلاع ، وہاں سے منگوا کر بھیج دوں گا ۔ "[۱]

اس کے جواب میں بے خبر نے غالب کو لکھا کہ :

" منشی ممتاز علی خاں صاحب کو میں نے کل لکھا کہ آپ ایک عرضی جناب کیمسن صاحب بہادر افسرِ مدارس کے حضور میں بھیج دیں اور اس میں یہ لکھیں کہ حضرت غالب نے آپ کو جس مجموعۂ نثر کا ذکر لکھا ہے ، اُسے میں مرتب کرتا ہوں ' عنقریب چھپنا شروع ہو گا ۔ کچھ جلدیں مدرسوں کے لیے آپ بھی خریدیں تو آپ کی اس اعانت سے کتاب جلد چھپ جائے ۔ اس سے بہتر اور کوئی طریقہ ' صاحب تک اس ذکر پہنچانے کا میری رائے میں نہ آیا ۔ "[۲]

---

۱ ؎ بے خبر کا قیام الہ آباد میں تھا ۔ غالباً اس بنا پر غالب کو یہ خیال ہوا کہ مجموعہ وہیں چھپ رہا ہو گا ۔

۲ ؎ خطوط غالب ، ایضاً ، جلد ۱ صفحہ ۲۹۳

۳ ؎ فغانِ بے خبر ، صفحہ ۸۱

اسی خط میں بےؔخبر نے غالبؔ کو مطلع کیا اور اُن سے پوچھا کہ :

"جا بجا سے جو آپ کے خطوط جمع کیے گئے، وہ اصل تو کہیں سے آئے نہیں، نقلیں آئیں۔ سرورؔ کے نام کے ایک خط میں جلال اسیرؔ کا ایک مصرعہ لکھا ہے، وہ اسی قدر پڑھا جاتا ہے۔ "زغیر در شکر آب است" مارہرے والوں کے خط کا حال تو آپ پر خوب ہویدا ہے۔ دوسرے لفظ "بینش" کو کہیں مذکر لکھا ہے اور کہیں مونث، آپ تو اسے مخنث کیوں بناتے، مگر یہ خرابی بھی کاتب سے ہوئی ہے۔ ان دونوں کی تصحیح لکھیے تو کتاب میں صحیح لکھ دیا جائے۔"[۱]

ایک دوسرے خط میں بےؔخبر نے غالبؔ کو لکھا کہ :

"یہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ مرزا محمد خاں صاحب سے اپنی اُردو نثریں لے کر مجھے بھیجے گا، اس کا کچھ جواب ہی ارشاد نہ ہوا۔"[۲]

"عودِ ہندی" طبع اوّل میں تفتہؔ کے نام غالبؔ کا ایک خط شامل ہے (صفحہ ۹۹-۱۰۰) غالب کے ایک خط بنام بےؔخبر سے معلوم ہوتا ہے کہ بےؔخبر نے غالبؔ سے تفتہؔ کے نام کے خط فراہم کرنے کی تحریک بھی کی تھی۔ غالبؔ جواباً لکھتے ہیں کہ :

"حضرت پیر و مرشد! اس سے آگے آپ کو ..... لکھ چکا ہوں کہ تفتہؔ کو میں نے خط نہیں لکھا۔ اشعار اُن کے آئے، اصلاح دے دی حسبِ منشار اصلاح جا بجا حاشیہ پر لکھ دیا۔ کل جو عنایت نامہ آیا، اس میں بھی ..... تفتہؔ کے خطوط کا حکم مندرج پایا۔ ناچار تحریرِ سابق کا اعادہ کر کے حکم بجا لایا۔"[۳]

غالبؔ کا یہ جواب تو کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں کہ تفتہؔ کو انھوں نے خط لکھے ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کے محفوظ اُردو خطوط، سب سے زیادہ تفتہؔ ہی کے نام ہیں۔ یہ تعداد میں سوا سو کے لگ بھگ ہیں اور ابھی جیسا کہ مولانا غلام رسول مہرؔ نے بھی لکھا ہے[۴] یقین ہے

---

[۱] - فغانِ بےخبر، صفحہ ۸۲

[۲] فغانِ بےخبر، صفحہ ۱۰۰

[۳] خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۷۹

[۴] خطوطِ غالب، طبع اوّل، ایضاً، ۱۹۶۹ء، جلد ۱، صفحہ ۲

کہ خاصے خط تلف بھی ہوگئے۔ مثلاً تفتہ کے نام دستیاب خطوں میں زمانی اعتبار سے جو پہلا خط ہے، اُس کی عبارت ہی سے ظاہر ہے کہ یہ پہلا خط نہیں بلکہ اس سے پیشتر کے خطوط بھی ہونے چاہئیں جو نہیں مل سکے۔ پھر ۱۸۴۸ء، ۱۸۵۰ء، ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء کا صرف ایک ایک خط ہے۔ یہ امر قرینِ قیاس نہیں کہ گہرے تعلقات کے باوصف ان برسوں میں صرف ایک ایک خط لکھا گیا ہو۔ مزید برآں غالب کے دستیاب خطوں میں تفتہ کے نام ۱۸۶۵ء کے بعد کا کوئی خط نہیں، حالانکہ تفتہ کے روابط، کوئی وجہ نہیں کہ غالب سے آخر وقت تک استوار نہ رہے ہوں۔

میرا خیال ہے کہ غالب نے اگر واقعتاً تفتہ ہی کے بارے میں یہ لکھا ہے تو اس میں یہ مصلحت کارفرما رہی ہوگی کہ تفتہ کے نام کے خطوں کی فراہمی کی فکر میں کتاب پڑی ہی نہ رہے، جلدی سے چھپ کر ایک طرف ہو۔ بصورتِ دیگر یہ غالب کا سہوِ قلم ہے یا اس میں کاتب کی کرشمہ سازی کو دخل ہے۔ غالب کے خط کا جملہ یہ ہے:

"اس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں کہ تفتہ کو میں نے خط نہیں لکھا۔ اشعار اُن کے آئے اصلاح دے دی، منشار اصلاح جابجا حاشیے پر لکھ دیا۔"[1]

بے خبر کے نام "اس سے آگے" کے کسی خط میں تفتہ کا ذکر نہیں آیا۔ ذکا کے بارے میں غالب نے ضرور بے خبر کو یہ لکھا تھا کہ:

"ذکا ..... کو کبھی اُردو خط نہیں لکھا ...... غزل اصلاحی کے ہر شعر کے تحت منشار اصلاح سے آگہی دی جاتی ہے۔"[2]

غالباً زیرِ بحث خط میں بھی ذکا ہی لکھنا چاہا ہوگا، تفتہ لکھا گیا یا کاتب کو سہو ہوا اور وہ "ذکا" کی جگہ "تفتہ" لکھ گیا یا اُس نے "ذکا" کو پڑھا ہی "تفتہ" اور تفتہ لکھ دیا۔

بہرنوع یہ تمام شواہد اس امر پر مظہر ہیں کہ بے خبر کو "عودِ ہندی" کی جمع و ترتیب میں کس درجہ انہماک اور دخل تھا۔ جزئیات تک پر اُن کی نظر رہی اور اس بارے میں خود غالب سے نہ صرف اُن کا رابطہ رہا بلکہ انھیں برابر غالب کی تائید و اعانت بھی حاصل رہی۔ غالب نے

---

[1] خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۷۹

[2] خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۹۱

اپنی بعض تحریریں مجموعے میں شمولیت کی غرض سے خود بے خبر کو بھیجیں۔ ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں :

"پیر و مرشد، کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتے میں۔ مولوی عبدالغفور اُن کا نام اور نساخ اُن کا تخلص ہے۔ میری ان کی ملاقات نہیں۔ انھوں نے اپنا دیوان چھاپے کا موسوم بہ "دفترِ بے مثال" مجھ کو بھیجا۔ اس کی رسید میں یہ خط میں نے اُن کو لکھا چونکہ یہ خط مجموعۂ نثرِ اُردو کے لائق ہے، آپ کے پاس ارسال کرتا ہوں۔" [1]

نساخ کے نام غالب کا یہ مرصع اور پرتکلف خط "عودِ ہندی" طبع اوّل میں موجود ہے۔ (صفحہ ۱۲۵۔۱۲۶)

اس خط کی ایک اہمیت یہ ہے کہ باعتبارِ مضمون اور باعتبارِ انشاد عبارت، اس خط کا تجزیہ کر کے، غالب کے اُس تصور کا تعین کیا جا سکتا ہے، جو وہ اپنے لائقِ اشاعت رقعات کے بارے میں رکھتے تھے۔ اسی طرح ایک اور خط میں بے خبر کو لکھتے ہیں :

"میرے ایک رشتے دار کے بھتیجے نے "بوستانِ خیال" کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ میں نے اُس کا دیباچہ لکھا ہے۔ ایک دو ورقہ اس کا بصورت پارسل بلکہ بہ ہیئت خط بھیجتا ہوں۔ آپ کا مقصود دیباچہ ہے، سو نقل کر لیجیے۔" [2]

یعنی اشارہ ہے کہ اس کا دیباچہ، میرے اُس مجموعۂ نثر کے لیے نقل کر لیجیے جو آپ ترتیب دے رہے ہیں۔ "بوستانِ خیال" کی پہلی جلد کا یہ اُردو ترجمہ "حدائق انظار" کے نام سے خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان دہلوی نے کیا تھا۔ اس کا دیباچہ مرقومۂ غالب "عودِ ہندی" طبع اوّل کے خاتمے (صفحہ ۱۸۲-۱۸۴) میں موجود ہے۔

۱۵ فروری ۱۸۶۴ء کے ایک خط موسومہ انور الدولہ شفق کو غالب نے اس "گزارش" پر ختم کیا ہے :

"اگر ان سطور کی نقل میرے مخدوم مولوی غلام غوث خاں بہادر، میر منشی لفٹیننٹ گورنری غرب و شمال کے پاس بھیج دیجیے گا تو اُن کو خوش اور مجھ کو ممنون کیجیے گا۔" [3]

---

[1] خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۷۰

[2] خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۷۷

[3] خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۴۹

مطلب یہ ہے کہ میرے اس خط کی نقل، اُس مجموعۂ نثر کے لیے بھیج دی جائے، جس کی ترتیب کا کام منشی غلام غوث بے خبر کے پیش نظر ہے۔

مختصر یہ کہ "عودِ ہندی" کی ترتیب میں بے خبر کی مساعئ جمیلہ اور انہماکِ جلیلہ کو بے حد دخل تھا اور دربارۂ خاص انھیں غالب کی تائید بھی حاصل تھی۔ خواجہ غوث بے خبر کے نام غالب کے ایک سے زیادہ خطوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بے خبر نے باصرار و تکرار خواہش ظاہر کی تھی کہ غالب اپنے اس مجموعۂ نثر پر خود دیباچہ لکھیں۔ لیکن غالب، عذرِ علالت کی بنا پر اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ایک خط میں غالب انھیں لکھتے ہیں:

"حضرت پیر و مرشد، اس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی خاں صاحب سے میری ملاقات ہے اور وہ میرے دوست ہیں یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ میں صاحب فراموش ہوں۔ اٹھنا، بیٹھنا ناممکن ہے ..... اس حال میں دیباچہ کیا لکھوں؟ کل جو عنایت نامہ آیا، اُس میں بھی دیباچے کا اشارہ ..... مندرج پایا۔ ناچار تحریرِ سابق کا اعادہ کر کے حکم بجالایا۔"[۱]

یعنی عذرِ سابق کا اعادہ کر کے تعمیلِ ارشاد سے معذرت چاہ لی۔ بے خبر نے غالباً پھر دیباچے کے لیے کہا کہ بے دیباچہ، کتاب کیوں کر چھپے گی؟ غالب جواباً لکھتے ہیں کہ:

"بندہ پرور! اگر ایک بندۂ قدیم کہ عمر بھر فرمان پذیر رہا ہو، بڑھاپے میں ایک حکم بجا نہ لائے تو مجرم نہیں ہو جاتا۔ مجموعۂ نثر اُردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچے پر موقوف ہے تو اس مجموعے کا چھپ جانا "بالفتح" میں نہیں چاہتا بلکہ چھپ جانا 'بالضم' چاہتا ہوں۔ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

رسم است کہ مالکانِ تحریر

آزاد کنند بندۂ پیر

آپ بھی اسی گروہ یعنی مالکانِ تحریر میں سے ہیں۔ پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے؟"[۲]

---

[۱] خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۷۹

[۲] خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۸۱۔

حاصل یہ کہ غالب اپنے مجموعے پر آپ دیباچہ لکھنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔

بے خبر نے "عودِ ہندی" کی جمع و ترتیب میں بہت وقت صرف کیا۔ خطوط کی فراہمی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ غالب نے بھی اعانت اور استمداد کی۔ بایں ہمہ اس کوشش و کاوش کے باوجود بمشکل پونے دو سو کے قریب خط جمع کیے جا سکے یا کیے کہ لائقِ اشاعت اتنے ہی سمجھے گئے۔ بے خبر نے ان کی جلد بندھوائی اور اشاعت کی غرض سے مولوی ممتاز علی خاں کو بھیج دی۔ "انشائے بے خبر" کا ایک خط، اس ضمن میں اہم ہے۔ بے خبر، غالب کو لکھتے ہیں:

> "عالی جناب! میں نے ایک عریضہ اس سے پہلے آپ کو بھیجا ہے۔ اس میں یہ مطلب، جواب طلب لکھا ہے کہ مولوی جہانگیر نگری نے جو رسالہ تصنیف کیا ہے، اس کا نام کیا ہے؟ اور وہ کہاں چھپا ہے، آج تک جواب نہیں، کیوں کر مجھے حیرت نہ ہو، جب ترکِ جوابِ حضرت کی عادت نہ ہو۔ جواب عنایت کیجیے، مجھے بلائے انتظار سے نجات دیجیے۔ الحمد للہ کہ "عودِ ہندی" کی ترتیب تمام ہوئی۔ جلد بندھوا کر آج منشی ممتاز علی خاں صاحب کی خدمت میں روانہ کر دی۔ آپ چھپوانے میں دیر کریں یا جلدی، انھیں اختیار ہے۔"[۱]

اس خط پر، بے خبر کے دوسرے خطوں کی طرح کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن بعض داخلی قرائن سے یہ ۱۸۶۶ء کا قرار پاتا ہے۔ مولوی صاحب جہانگیر نگری کے جس رسالے کا بے خبر کے اس خط میں ذکر ہے، اُس کا نام "مؤید برہان" ہے اور یہ رسالہ ۱۸۶۶ء میں مولوی احمد علی جہانگیر نگری نے غالب کی "قاطع برہان" کے رد میں لکھا تھا اور کلکتے سے ٹائپ میں بہت اہتمام سے چھپا تھا۔ ایک دوست نے کلکتے سے غالب کو اس کی اطلاع دی۔ غالب نے محض اس اطلاع پر "مؤید برہان" کو دیکھے بغیر[۲] اکتیس (۳۱) اشعار کا ایک فارسی قطعہ لکھا اور چھپوا کر نزدیک و دور احباب کو بھیج دیا۔ یہ ایک قطعہ ایک ورق پر اکمل المطابع، دہلی میں چھپا۔ منشی حبیب اللہ ذکا،

---

[۱] انشائے بے خبر، صفحہ ۱۱ و ما بعد

[۲] دیکھیے حبیب اللہ ذکا کے نام ۱۶، شعبان ۱۲۸۳ھ / ۲۴، دسمبر ۱۸۶۶ء کا خط مشمولہ، اردوئے معلیٰ دہلی ۱۸۶۹ء، صفحہ ۴۴

کے نام ۴، دسمبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں اس کا ذکر اس طرح آیا ہے گویا یہ اس سے کچھ پہلے اور ذکار کے نام پچھلے موجود خط مورخہ ۱۲، مئی ۱۸۶۶ء کے بعد چھپا تھا۔ اس قطعہ کا مطبوعہ عنوان یہ ہے:

"قطعہ در گزارش سپاس یاد آوری بعالی خدمت جناب مولوی
آغا احمد علی صاحب جہانگیر نگری"۔

اور اس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخہ‌ٔ
در خصوص گفتگوئ پارسی انشا کردہ است

اس قطعہ میں مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری کے نسخے "مؤید برہان" کا نام کہیں نہیں آیا۔ یقیناً یہی مطبوعہ قطعہ، غالب نے بے خبر کو بھیجا ہوگا اور قدرتی طور پر انھیں مولوی صاحب جہانگیر نگری کے رسالے کا نام جاننے کا تجسس ہوا اور انھوں نے غالب سے پوچھا کہ اس رسالے کا نام کیا ہے اور وہ کہاں چھپا ہے؟

اس خط کا زمانۂ کتابت ۱۲، مئی سے ۴، دسمبر ۱۸۶۶ء کے مابین طے پاتا ہے۔ اس میں انھوں نے "عودِ ہندی" کے ترتیب پا جانے اور اشاعت کے لیے اُسے صاحب مطبع ممتاز علی خاں کے حوالے کر دینے کی اطلاع دی ہے۔ لیکن ایک اور ذریعے سے "عودِ ہندی" کے مسودے کا صاحبِ مطبع کے سپرد کیے جانے کا زمانہ ۱۲، مئی سے ۴، دسمبر ۱۸۶۶ء کے مقابلے میں اور زیادہ متعین طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔ صاحب عالم مارہروی کے نام غالب کے ایک خط مرقومہ ۲۶، اگست ۱۸۶۶ء کا یہ ٹکڑا دیکھیے:

"چودھری عبدالغفور صاحب (کی خدمت میں) سلام پہنچائیں اور یہ بھی کہہ دیں کہ مولوی غلام غوث خاں، میر منشی نے آپ کا دیباچہ اور میرا مجموعۂ نثر مرتب کر کے منشی ممتاز علی خاں کو بھیج دیا ہے، اب چھپوانے میں ان کو اختیار ہے"[1]

یہ خط ۲۶، اگست ۱۸۶۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ گویا "عودِ ہندی" کا مسودہ اس تاریخ سے پہلے اشاعت کے لیے مطبع میں بھیجا گیا۔ مسودہ ایک ذریعے سے منشی ممتاز علی خاں کو بھجواتے ہوئے بے خبر نے

---

[1] خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، ایضاً، جلد ۲، صفحہ ۵۰۷

انھیں جو خط لکھا، حسنِ اتفاق سے وہ بھی محفوظ ہے وہ لکھتے ہیں کہ :

"مرزا نوشہ صاحب کے نثر کا مجموعہ مرتب کرکے آج ...... (؟) صاحب کے حوالے کیا ہے (کہ) غازی الدین حسین خاں صاحب کے پاس بھیج دیں اور وہ آپ کی خدمت میں روانہ کریں۔ مصنف آپ کے بہت قریب ہیں۔ ایک نظر ان کو بھی دکھا لیجیے، تب چھپوانا شروع کیجیے تو بہتر ہے۔ فقیر نے اس کے ترتیب دینے اور لکھوانے اور بذاتِ خود مقابلہ کرنے ہی میں محنت نہیں کی بلکہ اتنا تردد اور کیا کہ جو رقعات بریلی سے آئے ہوئے تھے (آپ نے لکھوادیے) لکھوادیے، ان کو وہاں سے مکرر منگوایا اور سوائے اس کے کہ گورکھپور، لکھنؤ، کانپور سے کچھ بہم پہنچایا اور نئی نثریں مصنف سے اور لیں اور ان سب کو بھی مجموعے میں داخل کیا اور جہاں کہیں شک ہوا مصنف سے اس کی تصحیح کرلی۔ اب اگر یہ مجموعہ طاقِ نسیاں پر رکھا نہ رہے اور جلد چھپے تو مصنف پر احسان ہوگا۔ فقیر کے پاس تو اصل موجود ہے۔ جب دیکھے گا کہ آپ نہیں چھپواتے تو اپنے کاتب سے ایک نسخہ اور لکھوالے گا اور جو جو نقل کے طالب ہوں گے، ان کو دے دے گا۔"[1]

لیکن اس تقریر و تنبیہ کے باوجود، ممتاز علی خاں نے اس مجموعے کو طاقِ نسیاں پر ڈالے رکھا اور اگست ۱۸۶۶ء کے بعد یہ کتاب جو دو سو صفحات کی بھی نہیں تھی، دو برس دو ماہ تک تعویق میں پڑی رہ کر بالآخر ۲۷، اکتوبر ۱۸۶۸ء کو غالب کے انتقال سے قریب پونے چار ماہ پہلے شائع ہوئی۔ پھر دیر آید درست آید والی بات بھی نہ ہوئی، یعنی کتاب کی طباعت میں دیر لگی اور یہ درست بھی نہیں چھپی۔ مطبوعہ نسخہ بے خبر کو ملا تو تاثر یہ تھا کہ مرزا غالب کے رقعات کا یہ مجموعہ "عودِ ہندی" :

"افسوس ہے کہ نہایت غلط چھپا، بہت جگہ غلطی سے مطلب خبط ہے۔"[2]

"عودِ ہندی" کا یہ پہلا ایڈیشن ۹½ × ۶ انچ پر ۱۹ سطری مسطر کی بڑی تقطیع کے ۱۸۸ صفحات

---

[1] انشائے بے خبر، صفحہ ۴۵

[2] نامہ۔ مورخہ ۔ الفہ ۔ نقادہ بے خبر، صفحہ ۱۴۱

پر مشتمل ہے۔ سرورق[۱] کی جدول پھولدار ہے اور سفید زمین پر صفحے کے وسط میں پھولوں کے درمیان خوش خط جلی قلم سے "عودِ ہندی" لکھا ہوا ہے۔ سرورق کا ڈیزائن مجموعی طور پر "دیوانِ غالب" نظامی ایڈیشن، کانپور (۱۸۶۲ء) سے بہت حد تک مماثل اور مشابہ ہے۔ سرورق پر ایک جلی شعر کے بعد یہ عبارت ثبت ہے:

بفضل واہب العطیات خالق الخیر والحسنات انشاء اُردو لاجواب موسومہ بہ

عودِ ہندی

من تصنیف جناب استادِ زمان علّامہ عصر اسد اللہ خاں المتخلص بہ غالب

حسب فرمائش مجمع خوبی جہان میاں محمد ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ

در مطبع مجتبائی واقع میرٹھ طبع گردید

سرورق کی پشت یعنی صفحہ ۲ سے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے زیرِ عنوان صاحبِ مطبع محمد ممتاز علی خاں کے "حرفِ مطلب" ہیں۔ یہ صفحہ ۳ تک گئے ہیں۔ اسی صفحے کے بقیہ حصّے سے چودھری عبدالغفور سرور کا لکھا ہوا دیباچہ شروع ہوتا ہے۔ سرور کا دیباچہ مرصع اور مقفّیٰ عبارت میں ہے۔ اسے غالب نے طباعت سے قبل دیکھا تھا اور ایک مقام پر جزواً عبارت کی اصلاح کی تھی، لیکن بحیثیتِ مجموعی سرور کو اس نگارش پر ان لفظوں میں داد دی تھی:

"آپ نے دیباچہ بہت اچھا لکھا ہے، کتاب کو اس سے رونق ہو جائے گی۔"[۲]

سرور کا دیباچہ صفحہ ۶ پر ختم ہوا ہے۔ اسی صفحے سے غالب کے رقعات شروع ہو جاتے ہیں۔ کتاب کی دو فصلیں اور ایک خاتمہ ہے۔ پہلی فصل میں چودھری عبدالغفور سرور کے مرتب کیے ہوئے خط ہیں اور دوسری فصل کے خط منشی محمد ممتاز علی خاں اور خواجہ غلام غوث بے خبر کی جمع و ترتیب

---

[۱] "عودِ ہندی" کا پہلا ایڈیشن دو طرح کے سرورق کے ساتھ چھپا۔ یہ دوسرا ایڈیشن قومی عجائب گھر، کراچی میں محفوظ بتایا گیا ہے۔ (بحوالہ: عکس سرورق مطبوعہ، ماہِ نو، کراچی فروری ۱۹۶۲ء، مابین صفحہ ۱۲، ۱۳) — "عودِ ہندی" کے یہ "دو طرح کے اوّلین" ایڈیشن ڈاکٹر خلیق انجم کے ایک قیمتی مقالے "عودِ ہندی" کا ایک پُراسرار ایڈیشن"، (مطبوعہ: نگار پاکستان، کراچی، جولائی، اگست ۱۹۸۴ء، ص ۱۸ — ۱۹) میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ زیرِ بحث آئے ہیں۔

[۲] خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، لاہور ۱۹۶۹ء، جلد ۲، صفحہ ۵۷۵

کا نتیجہ ہیں۔ خاتمے میں غالب کی ایسی چند تحریریں ہیں جو انھوں نے دوسروں کی کتابوں پر تقریظ یا دیباچے کے بطور قلم بند کیں۔

"پہلی فصل" صفحہ ۳ کے قریب وسط سے شروع ہو کر صفحہ ۴۷ کی پہلی سطر پر ختم ہوتی ہے؛ اس میں بظاہر کُل ۳۱ خط ہیں (۲۶ سرور کے نام، ۳ صاحبِ عالم مارہروی کے نام، اور دو شاہ عالم مارہروی کے نام) لیکن حقیقتاً یہ تعداد میں ۳۱ کے بجائے ۴۱ ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ کہ، سرور اور صاحبِ عالم دونوں کا تعلق مارہرہ سے تھا۔ سرور، صاحبِ عالم کے معتقدوں میں بمنزلہ عزیزوں کے تھے۔ غالب نے اکثر سرور کے نام خط آخر میں روئے سخن صاحبِ عالم کی طرف کر کے پورے کے پورے خط اُن کے نام بھی لکھ ڈالے ہیں (دیکھیے خط نمبر ۱، ۲، ۳، ۵، ۶، ۱۸، ۲۰، ۲۵، ۲۸) اس طرح غالب کے نو خط جو دراصل صاحبِ عالم مارہروی کے نام ہیں، چودھری عبدالغفور سرور کے نام کے خطوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ سرور کے نام ایک خط نمبر ۲ میں غالب نے شیفتہ کے نام اپنے ایک پُرانے مطبوعہ فارسی خط کو بھی نقل کیا ہے[۱]۔ اسے بھی الگ شمار کیا جانا چاہیے۔

صرف ایک خط جو شیفتہ کے نام ہے (صفحہ ۱۱، ۱۲) فارسی میں ہے۔ باقی چالیس اُردو میں ہیں۔ چودھری عبدالغفور سرور کے نام ۲۶، صاحبِ عالم کے نام ۱۲، اور شاہ عالم کے نام ۲، ان میں سے کسی ایک مکتوب الیہ کے سب خط ایک ہی جگہ نہیں ہیں، خط نمبر ۷، ۱۷ اور ۲۳ صاحبِ عالم کے نام ہیں۔ خط نمبر ۱۱ اور ۱۵ شاہ عالم کے نام؛ اور خط ۱ تا ۶، ۸ تا ۱۰، ۱۲ تا ۱۴، ۱۶، ۱۸ تا ۲۲ اور ۲۴ تا ۳۱ سرور کے نام ہیں۔

یہ سب کے سب خط ۱۸۵۸ء سے لے کر ۱۲۷۸ھ [۶۲-۱۸۶۱ء] کی درمیانی مدت کے ہیں، لیکن انھیں جمع کرنے میں تاریخ نگارش کی ترتیب بھی ملحوظ نہیں رکھی گئی، گو بجائے خود ایسا بھی نہیں کہ خطوں کی تاریخوں کے اندراج کا لازماً اہتمام کیا گیا ہو۔ یہ عدم احتیاط اور بے ترتیبی کتاب کی صرف "پہلی فصل" ہی سے خاص نہیں ہے، تا آخر صورتِ حال اس سے مختلف نہیں۔ دراصل ان خطوں کی ترتیب کا محرک اوّل، صرف اور صرف زبان کا چٹخارہ

۱؎ یہ فارسی خط "پنج آہنگ" میں شامل ہے۔ دیکھیے: طبع دوم، مطبع دار السلام دہلی، ۱۸۵۳ء، صفحہ ۲۹۱

یا ادبی نکات سے استفادہ تھا اور اس کے لیے ترتیب و تدوین کے وہ سارے اہتمام جنھیں آج تحقیق و تدوین کے مبادیات میں خیال کیا جاتا ہے، اُس وقت پیش نظر نہیں رکھے گئے یا غیر ضروری سمجھے گئے:

"عودِ ہندی" کی "دوسری فصل" ۱۳۵ رقعاتِ غالب پر مشتمل ہے۔ اس میں مجروح کے نام سب سے زیادہ خط ہیں۔ یہ تعداد میں ۳۱ ہیں۔ اس کے بعد بے خبر کے نام ۲۵، شفق کے نام ۲۰، مہر کے نام ۱۷، شاکر کے نام ۱۰، مرزا یوسف علی عزیز اور مردان علی خاں رعنا کے نام دو دو اور علائی، سرفراز حسین، تفتہ، نساخ، شیفتہ، مولوی عزیز الدین اور مفتی عباس کے نام ایک ایک خط۔ "نامۂ غالب" (مطبوعہ ۱۸۶۵ء) بنام میرزا رحیم بیگ میرٹھی بھی "عودِ ہندی" میں شامل ہے (صفحہ ۱۴۱-۱۵۵)۔ حکیم غلام نجف خاں کے بیٹے ظہیر الدین کی جانب سے (غالب کا مکتوبہ) اُن کے چچا کے نام ایک خط بھی "عودِ ہندی" (صفحہ ۱۲۶-۱۲۷) میں شریکِ اشاعت ہے۔

"خاتمہ" تقریظاتِ غالب پر مبنی ہے، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ تقریظ بر مثنوی مہر	صفحہ ۱۷۹-۱۸۰
۲۔ تقریظ بر "گلزارِ سرور"	۱۸۰-۱۸۲
۳۔ دیباچہ "حدائق انظار"	۱۸۲-۱۸۴
۴۔ "قواعد تذکیر و تانیث" کا دیباچہ	۱۸۴-۱۸۵
۵۔ دیباچہ مجموعہ قصائد نادر	۱۸۵

ان پانچ تقریظات کے بعد، پھر غالب کا ایک خط ہے (صفحہ ۱۸۵-۱۸۶) یہ منشی غلام بسم اللہ کے نام ہے۔ بظاہر یہ رقعہ اوّلاً کتابت سے رہ گیا، یا اس وقت جامعین کے ہاتھ آیا ہوگا جب کتاب کی "دوسری فصل" جو رقعات پر مبنی تھی، چھپ چکی ہوگی، اس لیے اس تنہا رقعے کو "خاتمہ" کی تقریظات کے بعد لگا دیا گیا۔

صفحہ ۱۸۶ ہی سے "عودِ ہندی" کی پُرتکلف مسجع اُردو نثر میں تقریظ ہے جو بعد انطباع کتاب "عودِ ہندی" کے طابع محمد ممتاز علی خاں کی فرمائش پر بطور "عبارت خاتمہ" حکیم غلام مولا قلق میرٹھی، نے لکھی ہے اور کتاب کے صفحہ آخر ۱۸۸ تک چلی ہے۔ اس آخری صفحے پر تقریظ

قلق کے بعد قلق کا قطعۂ تاریخ انطباع ہے :

مطبوعِ طبع بے شک، بے شک ہے "عودِ ہندی"
کیا طرفہ گفتگو ہے، اُردو کا باغ ہے یہ
خود سالِ طبع دل سے کہتا ہے اے قلق لکھ
کیا سہل مادہ ہے "راحِ دماغ ہے یہ"

۱۲۸۵ھ

اس کے بعد منشی عبدالحکیم احمد محو، شاگرد قلق، رئیس میرٹھ کا قطعۂ تاریخ ہے :

جب چھپی "عودِ ہندی" غالب | دیکھ کر میں بھی باغ باغ ہوا
سوئے تاریخ آگیا جو خیال | کرتے ہی فکر انفراغ ہوا
یہ تہہِ دل سے شور اٹھا اے محو | لکھ بھی دے "طیب ہر دماغ ہوا"

۱۲۸۵ھ

آخری شعر کے مصرعۂ اول کے پہلو میں "در مطبع مجتبائی محمد ممتاز علی خاں" درج ہے، اور دوسرے مصرعے کے پہلو میں "۱۰ رجب ۱۲۸۵ ہجری طبع شد" کے لفظ رقم ہیں. گویا "عودِ ہندی" کی طباعت ۱۰ رجب ۱۲۸۵ ہجری، مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو غالب کی زندگی میں تمام ہوئی۔

منشی عبدالحکیم احمد محو کے قطعۂ تاریخ کے بعد دو فارسی قطعے حاشیے پر لکھے گئے ہیں۔ پہلے کا عنوان ہے "قطعۂ تاریخ" اور قطعہ یہ ہے :

چوں بہ کوشش عودِ ہندی طبع شد
از پریشانی خاطر جمع شد
بے سر بیم از پیش کردم رقم
نسخۂ مطبوع جاں ہا طبع شد

دوسرے قطعے کے عنوان میں صرف "دیگر" لکھا گیا ہے اور اس سے کتاب کا میور صاحب کے نام انتساب ظاہر ہوتا ہے۔ "میور" سے غالباً سر ولیم میور مُراد ہیں جو اُس زمانے میں ممالک مغربی و شمالی کے گورنر تھے۔ اس قطعۂ تاریخ و انتساب کے لفظ یہ ہیں :

چو میور صاحب والا مناقب
ہنر را داد داد ارجمندی
برائے نذر، ممتاز علی خاں
بیاورد ایں متاعِ حُسن و خوبی
زہے ایں آورد رنگیں مضامین
کلام از طبعِ اُو دَر خود فروشی
نوشتم از سرِ انصاف تاریخ
بہ ہوش آمد سخن زین "عودِ ہندی"

ان دو آخری قطعات پر کسی کا نام ثبت نہیں۔ مولانا امتیاز علی عرشی کا خیال ہے کہ یہ دو قطعات:

"غالباً خود منشی ممتاز علی خاں صاحب کے ہیں"[۱]

مجھے اسے قبول کرنے میں تأمل ہے کیوں کہ مولانا امداد صابری کے بقول:

"منشی ممتاز علی خاں کو ادب و شعر سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ البتہ وہ اچھے شاعروں اور نثر نگاروں کو ضرور پسند کرتے تھے۔ اس سلسلے میں اُن کو سب سے زیادہ غالب نے متاثر کیا تھا۔ غالب کے متعدد دوستوں اور شاگردوں سے ان کی دوستی بھی تھی، لیکن اُن کا اصل کام ٹھیکہ داری تھا۔ وہ سرکاری عمارتوں اور مکانوں کے ٹھیکے حاصل کرتے تھے۔"[۲]

اس پس منظر میں یہ قطعات، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ منشی ممتاز علی خاں کے تو قطعاً نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ خود غالب کے زائیدۂ فکر ہیں۔ "پریشانی خاطر جمع شد" اور "خود فروشی" والی بات وہ خود ہی کہہ سکتے تھے، پھر کتاب کو حکامِ عالی مقام کی نذر کرنا بھی خود غالب کا خاص شیوہ رہا ہے۔ ایک بات اور بھی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت میں تعویق سے غالب

---

[۱] مکاتیبِ غالب، طبع اوّل: مطبعۂ قیمہ، بمبئی، ۱۹۳۷ء، دیباچہ، صفحہ ۱۷۲

کو بہت اُلجھن تھی۔ بے خبر کے نام ۷، مارچ ۱۸۶۴ء کے خط میں پوچھتے ہیں:

"ہاں حضرت، کہیے ممتاز علی خاں کی سعی بھی مشکور ہوگی؟ وہ مجموعہ اُردو چھپا یا چُھپا ہی رہے گا۔ احباب اس کے طالب ہیں، بلکہ بعض نے طلب کو بسر حدِ تقاضا پہنچا دیا ہے۔"[۱]

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"اور ہاں حضرت، وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح یا چُھپے گا بالضم؟"[۲]

اور ایک اور خط میں بے خبر سے پوچھتے ہیں کہ:

"اجی حضرت، یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں؟ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ اُن سے کہیں۔"[۳]

حسنِ اتفاق دیکھیے کہ خواجہ غلام غوث بے خبر کا جواب بھی محفوظ ہے۔ وہ غالب کو لکھتے ہیں کہ میں الہ آباد سے مراد آباد جاتے ہوئے:

"میرٹھ ہو کر آیا۔ وہاں منشی ممتاز علی خاں صاحب کے بھانجے نے آپ کی اُردو انشا مجھے دکھائی، سب چھپ گئی، ایک صفحہ اخیر کا باقی ہے۔ خاں صاحب نے قطعۂ تاریخ کے انتظار میں کہ کوئی کہہ دے اُسے پھینک رکھا ہے۔ میں نے خاں صاحب کو لکھا تو ہے کہ قطعۂ تاریخ کا ہونا فرض نہیں۔ یوں ہی اس صفحے کو چھپوا کے کتاب تمام کر دیجیے، دیکھیے خدا کرے کہ وہ مان لیں۔"[۴]

منشی ممتاز علی خاں نے قطعۂ تاریخ کے انتظار میں کہ کوئی کہہ دے 'عودِ ہندی' کو پھینک رکھا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ خود قطعہ کہنے سے عاجز اور قاصر تھے۔ غالب کو اس کی اطلاع ملی کہ محض اس وجہ سے کتاب پڑی ہے۔ اُن کے لیے قطعہ کہنا کیا مشکل تھا، انھوں نے بطور

۱؎ خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۶۶

۲؎ خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۷۰

۳؎ خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۱، صفحہ ۴۸۹

۴؎ فغانِ بے خبر، صفحہ ۱۲۹

دفع دخل، یہ قطعات کہہ کر فوراً منشی ممتاز علی خاں کو بھیجے ہوں تو کچھ عجب نہیں اور پھر ان قطعات میں بعض ایسی داخلی شہادتیں بھی ہیں جو ان قطعات کے تصنیفِ غالب ہونے کی مؤید ہیں۔ اس لیے قریب بہ یقین ہے کہ یہ انھیں کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان قطعات میں مدح کا جو ہلکا سا پَرتو ہے، ممکن ہے وہ بعض طبائع کو، ان قطعات کے غالب کا نتیجۂ فکر ماننے میں مزاحم ہو۔ لیکن غالب کے لیے مدح خود یا خودستائی کوئی نئی بات نہیں اور پھر یہ کہ ان قطعات میں اُن کا نام نہیں تھا اور ان قطعات کو وہ اپنے نام سے چھاپ بھی نہیں رہے تھے، اس لیے اس میں کی مدح کی ذمہ داری بھی اُن کے سر نہیں تھی۔

مولانا امتیاز علی عرشی نے ایک بات اور کہی ہے کہ "عودِ ہندی" کے :

"آخری قطعے کے مطالعے سے ایک نئی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ منشی ممتاز علی خاں نے میور صاحب' (غالباً سر ولیم میور گورنر مغربی وشمالی) کی خدمت میں "عود" کا مطبوعہ نسخہ نذر گزارنا تھا۔ سر ولیم میور علوم مشرقیہ کے عالم تھے ...... بے خبر نے جو "عودِ ہندی" کی جمع و ترتیب میں برابر کے شریک تھے، طابع کو مشورہ دیا ہوگا کہ مطبوعہ نسخہ صوبے کے اعلیٰ حاکم کے نام معنون کرکے اُس کے نشر و اشاعت کی تکمیل پر مہرِ توثیق ثبت کریں۔ اُس زمانے میں اُردو زبان میں ایسی نادر کتابیں معدودے چند شائع ہوئی تھیں۔ گورنمنٹ بعض سیاسی مصالح کے ماتحت نئی مفید کتابوں کی اشاعت میں انعام کے نام سے یا امدادِ طبع کہہ کر اخراجات کا بار اٹھالیا کرتی تھی، اس لیے بعید نہیں کہ منشی (ممتاز علی خاں) صاحب کو بھی کچھ روپیہ مل گیا ہو۔"[۱]

خاں بہادر ذوالقدر خواجہ غلام غوث بے خبر، لفٹننٹ گورنر غرب وشمال کے میر منشی تھے۔ اگر انتساب سے مقصود "کچھ روپیہ" حاصل کرنا ہی تھا تو بے خبر، بر بنائے عہدہ، یا کہہ لیجیے کہ گورنر سے قربت کی بنا پر اس کا بلا تکلفِ انتساب ہی شاید کچھ انتظام کرا سکتے تھے پھر منشی ممتاز علی خاں میرٹھ کے نامی رئیس تھے، وہ غالباً روپے پیسے کی امداد کے ضرورت مند

---

[۱] مکاتیبِ غالب، طبع اوّل، بمبئی ۱۹۳۷ء، دیباچہ، صفحہ ۱۷۲

بھی نہ رہے ہوں گے اور تیسری بات یہ کہ غالب کے نام بے خبر کے محولا بالا خط میں، تو بے خبر نے قطعے کے خیال ہی کو سرے سے زائد بتایا ہے۔ وہ میرٹھ گئے، منشی ممتاز علی خاں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اُن کے بھانجے نے "عودِ ہندی" کی زیارت کرائی، کتاب سب چھپ چکی تھی، ایک صفحہ اخیر کا باقی تھا:

"خاں صاحب (ممتاز علی خاں) نے قطعۂ تاریخ کے انتظار میں کہ کوئی کہہ دے اُسے پھینک رکھا تھا۔[۱] اب ممتاز علی خاں سے چونکہ ملاقات نہیں ہوئی۔ اس لیے بے خبر اُن کے لیے یہ تحریری پیغام چھوڑ آئے کہ:

"قطعۂ تاریخ کا ہونا فرض نہیں، یوں ہی اس صفحے کو چھپوا کے کتاب تمام کر دیجیے۔"[۲]

اس صورتِ حال میں مولانا امتیاز علی عرشی کا یہ خیال کہ:

"بے خبر نے جو عودِ ہندی کی جمع و ترتیب میں برابر کے شریک تھے، طابع کو مشورہ دیا ہوگا کہ مطبوعہ نسخہ صوبے کے اعلیٰ حکام کے نام معنون کر کے نشر و اشاعت کی تکمیل پر مہر توثیق ثبت کریں۔"[۳]

کچھ جی کو نہیں لگتا، بے خبر نے بظاہر ایسا کوئی مشورہ طابع کو نہیں دیا، بلکہ دستیاب ماٰخذ اور شواہد اس کے برعکس یہ ہیں کہ بے خبر نے قطعۂ تاریخ وغیرہ کے سرے سے پھیر میں پڑنے ہی کو زائد اور غیر ضروری امر قرار دیا تھا۔

"عودِ ہندی" کے انتساب میں خواجہ غلام غوث بے خبر کا کچھ دخل نہیں رہا، بلکہ میری رائے میں یہ خود غالب کے خاص شیوے کے عین مطابق ہے۔ فروری ۱۸۶۷ء میں "نکاتِ غالب و رقعاتِ غالب" کے نام سے غالب نے ایک رسالہ "میکلوڈ صاحب بہادر" کی نذر کیا تھا:

---

[۱] فغانِ بے خبر، صفحہ ۱۲۹

[۲] فغانِ بے خبر، صفحہ ۱۲۹

[۳] مکاتیبِ غالب، ایضاً، صفحہ ۱۷۲

"ارادہ کیا ہے کہ "پنج آہنگ" کی چوتھی آہنگ[1] جس میں فارسی کی صرف کا بیان ہے، اس کا اُردو میں ترجمہ کیا جائے تاکہ وہ اوراق حضور پر نور ..... جناب معلی القاب میکلوڈ صاحب بہادر فرماں روائے ممالک وسیعۂ پنجاب، بظاہر نواب لفٹننٹ گورنر بہادر اور اُن کا خطاب اور فی الحقیقت سلطان فلک رخش ہلال رکاب، کے نذر کیے جائیں۔ خدا کرے تجھ ترک جاہل کا بیان حضرت کے پسند آئے"[2]

اس سے پہلے ۱۸۶۵ء کے لگ بھگ غالبؔ صاحبانِ تازہ وارد ولایت" کے لیے ایک اُردو کتاب تیار کر کے اُسے "میکلوڈ صاحب بہادر" کی نذر کر چکے تھے:

"یہ مجموعہ نذر اس جناب رفعت مآب کے ہے جس سے عزّت و توقیر فنانشل کمشنری پنجاب کی ہے۔ صاحب والا مناقب عالی شان، علم و اہلِ علم کے قدرداں ..... عالی رتبہ معلی القاب حضرت فلک رفعت میکلوڈ صاحب بہادر فنانشل کمشنر بہادر قلم رو پنجاب ..... اس کتاب کا نذر کرنے والا جو اپنی نذر کے قبول ہونے کا طالب ہے ..... موسوم بہ اسد اللہ خاں و متخلص بہ غالب ہے"۔[3]

ستمبر ۱۸۵۸ء میں غالب کی معروف کتاب "دستنبو" آگرہ میں زیرِ طبع تھی، انہی ایام میں غالب نے ۲۲ ستمبر ۱۸۵۸ء کو منشی نبی بخش حقیر کو لکھا کہ میں نے ایک قصیدہ ملکۂ معظمہ انگلستان کی مدح میں لکھا ہے، اسے بھی چاہتا ہوں کہ "دستنبو" کے آغاز میں شامل کر لیا جائے۔ "کتاب کو قصیدے سے عزّت ..... ہو جائے گی"۔[4]

مختصر یہ کہ انگریز حکام کے اسمِ سامی سے انتساب غالب کی ایک خاص نفسیاتی اُلجھن تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ "عودِ ہندی" کے سر ولیم میور سے انتساب میں بھی یہی نفسیات کارفرما ہے کہ کتاب کو "اس سے عزّت" ہو جائے گی۔ اس سے غرض، طابع کی متوقع مالی مدد نہ رہی ہوگی

---

[1] یہاں غالب کو سہو ہوا ہے۔ "آہنگ دوم" لکھنا چاہیے تھا۔

[2] نکات غالب در رقعات غالب، طبع اوّل مطبع سراجی، دہلی، ۱۸۶۷ء، صفحہ ۳

[3] انتخاب غالب، مرتبہ، محمد عبدالرزاق، چشتیہ پریس، حیدر آباد دکن، ۱۹۲۶ء، صفحہ ۲

[4] خطوطِ غالب، ایضاً، جلد ۲، صفحہ ۹۱۵

اور "عود ہندی" کے طابع منشی ممتاز علی خاں میرٹھ کے نامی رئیس تھے، وہ روپے پیسے کے ضرورت مند تو یقیناً نہیں تھے، غالباً اُس کے آرزومند بھی نہ رہے ہوں گے۔

غالب "عود ہندی" کی اشاعت میں تاخیر سے شکستہ خاطر تھے۔ "مہر غالب" کے مادۂ تاریخ کے مطابق کتاب کی ابتدائی ترتیب کا کام چودھری عبدالغفور سرور کے ہاتھوں ۱۲۷۸ ہجری مطابق ۶۲-۱۸۶۱ء میں پورا ہو گیا تھا، لیکن ۱۰۸ صفحات کی اس کتاب کے چھپنے میں چھ سات سال لگ گئے۔ ممتاز علی خاں کے نام سے سر ولیم میور کی "نذر" میں یہ حکمت اور مصلحت کارفرما رہی ہو تو عجب نہیں کہ وہ کتاب کی اشاعت میں اس ذاتی حوالے سے شاید سرگرم اور مستعد ہو جائیں اور اس طرح غالب کو حقِ تصنیف کے کچھ زائد نسخے ممتاز علی خاں سے غالباً مل جانے کی اُمید ہو۔ بے خبر کے نام ایک خط میں غالب لکھتے ہیں کہ:

"مجموعۂ (نثرِ اُردو) .... چھپ چکا ہو تو حقِ تصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتصار کرے، فقیر کو بھیجیے۔"[1]

"حقِ تصنیف" کے کتنے نسخے غالب کو ملے، اس سلسلے میں دستیاب مآخذ خاموش ہیں، لیکن چھپنے سے پہلے ہی "پنجاب احاطہ" میں کتاب کی بڑی مانگ تھی۔ احباب اس کے دل سے مشتاق اور طالب تھے، بلکہ بعض نے تو طلب کو بہ سرحدِ تقاضا پہنچا دیا تھا۔ چنانچہ کتاب ابھی پوری طرح مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ نکلنا شروع ہو گئی۔ خواجہ غلام غوث بے خبر، ایک خط میں غالب کو لکھتے ہیں:

"مراد آباد میں اخبار "جلوۂ طور" کا مہتمم بھی وارد تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں نے (عود ہندی" کی) ویسے ہی ناتمام (بلا قطعۂ تاریخ) پچیس جلدیں لیں اور لوگوں کو دیں۔"[2]

خواجہ غلام غوث بے خبر نے "عود ہندی" کا مسودہ ترتیب دے کر اُسے کاتب سے خوش خط لکھوا کر اشاعت کے لیے منشی ممتاز علی خاں کو بھیجتے ہوئے لکھا تھا کہ:

---

[1] خطوطِ غالب، ایضاً جلد ۱، صفحہ ۴۷۰

[2] فغانِ بے خبر، صفحہ ۱۲۹

"اب اگر یہ مجموعہ طاقِ نسیاں میں رکھا نہ رہے اور جلد چھپے تو مصنف پر احسان ہوگا۔ فقیر کے پاس تو اصل موجود ہے۔ جب دیکھے گا کہ آپ نہیں چھپواتے تو اپنے کاتب سے ایک نسخہ اور لکھوائے گا اور جو نقل کے طالب ہوں گے ان کو دے دے گا۔"[1]

پنڈت مہیش پرشاد لکھتے ہیں کہ خواجہ غلام غوث بے خبر کی:

"اس تحریر کی بنا پر میں نے کوشش کی کہ خواجہ صاحب نے اپنا ذاتی کتب خانہ چھوڑا ہے، اس میں کہیں وہ نسخہ مل جائے، مگر خواجہ صاحب کے جو اعزہ بنارس میں ہیں، ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کا بے بہا سرمایہ بنارس میں ضائع ہو کر مفقود ہو چکا ہے۔ تاہم ہنوز کوشاں ہوں، ممکن ہے کہ کہیں وہ نسخہ دستیاب ہو جائے تاکہ اغلاط کی تصحیح یقین کے ساتھ ہو سکے۔"[2]

۱۹۴۱ء میں پنڈت مہیش پرشاد نے الہ آباد سے "خطوطِ غالب" کی پہلی جلد شائع کی۔ ۱۹۵۱ء میں ان کے انتقال سے یہ کام جہاں کا تہاں رہ گیا۔ اب اس اصل نسخے کا جو کبھی خواجہ غلام غوث بے خبر کی ملکیت رہا ہے، دستیاب ہونا بظاہر محالات میں سے معلوم ہوتا ہے۔

خواجہ غلام غوث بے خبر نے غالب کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ نسخہ "عودِ ہندی" کے لیے جگہ جگہ سے:

"آپ کی تحریریں فراہم کیں، خود سب کو دیکھا۔ جو مضامین لائق اعلان کے نہ تھے، ان کو نکال ڈالا۔"[3]

پنڈت مہیش پرشاد کو "عودِ ہندی" کے مطبوعہ خطوں کا، غالب کے بعض اصل قلمی رقعات سے مقابلہ کرنے کا موقع ملا۔ اس کے نتیجے میں وہ کہتے ہیں کہ:

"یہ ثابت ہوتا ہے کہ "عودِ ہندی" کے بعض خطوں کی کچھ عبارتیں قطع و برید کی زد میں ضرور آ گئی ہیں۔"[4]

---

۱ انشائے بے خبر، صفحہ ۴۵

۲ ہندوستانی، الہ آباد، اکتوبر ۱۹۳۵ء، صفحہ ۴۶۵

۳ انشائے بے خبر، صفحہ ۱۱

۴ ہندوستانی، الہ آباد، اکتوبر ۱۹۳۵ء، صفحہ ۴۶۹

اور اب "عودِ ہندی" کے سلسلے کی آخری بات، اس میں شامل خطوں کی مجموعی تعداد کے بارے میں، جس پر غالب شناسوں کا اتفاق نہیں ہے۔

پنڈت مہیش پرشاد[1]، اور مالک رام[2] "عودِ ہندی" طبع اوّل کے خطوں کی تعداد ۱۶۸ بتاتے ہیں (۳۱ پہلی فصل میں، ۱۳۷ دوسری فصل میں)، مولانا امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں کہ "عودِ ہندی" کے کل رقعات کی تعداد ۱۶۲ ہے[3]۔ مولانا غلام رسول مہر کا خیال ہے کہ "عودِ ہندی کے محض خطوط کی تعداد ۱۶۳ سے زیادہ نہیں"[4]۔

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے "عودِ ہندی" کو طبع اوّل کے مطابق مرتب کیا ہے۔ ان کے مرتبہ متن میں خطوں کی تعداد کا نمبر شمار ۱۶۶ ہے۔ "تعارف" میں فاضل لکھنوی نے 'فصل اوّل' کے خط ۳۱ اور 'فصل دوم' کے ۱۴۰ خط بتاتے ہوئے مجموعی تعداد ۱۷۱ قرار دی ہے[5]۔ آخر کتاب میں "فہرست مکتوب الیہم" کے تحت انھوں نے خطوں کی کل تعداد ۱۷۲ ظاہر کی ہے[6]۔ اس میں غالب کے نام بے خبر کے ایک خط کو بھی شمار اور شامل کیا گیا ہے۔

حقیقتاً "عودِ ہندی" میں شامل خطوں کی تعداد ۱۷۷ ہے۔ ۴۱ پہلی فصل میں ہیں اور ۱۳۶ دوسری فصل میں لیکن دوسری فصل میں ایک خط (صفحہ ۱۷۶ - ۱۷۷) دراصل منشی غلام غوث بے خبر کا نوشتہ ہے اور غالب کے ایک خط (صفحہ ۱۷۸) کے جواب میں ہے۔ اسے شمار سے خارج کرتے ہوئے "عودِ ہندی" میں غالب کے خطوں کی کل تعداد ۱۷۶ بنتی ہے جو اکیس مختلف اصحاب کے نام ہیں۔

"عودِ ہندی" غالب کے انتقال سے قریب پونے چار مہینے قبل ۱۰ رجب ۱۲۸۵ ہجری

---

[1] ہندوستانی، الہ آباد، اکتوبر ۱۹۳۵ء، صفحہ ۴۶۹

[2] ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی ۱۹۶۴ء، صفحہ ۲۰۸

[3] مکاتیبِ غالب، طبع اوّل، بمبئی ۱۹۳۷ء دیباچہ، صفحہ ۱۷۳

[4] خطوطِ غالب، مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۹ء، جلد اوّل، صفحہ "ب" (گزارش احوال)

[5] عودِ ہندی، مجلس ترقیِ ادب، لاہور ۱۹۶۷ء، تعارف، صفحہ ۶۸

[6] عودِ ہندی، ایضاً، صفحہ ۵۶۸

مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو پہلی بار شائع ہوئی۔[1] یہی غالب کی زندگی میں "عودِ ہندی" کا آخری ایڈیشن بھی ثابت ہوا۔[2] پروفیسر حمید احمد خاں نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ غالب کے:

> "خطوں کا پہلا مجموعہ "عودِ ہندی" کے نام سے ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو غالب کی زندگی میں شائع ہوا۔ یہ دن صرف غالب کے سوانح نگار اور نقاد ہی کے لیے خاص اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ تاریخ نثر اُردو میں ایک بڑے انقلاب کی خبر دیتا ہے۔ جو اسباب انیسویں صدی کے شروع میں اُردو نثر کے ظہور اور اس صدی کے نصف آخر میں اس کی ترقی کا باعث ہوئے، انھوں نے مل جل کر جدید اُردو نثر کی اس پہلی عظیم الشان اور مقبولِ عام کتاب کی اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔" [ادبی دنیا، لاہور، دسمبر ۱۹۴۹ء ص ۴۳]

---

[1] اخبارِ عالم، میرٹھ کی اشاعت ۲۲ اپریل ۱۸۶۹ء (صفحہ ۵) میں عودِ ہندی طبع اول پر یہ مختصر تبصرہ شائع ہوا ہے:

> "یہ کتاب لطافت مآب بہ زبان اُردو نثر جس میں اکثر خطوط اور مضامین مختلف بطور دیباچہ کتاب لکھے ہیں، نواب اسد اللہ خاں صاحب غالب مدظلہ کے نتائج فکر سے ہے، جس کا مطالعہ واسطے صفائی اور درستی زبان اُردو کے مفید اور کارآمد ہے۔ مطبع مجتبائی، واقع میرٹھ میں صاف اور خوش خط ..... ۱۸۸ صفحے کی .... چھپی ہے۔ قیمت اس کی ایک روپیہ اور محصول ڈاک تین آنے ہیں۔" [بحوالہ: اُردوئے معلیٰ، دہلی، غالب نمبر۲، فروری ۱۹۶۱ء، صفحہ ۴۴]

[2] "عودِ ہندی" طبع اوّل (۱۸۶۸ء) کے بعد انیسویں صدی کی چار مزید اشاعتوں کے حوالے راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں:

(i) عودِ ہندی، مطبع نارائنی، دہلی ۱۸۷۸ء (ii) عودِ ہندی، مطبع نولکشور، کانپور، ۱۸۸۰ء (iii) عودِ ہندی، مطبع نولکشور، کانپور، ۸۷-۱۸۸۶ء (iv) عودِ ہندی، مطبع نولکشور، کانپور

بیسویں صدی کے نصف اول کے بعض ایڈیشن:

مطبع العلوم، علی گڑھ ۱۹۱۰ء، مفیدِ عام، آگرہ مئی ۱۹۱۰ء، نولکشور کانپور ۱۹۱۲ء، نولکشور لکھنؤ ۱۹۲۵ء، ۱۹۴۱ء، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۲۷ء، نیشنل پریس الٰہ آباد ۱۹۲۹ء، مطبع انوارِ احمدی الٰہ آباد، گلزارِ ہند اسٹیم پریس لاہور، مطبع کریمی لاہور۔

اُردوئے مُعلّیٰ

خطوطِ غالب کا دوسرا مجموعہ

طبع اوّل : اکمل المطابع، دہلی، ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ / ۶ مارچ ۱۸۶۹ء

ضخامت : ۳۶۴ صفحات رقعات کی تعداد : ۲۸۰

سائز ۶×۹½ مسطر: ۱۷ سطری

"عودِ ہندی" کے تحت یہ تفصیل آچکی کہ اوّل اوّل چودھری عبدالغفور سرور نے مطبع مجتبائی کے مولوی ممتاز علی خان کے ایما پر "مہرِ غالب" کے تاریخی نام سے ۱۲۷۸ھ / مطابق ۶۲-۱۸۶۱ء میں، غالب کے خطوں کا مجموعہ ترتیب دیا۔ یہ مجموعہ مع دیباچہ، مارہرہ سے منشی غلام غوث بے خبر کے پاس الہ آباد پہنچا اور مزید خطوط کی فراہمی اور ترتیب کے سلسلے میں ایک مدت ان کے پاس رہنے کے بعد اگست ۱۸۶۶ء کے قریب قریب، طباعت کی غرض سے میرٹھ بھیجا گیا، جہاں سے بالآخر اکتوبر ۱۸۶۸ء میں یہ "عودِ ہندی" کے نام سے شائع ہوا۔ "عودِ ہندی" کی ترتیب وطباعت کا کام دہلی سے دور، غالب کی نظر سے اوجھل ہوا' ۱۸۸ صفحے کی اس کتاب کے مواد کی فراہمی اور اشاعت میں چھ سات سال لگ گئے، اس پر مستزاد یہ کہ کتاب غلط سلط چھپی۔ چنانچہ جس کتاب کے مسودے کو بے خبر نے کاتب سے خوش خط لکھوایا خود مقابلہ کیا، اور صحتِ متن کے سلسلے میں بشرطِ اشتباہ، خود غالب تک سے رجوع کرنے کے بعد، اس کی تصحیح کی، وہ کتاب، چھپ کر سامنے آئی تو بے خبر کو بڑی مایوسی ہوئی۔ صدر امین علی گڑھ، مولوی عبدالقیوم کے نام ایک خط میں بے خبر لکھتے ہیں کہ:

> "عودِ ہندی، یعنی مرزا غالب کے رقعات کا مجموعہ مجھ تک پہنچا۔ افسوس ہے کہ نہایت غلط چھپا، بہت جگہ غلطی سے مطلب خبط ہے ...."

(فغانِ بے خبر، صفحہ ۱۴۱)

"عودِ ہندی" کی اشاعت کئی برس معرضِ التوا میں رہی۔ اس تعویق سے بددل ہو کر اگرچہ ۱۸۶۳ء میں دہلی میں غالب کے احباب نے ایک دوسرے مجموعے کا ڈول ڈال دیا تھا' لیکن اس کی جمع و ترتیب میں بھی کسی غیر معمولی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ "عودِ ہندی" کی ناقص طباعت نے، عجب نہیں کہ مجموعۂ ثانی کی ترتیب و اشاعت کے سلسلے میں مہمیز کا کام دیا ہو، غالب کی طرف سے مجموعۂ مکاتیب کے نئے منصوبے کی اطلاع ملنے پر بے خبر، ایک خط میں غالب کو جواباً لکھتے ہیں کہ:

"جنابِ عالی! "پہلا مجموعہ (عودِ ہندی)، اگر ایسا مہمل چھپا تو دوسرے کا چھپنا، بہت مناسب ہوا..... جب چھاپا اتمام پر آئے اور قیمت قرار پائے تو مجھے اطلاع ہو، کچھ جلدیں میں بھی لوں گا....."

(فغانِ بے خبر، صفحہ ۱۲۹)

یہ دوسرا مجموعہ "اُردوئے معلیٰ" ہے، جس کی جمع و ترتیب غالب کی زندگی میں روبہ عمل آئی، اس کی طباعت کا بڑا حصہ بھی غالب کی زندگی ہی میں انجام پا گیا تھا لیکن کتابی صورت میں اس کی باقاعدہ اشاعت غالب کے انتقال کے انیس دن بعد اکمل المطابع، دہلی سے ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ، مطابق ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو ممکن ہو سکی ــــ

"عودِ ہندی" کی ترتیب و اشاعت کا کام دہلی سے باہر اور غالب کی نظر سے دور، بہت سست روی سے ہو رہا تھا۔ غالب، اس تساہل سے بیزار ہوئے تو مقامی طور پر اُنہوں نے اس کی ایک صورت پیدا کی تاکہ ان کی نگرانی میں، ان کی نظر کے سامنے یہ کام عجلت سے ہو سکے۔ چنانچہ منشی غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں کہ:

"اجی حضرت' یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں؟ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی خواہش ہے[۱]۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے"

---

[۱] پنجاب احاطے میں رُقعاتِ غالب کی مانگ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے:
مقدمہ، اُردوئے مُعلیٰ، حصہ اوّل، جلد اوّل، فاضل لکھنوی، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۷ و مابعد

کہ جتنے خطوط، آپ کو پہنچے ہیں، وہ سب، یا ان سب کی نقل بطریق پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب وہی پارسل ہو ....."

اس سے ظاہر ہے کہ "عودِ ہندی" کی اشاعت سے پہلے، اس کی طباعت میں پیہم تاخیر سے بددل ہو کر، "پنجاب احاطے کی خواہش اور مانگ" پر، اُس مجموعۂ مکاتیب کی فراہمی اور ترتیب شروع ہو چکی تھی جو "اُردوئے معلیٰ" کے نام سے شائع ہوا، ورنہ مولانا مہر کے بقول "مرزا غالب کو خواجہ غلام غوث بے خبر کے جمع کیے ہوئے مکاتیب کی نقل منگانے کی کیا ضرورت تھی[۱]....."

بہر نوع جیسا کہ مولانا امتیاز علی عرشی نے لکھا ہے "ابھی، عودِ ہندی، طبع نہ ہونے پائی تھی کہ اطرافِ ہند سے مرزا غالب کے مجموعۂ خطوط کی مانگ شروع ہو گئی۔ مرزا صاحب نے بے خبر کو ان کے مرتب کردہ مجموعے کی طباعت کے متعلق بار بار لکھا اور جب سال پر سال گزرنے لگے اور کسی طرح کتاب نہ چھپی تو انہیں اس کی طباعت کی طرف سے مایوس ہو گئی۔ احبابِ دہلی نے میرٹھ کے کارپردازوں کا تساہل دیکھ کر اس شرف کو خود حاصل کرنے کا تہیہ کیا[۲]....." احباب نے خود تہیہ کیا یا غالب کے ایما پر اس طرف متوجہ ہوئے، صورت خواہ کچھ بھی رہی ہو حقیقت یہ ہے کہ صاحبانِ "اکمل المطابع" دہلی سے غالب کے خاص تعلقات تھے۔ یہ اصحاب و احباب، اُردو رقعات جمع کرنے اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوتے اور فراہمی خطوط کی مہم میں خود غالب نے جامعین کی مدد کی اور ان کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔

خطوط کی فراہمی کا مسئلہ مولانا عرشی کے لفظوں میں "اس طرح حل ہو گیا کہ خود مرزا غالب جو اپنی انشا کی حقیقی قدر و قیمت اور بازاری مانگ سے باخبر ہو چکے تھے، اس میں ہاتھ بٹانے کے لیے تیار ہو گئے۔ چاروں طرف اصل خطوط، یا ان کی نقول کی طلب میں خطوط لکھے گئے اور رفتہ رفتہ کافی ذخیرہ فراہم ہو گیا[۳]....."

خطوط کی فراہمی کے سلسلے میں غالب نے جن احباب کو لکھا، ان میں سے خواجہ غلام

---

[۱] خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، جلد اوّل، لاہور، ۱۹۶۹ء، حاشیہ صفحہ ۴۸۹

[۲] و [۳] مکاتیبِ غالب، طبع دوم ۱۹۴۳ء، رامپور، دیباچہ، صفحہ ۲۲۱

غوث بے خبر اور نواب علاؤالدین علائی کے بارے میں دستاویزی شہادتیں موجود ہیں۔ بے خبر کے نام متعلقہ خط کا حوالہ اُوپر آچکا۔ علائی کے نام اس سلسلے کے ایک سے زیادہ خط ہیں پہلا دستیاب خط ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء سے پہلے کا ہے، اس میں لکھتے ہیں کہ :

"اقبال نشانا! مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع "اکمل المطابع" میں چند احباب، میرے مسودات، اُردو کے، جمع کرنے پر اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگے ہیں اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا، وہ جہاں بھیجنا ہوا، وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے، تمہارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بہ سبیلِ ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی (لوہارو سے) ادھر آنے والا ہو اور اس کو دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا اور میں ایسا جانتا ہوں کہ اس کے چھاپے جانے سے تم بھی خوش ہو گے ......"

علائی نے اس کے جواب میں غالب کی توقع کے برعکس خطوں کا پارسل بنا کر بھیجنے کی جگہ عذر و اندیشے کا اظہار کیا، غالب اس سے سخت بے مزہ ہوئے :

"میرے خطوط اُردو کے ارسال کے باب میں، جو کچھ تم نے لکھا، تمہارے حسنِ طبع پر تم سے بعید تھا۔ میں سخت بے مزہ ہوا۔ اگر بے مزگی کے وجوہ لکھوں تو شاید ایک تختہ کاغذ کا سیاہ کرنا پڑے۔ اب ایک بات موجز و مختصر لکھتا ہوں۔ سنو بھائی، اگر ان خطوط کا تم کو اخفا منظور ہے اور شہرت تمہارے منافی طبع ہے تو ہرگز نہ بھیجو، قصہ تمام ہوا اور اگر ان کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے دو اور کسی متصدی سے نقل اتروا کر چاہو کسی کے ہاتھ، چاہو بہ سبیل پارسل ارسال کرو، لیکن خدا کے واسطے کہیں غصے میں آکر "عطائے تو، بہ لقائے تو" کہہ کر اصلی خطوط نہ بھیج دینا کہ یہ امر میرے مخالف مقصود ہے۔"

اس کے بعد غالب نے خطوط کی ترسیل کے سلسلے میں پھر علائی کو نہیں لکھا اور اس معاملے میں

بوجوہ خاموشی اختیار کرلی، علائی کو یہ خیال ہوا غالب کا، "خطوط کے ارسال کو مکرر نہ لکھنا کہیں از راہِ ملال نہ ہو؟" چنانچہ علائی نے اس بارے میں کچھ استفسار کیا ہوگا جس کے جواب میں غالب۔ ۳۰، مئی ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں انہیں لکھتے ہیں کہ :

"لاموجود الا اللہ۔ اس خدا کی قسم جس کو میں نے ایسا مانا ہے، اور اس کے سوا کسی کو موجود نہیں جانا ہے کہ خطوط کے ارسال کو مکرر نہ لکھنا از راہِ ملال نہ تھا۔ طالب کے ذوق کو سست پاکر میں متوقف ہوگیا۔ متوسط، ایک جلیل القدر آدمی اور طالب، کتب کا سوداگر ہے، اپنا نفع نقصان سوچے گا، لاگت بچت کو جانچے گا۔ میں، متوسط کو مہتمم سمجھا تھا اور یہ خیال کیا تھا کہ یہ چھپوائے گا تیس رقعے ایک جگہ سے لے کر ان کو بھیجے۔ اس کی رسید میں تقریباً انہوں نے طلب رقعات بہ تکلف سوداگر لکھی اور اس سوداگر کو مفقود الخبر لکھا۔ ظاہرا کتابیں لے کر کہیں گیا ہوگا یا کتابیں لینے گیا ہوگا۔ یہ ۲۳ لفافے اور ۳۴ خط بدستور میرے بکس میں موجود و محفوظ رہیں گے۔ اگر متوسط بہ تقاضا طلب کرے گا، ان خطوط کی نقلیں اس کو اور اصل تم کو بھیج دوں گا، ورنہ تمہارے بھیجے ہوئے کاغذ تم کو پہنچ جائیں گے....."

یکشنبہ ۳، محرم ۱۲۸۰ھ / ۲۱، جون ۱۸۶۳ء کے ایک خط بنام علائی سے پتہ چلتا ہے کہ غالب نے مرزا علی حسین خان کے ہاتھ علائی کے مرسلہ خطوط واپس کیے :

"مرزا علی حسین خان آئے اور مجھ سے ملے۔ میں نے خطوط مرسلہ تمہارے یکمشت ان کو دیے۔ اب تمہارے پاس بھیجنے کا ان کو اختیار ہے۔ رسید کا البتہ مجھے انتظار ہے....."

غالب کے موجود اور محفوظ خطوں میں ۲۱، جون ۱۸۶۳ء کے مندرجہ خط کے بعد علائی کے نام تیس کے لگ بھگ خط اور بھی ہیں لیکن پھر کسی میں رقعاتِ غالب کی فراہمی، ان کی جمع و ترتیب اور طباعت و اشاعت کا کوئی مذکور نہیں۔

علائی کے علاوہ یقیناً غالب نے اپنے بعض دیگر احباب اور تلامذہ سے بھی خطوط فراہم

کرنے کے لیے کہا، چنانچہ خود علائی کے نام ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء کے نامۂ غالب میں یہ مذکور ہے کہ "تیس رقعے ایک جگہ سے لے کر تم کو بھیجے" علائی کے علاوہ دیگر اصحاب نے رقعات کی طلب میں، غالب نے جو رقعات لکھے، خود ان کی نقول بھیجنے کو غالباً زائد بات سمجھا اور تقاضائی خطوط کی نقول اشاعت کی غرض سے ارسال نہیں کیں، اس لیے اب یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کون کون اصحاب تھے جنہوں نے غالب کے ایما پر خطوط کی نقلیں بھیجیں، اور کون وہ اصحاب ہیں جن کے نام کے خط غالب کے علاوہ، دیگر جامعین نے اپنی کوشش سے فراہم کیں۔

تیس رقعے غالب نے کس "ایک جگہ" سے لیے، اسے مجہول چھوڑ دیا ہے، "اُردوئے معلّٰی" میں ۵۰ مختلف اصحاب کے نام مجموعی طور پر ۲۸۰ٗ خط ہیں، بایں ہمہ اس "ایک خاص جگہ" کا بڑی حد تک تعین کیا جانا ممکن ہے۔ "اُردوئے معلّٰی" میں تیس یا اس سے زائد کی تعداد میں رقعات صرف پانچ اصحاب کے نام ہیں جن کے اسمار علی الترتیب یہ ہیں:

۱۔ منشی میاں داد خاں سیاح	رقعات: ۳۰
۲۔ منشی ہرگوپال تفتہ	۸۸
۳۔ میر مہدی حسن مجروح	۴۴
۴۔ منشی شیو نرائن آرام	۳۳
۵۔ نواب علاؤ الدین خاں علائی	۵۶

ان میں علائی تو اس لیے سرے سے خارج از بحث ہیں کہ انہیں تو لکھا ہی گیا ہے کہ ایک جگہ سے تیس رقعات فراہم کیے ہیں۔ بظاہر تعداد کی یکسانی کے باعث یہ سیاح ہو سکتے تھے لیکن وہ اس لیے نہیں ہیں کہ غالب نے تیس رقعات کی فراہمی کا ذکر ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء کے خط میں کیا ہے، لازماً وہ تیس خط، مذکورہ تاریخ سے پہلے کے رہے ہوں گے، لیکن سیاح کے نام کے تیس خطوں میں سے صرف نو مذکورہ تاریخ سے پہلے کے ہیں اور بقیہ اکیس ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء کے بعد سے ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء تک کی مدت پر پھیلے ہوئے ہیں۔ تفتہ کے نام خطوں کی صورت

ٗ پرتھوی چندر لکھتے ہیں کہ "اُردوئے معلّٰی" میں ۲۷۷ خط ہیں (فکرِ غالب، طبع اوّل دہلی ۱۹۶۰ء، ص ۱۹۹)، یہ صحیح نہیں۔

یہ ہے کہ ۸۸ میں سے علی الحساب صرف دس خط (نمبر ۱۹، ۵۵، ۵۶، ۶۲، ۶۴، ۷۲ تا ۷۲)، متعینہ تاریخ کے بعد کے ہیں، بقیہ ۷۸، ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء سے پہلے کے ہیں۔ مجروح کے نام[۴۴] میں سے بلا ترتیب ۳۱ خط، ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء تک کے ہیں۔

شیونرائن آرام کے نام "اُردوئے معلیٰ" (طبع اوّل، ۱۸۶۹ء) میں غالب کے موجود خطوں کی تعداد ۳۳ ہے۔ ان میں سے پہلے تیس خط تاریخ تحریر کے اعتبار سے ترتیب وار اگست ۱۸۵۸ء سے اپریل ۱۸۶۰ء تک کی مدت، یعنی ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء سے پہلے کے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ "ایک جگہ" ہے جہاں سے غالب نے تیس خط لے کر طباعت کے لیے اپنے تئیں مہتمم کو دیے۔ اس قیاس کو اس امر سے بھی تقویت ہوتی ہے کہ آخری تین خط باعتبار تاریخ، بے ترتیب ہیں۔ یہ خط جامعین کو غالباً اپنی کوشش سے بعد میں حاصل ہوئے اور انہوں نے تاریخی ترتیب کا خیال رکھے بغیر، انہیں غالب کے فراہم کردہ تیس خطوں کے آخر میں شامل کر دیا۔

نومبر ۱۸۵۸ء میں غالب کے اُردو رقعات چھاپنے کی پہلی تجویز، شیونرائن آرام ہی کی طرف سے سامنے آئی تھی، جسے غالب نے اُس وقت رد کر دیا تھا۔ اس پس منظر میں بھی اس امر کا قوی امکان ہے کہ غالب نے خطوط منگوانے کے سلسلے میں اب خود ان سے رجوع کیا ہو اور آرام نے کہ وہ، برسوں سے اس امر کے خواہاں اور محرک تھے، اپنے نام کے خطوط فوراً طباعت کے لیے فراہم کر دیے ہوں ..... اگر خط بھیجنے والوں نے بالاقساط غالب کو خط نہیں بھیجے تو پھر یہ آرام ہی ہیں جن کی طرف سے آمدہ تیس خطوں کی جانب، علائی کے نام غالب نے اپنے ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء کے خط میں اشارہ کیا ہے ..... اور جو خالصتاً غالب کی توجہ سے "اُردوئے معلیٰ" کے جامعین کے ہاتھ آئے۔

"اُردوئے معلیٰ" کا دیباچہ میر مہدی مجروح کے قلم سے ہے، انھوں نے اس مجموعے کے جامعین کی نشاندہی کی ہے اور اس ضمن میں غالب کے شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر، مطبع کے مہتمم میر فخرالدین اور مطبع کے منشی اور غالب کے شاگرد لالہ بہاری لال مشتاق کے نام لیے ہیں؛ مجروح سے دیباچے کی فرمائش منشی جواہر سنگھ جوہر یا منشی مطبع بہاری لال نے کی تھی مجروح

کے لفظ یہ ہیں :

"مدت سے حضرت (غالب) کو اس طرزِ نو ایجاد اُردو سے لگاؤ ہے اور خط کتابت میں اسی کا برتاؤ ہے۔ جب شائقینِ سُخن دوست نے اس نمک ہندی کا مزہ چکھا، ہر ایک سرمایہ لذت مائدہ سخن سمجھ کر طلب گار و خواستگار ہوا۔ اس واسطے منشی جواہر سنگھ صاحب جوہر ..... کی طبع والا نے یہ اقتضا کیا کہ یہ گہرہائے شب افروز سلکِ تحریر میں منسلک ہو کر زینت بخش عروسِ سخن ہوں اور یہ گل ہائے پراگندہ جمع ہو کر ایک جا گل دستہ ہوں، تاکہ اس کے روایح روح پرور سے دماغ نکتہ سرایان غیرت چمن ہو۔ اس واسطے میر فخرالدین صاحب مہتمم اکمل المطابع دہلی نے سعی بے پایاں اور ، لالہ صاحب منشی مطبع مذکور نے کوشش فراواں سے اکثر خطوط جمع کیے اور قصدِ انطباع کیا اور "اُردوئے معلّیٰ" نام رکھا ... اور منشی صاحب موصوف نے اس ہیچ مداں خاکسار یعنی مجروح دل افگار سے اس کا دیباچہ لکھنے کو فرمایا ..."

[اُردوئے معلّیٰ، طبع اول، ١٨٦٩ء، صفحہ ۴ و بہ بعد]

گویا مجموعے کی جمع و ترتیب کے علاوہ اس کا نام بھی منشی جواہر سنگھ جوہر (جو ملازمینِ معززینِ سرکار میں سے ہونے کی وجہ سے "بابو" بھی کہلاتے تھے)، میر فخرالدین اور لالہ بہاری لال وغیرہ کا رکھا ہوا ہے۔ یہ نام غالب کے بعض احباب کو پسند نہیں آیا، چنانچہ خواجہ غلام غوث بے خبر نے ایک خط میں اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے غالب کو لکھا کہ :

"جناب عالی، کل ایٹہ میں تھا۔ مرزا حاتم علی مہر جو اپنے بیٹے کے اس ضلع میں سررشتہ دار کلکٹری ہونے کے سبب سے بالفعل وہیں ہیں، میرے پاس بیٹھے تھے کہ ہرکارہ ڈاک کا آپ کا خط لایا۔ میں نے پڑھا، انھوں نے سُنا، دونوں نے لطف اٹھایا ..... پہلا مجموعہ (عودِ ہندی) اگر ایسا مہمل چھپا تو دوسرے کا چھپنا بہت مناسب ہُوا، مگر گستاخی معاف، یہ نام "اردوئے معلّیٰ" نہایت بھونڈا رکھا گیا۔ لالہ صاحب یا بابو صاحب کی تجویز ہو گی، آپ نے

اخلاق سے دخل نہ دیا ہوگا۔ آپ کی تصنیف اور ایسا بھدا نام ! لاحول ولا۔
اے قبلہ! "قندِ ہندی" نام رکھا ہوتا، یا پھر سے جو چھپا، "قندِ مکرر" فرمایا ہوتا۔
یہ دونوں نام کیسے شیریں تھے؟ جب چھاپا اتمام پر آئے اور قیمت قرار پائے تو
مجھے اطلاع ہو، کچھ جلدیں میں بھی لوں گا ....." [فغانِ بے خبر، صفحہ ۱۲۹]

عجب نہیں کہ نام کی اس ناپسندیدگی میں مرزا حاتم علی بیگ مہر بھی بے خبر کے ہم نوا ہوں۔ ناپسندیدگی کا یہ اظہار، چھاپے کے اتمام پر آنے سے پہلے ہوا، لیکن یا تو واقعی غالب نے پھر بھی "اخلاق سے دخل نہ دیا" اور یا پھر نام ان کی پسند کے مطابق تھا اور وہ اسے بھونڈا یا بھدا خیال نہیں کرتے تھے۔ یہی زیادہ قرینِ حقیقت بھی معلوم ہوتا ہے ورنہ غالب ایسے خود نگر، نفاست پسند اور نازک مزاج فن کار سے، اخلاق اس حد تک برتنے کی توقع عبث ہے کہ اس کے نتیجے میں ان کی کتاب کا نام تک ان کے سامنے، ان کی پسند کے برعکس بھونڈا یا بھدا رکھ دیا جائے اور وہ اسے گوارا کرلیں۔

خواجہ غلام غوث بے خبر نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ :

"اُردوئے معلّیٰ" اور "عودِ ہندی" میں یہ فرق ہے کہ اکثر رقعے اِس کے اُس میں ہیں اور اِس کے اُس میں نہیں ....." (فغانِ بے خبر، صفحہ ۱۴۲)

لیکن اس بیان سے فرق کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ "عودِ ہندی" ۱۸۸ صفحات کی کتاب، غالب کے ۱۰۶ خطوط اور ۲۱ مکتوب الیہم، اس کے مقابلے میں "اُردوئے معلّیٰ" کی ضخامت ۴۶۴ صفحات خطوط کی تعداد ۴۸۰ اور مکتوب الیہم تعداد میں پچاس ـــ "اُردوئے معلّیٰ" میں سب سے زیادہ خط تفتہ کے نام ہیں، یہ تعداد میں ۸۸ ہیں، اس کے علاوہ علائی کے نام ۵۹، جبکہ "عودِ ہندی" میں تفتہ اور علائی کے نام صرف ایک ایک خط تھا۔ یہ دونوں خط علی الترتیب متن کے خفیف فرق اور خاصے اضافے کے ساتھ "اُردوئے معلّیٰ" میں موجود ہیں لیکن "اُردوئے معلّیٰ" کے بعد "عودِ ہندی" کی اپنی جداگانہ حیثیت نہ ختم ہوتی ہے، نہ کم ہوتی ہے، اس لیے کہ حجم میں کمی ہونے کے باوجود "عودِ ہندی" کے نہ سارے مکتوب الیہم "اُردوئے معلّیٰ" میں ہیں اور نہ سارے خط ہی۔ نیز جو خط دونوں مجموعوں میں مشترک ہیں، ان کے متنی فرق کو ظاہر کرنے کے لیے باعتبارِ اشاعت "عودِ ہندی"

کے زمانی تقدم کی وجہ سے اس کی اہمیت اور فضیلت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

"اُردوئے معلّیٰ" (طبع اوّل ۱۸۶۹ء) میں جن پچاس اصحاب کے نام ۴۰۰ رقعات ہیں ان کی تفصیل یہ ہے: بنام تفتہ ۸۸، علائی ۵۶، مجروح ۴۴، آرام ۳۳، سیاح ۳۰، غلام نجف ۲۲، میر اور شفق ۱۹، ۱۹، سرور ۱۶، جنون ۱۵، بے خبر ۱۴، یوسف مرزا ۱۲، مودودی ۱۱، نواب بابا اور ذکا ۱۰، ۱۰، شہاب ۹، امین الدین ۶، وفا اور فقیر ۵، ۵، حسین مرزا ۴، پیارے لال، شہزادہ بشیر، میرن اور کامل کے نام تین تین اور سرفراز، شاہ عالم، صاحب عالم، سالک، رضوان، ہرگوبند سہائے، میکش، جوہر، مشاق، شاکر، حقیر، قنوجی اور رعنا کے نام دو دو خط اور دیگر تیرہ اصحاب: نساخ، یوسف عزیز، عزیز الدین، مفتی عباس، ظہیر الدین، از طرف ظہیر الدین، تفضل، نیر، منشی لطیف، فرخ مرزا، غلام مرتضیٰ، غلام رضا اور ہیرا سنگھ کے نام صرف ایک ایک خط ہے۔

پچاس اصحاب کے نام، ان ۴۰۰ خطوں میں سے قدیم ترین خط ۱۸۴۸ء کے قریب وسط کا ہے، یہ تفتہ کے نام ہے (طبع اوّل ۱۸۶۹ء، صفحہ ۸۲ بہ بعد) اور ۱۷ اگست ۱۸۶۸ء سے متاخر، اس مجموعے میں کوئی تحریر نہیں، ۱۷ اگست ۱۸۶۸ء کا یہ رقعہ میر ابراہیم علی خاں وفا اور سید احمد حسن مودودی کے نام مشترک ہے (طبع اوّل، ۱۸۶۹ء، صفحہ ۲۳۷)۔

"اُردوئے معلّیٰ" (طبع اوّل) کا نسخہ راقم الحروف کے ذخیرۂ غالبیات میں محفوظ ہے جس کا سرورق سبز ہے۔ بیلدار لوح میں "اُردوئے معلّیٰ" طبع اوّل کے سرورق پر جو عبارت درج ہے، وہ یہ ہے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یُوں

الحمد اللہ کہ حصۂ اوّل کارنامۂ فصاحت و سرمایۂ بلاغت جس کا ہر حرف
نایاب، و ہر فقرہ لاجواب ہے، اعنی کتاب
۱۲۸۵ھ
اُردوئے معلّیٰ
۱۸۶۹ء

یعنی رقعات اُردوئے نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب، جو تعلیم اطفال کے لیے دستور العمل ہے۔ اکمل المطابع دہلی میں میر فخر الدین کے اہتمام سے منطبع ہوا۔

سرورق کے بعد صفحہ اول سے "دیباچہ" ہے جسے "من تصنیف شاعر شیریں مقال، ناثر عدیم المثال جناب میر مہدی صاحب المتخلص بہ مجروح شاگرد رشید جناب مرزا اسد اللہ خاں غالب مدظلہم ....." بتایا گیا ہے۔ میر مہدی مجروح کا دیباچہ صفحہ ۵ تک چلا ہے۔ اسی صفحے کی سطر ۱۵ سے "حصہ اول" لکھ کر رقعات شروع ہو جاتے ہیں۔ پہلا "رقعہ" میر غلام بابا خاں بہادر کے نام ہے۔ صفحہ ۵ پر القاب کے بعد اس رقعے کی صرف اتنی عبارت آئی ہے "فقیر اسد اللہ عرض کرتا ہے" یہ خط ۲۲ مارچ ۱۸۶۶ عیسوی کا ہے۔ دوسرے خط سے پہلے "ایضاً رقعۂ ثانی" کا عنوان دیا گیا ہے۔ اسی خط سے پہلے یہ عنوان قائم کیا گیا ہے ورنہ بالعموم صرف "ایضاً" لکھا گیا ہے۔

غرض اس ڈھنگ سے ۵۰ مختلف اصحاب کے نام ۴۸۰ خط "اُردوئے معلیٰ" کے صفحہ ۴۵۸ کی سطر ۱۴ پر تمام ہو گئے ہیں۔ صفحہ ۴۵۸ کی آخری تین سطروں میں "خاتمۃ الطبع" کے زیر عنوان یہ عبارت ہے:

"الحمد للہ کہ حصۂ اول "اُردوئے معلیٰ" بہ کمال تصحیح و تنقیح اکمل المطابع، دہلی میں بہ حسن اہتمام سید فخر الدین، ۲۱ ماہِ ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۵ ہجری مطابق ۶، مارچ سنہ ۱۸۶۹ء روز مبارک جمعہ کو بہ ساعت سعید و آوان حمید چھپ کر تیار ہو گیا....."

خاتمۃ الطبع سے انیس دن پہلے ۲، ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵، فروری ۱۸۶۹ء کو خود صاحبِ کتاب کے انتقالِ پُر ملال کا حادثۂ فاجعہ پیش آ چکا تھا.....

صفحہ ۴۵۹ سے "خاتمۂ کتاب اُردوئے معلیٰ" کی عبارت شروع ہوتی ہے اور یہ صفحہ ۴۶۱ کی ساتویں سطر پر ختم ہوتی ہے۔ یہ عبارت غالب کے شاگرد مرزا قربان علی بیگ سالک کے قلم سے ہے۔ خاتمۂ کتاب کیا ہے، خاتمۂ صاحبِ کتاب پر ایک دلدوز مرثیہ ہے:

"..... یہ سفینۂ بے نظیر و مجموعۂ دل پذیر، جس کا ہر حرف باعث نضارت

چشمِ نظارگیان اور ہر لفظ سببِ تازگی دیدۂ مشتاقاں ہے...... غور کیجیے کہ فراہم آنا اس نسخۂ بے بدل کا اور طبع ہونا اس کتاب بے مثل کا کیوں کر غنیمت نہ سمجھا جائے..... کیوں کر شکر فراہمی نہ ادا کیا جائے۔ ہاں، اے سالک اندوہ گیں کیسا شکریہ، کیا کلام ہے؟ اے بے خبر! یہ وقتِ گریہ و ہنگامِ ماتم عام ہے.....
ہنوز یہ نامۂ دل آویز تمام و کمال تشریف طبع نہ پا چکا تھا کہ سپہر بے مہر نے بہ تاریخ ۲ ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ جامۂ حیات جناب مغفور و مرحوم کو چاک کیا۔ ہے ہے! آفتابِ علم و کمال کو رنجِ خسوف دکھایا، ماہتابِ فضل و ہنر کو صدمۂ کسوف میں پھنسایا..... جب یہ بارِ گراں اندوہ دل پر آئے، دل کی مجال ہے کہ بیٹھ نہ جائے؟ کیسی تاریخِ خاتمۂ کتاب؟ کیسا سالِ وفات؟ ہاں گفتگو کو مختصر کرتا ہوں اور ایک قطعہ لکھتا ہوں:

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا — لب پہ نالوں کا ازدحام ہوا
صدمۂ مرگ حضرتِ غالب — سببِ رنجِ خاص و عام ہوا
ہے یہی سالِ طبع و سالِ وفات — "آج اُن کا سخن تمام ہوا"

۱۲ ھ ۸۵

مرزا قربان علی بیگ سالک کی خاتمۂ کتاب کی عبارت صفحہ ۴۶۱ کی ساتویں سطر پر ختم ہوئی ہے اس کے بعد جوہر کا فارسی قطعۂ تاریخ ہے جس کے عنوان کی عبارت یہ ہے "تاریخ طبع حصہ اوّل اُردوئے معلّیٰ، طبع زاد منشی جواہر سنگھ صاحب جوہر تخلص....." قطعہ یہ ہے:

چو اُردوئے معلّیٰ گشت تالیف — ہما نا یک جہاں گردید طالب
پئے سالِ مسیحائی طبعش — بگو جوہر "تنے اُردوئے غالب"

۱۸۶۹ء

جوہر کے اس قطعۂ تاریخ کے بعد صفحہ ۴۶۱ کی سطر ۱۱ سے کتاب کا صحیح نامہ ہے جس کے عنوان کی عبارت یہ ہے:

"ہر چند اس کتاب کی تصحیح میں کمال کوشش کی گئی، مگر پھر بھی بہ اقتضائے

بشریت بعض اغلاط ہنگام مقابلہ رہ گئے.... اکثر الفاظ پتھر پر مغشوش ہو گئے،
لہٰذا صحیح نامہ کے الحاق کی ضرورت پڑی۔ ناظرین سے اُمید یہ ہے کہ قبل از مطالعہ
کتاب صحیح نامہ کے بہ موجب، صحیح کرلیں....."

صفحہ ۴۶۱ پر اس صحیح نامہ کے دو کالمی جدول کی سات سطریں آئی ہیں، یہ صحیح نامہ صفحہ ۴۶۴ کے قریب نصف تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد حقِ تصنیف کے سلسلے میں ایک "اعلان" مطبع کی طرف سے اور اس اعلان کی سند اور توثیق میں ایک رقعہ غالب کی جانب سے مع مہر خطابی درج و ثبت ہے:

اعلان

اس کتاب کا حقِ تصنیف مصنف نے اپنی حیات میں حکیم غلام رضا خاں صاحب کو بخش دیا ہے اور ایک رقعہ بطور سند اپنے ہاتھ سے بہ ثبتِ مہر لکھ دیا ہے۔ پس کوئی صاحب ان رقعات کے چھاپنے کا ارادہ بے اجازت حکیم صاحب ممدوح الصدر کے نہ کریں۔ نقل اس رقعہ کی درج ذیل ہے:

"پیکرِ بے روح و رواں فقیر اسد اللہ خاں غالب تخلص ہیچ مداں کہتا ہے اور لکھ دیتا ہے کہ یہ جو "اُردوئے معلّٰی" تصنیف فقیر مطبع اکمل المطابع دہلی میں چھاپا ہوا۔ سو میں نے ازراہِ فرطِ محبت اپنا حقِ تالیف نورِ چشم اقبال نشان حکیم رضا خاں کو بخش دیا ہے اور اُس حق کو خاص اُن کا حق کیا۔ اب اور کوئی صاحب اگر مالک اکمل المطابع حکیم رضا خاں کے بے اطلاع، اُردوئے معلّٰی کے چھاپنے کا قصد کریں گے تو مواخذہ سے محفوظ نہ رہیں گے اور فوراً حسبِ منشاء قانون بستم ۱۸۴۷ء سزا پائیں گے۔"

مہر: "نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ ۱۲۶۷"

سرورق پر بالصراحت "حصہ اوّل" درج ہے۔ "خاتمۃ الطبع" میں بھی اسے وضاحت کے ساتھ "اُردوئے معلّٰی" کا حصہ اوّل بتایا گیا ہے، جواہر سنگھ جوہر کے قطعۂ تاریخ کے عنوان میں بھی "حصہ اول، اُردوئے معلّٰی" لکھا گیا ہے لیکن مجروح نے دیباچے میں لکھا ہے کہ جوہر،

میر فخر الدین اور بہاری لال نے :

"کوششِ فراواں سے اکثر خطوط جمع کیے اور قصدِ انطباع کیا اور "اُردوئے معلّیٰ" نام رکھا گیا، اور ان خطوں کو دو حصوں پر منقسم کیا۔ پہلے حصے میں صاف صاف عبارت کے خط تحریر کیے، تا طلبائے مدرسہ فائدہ اٹھائیں۔ دوسرے حصے میں مطالبِ مشکلہ کی تحریر اور تقریظ وغیرہ لکھی تا سخن وراں معنی یاب، اس کے دیکھنے سے مزہ پائیں ....." (اُردوئے معلّیٰ، طبع اوّل، ۱۸۶۹ء، صفحہ ۵)

خطوں کو اس طرح "دو حصوں پر منقسم" کرنے کا منصوبہ رہا ہوگا لیکن جیسا کہ پہلی طباعت سے ظاہر ہے اوّلاً خطوں کے اس مجموعے کا صرف "حصہ اوّل" ہی شائع ہوا۔ منشی غلام غوث بے خبر مولوی عبدالقیوم کے ایک استفسار کے جواب میں "اُردوئے معلّیٰ" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

"کہنے والے نے آپ سے سچ کہا۔ دہلی میں یہ مجموعہ (عودِ ہندی) ترتیب اور نام بدل کر چھپا ہے۔ میر فخر الدین مہتمم اکمل المطابع نے چھاپا ہے۔ "اُردوئے معلّیٰ" نام رکھا ہے۔ دو حصے قرار دیئے ہیں، ایک حصہ جس میں رقعات ہیں، مدت ہوئی تیار ہوگیا، دو دو روپے کو بکتا ہے، دوسرا حصہ، جس میں متفرقات نثر میں مثل تقریظ اور دیباچہ وغیرہ کے ہوں گے، ابھی نہیں چھپا ہے۔" (فغانِ بے خبر، صفحہ ۱۴۲)

غالباً غالب کے انتقال کے صدمے نے جامعین کے ولولے سرد کر دیے جس کے نتیجے میں "اُردوئے معلّیٰ" کا "حصہ دوم" مدت تک شائع نہیں ہوسکا اور غالب کے انتقال کے تیس برس بعد کہیں ۱۸۹۹ء میں "حصہ دوم" کی ترتیب و اشاعت کی نوبت آپائی۔ انیسویں صدی میں "اُردوئے معلّیٰ" "حصہ اوّل" کی مندرجہ ذیل دو مزید اشاعتیں ضرور عمل میں آئیں :

مطبع اُردو گائڈ، کلکتہ[1]، مارچ ۱۸۸۳ء

اکمل المطابع، دہلی، ۱۱، فروری ۱۸۹۱ء

---

[1] یہ ایڈیشن ٹائپ میں چھپا، لیکن ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے بقول :
"کہیں کہیں کچھ لفظ یا فقرے عمداً حذف کر دیے ہیں اور مجروح کے دیباچہ اور سالک کی تقریظ کو خارج کر دیا ہے۔ جو غلطیاں پہلی اشاعت میں رہ گئی تھیں وہ ویسے ہی رہیں ....."
[مقدمہ خطوطِ غالب، مہیش پرشاد، الہ آباد، ۱۹۴۱ء، صفحہ ۵]

اُردوئے معلّٰی، مع حصّہ دوم:

مرتبہ : مولانا الطاف حسین حالی

طبع اوّل : مطبع مجتبائی، دہلی، اپریل ۱۸۹۹ء

ضخامت (حصہ دوم) : ۹۴ صفحات

رقعات (حصہ دوم) : ۵۳

''اُردوئے معلّٰی'' کا حصہ اوّل غالب کی زندگی میں مرتب ہوا اور ان کے انتقال کے ۱۹ دن بعد اکمل المطابع، دہلی سے شائع ہوا۔ اس مجموعۂ مکاتیب کے ''حصہ دوم'' کی فراہمی حالی کے ہاتھوں، غالب کے انتقال کے تیس برس بعد ۱۸۹۹ء میں رُوبہ عمل آسکی۔ مطبع مجتبائی، دہلی کے مالک و مہتمم مولوی محمد عبدالاحد نے ''حصہ دوم'' کو اُردوئے معلّٰی حصہ اول سمیت جس میں ۰۸۹ خط تھے، ایک جلد میں شائع کیا۔ آغازِ کتاب میں ان کی طرف سے ایک مختصر تمہید ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

" حمد و صلوٰۃ کے بعد احقر العباد محمد عبدالاحد عفا عنہ الصمد شائقین والا تمکین کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ جب ''اردوئے معلّٰی'' مرزا غالب ہندوستان کے سعدی، مولانا حالی کی اجازت سے مطبع میں چھپی تو مولانا موصوف نے ایک قلمی مسودہ مرزا غالب کے رقعات کا اپنے پاس سے بھی عنایت فرمایا جس کو احقر نے :

حصہ دوم، اُردوئے معلّٰی

کے نام سے نامزد کرکے، اسی کے اخیر میں شامل کر دیا۔ اس حصے میں خاص کر وہ رقعات ہیں جن میں انھوں نے لوگوں کو اصلاحیں دی ہیں، یا

شاعری کے متعلق کوئی ہدایت کی ہے یا کوئی نکتہ بتایا ہے، اور بعض
کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی ہیں ۔ ۔ "

ناشر کے اس ہفت سطری تقریبی نوٹ کے بعد پہلے ہی صفحے سے "سراج المعرفت"
کا دیباچہ شروع ہو جاتا ہے یہ صفحہ ۴ کی آخری سطر پر ختم ہوا ہے، صفحہ ۴ کی آخری
سطر ہی سے صفحہ ۷ تک "حدائق انظار" کا دیباچہ ہے۔ اس کے بعد بہادر شاہ ظفر کی
ایک کتاب (صفحہ ۷ بعد) اور پھر "گلزار سرور" (صفحہ ۸ - ۱۲) کی تقریظیں ہیں۔
صفحہ ۱۲ پر نواب مرزا کلب حسین خان بہادر کی کتاب کا دیباچہ اور صفحہ ۱۴ پر صفیر بلگرامی
کے رسالے در تذکیر و تانیث کا دیباچہ ہے ۔

صفحہ ۱۵ سے "خطوط در تحقیق الفاظ و اصلاح بر اشعار بہ زبان اردو"
کے زیر عنوان خطوط شروع ہو جاتے ہیں اور گیارہ مختلف اصحاب کے نام مجموعی طور
پر ۵۳ خطوط صفحہ ۶۴ پر تمام ہوتے ہیں۔ جس ترتیب سے خط آئے ہیں، اس کی
تفصیل یہ ہے : تفتہ ۳۴ ، پیارے لال ۱ ، ذکا، سیاح ۵، ۵ ، شہزادہ بشیر،
سرور، ہشیار، کرامت علی، جوہر اور ہیرا سنگھ کے نام ایک ایک خط اور آخر میں دو خط
مجروح کے نام۔ یہ خط ، اگست ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۸ء تک کی مدت کے درمیان کے ہیں
اس حصے کا قدیم ترین خط تفتہ کے نام ہے۔ متاخر خط بھی ان کے نام ہے، لیکن ۱۸۶۸ء
کے خط تنہا انہی کے نام نہیں ہیں۔

"اردوئے معلیٰ" (مع حصہ دوم) کا ایک ایڈیشن دہلی ہی سے درج ذیل کوائف
کے ساتھ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا :

○ مطبع فاروقی، دہلی ۱۹۱۰ء

با ہتمام : سید محمد عبدالسلام مہتمم مطبع فاروقی

ضخامت (حصہ دوم) : ۵۵ صفحات   رقعات (حصہ دوم) : ۵۳

مطبع مجتبائی، دہلی (اپریل ۱۸۹۹ء) اور مطبع فاروقی، دہلی (۱۹۱۰ء) کی اشاعتوں میں
حصہ دوم علی الترتیب ۶۴ اور ۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس فرق کے علاوہ مولانا فاضل لکھنوی

کے لفظوں میں "دونوں ایڈیشن یکساں ترتیب و مواد و عبارات و الفاظ کے حامل ہیں"[1] یعنی پہلے سات تقریظیں یا دیباچے اور پھر ترپین (۵۳) خطوط۔ لیکن مطبع فاروقی کے مہتمم سید محمد عبدالسلام نے جو تقریبی نوٹ لکھا ہے، وہ اہم ہے اور "حصہ دوم" سے حالی کے تعلق پر روشنی ڈالتا ہے :

"حمد و صلوٰۃ کے بعد احقرالانام سید محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ، شائقینِ باتمکین کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ جب "اُردوئے معلیٰ" مرزا غالب کا، "حصہ اوّل" ارسطوئے زمان، مسیح دوران جناب مولوی حاجی حکیم غلام رضا خاں صاحب رئیس دہلی کی اجازت سے مطبع فاروقی دہلی میں سہ بارہ[2] چھپی تو خیال ہوا کہ اس کا دوسرا حصہ جو شمس العلما، مولانا حالی نے مرتب کیا، اس کے بارے میں جناب شمس العلما، مولانا حالی سے اجازت حاصل کی جائے۔ احقر نے مولانا سے حصولِ اجازت کی استدعا کی۔ مولانا نے جواب میں اجازت مرحمت فرمائی اور ساتھ ہی تاکید فرمائی کہ کتاب صحیح چھاپنے کی بہت کوشش کی جائے۔ اس لیے یہ حصہ آخر میں شامل کیا گیا اور نہایت صحت کے ساتھ چھاپنے کا خیال رہا۔ اس حصے میں فنِ شاعری کے متعلق مرزا غالب مرحوم نے نکات لکھے اور بعض کتابوں کے ریویو و دیباچے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ سابق اُردوئے معلیٰ میں یہ لطف حاصل نہ تھا، اب یہ کتاب دوبالا ہو گئی۔ اب اس کے پڑھنے سے کچھ اور ہی کیفیت حاصل

---

[1] مقدمہ اردوئے معلیٰ، حصہ اول، جلد اول، لاہور ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۹

[2] گویا ۱۹۱۰ء میں مطبع فاروقی سے اُردوئے معلیٰ تیسری مرتبہ (حصہ دوم کے اضافے کے ساتھ پہلی بار) چھپی۔ صرف حصہ اول پر مشتمل مطبع فاروقی دہلی کے ایک ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۰۸ء کا حوالہ مہیش پرشاد نے دیا ہے (ماہ نو، کراچی فروری ۱۹۴۹ء صفحہ ۱)۔ ۱۹۰۸ء سے پہلے یا ۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۰ء کے درمیان مطبع فاروقی، دہلی سے حصہ اول کا جو ایڈیشن شائع ہوا وہ نظر سے نہیں گزرا نہ اس کا حوالہ کہیں دیکھنے میں آیا۔

ہوگی، ع گر قبول افتد زہے عز و شرف ۔"

حالی کی معروف کتاب "یادگارِ غالب" پہلی بار ۱۸۹۷ء میں محمد رحمت اللہ رعد کے نامی پریس کانپور میں چھپی، اُس وقت تک "اُردوئے معلی" کا حصہ دوم شائع نہیں ہوا تھا۔ حالی نے "نثرِ اُردو" کے تحت اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"مرزا کی اُردو نثر میں .... سب سے زیادہ دلچسپ اور لطف انگیز ان کے خطوط ہیں جن میں سے زیادہ تر "اردوئے معلیٰ" میں اور اس سے کم "عودِ ہندی" میں جمع کر کے چھپوائے گئے ہیں اور بہت سے خطوط ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئے ہیں جو، اب تک شائع نہیں ہوئے مگر عنقریب بعض احباب کا ارادہ ان کے چھپوانے کا ہے"

"یادگارِ غالب" (۱۸۹۷ء) کی اشاعت کے دو برس بعد یہ مابعد دستیاب خطوط بھی جن کی نوید حالی نے دی تھی مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۸۹۹ء میں اردوئے معلیٰ حصہ دوم کے طور پر شائع ہو گئے۔ چنانچہ جب "یادگارِ غالب" کا دوسرا ایڈیشن حالی کی اجازت سے محمڈن کالج بکڈپو نے مطبع فیضِ عام علی گڑھ میں طبع کرایا تو حالی نے اپنے محولہ بالا بیان پر یہ حاشیہ تحریر کیا کہ :

"یادگارِ غالب کا پہلا ایڈیشن چھپنے کے بعد مطبع مجتبائی میں کل رقعات اور تقریظیں چھپ گئی ہیں ۔"

(یادگارِ غالب، طبع دوم درحیاتِ حالی، علی گڑھ، حاشیہ صفحہ ۱۵۷)

اِس پر مولانا فاضل لکھنوی لکھتے ہیں کہ :

"یہاں مولانا (حالی) اپنی ترتیب و تالیف کا ذکر نہیں کرتے ...[۱]"

اور اس سے مولانا فاضل یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ :

"یہ شہرت بلا دلیل ہے کہ "اُردوئے معلیٰ" کا حصہ دوم حالی کا مرتب کردہ ہے ۔[۲]"

[۱-۲] مقدمہ اُردوئے معلیٰ حصہ اول، جلد اول، لاہور ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۷، ۲۹ (علی الترتیب)

"اُردوئے معلّیٰ" کے "حصہ دوم" کی "حصہ اوّل" کے ۴۸۰ خطوں کے مقابلے میں کائنات ہی کیا ہے، سات تقریظیں اور ۵۳ خطوط، ان سات تقریظوں میں سے بھی چار تقریظیں "عودِ ہندی" سے منقول ہیں، صرف تین تحریریں (دیباچہ سراج المعرفت دیباچہ دیوان ذکا اور تقریظ بر کتابِ ظفر) نئی ہیں - اس کل کائنات پر حالی سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اسے خود منہ بھر کر "اپنی ترتیب و تالیف" کہیں تو اس حصّے کو ان کا مرتب کردہ مانا جائے، زیادتی کی بات ہے اور یہ حالی کے مزاج سے واقفیت کا کوئی اچھا ثبوت بھی نہیں۔ حالی کے مزاج اور ان کے انکسار کا عالم تو یہ ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بقول:

"انکسار کی انتہا ہے کہ وہ اپنی اکثر کتابوں پر مرتبہ الطاف حسین حالی لکھتے ہیں، مؤلفہ یا مصنّفہ نہیں لکھتے۔"

(اُردو، کراچی، اپریل ۱۹۵۲ء، صفحہ ۱۰)

بابائے اُردو نے ایک دوسرے موقع پر اسی بات کو زیادہ کھلے لفظوں میں بیان فرمایا ہے کہ حالی کے مزاج میں:

"خاکساری اور فروتنی خلقی تھی ..... اس سے بڑھ کر خاکساری کا کیا ثبوت ہوگا کہ انھوں نے اپنی کتابوں پر جو اصلی اور حقیقی معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں ہمیشہ "مرتبہ" لکھا، کبھی 'مولفہ' یا 'مصنفہ' کا لفظ نہ لکھا۔" (چند ہم عصر، طبع دوم، دہلی، ۱۹۴۲ء، صفحہ ۱۳۴)

"حصہ دوم" مستقل اور پورے حجم ہی کا کیوں نہ ہوتا، حالی کا مزاج ذہن میں رہے تو ان سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ اس پر "ترتیب و تالیفِ حالی" لکھتے۔

مختصر یہ کہ "اُردوئے معلّیٰ" کا "حصہ دوم" حالی کی مساعی اور توجہ سے منظر عام پر آیا۔ اس کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ انھیں یہ ذخیرہ یک جا کہیں سے مرتب صورت میں میسر آگیا یا لخت لخت انھوں نے اسے فراہم کیا، صورت خواہ کچھ بھی رہی ہو، اس سے بہر حال انکار محال ہے کہ یہ حصّہ حالی کے ہاتھوں منظر عام پر آیا اور گو اسے

اُن کا مرتبہ نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں[1]، لیکن یہ ان کا مرتبہ نہ بھی سہی۔ اُن کا فراہم کردہ ضرور ہے اور اس سے حالی کے عمل میں حسن و خیر کا جو پہلو ہے، وہ کم نہیں ہو جاتا اور "غالبیات" پر حالی کا احسان اور غالب شناسوں کے لیے اس احسان پر اظہارِ تشکر کا قرض اور فرض باقی رہتا ہے۔

اُردوئے معلیٰ (مع حصہ دوم) کی ان دو اولین اشاعتوں (مطبع مجتبائی، دہلی ۱۸۹۹ء اور مطبع فاروقی، دہلی، ۱۹۱۰ء) کے بعد، اگلے بیس بائیس برسوں میں آگرہ کانپور اور لکھنؤ سے اس کے ایڈیشن شائع ہوئے:

مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۱۴ء

مطبع مجیدی، کانپور، ۱۹۲۲ء

مطبع انوار المطابع، لکھنؤ، ۱۹۲۲ء

۱۹۲۲ء میں مطبع کریمی، لاہور سے اضافۂ خطوط کے ساتھ "اردوئے معلیٰ" کی ایک اہم طباعت و اشاعت عمل میں آئی۔

اُردوئے معلیٰ (ہر دو حصہ) مع ضمیمہ:

○ مرتبہ: شیر محمد سرخوش

طبع اول: مطبع کریمی، شیخ مبارک علی، لاہور، ستمبر ۱۹۲۲ء
ضخامت (ضمیمہ): صفحہ ۲۰۲-۲۱۹ = ۱۸ صفحات
رقعات (ضمیمہ): ۲۵

یہ اشاعت، ان معنوں میں اہم ہے کہ اس کے ذریعے "اُردوئے معلیٰ" میں ۲۵ خطوں کا اضافہ ہوا۔ ۲۳ خطوں پر مشتمل ایک "ضمیمہ" ہے جسے شیر محمد سرخوش نے مرتب کیا ہے۔ دو خط حصہ دوم کے آغاز میں خود ناشر نے اضافہ کیے ہیں۔ یہ دو خط سجاد مرزا (خلف

---

[1] حالی کی زندگی میں اس حصے کو "مرتبۂ حالی" لکھا گیا (اُردوئے معلیٰ مع حصہ دوم مطبع فاروقی، دہلی ۱۹۱۰ء) اور حالی نے اس کی تردید نہیں کی۔

حسین مرزا، ناظر) کے نام ہیں (صفحہ ۲۴۲) جو ناشر کو مکتوب الیہ کے خاندان (مولانا محمد حسین آزاد کے پوتے آغا محمد طاہر) سے دستیاب ہوئے تھے۔

ضمیمے کے ۲۳ خطوں میں سے ۲۲ قدر بلگرامی کے نام ہیں اور ایک شیخ لطیف احمد بلگرامی کے نام۔ یہ ۲۳ خط پہلی بار "رقعات مرزا غالب بنام قدر بلگرامی" کے عنوان سے مولوی علی اصغر بلگرامی نے حسرت موہانی کے رسالے اردوئے معلیٰ، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۰۷ء (صفحہ ۴-۲۳) میں شائع کیے تھے۔ سرخوش نے اس حوالے کے بغیر ان خطوں کو بطور ضمیمہ "اردوئے معلیٰ" کے محولہ فوق اشاعت میں شامل کر دیا۔ اس سہو و غفلت یا کوتاہی سے سرخوش کا یہ امتیاز بہرحال ختم نہیں ہو جاتا، کہ یہ خط غالب کے مجموعۂ مکاتیب، "اردوئے معلیٰ" میں پہلی بار سرخوش کے ہاتھوں داخل و شامل ہوئے۔

اردوئے معلیٰ، حصہ سوم :

مرتبہ : مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی
طبع اول در : اردوئے معلیٰ، حصہ دوم، صدی ایڈیشن
ناشر : مجلسِ ترقی ادب، لاہور، اپریل ۱۹۷۰ء
ضخامت (حصہ سوم) : صفحہ ۹۷۵-۱۰۴۵ = ۷۰ صفحات
رقعات وغیرہ (حصہ سوم) : ۹۳

مولانا فاضل لکھنوی نے "اردوئے معلیٰ" کا "صدی ایڈیشن" مرتب کیا، اسے مجلسِ ترقی ادب، لاہور نے بتفصیلِ ذیل شائع کیا ہے :

۱۔ اردوئے معلیٰ، حصہ اوّل، جلد اوّل : مقدمہ مرتب، صفحہ ۲-۳۳
متن خطوط : صفحہ ۴۱-۴۳۲، ۱۹۶۹ء

۲۔ اردوئے معلیٰ، حصہ اول، جلد دوم، متن صفحہ ۴۳۳-۸۴۸، ۱۹۶۹ء

۳- اُردوئے معلیٰ، حصہ دوم و حصہ سوم ہستن صفحہ ۸۴۹-۱۱۴۵، ۱۹۷۰ء
پہلی دو جلدوں میں "اُردوئے معلیٰ" طبع اول اکمل المطابع، دہلی ۱۸۹۹ء کا متن مواد آیا ہے۔ تیسری جلد کے آغاز میں (صفحہ ۸۴۹-۹۷۳) "اُردوئے معلیٰ" کے حصہ دوم، طبع اول مطبع مجتبائی، دہلی ۱۸۹۹ء کی تقریظات وغیرہ اور مکاتیب ہیں۔ اسی تیسری جلد میں صفحہ ۹۷۵ سے ۱۰۴۵ تک فاضل لکھنوی نے "اُردوئے معلیٰ حصہ سوم" کے عنوان سے ایک الگ اور جداگانہ سیکشن قائم کرکے، غالب کی ۹۳ متفرق تحریریں یک جا کردی ہیں۔ ان میں وہ خطوط بھی شامل ہیں جو اُردوئے معلیٰ (ہر دو حصہ) مطبوعہ شیخ مبارک علی، لاہور ۱۹۲۲ء کے ساتھ "ضمیمہ" کے بطور (صفحہ ۱۹-۴۰۲) یا حصہ دوم کے آغاز (صفحہ ۲۴۲) میں شریک و شائع ہوئے تھے، اور جن میں سے ۲۳ اس سے پہلے حسرت موہانی کے رسالے اُردوئے معلیٰ، علی گڑھ، شمارہ دسمبر ۱۹۰۷ء میں شائع ہو چکے تھے۔

"ابتدائیہ" کے عنوان سے غالب کی ان ۹۳ تحریروں کے بارے میں فاضل لکھنوی نے لکھا ہے کہ:

> "اُردوئے معلیٰ حصہ سوم . . . . میرے طویل مطالعے کی یادگار ہے۔ اس کے بہت سے خطوط لوگوں (غالب شناسوں) نے اپنے (مرتبہ) مجموعوں میں چھاپ دیے ہیں لیکن بحیثیتِ مجموعی فراہمی و تنقیحِ متن و تصحیح و تعیین تاریخ اور حواشی کے ساتھ با حوالہ پہلی مرتبہ پیش کیے جا رہے ہیں۔"
> (صفحہ ۹۷۵)

اس حصّے کی آخری تحریر (صفحہ ۱۱۴۴) ولیم کولڈ اسٹریم کے لیے ایک سپاس نامے پر مشتمل ہے جس کے مقابل اصل سپاس نامے کا عکس بھی شامل اشاعت ہے جو بخطِ غالب نہیں۔ کولڈ اسٹریم اور اس تحریر کے بارے میں فاضل لکھنوی نے یہ حاشیہ تحریر کیا ہے:

> " ولیم کولڈ اسٹریم، "دہلی سوسائٹی" کے آنریری سکریٹری تھے۔ ۱۸۶۵ء میں اُن کا دہلی سے لاہور تبادلہ ہو گیا۔ "دہلی سوسائٹی" نے ان کے اع

میں ایک جلسہ کیا جس میں غالب کا یہ سپاس نامہ پیش ہوا۔ دیکھیے :
افکار، غالب نمبر، صفحہ ۵۹ ۔" (اُردوئے معلیٰ، صدی اڈیشن، صفحہ ۱۱۴۲)

" افکار، غالب نمبر" سے فاضل لکھنوی کی مراد کراچی کے رسالہ " افکار" کے غالب نمبر، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء سے ہے جس کے صفحہ ۵۹ پر خود فاضل لکھنوی نے اس سپاس نامے کے بارے میں لکھا ہے کہ :

" ۱۸۶۶ء کی (دہلی سوسائٹی) کی کارروائی ابھی تک دستیاب نہیں ہوئی البتہ اس سال کی اہم اور نادر تحریر یعنی ایک غالب کا لکھا ہوا سپاس نامہ مل گیا۔ یہ سپاس نامہ بحالتِ موجودہ ۸ اِنچ لمبا اور ۲ اِنچ چوڑا ہے۔ ہلکے سرمئی رنگ کی سادہ لوح اور سادہ جدول کے بعد دس سطروں کا مسطر بنا (کر) بین السطور خوش خط، گنجان اور صاف قلم سے یہ عبارت درج ہے جو یقیناً مرزا غالب کی تخلیق ہے ۔"

فاضل لکھنوی نے دو باتیں کہی ہیں کہ یہ سپاس نامہ :

۱۔ " غالب کا لکھا ہوا" ہے ۔
۲۔ " یقیناً مرزا غالب کی تخلیق ہے ۔"

" اُردوئے معلیٰ، حصہ سوم" (زیرِبحث) میں اس قلمی سپاسنامے کا عکس شائع ہوا ہے جو غالب کے خط اور قلم سے نہیں ہے ۔ اس سپاسنامے کے آخر میں پچاس کے قریب اصحاب کے اردو یا انگریزی حروف میں دستخط ثبت ہیں ان میں سے ایک غالب بھی ہیں، لیکن محقق اس بنا پر یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ سپاس نامہ " غالب کا لکھا ہوا ہے" ؟ اِس لیے کہ " رنگِ کلام " کی مشابہت ہو تو بھی، کسی واقعی شہادت کے بغیر یہ کہنا بے دلیل اور خلافِ احتیاط ہے کہ سپاس نامہ " یقیناً مرزا غالب کی تحریر و تخلیق ہے " میرے نزدیک اس کا بارِ ثبوت، ابھی باقی ہے کہ یہ سپاس نامہ غالب کی تحریر و تخلیق ہے ۔"

" اُردوئے معلیٰ، حصہ سوم" میں شامل ایک خط (صفحہ ۱۱۴۰-۱۱۴۱) کے مکتوب الیہ کا نام معلوم نہیں بقیہ ۹۱ تحریریں ۴۲ مختلف اصحاب کے نام ہیں۔ سب سے زیادہ خط

قدر بلگرامی کے نام ہیں ۔ یہ تعداد میں بائیس ہیں ۔ صفیر بلگرامی کے نام ۶، جنوں بریلوی اور نعمان احمد کے نام ۴، ۴ ، زکی، صاحب عالم، محمد حسین خان اور کلب علی خان کے نام ۳، ۳ ، حکیم غلام نجف، آرام، آزاد، سجاد مرزا، میر ولایت علی، عزیز صفی پوری، بینا مرزا پوری، ضیاء الدین خان ضیا اور علائی کے نام ۲، ۲ خط اور ۲۵ اصحاب : حقیر، محمود مرزا، تفتہ، نجف علی، مشتاق، پیارے لال، مرزا یوسف علی شاہ عالم، سرور، ابراہیم خلیل، لطیف بلگرامی، مظہر مارہروی، صوفی منیری، ذکا، سخاوت حسین، فائق، حکیم محب علی، محمد محسن، محمد حسین، منشی نولکشور، امین الدین، ثاقب، یوسف علی بہادر، فرقان میرٹھی اور مہاراجہ سردار سنگھ کے نام صرف ایک ایک خط ہے ۔

"اُردوئے معلیٰ، حصہ سوم" کی ۹۳ تحریریں ۱۸۵۲ء اور ۱۸۶۸ء کی زمانی مدت پر پھیلی ہوئی ہیں ۔ "اُردوئے معلیٰ، حصہ اول، جلد اول" کے آغاز میں فاضل مرتب نے جو مقدمہ تحریر کیا ہے، اُس میں "حصہ سوم" کے ان کمیاب خطوں یا تحریروں کے بارے میں بجا لکھا ہے کہ :

> "صحتِ متن اور تعیینِ تاریخ کے لحاظ سے محنت طلب بھیں اور افادیت کے پیش نظر بیت اہمیت کی مالک ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ اُردوئے معلیٰ کا یہ تیسرا حصہ بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا اور قبولیت کا درجہ حاصل کرے گا ۔"
> (مقدمۂ مذکورہ صفحہ ۳۱ بہ بعد)

مکاتیبِ غالب

(اصحابِ رامپور کے نام)

غالب کی دربار رامپور سے دس بارہ برس خط کتابت رہی ۔ جنوری ۱۸۵۷ء سے مارچ ۱۸۶۵ء تک نواب یوسف علی خان ناظم کے ساتھ اور اس کے بعد اپنی وفات (۱۸۶۹ء) تک نواب کلب علی کے ساتھ ۔ ان میں سے اکثر خطوط ریاست رامپور کے دارالانشا میں

دبے پڑے تھے اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی توجہ سے پہلے منظرِ عام پر آئے۔ اشاعتِ اوّل (۱۹۳۷ء) سے اگلے بارہ برسوں میں، مکاتیب کے سات ایڈیشن شائع ہوئے:

- طبع اول: مطبعہ قیمہ، بمبئی، ۱۹۳۷ء
- طبع دوم: ۱۹۴۳ء
- طبع سوم: ۱۹۴۵ء
- طبع چہارم: ۱۹۴۶ء
- طبع پنجم: ۱۹۴۷ء
- طبع ششم: ۱۹۴۸ء
- طبع ہفتم: ۱۹۴۹ء

خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، عرشی صاحب مفید حواشی بھی بڑھاتے رہے اور دیباچہ بھی مفصل تر ہوتا گیا۔

طبع اول (۲۰×۳۰ × ۸/۲۶ سائز) میں دیباچہ ۱۸۳ صفحات اور مکاتیب و حواشی ۱۳۵ صفحات پر مشتمل تھے، خطوط کی تعداد ۱۱۵ تھی۔ ساتویں ایڈیشن میں دیباچہ ۲۵۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور حواشی ۸۷ صفحات پر مشتمل ہیں اور خطوں کی تعداد بتفصیلِ ذیل ۱۲۹ تک پہنچ چکی ہے:

۱۔ بنام نواب یوسف علی خاں ناظم (بشمول چار فارسی خطوط)	۴۳
۲۔ نواب کلب علی خاں	۷۳
۳۔ صاحبزادہ زین العابدین خاں	۲
۴۔ صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب	۲
۵۔ منشی سیل چند	۷
۶۔ خلیفہ احمد علی احمد رامپوری	۱
۷۔ مولوی محمد حسین خاں، مدیر دبدبۂ سکندری	۱
	۱۲۹ =

عرشی صاحب کا مشاہدہ ہے کہ نواب یوسف علی خان اور نواب کلب علی خان کے فرامین کے مسودوں نیز غالب کے مکاتیب میں تقریباً ۱۳۵ ایسے خطوں کے حوالے ملتے ہیں، جو مثلوں میں موجود نہیں ہیں۔ یہ سب خط بھی محفوظ ہوتے تو اصحابِ رامپور کے نام

مکاتیب غالب کی تعداد ۳۲۶ ہوتی۔ جو اور بڑھ جاتی، اگر اُن کی اہل شہر سے خط کتابت بھی دستیاب ہو سکتی۔[1]

"مکاتیبِ غالب" کے حواشی (۸۷ صفحات) مواد و معنی کے اعتبار سے تحقیق و تفحص کا ایک اعلیٰ معیار اور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ان حواشی کے علاوہ "مکاتیبِ غالب" پر عرشی صاحب کا دیباچہ (۲۰ × ۲۶/۸ سائز کے ۲۵۴ صفحات) قدر و قامت و وزن کے اعتبار سے بجائے خود ایک مستقل کتاب اور حیاتِ غالب پر ایک ناگزیر ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس طویل دیباچے کے جواز اور حدود کو عرشی صاحب نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"مرزا غالب کے سوانح حیات اور کلام نظم و نثر کا انداز و مرتبہ سمجھنے کے لیے خواجہ الطاف حسین حالی کی "یادگارِ غالب"، مولانا غلام رسول مہر کی "غالب" اور اکرام کی کتاب "غالب نامہ" مفید تصنیفات ہیں..... بایں ہمہ میرزا صاحب کے حالاتِ زندگی اور انشائے اُردو کی خصوصیات پر خامہ فرسائی کرنا میرے لئے ناگزیر ہے، اوّلاً: اس لیے کہ ضروری مواد دستیاب نہ ہونے کے باعث مذکورہ بالا تصنیفات، میرزا صاحب کے تعلقاتِ رامپور پر، جو اُن کی آخری زندگی کا اہم باب ہے، کما حقہ روشنی ڈالنے سے قاصر نظر آتی ہیں۔ ثانیاً اس لیے کہ ان تالیفات کا دائرہ میرزا صاحب کی ساری کائناتِ ادب کو محیط ہے، جس کے سبب اُن میں خاص انشای اُردو سے سیر حاصل بحث نہیں کی گئی ہے۔ البتہ میرزا صاحب کے سوانح لکھتے وقت اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ صرف وہی واقعات بیان کیے جائیں جو خود میرزا صاحب نے ان مکاتیب سے دربارِ رامپور یا وابستگانِ دربار کو تحریر کیے تھے، اور عام حالات سے جو "اُردوئے معلیٰ"، "یا عودِ ہندی" وغیرہ میں مذکور ہیں، قطعاً بحث نہ کی جائے۔ چونکہ تعلقاتِ رامپور سے

---

[1] مکاتیبِ غالب، طبع چہارم، جنوری ۱۹۴۹ء، ص ۲۵۴

کسی سوانح نگار نے تفصیلی بحث نہیں کی تھی، اِس لیے اس موضوع کی بنا، میرزا صاحب کی تمام اردو فارسی تحریروں پر رکھی گئی ہے۔ میرزا صاحب کے حالاتِ زندگی کے بعد ان کی انشای اردو کے انداز اور اس کے اجزا کی خصوصیات سے علاحدہ علاحدہ تفصیلی بحث ہے جس میں کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان زیرِ نظر مکاتیب سے مثالیں مہیا کی جائیں لیکن "اُردوئے معلیٰ" اور "عودِ ہندی" کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔"

مکاتیب کی جمع و ترتیب کا یہ کام عرشی صاحب نے ۱۹۳۵ء میں ریاست رامپور کے چیف منسٹر سید بشیر حسین زیدی کے ایما پر شروع کیا تھا اور دو سال کی محنت کے بعد اسے اس طرح پورا کیا، جیسا پورا کرنے کا حق ہوتا ہے۔ مجموعۂ مکاتیب بشیر حسین زیدی کی پانچ صفحات پر مشتمل "تقریب" کے ساتھ شائع ہوا۔ اس "تقریب" میں جس پر ۱۷ مارچ ۱۹۳۷ء کی تاریخ ثبت ہے، زیدی صاحب لکھتے ہیں:

"میں نے مولوی امتیاز علی خاں عرشی، ناظم کتابخانۂ رامپور کو (جن میں علمی قابلیت، ذوقِ سلیم اور علم و ادب کی علمی خدمت کے جذبات ہیں اور جن سے مجھے آئندہ کے لیے بہت بلند اور خوش آیند توقعات ہیں) اس ادبی خدمت کے انجام دینے پر مامور کیا اور وقتاً فوقتاً مناسب ہدایات اور مشورے دیتا رہا، ان کی مسلسل دو سال کی سعی و جانفشانی کے بعد آج یہ مجموعہ اس قابل ہوا ہے کہ ..... پیش کیا جا سکے ...."

زیدی صاحب نے "وقتاً فوقتاً ہدایات اور مشورے دیتے رہنے" پر اصرار کیا ہے، عرشی صاحب نے اپنے دیباچے میں ان "ہدایات اور مشوروں" کا کوئی ذکر نہیں کیا، صرف چیف منسٹر کے "حکم" کا تذکرہ کیا ہے جس کی تعمیل میں انھوں نے "مکاتیب کو ضروری حواشی اور ایک سیر حاصل مقدمہ کے ساتھ مسلسل دو سال کی شب و روز محنت کے بعد مرتب کیا۔ نظر بظاہر "چیف منسٹر" صاحب کی اس ادبی خدمت میں مناسب ہدایات اور مشوروں کے ساتھ شریک ترتیب رہنے والی بات، محض "حسنِ بیان" ہے۔ اس

کی واقعی حقیقت کچھ نہیں، لیکن ان کی اس بصیرت کی داد نہ دینا ظلم ہوگا جس کا انھوں نے عرشی صاحب سے آئندہ کے لیے بہت بلند اور خوش آیند توقعات وابستہ کرکے مظاہرہ کیا، اور جو حرف بحرف پوری ہوئیں۔

"مکاتیبِ غالب" کا پہلا ایڈیشن حسنِ طباعت کا بھی شاہکار تھا، بعد کی طباعتیں "درسی ایڈیشن" کے طور پر سامنے آئیں۔ طبعِ ہفتم (۱۹۴۹ء) ارزاں نسخہ ہے جسے مرتب نے حکومتِ رامپور کی اجازت سے طلباء کے لیے شائع کیا۔ "مکاتیب" (طبعِ اول) کے بارے میں مالک رام نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ :

"یہ خطوط ستر پچھتر برس سے کتاب خانۂ رام پور میں پڑے تھے، لیکن کسی نے ان کی طرف توجہ نہ کی اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اچھا ہی ہوا کہ ان کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا، ورنہ کوئی اناڑی "ڈاکٹر" انھیں غلط سلط چھاپ دیتا اور یوں، یہ ہمیشہ کے لیے غارت ہو جاتے۔ عرشی صاحب نے انھیں زندۂ جاوید کر دیا۔ پھر جس اہتمام سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے، وہ بجائے خود اردو طباعت میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس پہلو سے اگر کوئی کتاب اس کا مقابلہ کر سکتی ہے تو وہ عرشی صاحب ہی کا شائع کردہ "انتخابِ غالب" ہے۔ اردو میں اتنی حسین کتاب، آج تک شائع نہیں ہوئی۔"

(نذرِ عرشی، دہلی ۱۹۶۵ء، ص ۳۱ و بعد)

"مکاتیبِ غالب" پر دو اچھے تنقیدی جائزے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور قاضی عبدالودود کے قلم سے نکلے۔ ڈاکٹر صدیقی کا تبصرہ سہ ماہی ہندوستانی (الہ آباد) جولائی ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا (ص ۳۳۷ - ۳۶۷)۔ قاضی صاحب کا تحقیقی جائزہ ماہنامہ معاصر (پٹنہ) مارچ - جون ۱۹۴۳ء میں قسط وار چھپا۔

نادراتِ غالب :

منشی نبی بخش حقیر اور ابنِ حقیر کے نام غالب کے نئے خطوں کا یہ مجموعہ میرن صاحب

اور مجروح نے اشاعت کی غرض سے فراہم کیا لیکن شائع نہ ہو سکا۔

میرن صاحب کے نواسے آفاق حسین آفاق کو یہ مجموعہ ورثے میں ملا اور انھوں نے سیر حاصل مقدمے اور قیمتی حواشی کے ساتھ اس کی ترتیب و اشاعت کا اہتمام کیا۔[1] اس میں ۲۷ خط حقیر کے نام اور دو ان کے صاحبزادے منشی عبداللطیف[2] کے نام شامل ہیں۔ ایک فارسی کا اور بقیہ ۲۷ اردو کے ہیں۔ اس مجموعے کی "تمہید" از مرتب کے ضروری مقامات ملاحظہ ہوں:

"...... یہ خطوط مرزا غالب کے عزیز دوست میر مہدی حسین مجروح اور میر افضل علی عرف میرن صاحب نے فراہم کیے تھے، لیکن کسی وجہ سے ان کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ چونکہ میں نے اسی خانوادے میں آنکھیں کھولی ہیں، اس لیے اس گنجِ گراں مایہ کو محفوظ رکھنے کا شرف بھی میرا ہی حصہ رہا.... اس مجموعے میں خط نمبر ۲ جو مارچ ۱۸۴۸ء کا مرقومہ ہے مرزا غالب کے مطبوعہ و فراہم شدہ اردو مکتوبات میں سب سے پہلا خط ہے اور اس اعتبار سے اپنی جگہ ایک منفرد اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خطوط تمام تر منشی نبی بخش حقیر کے نام ہیں۔ دو خط جو ان کے بڑے فرزند منشی عبداللطیف کے نام تھے وہ بھی اس مجموعے میں بلحاظِ تاریخ شامل کر دیے گئے ہیں (اس مجموعے کا) پہلا خط فارسی کا "پنج آہنگ" میں موجود ہے۔[3] دو خط

---

[1] ناشر سلسلۂ مطبوعات ادارۂ نادرات، کراچی، ۱۹۴۹ء، ضخامت: حصہ اول (مقدمہ) ۹۷ صفحات حصہ دوم (مکتوبات) ۹۰ صفحات، حواشی ۹۱ صفحات، سائز ۲۰×۳۰/۱۶

[2] "نادراتِ غالب" کا آخری خط (نمبر ۷۴، بہ صفحہ ۹۰) دراصل منشی شیو نراین کے نام ہے لیکن "نادرات" میں سہواً اس کا انتساب منشی عبداللطیف کے نام ہو گیا ہے۔ "اردوئے معلیٰ" میں یہ خط غلطی سے حقیر کے نام چھپا ہے، لیکن اصلاً ہے یہ آرام کے نام۔

[3] ان دو میں سے ایک (نمبر ۴۷، بہ صفحہ ۹۰) آرام کے نام ہے لیکن جیسا کہ اوپر حاشیہ (۲) میں مذکور ہوا، غلطی سے "اردوئے معلیٰ" میں حقیر کے نام چھپا ہے۔ "نادرات" میں اس پر سہوِ مزید یہ ہوا کہ اس پر منشی عبداللطیف کا نام درج ہو گیا ہے۔

منشی نبی بخش کے نام کے اور ایک منشی عبداللطیف کے نام کا "اردوئے معلّٰی" میں شامل ہیں۔ مزید برآں "یادگارِ غالب" میں بعض دیگر خطوط کے اقتباسات مختلف مقامات پر نقل کیے گئے ہیں.... (جو) اس امر کی دلیل ہے کہ خطوط کا یہ مجموعہ مولانا حالی کے پیشِ نظر رہا ہوگا.... "نادراتِ غالب" دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ تحقیقی ابواب پر مشتمل ہے اور دوسرے میں متن و حواشی درج کیے ہیں۔ متن میں جو خطوط شامل ہیں وہ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۹ء تک کے دور میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے۔ اتفاق سے مرزا غالب کی زندگی کا یہ دس سالہ دور کافی تاریکی میں تھا، ان خطوط سے یہ خلا بھی پُر ہو گیا......"

قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ:

"جناب آفاق کی تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط مجروح اور میرن صاحب نے فراہم کیے تھے لیکن پتہ نہیں چلتا کہ جناب آفاق کو اصل خط ملے ہیں یا اُن کی نقلیں۔ یہ بھی صراحتاً انھوں نے نہیں لکھا کہ "پنج آہنگ" اور "اُردوئے معلّٰی" میں جو خطوط موجود ہیں وہ بھی انھیں ملے ہیں یا یہ ان مجموعوں سے لیے گئے ہیں جس کتاب کی تمہید، سرنامے اور مقدمے نے ۱۰۷ صفحات لیے ہیں' اس میں اتنی ضروری اطلاعات کا نہ ہونا حیرت انگیز ہے۔"

(معاصر، پٹنہ، حصہ ۱، صفحہ ۱۶۲)

کتاب کے مشمولات کی ترتیب یہ ہے:

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بقول :

"نادرات غالب" میں بہت سی ایسی باتیں ملتی ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملیں گی۔ آفاق صاحب نے نہ صرف بہت سے ان غیر مطبوعہ نادر رقعات کو ضائع ہونے سے بچالیا جو منشی نبی بخش حقیر کے نام ہیں بلکہ اپنی طرف سے تلاش و تحقیق کے بعد ایسے حواشی وغیرہ کا اضافہ کیا ہے جن میں بہت سی کار آمد معلومات ہیں۔" (سرنامہ، صفحہ ۴)

قاضی عبدالودود نے خطوط کے زمانۂ تحریر کی قیاسی تعیین میں آفاق صاحب کی "دو غلطیوں" کی نشاندہی کی ہے :

"خط ۱۶ کا زمانۂ تحریر ستمبر ۱۸۵۱ء تا مارچ ۱۸۵۲ء لکھا ہے لیکن

---

[1] "مرزا غالب کے شاگرد" ہمارے موضوع سے بظاہر ایک ہٹی ہوئی چیز سہی، لیکن ایک نئی چیز ضرور ہے"۔ (آفاق حسین آفاق، تمہید، ص ۹)

اس میں یہ عبارت ہے: "میاں لڑکے بالے سب خیر و عافیت سے ہیں تم کو بندگی اور اپنے بھائی بہنوں کو سلام کہتے ہیں۔" یہ خط صریحاً اُس زمانے کا ہے جب باقر علی خاں بھی غالب کے ہیاں آگئے ہیں اور یہ ۲۸ رمضان ۱۲۷۱ھ (مطابق جون ۱۸۵۵ء) یا اس کے کچھ ہی بعد کی بات ہے جیسا کہ خط ۵۹ سے ثابت ہے۔ خط ۶۵ کی تاریخ تحریر ۳-اکتوبر ۱۸۵۵ء لکھی ہے۔ خط ۶۵-۴-اکتوبر کا ہے '۳'-اکتوبر کا نہیں ہے۔"

(معاصر، پٹنہ، حصہ ۱، صفحہ ۱۶۷)

"غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط ایک نادر شے ہے چہ جائیکہ ایسا مجموعہ جسے پڑھ کر غالب کی زندگی اور ان کے زمانے کے بعض اہم واقعات کی وضاحت بھی ہوتی ہو اور بعض علمی و ادبی نکات بھی حل ہوتے ہوں ان خطوط کا ایک ایک لفظ پڑھنے اور محفوظ رکھنے کے قابل ہے۔"

(پروفیسر سید وقار عظیم گرد پوش "نادراتِ غالب")

"اس مجموعے کی یہی خصوصیت نہیں کہ اس میں غالب کے غیر مطبوعہ خطوط ہیں آفاق صاحب نے اس کو حواشی سے بڑے کام کی چیز بنا دیا ہے اور پھر غالب ہی کے خطوط سے ان کی اہلی و ادبی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو اس سے قبل تاریکی میں تھے۔ حواشی میں ان تمام لوگوں کے حالات درج ہیں جن کا غالب نے اپنے خطوط میں جا بجا ذکر کیا ہے اور اس حیثیت سے یہ کتاب واقعی "نادر" کہلائے جانے کی مستحق ہے۔"

(نیاز فتحپوری، گرد پوش نادراتِ غالب)

"خُطُوطِ غالب"

"خُطُوطِ غالب" کے نام سے ۱۹۴۱ء میں ہندوستانی اکیڈمی یو۔ پی الہ آباد سے

ٹائپ میں ایک مجموعہ شائع ہوا جسے مہیش پرشاد (۱۸۹۱ء - ۱۹۵۱ء) نے مرتب کیا اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (۱۸۸۵ء - ۱۹۷۲ء) نے اس پر نظرِ ثانی کی۔ مہیش پرشاد کے دیباچے سے اس مجموعے کے بارے میں ضروری کوائف پر روشنی پڑتی ہے:

"عودِ ہندی" اور "اُردوئے معلیٰ" اور ان کے علاوہ بہت سے خط اس میں شامل ہیں جو ان دونوں کتابوں کے کسی نسخے میں نہیں ملتے بلکہ کسی اور کتاب یا مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو اب تک کہیں شائع نہیں ہوئے یا شائع ہو چکے ہیں مگر ان میں جا بجا غلطیاں تھیں۔ جو خط "عودِ ہندی" یا "اُردوئے معلیٰ" میں ہیں اُن کے مقابلے اور تصحیح کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں کہیں ایک متن کے دو یا زیادہ نسخوں میں اختلاف تھا، بہتر صورت کو متن میں رکھا اور اختلاف اگر کاتب کے سہو پر مبنی پایا گیا تو اس سے قطع نظر کیا گیا، صرف اہم اختلافات حاشیے میں دیئے گئے ہیں۔ ہر ایک مکتوب الیہ کے نام کے خط تاریخی ترتیب سے مرتب کیے گئے ہیں۔ ہر ایک مکتوب الیہ کے نام کے پہلے خط کی تاریخ کے لحاظ سے مکتوب الیہان کی تقدیم و تاخیر کی گئی ہے۔ "عودِ ہندی" میں بہت تھوڑے خط ایسے ہیں جن میں تاریخیں درج ہیں مگر ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ ان میں دن اور مہینہ تو ہے مگر سنہ نہیں ہے۔ "اُردوئے معلیٰ" میں بہت سے خطوں میں تاریخیں ہیں، کہیں ہجری تاریخیں کہیں عیسوی تاریخیں ہیں، کہیں دونوں اور بعض تاریخیں غلط بھی ہیں۔ اس مجموعے میں تاریخوں کو ایک ڈھنگ پر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جن خطوں میں صرف ہجری تاریخیں ہیں اُن کے مطابق عیسوی تاریخیں خط کے آخر میں درج کر دی گئی ہیں۔۔۔۔ جس خط میں کوئی تاریخ درج نہیں ملی اُس کے زمانے کی تعیین اندرونی شہادت یا کسی اور ذریعے سے کی گئی۔

(نوابانِ رامپور) کے نام غالب کے بہت سے خط "مکاتیبِ غالب" کے نام سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے۔۔۔۔ "مکاتیب" میں سے میں نے خطوں کو لے کر اس مجموعے میں درج کیا ہے۔ تلاش اور کوشش سے جو مسالا مجھے ملا اس میں بعض

چیزیں بہت قدر کے قابل ہیں جیسے ایک پُرانا خط تفتہ کے نام کا ایک اور خط مجروح کے
نام کا ۔ پہلا "اردوئے معلیٰ" (حصہ دوم) میں موجود ہے، دوسرا ابھی تک شائع نہیں
ہوا تھا.... قاضی عبدالجمیل جنوں کے نام کے سترہ خط "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلیٰ"
میں ہیں مگر ان کے بیٹے قاضی محمد خلیل رئیس بریلی نے ان خطوں کی تعداد کو تیس تک
بڑھا دیا اور مطبوعہ خطوں کا اصل سے مقابلہ کرنے اور خطوں کی نقل کروانے اور پھر
ان کا مقابلہ کرنے کی زحمت فرمائی۔ نیز غالب کے لکھے ہوئے لفافے اور بعض اصلاحیں
وغیرہ عنایت فرمائیں ۔ انورالدولہ شفق کے نام کے گیارہ خط اعظم گڑھ میں (ایک)
صاحب کے پاس ہیں۔ ان خطوں سے مطبوعہ خطوں کا مقابلہ کیا جا سکا قاضی عبدالودود
کی توجہ سے سید فرزند احمد بلگرامی کے نام کے چھ خط ملے (دیگر متعدد اکابر نے مختلف
خطوط نقل یا مقابلے کے لیے عنایت فرمائے جن سے کتاب کی ترتیب و تکمیل میں بڑی
مدد ملی ۔

قدر بلگرامی کے نام بعض خطوں کی نقلیں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے پاس تھیں
ان میں سے بعض خطوں کے متن کو درست کرنے میں مدد ملی۔ ان کے پاس غالب
کے رقعوں کا ایک انتخاب ہے جسے خود غالب ہی نے ترتیب دیا تھا (اس) سے
بھی بعض خطوں کی تصحیح میں مدد ملی ۔

متعدد اردو رسالوں میں غالب کے خط شائع ہوتے رہے جن میں سے خاص
ذکر کے قابل یہ ہیں: فصیح الملک ، اردو ، ہندوستانی ، معارف ، مرقع (لکھنؤ)،
خیابان (لکھنؤ)، ندیم (گیا)، حیاتِ نو (پانی پت)۔ جرنل ہسٹاریکل سوسائٹی (لکھنؤ)
میں نے ان سب رسالوں سے فائدہ اٹھایا ہے — میں اپنے محترم کرم فرما ڈاکٹر عبدالستار
صدیقی صاحب کا شکریہ اگر خصوصیت سے ادا نہ کروں تو بلاشبہ ایک سنگین اخلاقی
جرم کا مرتکب ہوں گا کیوں کہ اگر وہ عملی طور سے میری حوصلہ افزائی نہ فرماتے ،
وقتاً فوقتاً مجھے مشورہ نہ دیتے ، میرے کام کی نگرانی نہ رکھتے ، مواد کی فراہمی کے
علاوہ تمام متن کی تصحیح و نظرِ ثانی نہایت ہی جانفشانی کے ساتھ نہ کرتے ، میری غلطیوں

کو دور نہ کرتے اور بعض ضروری حاشیے نہ بڑھاتے تو یہ مجموعہ جس صورت میں ... پیش ہو رہا ہے، اُس صورت میں ہرگز نہ پیش ہو سکتا۔" (مہیش پرشاد، بنارس، جنوری ۱۹۴۱ء)

"خطوطِ غالب" (مُرتبہ: مہیش پرشاد) کا ایک نیا ایڈیشن انجمن ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ سے ۱۸×۲۲/۸ سائز کے ۴۴۸ صفحات پر مشتمل، آلِ احمد سرور کے "تعارف" کے ساتھ شائع ہوا جس پر سالِ اشاعت ۱۹۶۲ء درج ہے لیکن سرور صاحب کی تعارفی تحریر کے آخر میں ۲۰۔ مارچ ۱۹۶۳ء کی تاریخ ثبت ہے۔ اس ایڈیشن پر بوجوہ[۵] مرتب کے طور پر مالک رام کا نام درج ہے۔ اس ایڈیشن کے مشمولات کی تفصیل یہ ہے:

مکتوب الیہ		
ہرگوپال تفتہ	تعداد خطوط:	۱۲۲
نبی بخش حقیر		۷۰
جواہر سنگھ جوہر		۳
عبداللطیف		۲
بدرالدین فقیر		۵
عبدالجمیل جنون		۳۰
انوار الدولہ شفق		۲۱
یوسف مرزا		۱۲
یوسف علی خاں عزیز		۳
احمد حسین میکش		۲
محمد یوسف علی خاں ناظم		۳۷
غلام حسنین قدر بلگرامی		۲۲
غلام نجف خاں		۲۳

۵ــ "وجوہ" کی کچھ تفصیل کے لیے دیکھیے: "اردو تحقیق اور مالک رام" مرتبہ: شاہد اعظمی، ادارۂ تحقیق، دہلی نمبر ۶، مطبوعہ ۱۹۷۵ء، صفحہ ۱۱۴ - ۱۲۵، نیز ہفتہ وار "ہماری زبان"، دہلی ۸ مارچ ۱۹۷۵ء، ص ۱-۲

مہدی حسین مجروح	۵۰
شہاب الدین ثاقب	۱۰
حاتم علی مہر	۱۹
زین العابدین خاں	۲
علاء الدین احمد خاں علائی	۵۸
شیو نرائن آرام	۳۵
دو نامعلوم اصحاب	۲

خطوں کی کل تعداد: ۵۲۸

"خطوط غالب" کے اس تازہ ایڈیشن کے بارے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، عقیل حسن موسوی کے نام ۸۔ اپریل ۱۹۶۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ اس کا: "ظاہر تو جیسا کچھ ہے سب پر عیاں ہے، باطن اس سے کہیں زیادہ خراب اور مسخ۔ خط غلط، معنی غلط، انشا غلط، املا غلط۔ نہ صحت کا لحاظ نہ ماخذ کا پتا۔ حواشی میں محققات موجود البتہ ان کی حیثیت طلسمات کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ جو وضاحتیں کتاب کے ہندوستانی اکیڈمی والے ایڈیشن میں میرے معروضات کے ذریعے ہوئی تھیں، وہ یک قلم خارج۔ اب اس طلسم کو کھولے تو کون اور کھلے تو کیونکر؟ ظاہرا پڑھنے والے اندھیرے میں بھٹکتے رہیں گے۔"[1]

مالک رام لکھتے ہیں:

"میرے کام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جناب مہیش پرشاد کی اصل کتاب میں جو ٹائپ میں چھپی تھی خطوں کا متن ستائیس سطری مسطر پر ۴۰۸ صفحات کو محیط ہے اور اس میں ۴۵۲ خط ہیں۔ طبع ثانی میں کتاب نستعلیق میں چھپی ہے۔ اس کے ہر صفحے میں بھی ستائیس سطریں ہیں لیکن نستعلیق کی گنجان کتابت کے باوجود اس کی ضخامت ۴۴۸ صفحات کی ہے اور اس میں

---

[1] ہفتہ وار بلٹز، بمبئی ۱۵۔ فروری ۱۹۷۵ء ص

۵۲۰ خطوط ہیں۔[1]"

گویا "خطوطِ غالب" (طبع اول ۱۹۴۱ء) کے مقابلے میں، اس کے تازہ ایڈیشن میں ۷۹ خط زائد ہیں۔ ان ۷۹ خطوں میں ۷۳ خط "نادراتِ غالب" مرتبہ: آفاق حسین آفاق دہلوی سے ماخوذ و منقول ہیں، تین خط مالک رام نے دیگر ماخذ سے فراہم کیے ہیں۔

خُطوطِ غالب:

"خُطوطِ غالب" کے نام سے مولانا غلام رسول مہر نے دو حصّوں میں ایک مجموعہ مرتب اور شائع کیا، حصّہ اول ۱۹۵۱ء میں اور حصّہ دوم فروری ۱۹۵۲ء کے بعد کتاب منزل لاہور سے شائع ہوا۔ حصّہ اول ۳۶۱ اور حصّہ دوم ۴۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ حصّہ اول کے شروع میں دو صفحات کا "تعارف" اور ۴۹ صفحات کا "مقدمہ" ہے۔ مقدمے کے آخر میں ۱۴ مئی ۱۹۵۱ء کی تاریخ درج ہے۔ حصّہ دوم پر سالِ اشاعت درج نہیں، لیکن صفحہ ۴۳۵ پر فروری ۱۹۵۲ء کا حوالہ آیا ہے جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ حصّہ مذکورہ تاریخ کے بعد کسی وقت شائع ہوا ہوگا۔

"خطوطِ غالب" کے تعارف میں مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ:

"اِس مجموعے میں مرزا (غالب) کے وہ تمام خطوط آگئے ہیں جن کا مرتب کو سراغ مل سکا، صرف دو مجموعوں کو چھوڑا گیا، ایک مکاتیب رامپور کا مجموعہ دوسرا منشی نبی بخش حقیر کے نام خطوط کا وہ مجموعہ جو "نادراتِ غالب" کے نام سے چھپا ــــــ تمام خطوط تاریخ وار مرتب کر دیے گئے ہیں جن خطوں پر تاریخیں ثبت نہیں تھیں ان کے بارے میں داخلی شہادتوں

---

[1] ہفتہ وار ہماری زبان، دہلی ۸۔ مارچ ۱۹۷۵ء، صفحہ ۱

کی بنا پر قیاساً فیصلہ کیا گیا کہ وہ کس زمانے کے ہوں گے... تمام مکتوب الیہم کے حالات لکھ دیئے گئے ہیں تاکہ مرزا (غالب) کے ساتھ اُن کے تعلق کی حیثیت واضح ہو جائے ... خطوط میں جابجا مقامی اور تاریخی تلمیحات ہیں.... عام خوانندگانِ کرام تشریح کے بغیر انہیں سمجھ نہیں سکتے..... مرتب نے حتی الامکان تمام تلمیحات کی تشریح کر دی ہے۔ ابتدا میں مقدمہ لکھا جس میں انشائے غالب کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں... اوقاف کے اہتمام میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ ہوا۔" (تعارف حصہ اول) محرر ج

"خطوطِ غالب" کا دوسرا ایڈیشن، ایک جلد میں کتاب منزل، لاہور سے شائع ہوا، اس پر سنہ طباعت درج نہیں، یہ ۶۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ "خطوطِ غالب" کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۲ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور سے شائع ہوا، جو ۵۸۴ صفحات پر مبنی ہے۔ ۱۹۶۸ء میں "خطوطِ غالب" کا ایک نیا ایڈیشن ایک جلد میں شائع ہوا[1] اس کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ:

"خطوطِ غالب" کا یہ چوتھا ایڈیشن ہے۔ اس میں ان خطوط کی بھی خاصی بڑی تعداد شامل کر دی گئی ہے جو پہلے ایڈیشنوں کے وقت دستیاب نہیں ہو سکے تھے۔ تصحیح اور ترتیب و تحشیہ کے اہتمام میں بھی حتی الامکان کوئی دقیقہ سعی اُٹھا نہیں رکھا گیا لہٰذا اگر میں گزارش کروں کہ اب کتاب سابقہ ایڈیشنوں سے مقابلے میں زیادہ مکمل و جامع ہے تو شاید وہ ستائش نفس پر

---

[1] ناشر: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، بار چہارم ۱۹۶۸ء، صفحات: ۵۸۴

محمول نہ ہو، بعض خطوط بروقت ہاتھ نہ آسکے اور تکمیلِ کتابت کے بعد ملے، انھیں مجبوراً ضمیمے میں درج کیا گیا۔"

(خطوطِ غالب، طبع چہارم ۱۹۶۸ء، صفحہ ۳۸)

فروری ۱۹۶۹ء میں غالب کی صدسالہ برسی کے موقع پر مجلسِ یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کی جانب سے ٹائپ میں مولانا غلام رسول مہر کے مرتبہ "خطوطِ غالب" دو جلدوں میں شائع ہوئے۔ جلدِ اوّل ۵۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ جلدِ دوم صفحہ ۵۱۹ تا ۱۰۱۱ صفحات پر مبنی ہے۔ "گزارشِ احوالِ واقعی" کے عنوان سے جلدِ اوّل کے آغاز میں مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ:

"خطوطِ غالب" کا یہ مجموعہ کسی طویل تمہید و تعارف کا متقاضی نہیں۔ اس میں میرزا (غالب) کے وہ تمام مکاتیب آگئے ہیں جو علم میں آسکے اور ان پر دسترس ہو سکی۔ صرف دو چیزیں یہ (مکاتیبِ غالب" عرشی اور" نادراتِ غالب" آفاق دہلوی) بعض قانونی و اخلاقی موانع کی بنا پر باہر رہ گئیں .... بہ ایں ہمہ اس مرقع میں مرزا غالب کے اتنے خطوط اور بعض دوسرے رشحاتِ قلم یک جا ہو گئے ہیں کہ غالباً ان جواہر پاروں کا اتنا مجموعہ پہلے کبھی تیار نہیں ہوا۔ نامۂ غالب نیز تقریظوں، دیباچوں اور متفرق تحریروں کے علاوہ صرف خطوط کی تعداد پونے سات سو سے زیادہ ہی ہوگی، کم نہ ہوگی۔

ایک جامع مجموعے کی ترتیب میں "اردوئے معلّٰی" اور "عودِ ہندی" کی تفریق کا خاتمہ ناگزیر تھا.... یہی بہتر تھا کہ تفریق ختم کر دی جائے اور ایک ہی مجموعے میں زیادہ سے زیادہ خطوط و رشحاتِ قلم جمع کیے جائیں، اگرچہ اسے دو جلدوں میں تقسیم کرنا پڑے.... نئے مجموعے کی ترتیب کا مقصد صرف یہی نہ تھا کہ مرزا غالب کے تمام اردو مکاتیب یکجا ہو جائیں۔ اس کے علاوہ چند ضروری کام تھے جو

بہت پہلے پورے ہو جانے چاہئیں تھے تاکہ ان نگارشات کا مطالعہ زیادہ سہل و مفید، نیز زیادہ دلآویز ہو جاتا:

۱۔ متن کی تصحیح ۲۔ مکاتیب کی تاریخ وار ترتیب

۳۔ تاریخی جغرافیائی، علمی اور ادبی تلمیحات و اشارات کی مناسب تشریح

۴۔ مکتوب الیہ کے احوال و سوانح کا مختصر خاکہ

۵۔ مشکل الفاظ و تراکیب کی توضیح

متن کی تصحیح کے سلسلے میں سب سے پہلی قابلِ ستائش کوشش منشی مہیش پرشاد نے کی۔ وہ مختلف مکتوب الیہم کے وارثوں تک پہنچے ..... اصل مکاتیب کا مقابلہ شائع شدہ متون سے کیا۔ اس طرح فروگذاشتوں اور تسامحوں کی تلافی کر دی۔ بعض نئے مکاتیب بھی حاصل کیے .... میں باقی خطوط کا مقابلہ اصل سے کرنا چاہتا بھی تو یہ کام تقسیمِ ملک کے بعد بہت مشکل ہو گیا تھا لہٰذا اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ "اردوئے معلیٰ" اور "عودِ ہندی" کے جتنے بھی ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں، اُن کے متون سامنے رکھ کر بہ امعانِ نظر غلطیوں اور فروگزاشتوں کا سراغ لگایا جائے... (اس مجموعے کے) متن میں بعض ایسی تصحیحات بھی ملیں گی جن کے ضمن میں مجھے منشی مہیش پرشاد اور دوسرے تمام مطبوعہ ایڈیشنوں سے اختلاف کے سوا کوئی راستہ نظر نہ آیا.... ایسے مقامات کے سلسلے میں .... حواشی کے ملاحظے سے حقیقت کا اندازہ ہو جائے گا۔

خطوں کی تاریخ وار ترتیب کا کام گوناگوں مشکلات سے لبریز تھا ..... تاہم جو احتیاط حدِ امکان میں تھی، اس میں کوتاہی نہ ہوئی .... پچہتر فیصد تاریخیں بھی درست ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس ضروری کام کا راستہ ہموار ہو گیا، مگر مجھے .... اُمید ہے کہ اختلاف

کی گنجائش زیادہ نہ ہو گی۔

میرزا غالب نے ہر مکتوب الیہ کے خط میں جو مطالب و مباحث تحریر فرمائے، وہ غیر مرتب شکل میں ٹھیک ٹھیک ذہن نشین نہیں ہو سکتے تھے.... اب تمام مطالب و مباحث طبعی ترتیب میں پیش ہو رہے ہیں اور ان کا مطالعہ یقیناً زیادہ مفید و نتیجہ خیز ہو گا......

میرزا کے خطوط میں تاریخی، جغرافیائی یا دوسری تلمیحات بھی خاصی ہیں... ان کی تشریح کے بعد مطالب خطوط سے زیادہ حظ اُٹھایا جا سکے گا.... بہر حال سعی و کاوش سے جو کچھ ممکن تھا، وہ اس مرقع کی شکل میں حاضر ہے۔"

ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول: "عام طور پر خطوط وقتی دلچسپی کے حامل ہوتے ہیں اور بعد میں ان کی تاریخی حیثیت صرف ایک تبرک کی رہ جاتی ہے لیکن خطوطِ غالب، غالب کی شاعری کی طرح ایک ایسے سدا بہار پھول کی طرح ہیں جس کی خوشبو، رنگ و نور ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔ آج بھی انھیں پڑھیے تو غالب کی ذکاوت، احساسِ مزاح، اندازِ نظر، خوبصورت نثر اور برجستہ فقرے ہمارے دل کو موہ لیتے ہیں۔ باہتمام مولانا غلام رسول مہر ("خطوطِ غالب" کے نام سے دو جلدوں میں) غالب کے خطوط تاریخ وار ترتیب اور صحتِ متن کے ساتھ یک جا کر دیے گئے ہیں۔ غالب کے خطوں کا اتنا بڑا مجموعہ اس سے پہلے کبھی شائع نہیں ہوا[۱]"

غالب کی نادر تحریریں:

"غالب کی وفات سے اب تک مختلف رسالوں میں ان کے خطوط شائع ہوتے رہے ہیں۔" (ڈاکٹر) خلیق انجم نے کوشش کی ہے کہ "ان تمام موتیوں کو جو لگ بھگ

۱؎ نیا دور، کراچی، شمارہ ۵۵، ۵۶، ۱۹۷۱ء، ص ۳۰۷

سو سال کے جریدوں میں بکھرے پڑے ہیں سلیقے سے ایک لڑی میں پرو دیں [۱]۔

کتاب کے مشمولات و مندرجات کی ترتیب یہ ہے :-

اس مجموعے میں کم و بیش وہ تمام خطوط شامل ہیں جو غالب کے کسی مجموعے میں شریک نہیں، البتہ مرتب نے "دو تین خطوط" بوجوہ ایسے ضرور اس مجموعے میں شامل کر لیے ہیں جو "خطوطِ غالب" مرتبہ مہیش پرشاد اور "خطوطِ غالب" مولانا غلام رسول مہر میں آگئے تھے۔ ماخذ کا حوالہ ہر جگہ درج کیا ہے۔ اخیر میں بہت مفید اور قیمتی حواشی لکھے گئے ہیں اور خطوط کو تاریخ وار ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کام نے بہت سلیقے، محنت اور خوش ذوقی سے صورتِ انجام پائی ہے۔

نادر خطوطِ غالب (جعلی):

یہ نادر مجموعہ جو سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی گیاوی کی کوشش و کاوش کا نتیجہ ہے بتفصیلِ ذیل ستائیس خطوں پر مشتمل ہے [۲] :

---

[۱] ناشر: مکتبہ شاہراہ دہلی، فروری ۱۹۶۱ء، صفحات: ۱۸۴، سائز ۱۸×۲۲/۸

[۲] ناشر: کاشانۂ ادب لکھنؤ، ۱۹۳۹ء، صفحات: ۹۲، سائز: ۲۰×۳۰/۱۶

۱ - بنام سید شاہ کرامت حسین کرامت ہمدانی ۲۳
۲ - بنام صفیر بلگرامی ۳
۳ - بنام صوفی منیری ۱

"نادر خطوط" کے مرتّب رسا ہمدانی کا بیان ہے کہ:

"میرے دادا سید شاہ علی حسین ہمدانی المتخلص بہ عالی ہمدانی نے ۱۹۱۲ء میں غالب کے چند غیر مطبوعہ خطوط جو اُن کے والد سید شاہ کرامت حسین کرامت ہمدانی بہاری کے نام سے آئے تھے، ایک خوش خط کاتب سے صاف کرا کے، کتابی صورت میں یک جا جمع کیے تھے اور ان کا تاریخی نام "نادر خطوط غالب" رکھا تھا۔ افسوس یہ ہے کہ چند مجبوریوں کی وجہ سے وہ خطوط، کتابی صورت میں اب تک شائع نہ ہو سکے۔"

(دیباچہ، صفحہ ۱۵، ۱۶)

اِن خُطوط کو رسا ہمدانی نے کتابی صورت میں شائع کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ستائیس خطوں میں سے چھبیس خط، جعلی ہیں۔ صرف صوفی منیری کے نام ایک خط اصلی ہے:

"مرتب نے مطبوعہ خطوں کے ٹکڑے ادھر ادھر سے جمع کر کے یہ خط تیار کر لیے ہیں، ورنہ میرزا نے کبھی یہ، ان کے پردادا جناب کرامت ہمدانی مرحوم کے نام نہیں لکھے تھے۔"

(مالک رام، ذکرِ غالب، طبع چہارم، ص ۲۱۴)

تفصیل کے لیے دیکھیے مالک رام کا مضمون "نادر خطوط غالب پر ایک نظر"[1] اور "نادر خطوط غالب"[2] (تبصرہ) از قاضی عبدالودود جن میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ان "نادر خطوط" کی کوئی واقعی اور حقیقی بنیاد نہیں ہے۔

"رسا صاحب نے "عودِ ہندی" اور "اُردوئے معلی" سامنے رکھ کر بہت سے خطوط کی مختلف عبارتیں نکال کر انھیں مرتب کیا ہے۔ مالک رام اور قاضی عبدالودود نے

---

[1] جامعہ، دہلی، مارچ ۱۹۴۲ء [2] معاصر، پٹنہ، جنوری ۱۹۴۳ء

ثابت کیا ہے کہ یہ خطوط ہرگز شاہ کرامت حسین کے نام نہیں لکھے گئے۔ خود رسا ہمدانی صاحب کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں ۔" (خلیق انجم، غالب کی نادر تحریریں' ۱۹۶۱ء، ص ۲۴ و بہ بعد)

" یہ کتاب جعلی خطوط کا مجموعہ ہے، لیکن یہ جعل عبارت میں نہیں، مکتوب الیہ کے متعلق عمل میں آیا ہے، عبارت، غالب ہی کے مطبوعہ خطوط کے تار و پود سے بنی ہے . . . " (عرشی، فرہنگِ غالب، ۱۹۴۷ء، ص ۲۳)

" اس کتاب کی نسبت جناب عرشی کا قول ہے کہ "جعل عبارت میں نہیں، مکتوب الیہ کے متعلق عمل میں آیا ہے"۔ اس سے صورتِ حال کامل صحت کے ساتھ ظاہر نہیں ہوتی، اس میں صرف غالب کے عبارات نہیں، حالی اور مرتب "نادر" کے عبارات بھی ہیں اور غالب و حالی کے عبارات میں مرتب نے جا بجا تصرف بھی کیا ہے . . . "
(قاضی عبدالودود، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، ص ۲۵۳)

" نادر خطوط غالب : میرزا کے ۲۷ اُردو مکاتیب کا مجموعہ، میرے نزدیک اِن سب کا مستقل وجود محل نظر ہے۔"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، لاہور بار چہارم ۱۹۶۸ء، مقدمہ، ص ۱۳)

"نادر خطوطِ غالب" کے عنوان سے سید اسمٰعیل رسا گیاوی نے "غیر مطبوعہ" خطوط کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے، جسے وہ غالب کا نتیجۂ قلم بتاتے ہیں۔ اس میں غالب کے رقعات سے ترکیبیں اور فقرے لے کر خطوط تیار کیے گئے ہیں، لیکن کوئی شخص جو غالب کا اندازِ تحریر پہچانتا ہے، سید صاحب کا دعویٰ تسلیم نہیں کرے گا ۔"
(شیخ محمد اکرام، غالب نامہ: آثارِ غالب، طبع چہارم، بمبئی، ص ۱۹۵ و بہ بعد)

رسا ہمدانی نے مقدمے میں ان حالات و اسباب کا بھی ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے وہ اس سے پہلے یہ خط شائع نہیں کر سکے تھے اور اب کر سکے :

" بات یہ تھی ۱۹۱۸ء میں میرے دادا سید شاہ علی حسین ہمدانی (المتخلص بہ عالی ہمدانی) کا انتقال ہو گیا اور یہ "نادر خطوط غالب" ان کے دیگر ملفوظات کے ساتھ ان کے بکس میں بند رہے۔ جون ۱۹۲۱ء

میں مجھے غالب کے غیر مطبوعہ خطوط شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ندیم"
اور "ساقی" کے ایڈیٹروں نے بڑے اصرار سے دو چار خطوط مجھ سے
لے کر "ندیم" اور "ساقی" میں شائع کیے۔ اس کے بعد کثرتِ مشاغل
کی وجہ سے میں پھر دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہو گیا اور یہ خطوط
کتابی صورت میں شائع نہ ہو سکے۔ دسمبر ۱۹۳۸ء سے میرے محترم
دوست پیارے لال شاکر میرٹھی ..... میرے سر ہو گئے۔"

آخر کار شاکر میرٹھی صاحب کی فرمایش اور "فہمایش" اس مجموعے کی اشاعت کا باعث ہوئی۔
اس "نادر" مجموعے کا انتساب ڈاکٹر سچدانند سنہا (وائس چانسلر، پٹنہ یونیورسٹی)
کے نام ہے۔ پہلے پچیس صفحات میں رسا ہمدانی کا "مقدمہ" ہے اور صفحہ ۲۷ تا ۶۲ میں
ستائیس خطوط آئے ہیں۔ مقدمہ نگار کے نزدیک اس مجموعے کی ایک "خوبی یہ ہے کہ اس
کے خطوط صرف، ان تین شاعروں کے نام ہیں جو خاص صوبہ بہار کے رہنے والے ہیں۔"
(صفحہ ۲۴)

"نادر خطوطِ غالب" کے اعداد ابجد کے قاعدے سے ۱۹۱۲ ہوتے ہیں اور ۲۷ کا
اگر ان میں اضافہ کر دیا جائے تو ۱۹۳۹ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے میں نے اس مجموعے میں
انتخاب کر کے ۲۷ خطوط شائع کیے ہیں تاکہ "ستائیس نادر خطوطِ غالب" سے ۱۹۳۹ء
کا تاریخی سنہ ظاہر ہو جائے اور یہ پتہ چل جائے یہ کتاب ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی ہے۔"
(صفحہ ۱۷ و ما بعد)

رسا ہمدانی کا بیان ہے کہ ان کے پردادا سید شاہ کرامت حسین کرامت ہمدانی
کو مرزا غالب سے تلمذ حاصل تھا" (صفحہ ۲۳)۔ "ان کا غیر مطبوعہ دیوان اور غالب مرحوم
کی اصلاحیں میرے پاس محفوظ ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد شائع ہوں گی" (صفحہ ۲۴)۔
لیکن غالب کی یہ مبینہ اصلاحیں آج تک شائع نہیں کی گئیں۔ اس کا باعث شاید یہ
ہو کہ غالب شناسوں نے "نادر خطوط" ہی کو پہچان لیا تھا!

غالب کے خطوط

مرتبہ : ڈاکٹر خلیق انجم

عہدِ موجودہ کے ممتاز اور محتاط محقق ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کے تمام اُردو خطوط کا چار جلدوں میں سائنٹی فک طریقے سے تنقیدی ایڈیشن مُرتب کیا ہے جسے غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے، چوتھی جلد زیر طبع ہے ۱۸×۲۲/۸ سائز کی پہلی تین جلدوں کے مشمولات کی تفصیل یہ ہے :

○ جلد اوّل : ۱۹۸۴ء، ص ۴۸۲

حرفِ آغاز ص ۹ - ۱۲، کچھ اس تنقیدی ایڈیشن کے بارے میں ص ۱۳-۲۱ خطوط غالب کے مختلف ایڈیشن اور ری پرنٹ، ص ۲۲ - ۵۹، غالب کی اردو املا کی خصوصیات ص ۶۴ - ۷۶، غالب کی زبان پر فارسی اثرات ص ۷۷ - ۸۹، انگریزی الفاظ کا استعمال، تلفظ، املا اور اُردو ترجمہ ص ۸۹ - ۹۲، غالب کے اردو خطوط کی مجموعی تعداد ص ۹۲ - ۹۷، خطوطِ غالب کا تنقیدی مطالعہ، ص ۹۹ - ۲۲۸

جلد اوّل میں ص ۲۳۲ تا ۳۶۰، تفتہ کے نام غالب کے ۱۲۳ اور ص ۳۶۲ تا ۴۲۸، علائی کے نام غالب کے ۵۸ خطوط کا متن شامل ہے۔ جلد اوّل کے آخری صفحات (۴۲۹ - ۴۸۱) "متن کے مآخذ" کی تفصیل فراہم کرتے ہیں۔ ص ۲۳۱ پر تفتہ اور ص ۳۶۲ پر علائی کی تصویر ہے ص ۴۲ - ۲۴۱ پر تفتہ کے نام اور ص ۲۷۷، ص ۳۸۸ تا ۳۹۰ اور ص ۴۲۶ پر علائی کے نام غالب کے خطوط عکس دیے گئے ہیں۔

○ جلد دوم : ۱۹۸۵ء، ص ۴۸۳ - ۹۷۰

پیش لفظ - حرفِ آغاز از مرتب ص ۴۸۹ - ۴۹۰۔

۴۷ مکتوب الیہم کے نام غالب کے خطوط کا متن ص ۴۹۱ - ۸۴۶، متن کے

ماخذ ص ۸۴۷ ـ ۸۸۱، حواشی ص ۸۸۲ ـ ۹۷۰۔ اس جلد میں ۱۲ مکتوب الیہم کے نام خطوطِ غالب کے عکس بھی شامل ہیں۔

○ جلد سوم: ۱۹۸۷ء، ص ۹۷۱ ـ ۱۴۰۳

حرفِ آغاز از مرتب ص ۹۷۷ ـ ۹۷۸

۱۷ مکتوب الیہم کے نام غالب کے خطوط کا متن ص ۹۷۹ ـ ۱۲۶۱، خطوط کے عکس، ص ۱۲۶۲ ـ ۱۳۰۸، متن کے ماخذ ص ۱۳۰۹ ـ ۱۳۴۴،

حواشی، ص ۱۳۴۵ ـ ۱۴۰۳

"غالب کے خطوط" کی ان جلدوں میں حتی الوسع غالب کے تمام خطوط شامل کر لیے گئے ہیں۔ اُردوئے معلّیٰ، عودِ ہندی، مکاتیبِ غالب (عرشی) نادراتِ غالب (آفاق دہلوی)، اور غالب کی نادر تحریریں (خلیق انجم) کے بشمول خطوطِ غالب کے زیرِ نظر تنقیدی ایڈیشن میں کم و بیش وہ تمام خط بھی آگئے ہیں جو متفرق طور پر جہاں تہاں چھپتے رہے اور غالب کے کسی مجموعے میں شامل نہیں تھے ـــ "متن کے ماخذ" کے تحت ہر خط کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس کا بنیادی متن کہاں سے لیا گیا ہے اور کس متن سے اس کا موازنہ کر کے اختلافاتِ نسخ بیان کیے گئے ہیں۔

جلد اوّل کے "حرفِ آغاز" میں ڈاکٹر خلیق انجم نے بتایا ہے کہ:

> "غالب کے خطوط میں جن لوگوں، کتابوں، اخباروں اور مختلف مقاموں کا ذکر آیا ہے، اُن پر "جہانِ غالب" کے عنوان سے حواشی لکھے گئے ہیں.... غالب کے خطوط میں جتنے بھی فارسی اور اُردو اشعار یا مصرعے نقل ہوئے ہیں ان کا اشاریہ ترتیب دیا گیا ہے، پورے متن کا مکمل اشاریہ بھی تیار کیا گیا ہے۔ مکتوب الیہ کے حالات، جہانِ غالب، کتابیات، اشعار کا اشاریہ اور متن کا اشاریہ آخری جلد میں شامل کیے گئے ہیں ـــ" (ص ۱۲)۔

آخری جلد کی اشاعت جلد متوقع ہے۔

غالبیات اور ترتیبِ متن کے معاملات اور مسائل اگرچہ برسوں سے ڈاکٹر خلیق انجم کے اختصاصی اور امتیازی نشان اور میدان رہے لیکن "غالب کے خطوط" کی ترتیب و تدوین، ڈاکٹر خلیق انجم کا ایک ایسا تابندہ اور تازہ تحقیقی کارنامہ ہے جس نے غالبیات اور متنی تنقید میں اُن کے نام اور کام کو قابلِ رشک اور ناقابلِ شکست سا بنا دیا ہے۔

تیسرا باب

تصانیفِ غالب : نظمِ فارسی

۱۔ دیوانِ فارسی : دہلی، ۱۸۴۵ء

۲۔ کلیاتِ غالب : لکھنؤ، ۱۸۶۳ء

۳۔ مثنوی ابرِ گہربار : دہلی، ۱۸۶۴ء

۴۔ سبدِ چین : دہلی، ۱۸۶۷ء

۵۔ دعائے صباح : لکھنؤ، ۱۸۶۷ء

دیوانِ فارسیٔ غالب

طبع اوّل : مطبع دارالسلام، واقع حوض قاضی، دارالخلافہ،
شاہجہان آباد، دہلی ۱۸۴۵ء
تصحیح و ترتیب : نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں
ضخامت : ۵۰۶ + ۳ صفحات
سائز : پندرہ سطری سطر ۱/۲ ۲۷ سینٹی میٹر × ۱۹ سینٹی میٹر
تعداد اشعار : ۶۶۹۴

اس کے آغاز اور آخر میں خود غالب کا لکھا ہوا "دیباچہ" اور "خاتمہ" ہے جو کلیات غالب" (طبع اوّل نولکشور، لکھنؤ، ۱۸۶۳ء) میں بھی ناگزیر جزوی ترمیم کے ساتھ ملتا ہے اور "پنج آہنگ" کے آہنگ چہارم میں بھی موجود ہے۔ "کلیاتِ غالب" طبع اوّل اور بعد کی سب نولکشوری اشاعتوں میں غالب کا لکھا ہوا 'خاتمہ' ..... "تقریظ از حضرت مصنف یعنی جناب نواب اسد اللہ خاں صاحب بہادر، غالب" کے عنوان سے چھپا ہے۔

دیوان، نظم اور نثر کے ۵۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد تین صفحات، مزید ہیں پہلے دو صفحے "صحت نامہ" کے لیے وقف ہیں اور تیسرے پر نیّر رخشاں کے دو قطعاتِ تاریخ ہیں :

خاتمۂ دیوان فارسی (تقریظ) کے آخری حصے میں غالب لکھتے ہیں :

"آنچہ دریں اوراق از قطعہ و مثنوی و قصیدہ و غزل و رباعی فراہم آمدہ ہگی شش ہزار شش صد و دو بیت ست کہ ہر یک از روی شوخیِ تاثیر و خوبیِ تقریر پیرایۂ گلوی بسمل و آویزۂ گوش دل تواند بود ....."

(دیوان، طبع اوّل دہلی، ۱۸۴۵ء، ص ۵۰۶، بحوالہ کلیاتِ غالب فارسی' جلد سوم، مرتبہ : فاضل لکھنوی، ۱۹۶۷ء، ص ۳۱۷)

غالب کا بیان ہے کہ اس میں ۶۶۷۲ شعر ہیں لیکن مالک رام کے بقول[1] یہ درست نہیں، شمار کرنے سے معلوم ہوا کہ اشعار کی تعداد ۶۶۹۴ ہے۔ "خاتمہ دیوانِ فارسی (تقریظ) کو غالب نے ۱۲۵۳ھ (مطابق ۱۸۳۷ء) کی نگارش[2] بتایا ہے لیکن دیوان کی اشاعت ۱۸۴۵ء میں عمل میں آئی۔

غالب کے "دیوانِ فارسی" کا یہ ایڈیشن (۱۸۴۵ء) بہت جلد ختم ہوگیا[3]۔ نواب علی بہادر مسند نشین باندہ نے غالب سے دیوانِ ریختہ اور اس دیوان کی فرمائش کی تھی، اگست ۱۸۴۹ء کے بعد کے ایک خط میں غالب انہیں جواباً لکھتے ہیں:

"..... بہ پذیرفتن فرمان، مردم را سو بسو گماشتم، رفتند و جستند۔ دیوان فارسی و دیوان ریختہ فراچنگ نیامد۔"

(پنج آہنگ، مطبوعہ ۱۸۵۳ء، مرتبہ: وزیر الحسن عابدی، لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۵۶۸)

غالب کا فارسی کلام بطور "دیوان" ان کی زندگی میں صرف ایک ہی بار چھپا۔ ۱۸۶۳ء کے اپنے ایک خط موسومہ بدر الدین کاشف میں لکھتے ہیں:

"فارسی کا دیوان بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا، جب چھپا تھا پھر نہیں چھپا ـــــ"

کلیاتِ غالب:

طبع اوّل: مطبع نولکشور، لکھنؤ مئی، جون ۱۸۶۳ء

مرتبہ: نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر ورخشاں

---

[1] ذکرِ غالب، طبع چہارم، ص ۱۹۴۔ جبکہ مالک رام سے مختلف، مولانا فاضل لکھنوی اشعار کی مجموعی تعداد ۶۶۸۱ بتاتے ہیں۔ دیکھیے کلیاتِ غالب فارسی، جلد (۱) پیش گفت، ص ۱۹

[2] دیوان طبع اوّل، دہلی ۱۸۴۵ء، بحوالہ کلیات غالب فارسی، نسخہ فاضل، جلد سوم، ص ۴۱۵

[3] غالب کا یہ نایاب فارسی دیوان، پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے شیرانی کلکشن میں موجود ہے (نمبر: SPi VI 9 B) یہ نسخہ ناقص الآخر ہے۔ اس میں صفحہ اوّل سے صفحہ ۲۹۶ تک کا حصہ موجود ہے، بقیہ اوراق ضائع ہو چکے ہیں۔

ضخامت : ۵۵۲ + ۱۰ صفحات

سائز : ۲۱ سطری مسطر، ۲۵ س م × ۱۶ س م

تعداد اشعار : ۱۰۵۱۶

غالب کا فارسی دیوان ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد جو کلام فراہم ہوا وہ ان کے مختلف احباب بالخصوص نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر نے اہتمام کے ساتھ جمع کیا اور صرف کثیر سے عمدہ جلدیں بندھوا کر محفوظ کیا لیکن ۱۸۵۷ء کے "فتنہ وفساد" میں یہ سرمایہ ضائع ہوگیا:

"...... ضیاء الدین خاں جاگیر دار لوہارو، میرے سبتی بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں، جو نظم و نثر میں، میں نے کچھ لکھا، وہ انھوں نے لیا اور جمع کیا چنانچہ "کلیات نظم فارسی" چون پچپن جزو اور "پنج آہنگ" اور "مہر نیمروز" اور "دیوان ریختہ" سب مل کر سو، سوا سو جزو مطلا اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ، کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں ـــــ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یک جا فراہم ہے۔ پھر ایک شہزادے نے اس مجموع نظم و نثر کی نقل لی۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لٹے۔ وہ دونوں جگہوں کا کتاب خانہ خواں یغما ہوگیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے، کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ قلمی "فارسی کا کلیات"، قلمی "ہندی کا کلیات"، قلمی "پنج آہنگ"، قلمی "مہر نیمروز"، اگر کہیں ان میں سے کوئی نسخہ بکتا ہوا آوے، تو اس کو میرے واسطے خرید کر لینا اور مجھ کو اطلاع کرنا۔ میں قیمت بھیج کر منگوالوں گا ـــــ"

(بنام شیو نرائن آرام، ۱۱ دسمبر ۱۸۵۸ء)

"میرا ایک سبتی بھائی ہے نواب ضیاء الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ، وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ مجموعہ نثر، اور کلیات نظم فارسی اور کلیات نظم اردو، سب صحفے اس کے کتب خانے میں تھے۔ وہ کتب خانہ

ہوں، بیس ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا، لٹ گیا، ایک ورق نہیں رہا۔ ۔ ۔ ۔"

(بنام: صاحب عالم، جولائی ۱۸۶۱ء)

آخر انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد قریب تین چار برس کی تلاش و جستجو سے غالب کا جو کچھ فارسی کلام جمع ہو سکا، اس کے چھاپنے کی تدبیر ہوئی۔ غالب نے نواب ضیاء الدین خاں نیّر سے اپنے فارسی کلام کا قلمی مسودہ مانگا، جنھیں اس اندیشے سے کہ مبادا یہ ضائع ہو جائے، ابتداً دیوان دینے میں تکلف تھا۔ ۱۸۶۰ء کا ایک خط بنام نیّر ملاحظہ ہو:

"آپ کو دیوان دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعے میں نہیں رہتا۔ بغیر اس کے دیکھے آپ کو کھانا ہضم نہ ہوتا ہو، یہ بھی نہیں، پھر آپ کیوں نہیں دیتے؟ ایک جلد، ہزار جلد بن جائے، میرا کلام شہرت پائے، میرا دل خوش ہو۔ تمھاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں، تمھارے بھائی کی تعریف کی نثر، سب کی نظر سے گزرے[1]۔ اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں؟ رہا، کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ، یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی۔ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنؤ کی عوض راہ میں[2] ڈاک لُٹ گئی تو میں فوراً بہ سبیل ڈاک رامپور جاؤں گا اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔ اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دو، وہ نہ کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہیں بھیجتے؟ ہاں، یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نہیں دیتے، تو کیا وہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمھارے بھائی اور تمھارے قریب ہو کر نہیں دیتے تو میں اتنی دور سے کیوں دوں؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضّل سے لے کر بھیج دو، وہ اگر نہ دیں تو میں کیا کروں؟ اگر دیں تو میرے کس کام کا؟ پہلے تو ناتمام، پھر ناقص۔ بعض بعض قصائد اس میں اور کے نام کر دیے گئے اور اس میں اسی ممدوح سابق کے نام پر ہیں۔ شہاب الدین خاں کا دیوان، جو یوسف مرزا لے گیا ہے، اس

---

[1] یہ "کلیات نظم فارسی" کا ذکر ہے جس میں نیّر کی مدح کا قصیدہ اور ان کے بھائی امین الدین احمد خاں کی مدح کی نثر ہے۔

[2] نسخۂ کلیات دہلی سے اشاعت کے لیے مطبع منشی نولکشور لکھنؤ میں بھیجنا مقصود و منظور تھا۔

میں یہ دونوں قباحتیں موجود، تیسری یہ کہ سراسر غلط۔ ہر شعر غلط، ہر مصرع غلط۔ یہ کام تمہاری مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا اور تمہارا کچھ نقصان نہیں ہاں احتمالِ نقصان، وہ بھی از روئے وسوسہ و وہم۔ اس صورت میں، میں تلافی کا کفیل، جیسا کہ اُوپر لکھ آیا ہوں۔ بہرحال راضی ہو جاؤ اور مجھ کو لکھو تو میں طالب کو اطلاع دوں اور طلب اس کی جب دوبارہ ہو تو کتاب بھیج دوں۔

رحم و کرم کا طلب : غالب

یہ خط، کلیاتِ غالب کے چار مختلف قلمی نسخوں کی نشاندہی کرتا ہے:

۱۔ نسخہ مملوکہ نواب ضیاء الدین احمد خاں : مکمل اور مستند

۲۔ نسخہ مکتوبہ نواب فخرالدین خاں مرحوم، رامپور

۳۔ نسخہ تفضل : ناتمام اور ناقص

۴۔ نسخہ شہاب الدین خاں، مقبوضہ یوسف مرزا : ناتمام، ناقص اور سراسر غلط

جولائی ۱۸۶۱ء میں مجروح کو لکھتے ہیں :

"کلیاتِ نظم فارسی کے چھاپنے کی ..... تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بندھ گیا تو وہ ..... چھاپا جائے گا۔"

۱۸۶۳ء کے ایک خط موسومہ بدر الدین کاشف سے پتہ چلتا ہے کہ کلیات کے چھاپنے کی صورت نکل آئی اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نے اپنا قلمی مجموعۂ کلامِ غالب جو کل موجود نسخوں میں مکمل بھی تھا اور مستند بھی، اشاعت کے لیے فراہم کر دیا :

"سال گذشتہ (۱۸۶۲ء) میں منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیاتِ فارسی، جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، منگالیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو ہیں یعنی کوئی مصرعہ میرا اس سے خارج نہیں۔"

اودھ اخبار لکھنؤ (جلد ۴، نمبر ۱) کی اشاعت یکم جنوری ۱۸۶۲ء (صفحہ ۲) میں غالب کے فارسی کلیات کے چھاپے جانے کے منصوبے سے متعلق ایک مفصل اشتہار

شائع ہوا ہے:

"نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب دہلوی کا فارسی کلیات مطبوع ہوا چاہتا ہے..... دس ہزار چار سو کئی اشعار ہیں کہ سب سلک گوہر شاہوار ہیں۔ خدا کے فضل سے نسخہ بھی وہ صحیح و درست بڑے کتب خانے کا ہاتھ آیا جس کو نواب ضیاء الدین خاں صاحب بہادر دہلوی نے جد و جہدِ تمام سے جمع فرمایا..... ایسی نادر چیز کہاں میسّر آتی ہے..... سب کتاب تقریباً چالیس جز میں چھپے گی۔ بعض مقام مناسب پر تصویر مصنف کھنچے گی۔ شروع طبع میں قیمت بھیجنے والے تین روپے چار آنے کو پائیں گے۔ چھپ چکنے کے بعد پورے پانچ روپے مقرر ہو جائیں گے..... اشتہار دینے کا یہ سبب ہے کہ..... ابھی سے طلب گار ہوں، کمی قیمت کے حصہ دار ہوں[1]۔"

لیکن کلیات کی اشاعت میں بوجوہ تعویق ہوئی۔ ۱۶ مئی ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں مجروح کو لکھتے ہیں:

"کلیات کے چھاپنے کی حقیقت سنو۔ ساٹھ صفحے چھاپے گئے تھے کہ مولوی ہادی علی، مصحح بیمار ہو گئے۔ کاپی نگار رخصتی، اپنے گھر گیا، اب دیکھیے کب چھاپا شروع ہو۔"

مولوی محمد ہادی علی، منشی نولکشور کے مطبع سے بطور مصحح وابستہ ایک بنیادی کارکن اور بڑے صاحبِ علم بزرگ تھے۔ منشی نولکشور نے مولوی محمد ہادی علی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"یہ وہ بزرگ ہیں کہ جن کے صرف متبرک نام سے جوہرِ علم عرضِ عرض میں آتا ہے۔ علماء اور فضلاء کا سرمایۂ افتخار کوئی علوم و فنون متعلقہ عربی و فارسی اور دیسی زبان کا ایسا نہیں جس کے واسطے اُستادِ

---

[1] غالب نامہ، نئی دہلی، جلد ۱، شمارہ ۲-۳، صفحہ ۲۵

مُسلّم نہ کہوں۔ اِس وجہ سے قلمرو ہند میں، مجھ کو دعویٰ ہے کہ کوئی اہلِ مطبع اپنے ہم پلّہ نہیں۔[1]"

مئی ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں:

"جناب منشی صاحب (منشی نولکشور) سے میرا سلام کہیے اور یہ رقعہ ان کو پڑھا کر عرض کیجیے کہ غالب پوچھتا ہے کہ فارسی کی کلیات کا چھاپا ملتوی ہے یا جاری؟ ملتوی ہے تو کب تک کھلے گا؟ جاری ہے تو تصحیح کس کے طور پر ہے؟ ..... ہاں، مولوی ہادی علی صاحب کا جو حال معلوم ہو، وہ بھی ضرور لکھنا....."

۲۲ر مئی ۱۸۶۲ء کے ایک دوسرے خط میں قدر بلگرامی ہی کو تاکید کرتے ہیں کہ:

"مولوی ہادی علی صاحب کے مطبع میں آنے کا حال تم لکھو اور کلیات کے کاپی نگار کے آنے کا بھی حال معلوم کر کے لکھو۔"

کلیات کی اشاعت میں تاخیر سے اکتا کر بددلی اور بیزاری کے عالم میں ۱۹ جون ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں نواب علائی کو لکھتے ہیں:

"کلیات کے انطباع کا اختتام، اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا۔"

اس عالم مایوسی کے کم و بیش ایک سال بعد کہیں کلیات کا چھاپا تمام ہوا۔ "اودھ اخبار" لکھنؤ کی دو اشاعتوں میں کلیات کی طباعت کا اعلان و اشتہار شائع ہوا:

"..... خدا کے فضل سے نسخہ بھی وہ صحیح و درست، بڑے کتب خانے کا ہاتھ آیا، جس کو نواب ضیاء الدین خاں صاحب بہادر دہلوی نے بجد وجہد تمام سے جمع فرمایا..... تمام کتاب ۴/۱ ۳۵ جز میں چھپ کر تیار ہے اور مقام مناسب پر تصویر مصنّف کی بھی یادگار ہے....."

(اودھ اخبار، لکھنؤ، ۱۲ر مئی ۱۸۶۳ء، ص ۳۳۵؛ نیز، ۲۰ر مئی ۱۸۶۳ء)[2]

پھر "اودھ اخبار" کی ایک مابعد اشاعت میں بالآخر کلیات کی نوید سنا دی گئی:

---

[1] اودھ اخبار لکھنؤ، جلد ۴، نمبر ۱، ۸ جنوری ۱۸۶۲ء، ص ۱۸، بحوالہ غالب نامہ، ایضاً ص ۲۸

[2] بحوالہ فاضل لکھنوی، کلیات غالب فارسی، جلد اوّل، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۲۵

"بوجہ طیاری (کذا) تصویر جناب مرزا صاحب موصوف، کلیات، بخدمت شائقان، تقسیم ہونا ملتوی تھا، اب طیار ہو گئی ...."

(اودھ اخبار، لکھنو، ۳ جون ۱۸۶۳ء، ص ۳۹۰[۱])

"کلیات" کی اس اشاعت (۱۸۶۳ء) میں غالب کی یہ تصویر "صفحہ ۱۴۱ کے مقابل چھپی ہے اور بہت خوبصورت ہے[۲]۔" منشی نولکشور مالک مطبع "اودھ اخبار" نے ابتداً سوا تین روپے فی جلد کلیات کی قیمت مشتہر کی تھی لیکن شاید لاگت میں اضافے کی وجہ سے انھوں نے اس کی قیمت پانچ روپے کر دی۔ کلیات کی دس جلدیں غالب نے اور دس علائی نے خریدیں۔ علائی نے غالب کو کتابیں بھجوائیں۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۳ء کے خط میں غالب انھیں جواباً لکھتے ہیں:

"...... بتوسط برخوردار علی حسین خاں مجلد "کلیات فارسی" پہنچے۔ حیرت ہے کہ چار روپے قیمت کتاب اور چار آنے محصول ڈاک قالب انطباع میں آ کر پانچ روپے قیمت اور پانچ آنے محصول قرار پاوے! خیر جہاں سو، وہاں سوا سے، میرا حال تمھیں اور تمھارا مجھے معلوم ہے:

این ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

اب کے چھٹے میں شاید نہ دے سکوں۔ نومبر سنہ حال میں پچاس تمھارے پاس پہنچ جائیں گے ....."

لیکن قیمت کی ادائی سے پہلے ہی منشی نولکشور کا دہلی آنا ہوا، غالب سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے غالب سے کتابوں کی قیمت، اشتہار سابقہ کے حساب ہی سے لینا قبول کیا۔ ۳، دسمبر ۱۸۶۳ء کے خط میں غالب نے علائی سے اس ملاقات کا ذکر کیا ہے:

"شفیق مکرم و لطف مجسم منشی نولکشور صاحب بہ سبیل ڈاک یہاں آئے، مجھ سے اور تمھارے چچا اور تمھارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے۔ خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے، گویا بجائے خود "قران السعدین" ہیں۔ تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کے دس مجلد کی قیمت پچاس روپے

---

[۱]، [۲] بحوالہ فاضل لکھنوی، کلیات غالب فارسی، جلد اول، لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۲۶

مان لیے تھے۔ اب ان سے جو ذکر آیا تو انھوں نے پہلی قیمت مشتہرۂ اخبار لینی قبول کی، یعنی تین روپے چار آنے فی جلد۔ اس صورت میں دس مجلد کے بتیس روپے آٹھ آنے ہیں، اور بتیس روپے آٹھ آنے تم دو ہگی پینسٹھ (روپے) مطبع "اودھ اخبار" میں پہنچانے چاہئیں۔"

مطبع کی جانب سے "رفاہ عام" کی خاطر عام قارئین کے لیے بھی "کلیات" کی قیمت میں کمی کا اعلان ہوا:

"..... سابق میں سوائے محصول، پیشگی قیمت چار روپے قرار دی تھی، اور بعد ختم کتاب پانچ روپے درج کی تھی۔ اب چونکہ رفاہ عام منظور ہوا، قیمت کا گھٹا دینا ضرور ہوا..... (جن لوگوں سے پیشگی قیمت لے لی گئی ہے انھیں محصول معاف) اور جو صاحب، اب طلب کریں گے، ان سے چار روپے قیمت لیں گے....."

(اودھ اخبار، لکھنو ۱۳ مئی ۱۸۶۳ء، ص ۳۳۵، نیز ۲۰ مئی ۱۸۶۳ء)

کلیات کا متن صفحہ ۵۵۲ پر ختم ہو گیا ہے۔ صفحہ ۵۵۳ سے ایک نثری تقریظ ہے جو صفحہ ۵۵۵ پر ختم ہوتی ہے (پہلی سات سطریں)۔ صفحہ ۵۵۵ ہی سے ۵۵۸ تک مجروح کی منظوم تاریخ اختتام انطباع ہے۔ صفحہ ۵۵۸ سے صفحہ ۵۶۰ تک مرزا محمد اصغر علی خان نسیم، محمد عبدالغنی، امیر اللہ تسلیم، منشی اشرف علی اور محمد مردان علی خاں رعنا کے قطعات تاریخ ہیں۔ صفحہ ۵۶۱ ۔ ۵۶۲ پر خاتمۃ الطبع کی نثری عبارت، مولانا محمد علی اشکؔ کی ہے۔ اخیر میں صفحہ ۵۶۲ پر اشک کا قطعۂ تاریخ بھی درج ہے۔ تاریخِ انطباع کے لیے خود غالب سے بھی کہا گیا تھا، لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے، ۲۴ مئی ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں:

"کلیات کے انطباع کی تاریخ میں کیوں لکھوں؟ اہلِ مطبع کو خدا منشی صاحب کے سایۂ عطوفت میں سلامت رکھے، کہہ لیں گے۔ چھاپا ۷۸ھ میں شروع ہوا، ۷۹ھ میں تمام ہوگا۔"

کلیات کے آخر، اپنی نثری، تقریظ میں (ص ۵۵۴) غالب نے اشعار کی مجموعی

تعداد "دہ ہزار و چہار صد و بست و چہار" (۱۰۴۲۴) بتائی ہے۔ لیکن مالک رام کا بیان ہے کہ "دیوانِ فارسی" (۱۸۴۵ء) کی طرح "یہ تعداد بھی ٹھیک نہیں، اس میں ۱۰۴۴۸ اشعار ہیں۔" (ذکرِ غالب، طبع چہارم، صفحہ ۱۹۴)۔ اس کے برعکس مولانا فاضل لکھنوی نے اصناف وار اشعار کی تعداد کا جو گوشوارہ تیار کیا ہے، اس کے مطابق اشعار کی کل تعداد "دس ہزار پانچ سو سولہ" ہے۔ (کلیاتِ غالب فارسی، جلد (۱) صفحہ ۲۸)۔

فاضل لکھنوی نے "کلیاتِ غالب" (طبع اوّل) کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"یہ ایڈیشن اپنی جامعیت، صحت، حُسنِ طباعت کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔" (کلیاتِ غالب فارسی، جلد (۱)، صفحہ ۲۶)

لیکن خود غالب "کلیات" کی "صحت طباعت" سے مطمئن نہیں تھے، ۲۲، اگست ۱۸۶۳ء کے خط میں مجروح کو لکھتے ہیں:

"نورِ چشم میر مہدی کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ "کلیاتِ فارسی" کا پہنچنا مجھ کو معلوم ہوا۔ میاں، اس میں بھی اغلاط بہت ہیں۔ مبارک ہو تمہیں اور میر سرفراز حسین کو اور میرن صاحب کو، اور بھائی، خدا کرے، مجھ کو بھی...."

لیکن غالب کی یہ بے اطمینانی صرف اغلاطِ طباعت کی حد تک ہی تھی ورنہ وہ اپنے "کلیاتِ فارسی" کو نہ صرف اپنی عمر بھر کی پونجی خیال کرتے تھے بلکہ اِسے ایزدی کتاب اور صحیفۂ الہامی و آسمانی قرار دیتے تھے۔ ۱۲، مئی ۱۸۶۴ء کے ایک خط بنام صفیر بلگرامی میں روئے سخن صاحب عالم کی طرف کر کے لکھتے ہیں کہ:

"پیر و مُرشد! فارسی کی کلیات کو بھی کبھی آپ دیکھتے ہیں یا نہیں؟ بہ قول اِن شاء اللہ خاں: "یہ میری عمر بھر کی پونجی ہے...."

(خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، جلد دوم، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۴۹۳)

• "کلیات" کا خاتمہ غالب کی اِس معروف رُباعی پر ہوتا ہے:

گر ذوقِ سخن بہ دھر آئین بودے

اشعارِ مرا شہرت پروین بودے

غالب، اگر ایں فن سخن دیں بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

- طبع دوم : مطبع منشی نولکشور، لکھنؤ، جنوری ۱۸۷۲ء، ۲۰×۲۶/۸ ، ۵۵۶ صفحات
- طبع سوم : مطبع منشی نولکشور، لکھنؤ، جون ۱۸۹۳ء، ۲۰×۲۶/۸ ، ۵۶۲ صفحات۔

کلیات کی اس تیسری اشاعت کے سرورق پر جلی قلم سے درج ہے "در مطبع خاص نولکشور، طبع دویں شد" خاتمۃ الطبع میں بھی اسے "بار دوم" لکھا گیا ہے لیکن یہ سہو کتابت ہے، حقیقتاً یہ کلیات کی دوسری نہیں، بلکہ تیسری اشاعت ہے۔

- بیسویں صدی کے ربع اوّل کی اشاعت : نولکشور، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۲۴ء، صفحات ۵۲۴
- قریبی اشاعت : شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۵ء، صفحات : ۶۶۷

احوال : مولانا غلام رسول مہر، صفحہ ۱ — ۱۴

فارسی کلام پر ریویو : حالی، صفحہ ۱۵ — ۱۰۴

- کلیاتِ غالب مرتبہ : مولانا فاضل لکھنوی، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء

جلد اوّل : قطعات، مثنویات، فواتح، نوحہ، مخمس، ترکیب بند، ترجیع بند وغیرہ

صفحات : ۵۱۲ پیش گفت، فاضل لکھنوی، صفحہ ۱-۳۲

مقدمہ — شخصیت اور فن، سید عابد علی عابد، ص ۱ — ۱۴۰

جلد دوم : قصائد، صفحات : ۴۰۱

جلد سوم : رُباعیات، مُعمیات، ابیات، صفحات : ۴۲۳

- کُلیاتِ غالب (غزلیاتِ فارسی، تحقیقی نسخہ) مرتبہ : وزیر الحسن عابدی

مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۱۹۶۹ء، صفحات : ۶۴ + ۵۱۳

- غزلیاتِ فارسی (غالب)، مرتبہ : وزیر الحسن عابدی،

پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء صفحات : ۴۸ + ۴۵۵ + ۸۲

- قصائد و مثنویاتِ فارسی (غالب)، مرتبہ : مولانا غلام رسول مہر،
پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء صفحات : ۱۴ + ۲۵۲

- قطعات، رُباعیات، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس، مرتبہ : مولانا غلام رسول مہر،
پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحات : ۲۲ + ۴۸۴ + ۱۶۱

- کلیاتِ غالب فارسی : امیر حسن نورانی، نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۶۸ء

مثنوی ابرِ گہربار :

- طبع اوّل (بصورت کتاب) : اکمل المطابع، دہلی ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء
ضخامت : ۴۲ صفحات سائز : ۶×۹½"
اصلاً تعداد اشعار : ۱۰۹۸
بصورتِ موجودہ در کتاب : ۱۰۶۴

یہ مثنوی "کلیاتِ غالب" طبع اوّل لکھنؤ ۱۸۶۳ء میں اس عنوان سے شامل ہے:
"مثنوی ناتمام موسوم بہ "ابرِ گہربار" یا اسد اللہ الغالب "مثنوی یازدہمین"
لیکن "کلیات" کی اشاعت کے بعد یہ الگ سے "بکمال تصحیح" ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء میں کتابی صورت میں بھی شائع ہوئی۔ سرورق پر یہ اعلان ثبت ہے :
"بکمال تصحیح کہ ہر صفحہ بہ نظر مصنف گذشتہ بہ سعی میر فخر الدین در مطبع اکمل المطابع واقع اندرونِ شہر دہلی طبع شد"

غالب کے خطوں میں صرف دو تین جگہ اس کا ذکر آیا ہے۔ ۳۰ مئی ۱۸۶۴ء کے ایک خط بنام علائی میں لکھتے ہیں :

"اے میری جان! مثنوی "ابرِ گہربار" کون سی فکر تازہ تھی کہ میں تجھ کو بھیجتا؟ "کلیات" میں موجود ہے۔ معہذا شہاب الدین خاں نے بھیج دی ہیں مکرر کیا بھیجتا۔"

اخیر عمر کے ایک خط بنام صوفی منیری سے پتہ چلتا ہے کہ غالب نے "ابرِ گہربار" کا ایک نسخہ انہیں بھیجا تھا۔ لکھتے ہیں :

"ایامِ شباب میں کہ بحرِ طبع روانی پر تھا، جی میں آیا کہ غزوات صاحبِ ذوالفقار لکھنا چاہیے۔ حمد و نعت و منقبت و ساقی نامہ و مغنی نامہ لکھا گیا۔ داستان طرازی کی توفیق نہ پائی۔ ناچار اس آٹھ نو سو شعر کو چھپوا لیا۔ اس رسالۂ مطبوع کو ایک پارسل ..... میں بھجوا دیا اور توقع رکھتا ہوں کہ اس کی رسید روزِ ورود یا دوسرے دن لکھی جائے ....."

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے نام غالب کا پہلا خط ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ (مطابق ۱۲ مئی ۱۸۶۴ء) کا ہے۔ اس میں غالب روئے سخن حضرت صاحبِ عالم کی طرف کر کے لکھتے ہیں کہ :

"کل میں نے ایک چھاپے کی کتاب کا پارسل جس کا عنوان سید فرزند احمد کے نام کا ہے، ارسال کیا ہے۔ آپ بھی بہ نظرِ اصلاح مشاہدہ کیجیے گا ....."

مولانا غلام رسول مہرؔ "چھاپے کی کتاب کے اس پارسل" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ :

"غالباً یہ میرزا کی مثنوی ابرِ گہربار تھی .... صفیر نے "ابرِ گہربار" کی مدح میں ایک مثنوی لکھی تھی ـــ" (خطوطِ غالب، جلد دوم، ص ۲۹۷)

خود صفیر بلگرامی نے بھی ایک موقع پر، اس امر کا اظہار کیا ہے کہ غالب نے انہیں مثنوی "ابرِ گہربار" کی ایک جلد عطا فرمائی تھی : (جلوۂ خضر، جلد اول، صفحہ ۲۲۱)

محمد صادق صفوی کی شہادت کے مطابق اُن کے جدِ اعلیٰ نواب سید محمد علی معروف بہ نواب دولہا نے ۳۰ جولائی ۱۸۶۴ء کو مرزا غالب سے دہلی میں ملاقات کی۔ اس موقع پر

غالب نے انہیں "ابرِ گہربار" (مطبوعہ ۱۲۸۰ھ) ہدیہ کیا۔ یہ نسخہ اہدائی اب بھی اس خاندان میں نواب فرخ حیدر کے کتاب خانے میں موجود ہے [1]

ایک موقع پر، اپنے خود نوشت حالات کے آخر میں جو غالباً ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں لکھے گئے، غالب نے بتایا ہے کہ "ایک مثنوی غزواتِ رسالتمآب صلعم میں وہ بہت عمدہ اور بہت طویل" [2] لکھ چکے ہیں۔

یہ مثنوی پہلی بار، ان کے "کلیات" (۱۸۶۳ء) میں شائع ہوئی گو یہ ان کے "دیوان" (۱۸۴۵ء) میں شامل نہیں، لیکن اس کا زمانۂ تصنیف ۱۸۶۳ء سے بہت پہلے اور ۱۸۴۵ء کے قریب بعد کا ہے، اس لیے کہ سر سید احمد خاں کی کتاب "آثار الصنادید" کے پہلے ایڈیشن، مطبوعہ سید الاخبار، دہلی، ۴۷-۱۸۴۶ء میں بدیں الفاظ اس مثنوی کا ذکر موجود ہے:

"..... ایک مثنوی مشتمل اوپر غزوات حضرت رسالت دستگاہی ختمی پناہی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اگرچہ ہنوز ناتمام ہے لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے ہو چکی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جس وقت اتمام کو پہنچے گی گلدستۂ بزم احباب ہوگی...." (آثار الصنادید، طبع اول، باب چوتھا، ص ۱۳۸)

لیکن یہ مثنوی جیسا کہ انہوں نے اس کی کتابی اشاعت کے دیباچے میں بھی لکھا ہے ناتمام ہی رہ گئی یعنی حقیقی بادل صرف قطرہ افشانی ہی کر سکا اور دجلہ ریز نہ ہوا۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے اس مثنوی کا بڑی دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "کلکتے کے سفر (۲۹-۱۸۲۷ء) اور واپسی کے بعد سے غالب کی اس ناتمام مثنوی کا چرچا اہلِ نظر میں ہونے لگا۔ یہی دور ہے جب غالب نے اپنے فکر اور فن کی پختگی کا اظہار زیادہ تر فارسی زبان میں کیا۔ خطوں اور تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ غالب ایک مفصل داستان نظم کرنا چاہتے تھے اور کئی سال تک برابر اس پر کام کرتے رہے۔ جب سر سید کی کتاب "آثار الصنادید" کا چوتھا باب لکھا گیا ہے ۱۸۴۵ء کے قریب تو یہ مثنوی قریب قریب اتنی

---

[1] غالب نامہ، نئی دہلی، جولائی ۱۹۸۲ء، ص ۱۹۳-۱۹۴

[2] اس قلمی تحریر نوشتۂ غالب کا عکس تعارفی کلمات کے ساتھ مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو، جولائی ۱۹۲۸ء (صفحہ ۳۲۷-۳۲۹) میں شامل کیا۔

ہی تھی، جتنی اب ہمیں ملی ہے اور دیوان کی گیارہویں مثنوی ہے، بارہویں کوئی نہیں ——
"یہ مثنوی نہیں، مثنوی کی تمہید ہے جو ایک ہزار اٹھانوے شعروں پر پھیلی ہوئی ہے اور ابھی یہ تمہید مکمل ہو پائی تھی کہ غالب، دربار کی آخری بساط پر جا بیٹھے۔ سات برس پورے نہ ہوئے تھے کہ ۱۸۵۷ء میں وہ بساط اُلٹ گئی اور غالب میں نہ اتنی سکت رہی، نہ سکون میسّر آسکا، جو ایسے کاموں کے لیے لازمی ہے۔ مولانا حالی نے "ابرِ گہربار" کو ان کی "آخری تصنیف"[۱] قرار دیا ہے۔ اگر بیان کی قوت، روانی، گہرائی اور بے باکی میں دیکھا جائے تو یہ (غالب) کا کمالِ فن ہے، اس لحاظ سے "آخری" ہے اور ناتمام رہنے پر بھی تمام ہے۔ ممکن ہے عمر کے آخری حصے میں بھی غالب کو خیال آ رہا ہو کہ "ابرِ گہربار" کا دامن وسیع ہوتا چلا جائے اور اس میں ابتدائے اسلام کے تاریخی کارنامے شامل ہو جائیں، لیکن یہ بادل موتی برسا کر کھل چکا تھا اور آگے غالب جیسی طبیعت کے لیے گنجائش کم ہی تھی، مثنوی یہیں تک آکر رک گئی، غالب اگر خود اپنے ارادے کا ذکر نہ کرتے تو ہمیں پتہ بھی نہ چلتا کہ مثنوی کو اس کے آگے بڑھنا تھا۔"[۲]

اس مثنوی کے کتابی ایڈیشن کے لیے غالب نے ایک مختصر فارسی "دیباچہ" اور بطور خاتمہ ایک مختصر تر "تقریظ" لکھی۔ دیباچے میں کہتے ہیں کہ جب غزل، قصیدہ، قطعہ اور رباعی میں الفاظ و معانی کی کیف آفرینی اور دلکشی کو لوگوں کے حدِ تصور سے بھی بڑھا کر پیش کر چکا تو اپنے جوہر دکھانے اور منوانے کے لیے ایک دل نشین مثنوی لکھنے کا ارادہ کیا، میری ذکی الحس طبیعت میں یہ خیال پیدا ہوا کہ خداوندِ دنیا و دین، حضرت امام المرسلین (ان پر ربِ دو جہاں کی طرف سے سلام) کے غزوات کو احاطۂ تحریر میں لاؤں۔ بنا بریں توحید،

۱۔ "یادگارِ غالب" میں حالی نے کلیاتِ نظمِ فارسی کے جائزے کو "مثنوی ابرِ گہربار" کے ذکرِ خیر پر ختم کیا ہے۔ حالی کا بیان ہے کہ "مرزا نے کوئی مبسوط مثنوی نہیں لکھی۔ ان کے کلیات میں گیارہ مثنویاں ہیں، جن میں سب سے بڑی (وہ ہے)۔۔۔ جس کا نام مرزا نے "ابرِ گہربار" رکھا تھا۔ ان کا ارادہ آنحضرت صلعم کے غزوات بیان کرنے کا تھا، مگر چوں کہ یہ ان کی آخری تصنیف تھی اور اخیر عمر میں طرح طرح کے عوائق اور موانع پیش آئے، اس وجہ سے غزوات کے شروع کرنے کی نوبت نہیں پہنچی۔ صرف دیباچے کے چند عنوان لکھنے پائے تھے کہ مکروہاتِ روزگار نے گھیر لیا۔ مگر یہ مثنوی، اُن کی تمام مثنویوں میں ممتاز ہے۔۔۔"

۲۔ غالب شناسی (۱)، طبع اوّل بمبئی ۱۹۶۵ء، ص ۱۰۳ و بہ بعد

مناجات، منقبت، ساقی نامہ اور مغنی نامہ معرضِ اظہار میں آئے۔

ساقی اور مغنی سے بڑی بڑی دلآویز اور محبت خیز باتیں کی گئیں، بالخصوص مناجات میں جدت آفرینی کے طور پر ایسی ایسی رندانہ اور قلندرانہ باتیں کہی گئیں کہ ہایا ہوکی شدت سے ملائکۂ بہشت کے ہونٹوں پر چھالے پڑ گئے اور معراج کے بارے عروجِ فکر سے کلام اس مقام تک پہنچ گیا جس کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے مثنوی کا نام "ابرِ گہربار" رکھا تھا لیکن حقیقی بادل صرف قطرہ افشانی ہی کر سکا اور دجلہ ریز نہ ہوا ..... وہ نیرنگِ آسمانی جو سپاہ کی سرکشی کی صورت میں ظاہر ہوا، اس نے نہ جسموں میں جان، نہ جانوں میں طاقت، نہ امیروں کے خزانے میں دولت اور نہ شاعروں کی زبان میں کلام باقی چھوڑا ..... ستر سالہ سخن پرداز، غمزدہ و سینہ فگار، بیمار، جینے سے بیزار، مرگِ ناگہاں کا منتظر ہے ––

خاتمۂ کتاب "تقریظ" میں غالب نے بتایا ہے کہ سعادت مند اور اقبال نشان حکیم غلام رضا خاں ابن عالی جاہ حکیم مرتضیٰ خاں ابن فرزانۂ یگانہ حکیم محمد صادق علی خاں مرحوم نے مثنوی "ابرِ گہربار" کو پیرایۂ طبع عطا کیا اور دو قصیدے، چند قطعے اور کچھ رباعیاں جو کلیاتِ فارسی کی اشاعت کے بعد مبدا فیاض نے مجھے ارزانی کی تھیں، اس تحریر پر اضافہ کر کے مجھ سے اس کے فاتحہ و خاتمہ کی فرمائش کی۔ چونکہ مجھے اس کے اجداد سے بڑی عقیدت تھی اور اس کے باپ سے محبت رکھتا تھا، نیز نقش ہوالاول ہوالآخر جو اہلِ وحدت کا مطلوب ہے، اس جگہ ٹھیک بیٹھتا تھا، اس لیے یہ دونوں عبارتیں احاطۂ تحریر میں آئیں۔ مکلف کو اس کام کے پورا ہونے سے خوشی اور تعمیلِ فرمائش کرنے والے کو کاوش کے بندھن سے رہائی حاصل ہوئی۔[۱]

کتاب کے کتابیاتی کوائف یہ ہیں: سرورق کی پشت، یعنی صفحہ ۲ سے خوبصورت گل کاری، پیشانی، بیلدار جدولیں، حاشیے اور لوح کے بعد لکھا ہے:

"بسم الرحمٰن الرحیم" (یعنی "بسم اللہ" ہی غلط ہو گئی ہے کہ "اللہ" کا لفظ سہوِ کاتب کا شکار ہو گیا ہے)۔ پھر دیباچہ شروع ہو جاتا ہے (صفحہ ۲ پر دیباچے کی آٹھ سطریں آئی ہیں) اور

---

[۱] "ابرِ گہربار" کے فارسی دیباچے اور خاتمے کے مندرجات کا یہ اُردو متن رفیق خاور کے ترجمہ "ابرِ گہربار" سے ماخوذ ہے جو کتابی صورت میں غالب کی صد سالہ برسی پر رائٹرز بیورو، کراچی کی جانب سے شائع ہوا ہے۔

صفحہ ۴ کے نصف کے قریب ختم ہوتا ہے۔ اسی صفحے (۴) کے بقیہ خالی حصے کی سطر ۹ سے مثنوی کا آغاز ہوتا ہے۔ صفحہ ۲۵ کے حاشیے کے نصف پر مثنوی ختم ہو جاتی ہے۔

مثنوی کے بعد چھوٹے چھوٹے دو قصائد لارڈ الگن[1] اور جان لارنس کی مدح میں ہیں۔ صفحہ ۲۸ متن کی گیارہویں سطر سے دو مدحیہ قطعات ہیں۔ پھر چار بیت کا ایک قطعہ ہے جو اجمیر میں میر سعادت علی کی مسجد و چاہ کی تعمیر سے متعلق ہے۔[2] صفحہ ۲۹ کی ساتویں سطر سے دس رباعیات ہیں۔ ان منظومات کے بارے میں جو مثنوی کی اس جداگانہ اشاعت میں مثنوی کے بعد اضافہ کی گئی ہیں، غالب نے لکھا ہے کہ یہ کلیات فارسی کی اشاعت کے بعد میرزا فیاض نے مجھے ارزانی کی تھیں۔ غالب کے لفظ یہ ہیں:

"...... دو قصیدہ و چند قطعہ و اند رباعی کہ پس از طبع کلیاتِ فارسی از میرزا فیاض
بہ من حوالت رفتہ بود بر سواد آن نگارش (مثنوی ابر گہر بار) افزود"...

"لیکن غالب کا یہ کہنا درست نہیں کہ یہ تمام کلام، کلیات کی طباعت کے بعد کا ہے[3]۔ اس مجموعے میں شروع کے دو قصیدے وہ ہیں جو ۱۸۶۳ء میں کہے گئے تھے۔ کلیات کا مسودہ طبع کو دینے کے بعد کہے گئے ہوں گے، لیکن پہلا قطعہ جو انقلاب ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد کا ہے، ۱۸۶۲ء کے بعد کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ البتہ دوسرا قطعہ ۱۸۶۴ء کا ہے، مگر تیسرا قطعہ، ایک مسجد کا قطعۂ تاریخ ہے جو ۱۸۵۲ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ اسی طرح پہلی رباعی ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کی ہے اور پانچویں رباعی مسلّم طور پر بہادر شاہ کے فرزند اور مدارالمہام مرزا شاہ رُخ کے سالِ وفات ۱۸۴۷ء سے پہلے کی ہے، بلکہ اسے جولائی ۱۸۳۸ء اور دسمبر ۱۸۴۱ء کے درمیان کی قرار دیا جا سکتا ہے۔ چھٹی رباعی "دستنبو" میں آئی ہے اور اسی طرح اگست ۱۸۵۸ء سے پہلے کی ہوئی۔ ساتویں رباعی ۲۴ فروری

۱؎ لارڈ الگن کی مدح کا یہ قصیدہ، اُردو اخبار، لکھنؤ کی اشاعت ۳۰ دسمبر ۱۸۶۲ء، ص ۸۶۱ میں شائع ہو چکا ہے۔ اخبار مذکورہ میں کرنیل ڈورینڈ صاحب "سکتر اعظم بہادر گورنمنٹ" کے اس خط کی نقل بھی درج کی گئی ہے جو "در رسید قصیدہ بر کاغذ افشاں" غالب کو موصول ہوئی۔ (فاضل لکھنوی، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، فروری ۱۹۵۲ء، ص ۶۰-۶۱)

۲؎ اجمیر میں یہ مسجد اور اس کے ساتھ کا کنواں، اب بھی اچھی حالت میں ہے۔ مسجد کے دروازے کا حالیہ عکس جس میں سر در پر اس قطعے کا کتبہ صاف پڑھا جاتا ہے، "سبد چین" مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی (مطبوعہ ۱۹۶۹ء، بمقابل ص ۴) میں شامل ہے۔

۳؎ وزیر الحسن عابدی، سبد چین، ایضاً، ص ۳ و ما بعد

۱۸۵۸ء کو کہی گئی تھی۔ نویں رُباعی اگست ۱۸۵۸ء سے پہلے کی ہے، اس لیے کہ یہ بھی "دستنبو" میں درج ہوئی ہے۔[1]

ان منظومات کے بعد آخر کتاب میں تیرہ سطری غالب کی ایک مختصر سی تقریظ ہے۔ تقریظ کے بعد صفحہ ۴۰ ہی پر ثاقب، سالک، رضوان اور مرزا یوسف علی خاں عزیز کے قطعاتِ تاریخ، فارسی میں اور ایک قطعہ مرزا باقر علی خاں کامل کا اُردو میں ہے۔ ایک زائد ورق کے ایک رُخ (صفحہ ۴۱) پر دو کالم کا غلط نامہ ہے، جسے "صحیح نامہ مثنوی ابرِ گہربار" کا عنوان دیا گیا ہے اور اس کے تحت چالیس غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے۔ اس کے نیچے "اشتہار" کا عنوان قائم کر کے جلی قلم سے یہ عبارت درج ہے "اس کتاب کو بے اجازت حضرت مصنف مدظلہ اللہ تعالیٰ کے کوئی صاحب قصد انطباع نہ فرمائیں، فقط" آخر کا صفحہ ۴۲ سادہ ہے۔ ہر صفحے کے متن کا مسطر سترہ سطری ہے۔ دو کالمی حاشیے کو بھی کام میں لایا گیا ہے۔ یہ بھی سترہ سطری، اس طرح ہر صفحے پر چونتیس سطریں ہیں۔

"ابرِ گہربار" کی جداگانہ اشاعت میں بمقابلہ کلیات، چونتیس شعر کم ہیں۔ کتاب جس مسطر پر چھپی ہے، اس کے حساب سے گویا پورے ایک صفحے کا مواد، کتابت ہی نہیں ہوا، یا طباعت میں رہ گیا۔ یہ اشعار، مثنوی کے "بیانِ معراج" کے شعر ۱۳۶ کے بعد سے مسلسل حذف ہوئے ہیں۔ شعر ۱۳۶ یہ ہے:

ولی بود چوں بر کمر دامنش   توانگر نکرد آں گہر چیدنش

آخری محذوف شعر یہ ہے:

چو زنگو نہ زیں ہفت در بند ژرف   پدید آمدش فتح یابی شگرف

"کلیاتِ غالب فارسی (۱۸۶۳ء) سے جداگانہ، کتابی صورت میں "مثنوی ابرِ گہربار" کا یہ ایڈیشن اس لیے اہم ہے کہ اوّل تو مثنوی پر مرزا کی دوسری نظر ہوئی ہے اور نولکشوری ایڈیشن کی بعض اہم غلطیوں کی اصلاح خود غالب نے کی ہے۔ دوسرے یہ کہ بعض قصائد و قطعات و رُباعیات کی پہلی روایت اسی میں ملتی ہے۔ تیسری بات مرزا کی دو فارسی عبارتیں ہیں۔ (یعنی فاتحہ و خاتمہ کتاب)، جن سے مرزا کے شعورِ تنقید اور ذوقِ سخن فہمی و فنِ شعر شناسی پر روشنی پڑتی ہے۔ خصوصاً شاعر نے خود اپنے بارے میں بڑے اعلیٰ درجے کی رائے دی ہے۔[2]"

---

[1] ان تاریخوں کی تعیین اور اس کی توضیح "سبد چین" مذکورہ (عابدی) کے حواشی اور تعلیقات میں کی گئی ہے۔

[2] مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، "اُردو"، کراچی، جنوری ۱۹۶۶ء، ص ۴۸۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کے آزاد کلکشن میں "مثنوی ابرِ گہربار" کا پہلا ایڈیشن اس نمبر پر محفوظ ہے: A Pi XI 105 -

دو اشاعتیں :

مرتبہ : شیخ اصغر علی، مشمولہ : اورینٹل کالج میگزین، لاہور
فروری، مئی ۱۹۵۸ء

مرتبہ : مرتضیٰ حسین لکھنوی، مشمولہ : سہ ماہی "اردو"، کراچی
شمارہ جنوری ۱۹۶۶ء، اپریل ۱۹۶۶ء، جولائی ۱۹۶۶ء
اکتوبر ۱۹۶۶ء [چار اقساط میں]

سَبَدِ چین

مطبع محمدی (مالک محمد مرزا خاں)، دہلی
ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ، اگست ۱۸۶۷ء
ضخامت : ۴۰ صفحات (۲۱ سطری مسطر)
(آخر میں دو صفحوں کا صحیح نامہ علاوہ)

"مثنوی ابرِ گہربار" کی جداگانہ اشاعت ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء کے آخر میں دو قصائد، کچھ قطعات اور رباعیات کا اضافہ کر دیا گیا تھا، یہی نیا غیر مرتب کلام، "سبدِ چین" کا باعث ہوا۔ "سبدِ چین" کا غالب کی زندگی میں صرف ایک ہی ایڈیشن شائع ہوا۔ یہ کتابچہ اب عام طور پر دستیاب نہیں ہے۔ اس کے دیباچے میں غالب نے صراحت کے ساتھ یہ بات بتا دی ہے کہ اس مجموعے میں بعض منظومات وہ ہیں

۱؎ "سَبَدِ چین" (س/ب مفتوح؛ د بساکن) : ترکیب اضافی نہیں ہے، مصدر "چیدن" سے اسم مفعول سماعی ترکیبی ہے یعنی "میوۂ چیدہ در سبد"، یا بچا کھچا ٹوکری بھر پھل، جو فصل ختم ہونے پر رہ جاتا ہے۔ یہی معنی غالب نے اپنے دیباچے میں بتائے ہیں۔
[وزیر الحسن عابدی، "سبدِ چین"، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۲۶]

جو کلیات کی طباعت کے بعد موزوں ہوئیں اور کچھ، ان کے احباب پاس اس سے پہلے کے مسودوں میں موجود تھیں اور وہ ان سے بے خبر تھے۔ "سبد چین" کے دیباچۂ غالب کے لفظ یہ ہیں:

"..... ہر آئینہ آنچہ پس از انطباعِ کلیاتِ فارسی گفتہ شد و آنچہ
یاران از دیرین مسودات داشتند و من از آن خبر نداشتم و اینک ہمی ساختند
در اوراقِ جداگانہ ضبط کردہ شد و آن را "سبد چین" نام نہادہ آمد..."

دیباچے میں غالب نے اس مجموعے کے اشعار کی تعداد کچھ کم ہزار بتائی ہے:

"دانم کہ از فراہم آوردنِ کلیات کردہ ہزار بیست دارد چہ کشود کہ
ازین ابیات کہ در شمار ہزار بیت نتواند رسید خواہد کشود..."

لیکن مالک رام لکھتے ہیں کہ اس میں مختلف اصناف میں ۷۴۵ شعر[1]" ہیں اور وزیر الحسن عابدی کا بیان ہے کہ: "در اصل یہ اشعار تعداد میں سات سو ترپن ہیں[2]:"

"غالب نے ۲۲ اکتوبر ۱۸۶۷ء سے پہلے "سبد چین" کے چھ نسخے "دہلی سوسائٹی" کو عنایت کیے تھے[3]"

محمد صادق صفوی نے غالب اور اپنے جدِ اعلیٰ نواب سید محمد علی معروف بہ نواب دولہا (۱۷۰۷ھ – ۱۸۷۷ء) کے مابین روابط کی دستاویزی اور زبانی روایتوں کو قلمبند کرتے ہوئے بتایا ہے کہ[4] غالب نے "سبد چین" کے دو نسخے بذریعہ ڈاک نواب دولہا کو بھیجے تھے۔ ایک خود اُن کے لیے اور ایک مرزا کلب حسین نادر (ڈپٹی کلکٹر فتح گڑھ) کے لیے۔ یہ ہدیہ نواب دولہا کو شمس آباد میں ۸۔ ستمبر ۱۸۶۸ء کو ملا۔ "سبد چین" کا یہ مطبوعہ نسخہ (عطیۂ غالب)، اب نواب دولہا کے خاندان میں ان کی یادگار محمد صادق صفوی

---

[1] ذکرِ غالب، طبع چہارم، ص ۱۹۵

[2] سبد چین، مطبعہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۹ء: ص ۴

[3] رسالہ دہلی سوسائٹی، شمارہ نمبر ۴، ص ۳، مطبوعہ ۱۸۶۹ء، بحوالہ: احوالِ غالب ۱۹۵۳ء، ص ۱۹۰

[4] غالب نامہ، نئی دہلی، جولائی ۱۹۸۷ء، ص ۱۹۶ - ۱۹۷

کے کتاب خانے کی زینت ہے۔

"سبد چین" ۱۸۶۷ء کے بعد قریب ستر برس تک پھر نہ الگ سے شائع ہوا اور نہ اسے "کلیات غالب" کے کسی اڈیشن میں شامل کیا گیا، اس لیے نایاب ہو چکا تھا۔ اس کا ایک نسخہ نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمٰن شروانی (علی گڑھ) کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا۔ مالک رام نے اسے نئی ترتیب کے ساتھ، غالب کے کچھ منتشر کلام کے اضافے کے ساتھ شائع کیا۔ مالک رام لکھتے ہیں کہ:

"پہلے اڈیشن میں ترتیب کلام کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ اس میں یہ نقص دُور کردیا گیا ہے نیز میرزا کا بہت سا ایسا کلام بھی جو ادھر ادھر منتشر حالت میں پڑا تھا اکٹھا کرکے اس میں شامل کردیا گیا ہے"

[ذکر غالب، طبع چہارم، دہلی ۱۹۶۴ء، ص ۱۹۰]

"سبد چین" طبع اول کے مقابلے میں، مالک رام نے "سبد چین" کے اپنے مرتبہ اڈیشن میں پچاس کے لگ بھگ غالب کے اشعار اضافہ کیے ہیں جس کے لیے ان کے بعض مطبوعہ ماخذ یہ ہیں: اردوئے معلّٰی، تیغ تیز، مکاتیب غالب (عرشی)، یادگار غالب (حالی)، واقعات دار الحکومت دہلی (بشیر الدین احمد)، تذکرۂ غوثیہ (شاہ گلحسن) وغیرہ

"سبد چین" (مرتبہ: مالک رام، ۱۹۳۸ء، صفحات ۸۰، سائز ۲۰×۳۰/۱۶) کے مشمولات کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ چھ قصائد،	۲۳۱	۶۔ نظم	۷
۲۔ ترکیب بند	۸۴	۷۔ دس غزلیات	۱۰۳
۳۔ ترجیع بند	۳۰	۸۔ متفرق اشعار	۱۸
۴۔ مثنوی	۹	۹۔ بیس رباعیات	۴۰
۵۔ پچاس قطعات	۲۸۶	تعداد اشعار	۸۰۸

"سبد چین" کی اس اشاعت میں غالب کے اشعار کی کل تعداد ۸۰۸ بنتی ہے۔ خود مالک رام نے اپنے مرتب کردہ اس اڈیشن کے اشعار کی تعداد ۸۲۴ بتائی ہے۔[۵] یہ سہو غالباً اس لیے ہوا ہے کہ "سبد چین" (مالک رام) کے صفحہ ۴۵ کے حاشیے میں درج

ایک قطعے کے اشعار بھی شمار کر لیے گئے ہیں جبکہ یہ قطعہ غالب کا نہیں ہے۔

ایک حالیہ اشاعت مرتبہ: سید وزیر الحسن عابدی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۹ء

مثنوی دعای صباح:

★ طبع اوّل: مطبع نولکشور، لکھنؤ، ماقبل ۲۰ نومبر ۱۸۶۷ء

ضخامت: ۲۶ صفحات   سائز: ۱۸ × ۲۲/۸

تعداد اشعار: ۱۲۴ + ۷

"دعای الصباح" حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منسوب عربی زبان میں ایک دعا ہے۔ "مثنوی دعای صباح" اسی دعا کا منظوم فارسی ترجمہ ہے۔ غالب نے یہ ترجمہ اپنے بھانجے مرزا عباس بیگ[1] کی فرمائش پر کیا تھا۔ غالب کے خطوط یا اُن کی دوسری تحریروں میں اس ترجمے کا کہیں ذکر نہیں ملتا، غالب کے تلامذہ اور معاصرین کی تحریریں بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ "آبِ حیات" (۱۸۸۰ء) اور یہاں تک کہ "یادگارِ غالب" (۱۸۹۷ء) بھی، اس منظوم ترجمے کے ذکر سے خالی ہے۔

---

[1] (i) "مرزا عباس بیگ، میرا بھانجا، فتنہ و فساد کے زمانے میں بلگرام میں رہا اور اب فرخ آباد میں ڈپٹی کلکٹر ہے" (غالب بنام: صاحبِ عالم مارہروی، مارچ ۱۸۵۸ء)

(ii) تاریخِ وفات مرزا عباس بیگ: یک شنبہ، دہم جمادی الاوّل ۱۲۹۶ھ/ ۲ مئی ۱۸۷۹ء
(بحوالہ، کلیاتِ قدر بلگرامی، صفحہ ۳۵۲)

(iii) مرزا عباس بیگ، لکھنؤ کے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے منصب سے ۱۸۸۷ء میں ریٹائر ہوئے۔ شرحِ احوال کے لیے دیکھیے: کارنامۂ سروری، سرور جنگ، مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(iv) حالات کی تحقیق میں ایک نسبتاً تازہ قیمتی مقالے کے لیے رجوع کیجیے
"مرزا عباس بیگ مرحوم —— خواہر زادۂ غالب" مشمولہ: متعلقاتِ غالب، کالیداس گپتا رضا، بمبئی ۱۹۷۸ء، صفحہ ۵۲-۸۵

خوش قسمتی سے مولانا امتیاز علی عرشی کو اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ کتاب خانۂ رامپور کے ایک مجموعے میں دستیاب ہوا، اور انھوں نے اہلِ علم سے اس کا تعارف کرایا۔[1]

مولانا عرشی کے بقول : یہ مثنوی ½۷ × ¾۴ سائز کے ۴۲ صفحات کی ہے اور ۱۲۸۴ھ میں امروہے کہ ایک بزرگ محمد علی بن سید برخوردار علی نے (اسے) نقل کیا تھا۔ اس قلمی نسخے میں اولاً اصل دعا کا عربی متن سیاہ روشنائی سے تحریر ہے۔ عبارت کے چاروں طرف قرمزی دُہری جدول ہے اور متن عربی، ترجمۂ نثر اور ترجمۂ نظم باہم جدا کرنے کے لیے بھی قرمزی لکیریں کھینچی گئی ہیں۔ یہ کتاب مجموعے کے ورق ۵۶/ب سے شروع ہو کر ۶۷/ب پر ختم ہوتی ہے لیکن کاتبِ مجموعہ نے ہر رسالے کے اوراق پر جداگانہ ہندسے ڈالے ہیں۔ کاغذ باریک یورپی ہے، کہیں کہیں پیوند کاری اور اکثر جگہ کرم خوردگی کے نشانات پائے جاتے ہیں۔

مثنوی کا آغاز "مفاتیح النجات" مصنفہ محمد باقر بن محمد مومن خراسانی السبزواری کے ایک اقتباس سے ہوتا ہے، جس میں اس دعا کی فضیلت اور اس کے نام کا ذکر ہے اور کسی بزرگ کی زبانی یہ نقل کیا گیا ہے کہ میں نے امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قلم کا ایک سفینہ دیکھا جس کی تاریخ کی کتابت ۲۵ ہجری (= ۶۴۵ء) تھی۔ اس میں درج تھا کہ یہ دعا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی ہے۔ تمہید کا عنوان "اسناد دعاء صباح" ہے جو شنگرفی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک دعا لکھی ہے جو دعاء الصباح سے پہلے پڑھی جانی چاہیے۔ اس کا عنوان ہے "ھٰذَا الْاِعْتِصَامُ یُقْرَاُ سَبْعَ مَرَّاتٍ" اور یہ شنگرفی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرے ورق کے دوسرے صفحے سے شروع ہو کر ......

دعا الصباح ورق ۱۱/ب پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ۱۲/ الف و ب پر امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول دعا، ایک اردو عنوان کے نیچے ترجمہ نثر و نظم کے ساتھ درج ہے۔"

(نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۴۱ء، صفحہ ۹، ۱۰)

عرشی صاحب لکھتے ہیں کہ "یہ مثنوی اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے

---

[1] نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۴۱ء، صفحہ ۹ – ۱۵

ذریعے سے ہمیں (غالب) کے ترجمے کی کوشش کا علم ہوتا ہے ..... جہاں تک ترجمے کا تعلق ہے اس میں شبہ نہیں کہ میرزا صاحب نے اصل دعا کے مطلب اور مفہوم کو شعر فارسی میں پورا پورا کر دینے میں کمال کر دکھایا ہے، حتیٰ کہ بہت سے فقروں کا ترجمہ اتنے ہی مختصر الفاظ میں کیا گیا ہے جتنے مختصر الفاظ، اصل عربی کے تھے اور شاید ہی کسی جگہ اصل عربی کا کوئی لفظ میرزا صاحب کے ترجمے کی گرفت سے بچ نکلا ہو۔"

اس دعوے کے اثبات میں مولانا عرشی نے اصل عبارت اور اس کے کامیاب منظوم فارسی ترجمے کی متعدد مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ بایں ہمہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ :

"بلحاظِ شعریت، مرزا کی یہ مثنوی کوئی بلند پایہ نظم نہیں معلوم ہوتی۔"
(نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۴۱ء، صفحہ ۱۱)

قلمی نسخے کے ترقیمے کی عبارت یہ ہے :

"دعائے ماثور و منقول از جناب امیر علیہ السلام معہ ترجمہ نثر و نیز ترجمہ منظوم مرزا اسد اللہ خاں غالب موسوم بہ دعائے صباح حسب الایمائے مرزا عباس بیگ صاحب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ بمطبع منشی نولکشور رونق طبع یافتہ ...... بود بست و سوم شہر رجب سنہ یک ہزار و دو صد و ہشتاد و چہار، بندہ حقیر فقیر محمد علی بن سید برخوردار علی امروہوی نقل برداشت۔" (نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۴۱ء، صفحہ ۱۰)

۲۳ رجب ۱۲۸۴ھ مطابق ہے ۲۰ نومبر ۱۸۶۷ء کے۔ مولانا عرشی لکھتے ہیں کہ :

"مندرجہ بالا عبارت کے جن الفاظ کے ذریعے ۱۲۸۴ھ ظاہر کیا گیا ہے یہاں غالباً کاتب نے سالِ طباعتِ کتاب، نقل کیا تھا لیکن بعد ازاں اس کو مٹا کر سالِ کتابت لکھا ہے۔ بہر حال اس سے اتنا یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ منظوم مرزا عباس بیگ کی فرمائش پر منشی نولکشور کے مطبع میں مرزا غالب (۱۲۸۵ھ) کی زندگی میں چھپا تھا اور ان کے انتقال کے ایک سال تین مہینے کچھ دن قبل نسخہ مطبوعہ سے اس کی نقل

کی گئی۔ مطبع نولکشور سے اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہو سکا اور نہ کسی کتاب خانے کی فہرست میں اس کا ذکر نظر سے گزرا۔"

(نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۴۱ء، صفحہ ۱۰)

مولانا امتیاز علی عرشی کا خیال ہے کہ:

"کاتب کے خاتمے کے الفاظ سے جو دراصل نسخہ مطبوعہ کا خاتمہ ہے، یہ مترشح ہوتا ہے کہ دونوں ترجمے مرزا غالب کے ہیں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ صرف ترجمہ منظوم میرزا صاحب کا ہے۔ نثر کا ترجمہ کسی عربی دان عالم نے کیا ہوگا، جس پر لفظی اصلاح ممکن ہے، میرزا صاحب نے بھی دے دی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرزا صاحب، ایسے عربی دان نہ تھے کہ دعاء الصباح کی عبارت کا از خود ترجمہ کر لیتے۔ میرے خیال کی تائید خاتمے کی عبارت کو بغور پڑھنے سے بھی ہوتی ہے۔ اگر دونوں ترجمے میرزا صاحب کے ہوتے تو عبارت یوں ہونی چاہیئے تھی:

"مع ترجمہ نثر و ترجمہ منظوم از میرزا اسد اللہ خاں غالب"

یقیناً خاتمہ نگار نے "نیز" کا اضافہ کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اس عبارت میں صرف مؤخر الذکر فقرہ غالب سے متعلق ہے۔"

(نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۴۱ء، صفحہ ۱۰)

یہ محض قیاس ہے اور گو بہت صائب ہے لیکن کسی دستاویزی شہادت کے بغیر اسے امرِ واقعہ کا مقام بہر حال نہیں مل سکتا۔ مالک رام بھی مُعترض ہیں:

"فارسی نثر، غالب کے قلم سے نہیں، یہ ترجمہ کسی اور سے لیا ہے۔ ہاں میرزا نے اس کی نوک پلک درست کی ہو تو یہ ممکن ہے۔ اسی نثری ترجمے کو اُنھوں نے نظم کر دیا ہے۔"

(ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی، ۱۹۶۴ء، صفحہ ۱۵۸)

۱۹۵۰ء میں فضل اللہ فاروقی نے اس مثنوی کا مطبوعہ نسخہ بھی ڈھونڈ نکالا،

انھوں نے، نوائے ادب، بمبئی، جلد ۱، نمبر ۲، شمارہ اپریل ۱۹۵۰ء میں "غالب کی مثنوی دعا ر صباح کا مطبوعہ نسخہ" کے عنوان سے (صفحہ ۵۶ - ۶۱)، اس مثنوی کی اولین طباعت کا تعارف کرایا ہے اور مطبوعہ ایڈیشن کے سرورق اور صفحہ ۱۵ کا عکس بھی پیش کیا ہے (مابین صفحہ ۶۰ و ۶۱) منقوش سرورق کی عبارت یہ ہے:

۱۔ بخطِ جلی : دعای ماثور و منقول از جناب امیر علیہ السلام

۲۔ بخطِ خفی : مع ترجمہ نثر و نیز ترجمہ منظوم از میرزا اسد اللہ خاں غالب موسوم بہ

۳۔ بخطِ جلی تر : دعای صباح

۴۔ بقلم ۲ : حسب الایمائے مرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، لکھنؤ

۵۔ بقلم ۱ : بمطبع منشی نولکشور رونق طبع یافت

اس نولکشوری اشاعت پر سالِ طباعت درج نہیں ہے۔ حالانکہ اس مثنوی کے علاوہ، غالب کی زندگی میں ان کی تین اور کتابیں : قاطع برہان (۱۸۶۲ء)، کلیاتِ غالب فارسی (۱۸۶۳ء) اور کلیاتِ نثرِ غالب فارسی (۱۸۶۸ء) مطبع نولکشور سے چھپی ہیں اور تینوں پر سالِ طباعت درج رہا ہے۔ فاروقی صاحب نے "دعای صباح" کے سرورق کا جو عکس شائع کیا ہے، اس پر "بمطبع منشی نولکشور رونق طبع یافت" ہے، "یافتہ" نہیں، جیسا کہ مولانا عرشی کے متعارفہ قلمی نسخے میں ہے۔ قلمی نسخے میں "یافتہ" اور اس کے بعد کا کل اندراج کاتب کا اضافہ ہے "اور وہ سنہ کتابت ہی ہے"[۱]۔

فضل اللہ فاروقی لکھتے ہیں کہ "سرورق کے دوسرے ہی صفحے (یعنی سرورق کی پشت) سے اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ حاشیے پر دعاء الصباح کی اسناد ہیں اور حوض میں پہلے عربی دعا ہے، پھر فارسی نثر (میں) ترجمہ اس کے نیچے مرزا غالب کا منظوم ترجمہ" اس مطبوعہ نسخے کے سرورق اور ایک دوسرے صفحے (نمبر ۱۵) کا عکس دیکھنے سے معلوم ہوتا

[۱] نوائے ادب، بمبئی، اپریل ۱۹۵۰ء، صفحہ ۶۱۔

ہے کہ یہ بہت روشن، اور خوشخط لکھا ہوا ہے ۔

اس مثنوی کی تعدادِ اشعار اختلافی ہے۔ فضل اللہ فاروقی لکھتے ہیں کہ :

"مثنوی میں، کل ۱۲۴ اشعار دعا صباح کے ہیں اور ۷ اشعار امام زین العابدین کی مناجات کے ہیں۔ نسخۂ منقولہ (عرشی) میں اشعار کی ترتیب وہی ہے جو مطبوعہ نسخے (کشوری) میں ہے ۔"

(نوائے ادب، بمبئی، اپریل ۱۹۵۰ء، صفحہ ۶۰)

عرشی صاحب نے اپنے مضمون کے ساتھ مثنوی کا متن بھی شائع کیا (دیکھیے "نگار" مئی ۱۹۴۱ء، صفحہ ۱۴-۱۵)، اس میں جیسا کہ فاروقی صاحب نے بھی لکھا ہے، اشعار کی تعداد ۱۲۴ + ۷ ہی ہے۔

جبکہ مالک رام لکھتے ہیں کہ اس مثنوی کے :

پہلے ۲۴ صفحوں میں ۱۲۲ شعر دعاء صباح کے آخری دو صفحوں میں سات شعر، حضرت امام زین العابدین کی ایک دعا کا ترجمہ ہیں"

(ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی ۱۹۶۴ء، صفحہ ۱۹۸

طبع پنجم، دہلی ۱۹۷۶ء، صفحہ ۱۵۷)

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (مغلپورہ، لاہور) کے ذخیرۂ غالبیات میں مثنوی "دعای صباح" طبع اول (نولکشور) کا ایک نسخہ موجود ہے[۱]۔ مولانا فاضل نے اس مثنوی کو اپنی مرتبہ "کلیات غالب فارسی" میں شامل کر لیا ہے[۲]۔ اس میں مثنوی کے اشعار کی تعداد ۱۲۰ ہے، سات اشعار علاوہ ہیں۔ "کلیات" (مذکورہ) میں ان سات اشعار کے عنوان کی عبارت یہ ہے "ترجمہ دعای امام زین العابدین جو حضرت بعد اس

---

[۱] مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے بعض دوسری اشاعتوں کے منجملہ اودھ اخبار پریس لکھنؤ کے ایک نسخے کی بھی نشاندہی کی ہے۔

[اورینٹل کالج میگزین، لاہور، فروری ۱۹۵۲ء، صفحہ ۵۱-۶۱)

[۲] کلیات غالب فارسی، جلد اول، لاہور، ۱۹۶۷ء، صفحہ ۴۱۹ - ۴۳۰

دعا کے پڑھتے تھے ---- "

فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ انھوں نے اس مضمون (نوائے ادب، بمبئی، اپریل ۱۹۵۰ء) کے لکھنے کے دوران میں عرشی صاحب سے دریافت کیا تھا کہ :

" ان کا مضمون (نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۴۱ء) شائع ہونے کے بعد مثنوی دعاء الصباح پر کوئی نئی تحقیق ہوئی ہو تو وہ مطلع فرمائیں انھوں نے ازراہ مہربانی اطلاع دی کہ سید آغا مہدی کو اس مثنوی کا مطبوعہ نسخہ مل گیا ہے اور وہ اسے شائع کر رہے ہیں۔ سید صاحب سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ موصوف کو اس مثنوی کا جو نسخہ ملا وہ مطبع مظہر العلوم لکھنؤ میں ۱۸۹۵ء میں چھپا تھا اور اب انھوں نے اسے "نور کا تڑکا" کے نام سے شائع کر دیا ہے " (نوائے ادب، بمبئی، اپریل ۱۹۵۰ء، حاشیہ صفحہ ۶۱)

مثنوی " دعای صباح " طبع اوّل کا ایک نسخہ کالیداس گپتا رضا (بمبئی) کے غالب کلکشن میں محفوظ ہے جنھوں نے اسے صفحہ بہ صفحہ فوٹو عکس کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔[1] اس طرح یہ نادر و نایاب اشاعت اب گویا ہر غالب شناس کی دسترس میں ہے :

ضخامت : ۲۹ صفحات ، سائز ۲۰×۳۰/۱۶

تعداد اشعار ۱۲۴ + ۷

سرورق کی پشت صفحہ ۲ کے دائیں اور ذیلی حاشیے پر فارسی نثر میں اس دعا کی فضیلت اور حضرت علی سے اس کی نسبت کی سند درج ہے۔ صفحہ ۲ ہی سے "دعا الصباح کے نسبتاً جلی عنوان کے تحت " بسم اللہ الرحمن الرحیم " کے بعد متن شروع ہو جاتا ہے۔ پہلے نسبتاً جلی قلم سے عربی متن، اس کے نیچے فارسی نثر میں ترجمہ اور پھر منظوم فارسی ترجمہ۔ اس ترتیب سے صفحہ ۲ پر تین شعر آئے ہیں اور صفحہ ۳ پر پانچ شعر ---- صفحہ ۳ کے بائیں حاشیے پر " ھذا الاعتصام یقرا سبع مرات " کے عنوان سے عربی میں ایک دعا ہے جسے " دعاء الصباح " سے پہلے پڑھنا چاہیے۔ صفحہ ۴ پر مثنوی

---

[1] ناشر: دل پبلی کیشنز، بمبئی، دسمبر ۱۹۷۰ء، ۲۰×۳۰/۱۶ سائز، صفحات ۸۴

ایک سو چوبیس شعروں پر تمام ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۲۴ ہی کی آخری دو سطروں میں جلی قلم سے یہ ادارہ عبارت ہے :

"اور جناب امام زین العابدین علیہ الصلوٰۃ والسلام سے روایت ہے کہ بعد پڑھنے اس دعا کے، سجدے میں یہ دعا پڑھے۔"

صفحہ ۲۵ سے حضرت امام زین العابدین سے منقول ایک عربی دعا، فارسی نثر اور نظم میں ترجمے کے ساتھ شروع ہو کر صفحہ ۲۶ کے نصف اول پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس ہفت شعری دعا کا آخری شعر یہ ہے : اے خدا! از آسماں آور فرود

بر نبی و آلِ اطہارش درود

کالیداس گپتا رضا نے بعض دوسری اشاعتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے :

- مطبع نامی، مظہر العلوم، لکھنؤ، باہتمام منشی مظہر حسین شعبان ۱۳۱۲ھ، فروری ۱۸۹۵ء، صفحات : ۲۴
- وظائف الابرار کے ساتھ، باہتمام : میر عابد، مالک اثنا عشری پریس، لکھنؤ، ۲۵۔ شوال ۱۳۲۴ھ، (مطابق ۱۲۔ دسمبر ۱۹۰۶ء)
- شرح دعائے صباح موسوم بہ معراج الصلاح، المعروف بہ "نور کا تڑکا" مرتبہ : مولانا سید آغا مہدی، صفدر پریس، لکھنؤ، ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۸ء، ص ۴۰

- در نظامی جنتری برائے ۱۹۵۰ء، مرتبہ : عارف مطبوعہ : نظامی پریس، لکھنؤ، صفحہ ۱۰-۱۵، ترتیب یہ ہے : عربی متن کے بعد پہلے مولانا سید محمد صادق کا منثور اور منظوم ترجمہ اردو میں، بعد ازاں غالب کا ترجمہ منظوم فارسی میں۔ اسی جنتری میں محمد امیر حیدر خاں مہاراج کمار محمود آباد کا "دعائے صباح" کا انگریزی ترجمہ بھی شامل ہے۔ غالب کے دو شعر چھپنے سے رہ گئے ہیں۔

- خواجہ غلام السیدین یادگاری اشاعت "ارمغانِ اُلفت" (۱۹۶۴ء) میں مالک رام کا ایک مضمون "دعائے صباح" شامل ہے جس کے آخر میں پوری مثنوی بھی درج ہے۔
- "کلیاتِ غالب فارسی"، مرتبہ: امیر حسن نورانی، ۱۹۶۸ء میں بھی یہ مثنوی شامل کر لی گئی ہے۔ (صفحہ ۷۱۰ - ۷۱۶)

چوتھا باب

تصانیفِ غالب : نثرِ فارسی

۱۔ پنج آہنگ :	دہلی، ۱۸۴۹ء
	لکھنؤ، ۱۸۶۳ء
۲۔ مہرِ نیمروز :	دہلی، ۱۸۵۴ء
	لکھنؤ، ۱۸۶۸ء
۳۔ دستنبو :	آگرہ، ۱۸۵۸ء
	بریلی، ۱۸۶۵ء
	لکھنؤ، ۱۸۶۸ء
۴۔ نکات و رقعاتِ غالب :	دہلی، ۱۸۶۷ء
۵۔ کلیاتِ نثرِ غالب :	لکھنؤ، ۱۸۶۸ء

پنج آہنگ :

★ طبع اول : مطبع سلطانی ، قلعہ دہلی ، ۱۲ رمضان ۱۲۶۵ھ ، ۴ راگست ۱۸۴۹ء
باہتمام : حکیم غلام نجف خاں
ضخامت : ۱۳ سطری مسطر کے متوسط سائز پر ۴۹۳ صفحات
(کتاب صفحہ ۴۹۲ پر ختم ہو گئی ہے - اضافی صفحہ ۴۹۳ پر صرف ترقیمہ ہے)

★ طبع دوم : مطبع دارالسلام ، دہلی ، اپریل ۱۸۵۳ء
باہتمام : منشی نورالدین احمد لکھنوی
ضخامت : ۴۴۵ صفحات ، سائز : ۲۰ × ۱۶/۳۰
(صفحہ ۳۰۴ تک فی صفحہ چودہ سطریں ، صفحہ ۳۰۵ سے آخری صفحے تک ۱۵ سطریں - کتاب کے صفحات کا آخری شمار ۴۴۴ ہے ، لیکن صفحہ ۱۵۶ کے بعد پھر صفحہ ۱۵۶ چھپ گیا ہے اور یہ غلطی تا آخر قائم رہی ، اس طرح اصلاً کتاب کو ۴۴۵ صفحات پر مشتمل سمجھنا چاہیئے - گو اس میں صفحوں کا آخری شمار ۴۴۴ ضبط ہوا ہے -

★ طبع سوم در : "کلیاتِ نثرِ غالب" مطبع نولکشور ، لکھنؤ ، جنوری ۱۸۶۸ء
ضخامت : ۱۲۲ صفحات ، سائز : $8\frac{3}{4}" \times 12\frac{1}{4}"$ ، مسطر : ۲۹ سطری

(اس اشاعت میں خاتمہ "پنج آہنگ" (ص ۱۲۲) کی عبارت نئی ہے۔ نیز آہنگ چہارم میں تین نثروں اور آہنگِ پنجم کے آخر میں بارہ خطوں کا اضافہ ہوا ہے۔

"پنج آہنگ" پانچ حصوں پر مشتمل غالب کی متفرق فارسی تحریروں سے عبارت ہے جسے غالب کے برادرِ نسبتی میرزا علی بخش خاں نے مرتب کیا۔ انھوں نے "پنج آہنگ" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ :

"میں ۱۸۳۵ء میں نواب شمس الدین احمد خاں کی بغاوت کے بعد جے پور سے دلی پہنچا۔ انھی ایام میں مرزا غالب کا دیوان فارسی موسوم بہ "میخانۂ آرزو سرانجام" مرتب ہوا تھا۔ اس میں کی نثر کو میں نے میرزا سے پڑھا تو میرے جی میں آئی کہ یہ نثر اور ان کی دوسری متفرق فارسی تحریریں جمع کر دینا چاہئیں، مگر مکروہات سے فرصت نہ ملی۔ حتیٰ کہ حکیم رضی الدین حسن خاں بہادر نے تحریک کی کہ ان اوراق کو ضرور یکجا کر دیا جائے۔ میرے ہم سبق میر محمد حسین خان صاحب بھی میرا ہاتھ بٹانے کو تیار ہو گئے۔ میں نے خیال کیا کہ اگر یہ جمع ہو جائیں تو میرا لڑکا غلام فخر الدین خاں بھی ان سے مستفید ہو گا۔ لہٰذا میں نے اس کام پر کمر ہمت کس کے باندھ لی۔[1]"

"پنج آہنگ" کی بنیاد ۱۸۲۵ء (۱۲۴۱ھ) میں رکھی گئی تھی۔ اس سال انگریزوں نے بھرت پور کے قلعے پر لشکر کشی کی اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس لڑائی میں نواب احمد بخش خاں والیِ فیروز پور جھرکہ و لوہارو، انگریزوں کی طرف سے لڑ رہے تھے۔ غالب اور مرزا علی بخش خاں بھی اس موقع پر نواب صاحب کے ہم رکاب تھے۔ یہ دونوں دن بھر ساتھ رہتے اور ایک ہی خیمے میں شب باش ہوتے۔ مرزا علی بخش خاں نے غالب سے فرمائش کی آپ میرے لیے تمام ایسے کلمات اور جملے جمع کر دیں، جو رسمی القاب و آداب، اور شکر و شکوہ اور شادی و

---

[1] میرزا علی بخش خاں کے فارسی کلمات کا یہ آزاد اردو ترجمہ مالک رام کی کتاب "ذکرِ غالب" (طبع چہارم، ص ۱۰۹) سے ماخوذ ہے۔

غم کے مواقع پر خطوں میں استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

اس پر مرزا نے آہنگِ اول مرتب کیا۔ اس میں بلا فرق مراتب، القاب و آداب وہ فقرات درج کیے ہیں جو تعزیت و تہنیت، شکر و شکوہ، دعا و عتاب کے لیے لکھے جاسکتے ہیں۔

اس کے بعد آہنگِ دوم بھی مرزا علی بخش خاں ہی کی درخواست پر لکھا اور اسے چار زمزموں میں تقسیم کیا۔ زمزمۂ اول میں مختصراً مصادر کی حقیقت اور صرف کے چھ اصول بیان کیے ہیں۔ زمزمۂ دوم میں گویا زمزمۂ اول کی توضیح و تشریح کے لیے مثلاً تقریباً ۱۵۰ فارسی مصادر کی تعریف کی ہے اور ان کے ماضی، مفعول، مضارع، فاعل اور امر کے معنی لکھے ہیں۔ زمزمۂ سوم میں بعض مصادرات، مصطلحات دے کر ان کی تشریح کی ہے اور ان کے محلِ استعمال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ زمزمۂ چہارم میں بعض الفاظ کے معانی ہیں۔

آہنگِ سوم میں اپنے دیوانِ فارسی سے ایسے اشعار انتخاب کیے ہیں جو خطوط یا دوسری نثری تحریروں میں آرائشِ کلام کے لیے مفید اور کارآمد ہوسکتے ہیں۔ ہر ایک شعر کے عنوان میں لکھ دیا ہے کہ یہ کس موقع پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

آہنگِ چہارم میں وہ نثریں ہیں جو مرزا نے خود اپنی تصانیف کے آغاز و خاتمے میں یا دوسرے احباب کی کتابوں کے دیباچے یا تقریظ کے طور پر قلم بند کی ہیں۔ دراصل یہی وہ تحریریں تھیں، جنھیں یک جا کرنے کا خیال سب سے پہلے مرزا علی بخش خاں کے دل میں آیا تھا، اور جس نے بڑھ کر پنج آہنگ کی شکل اختیار کرلی۔ اس سے ان کی غرض یہ تھی کہ جس طرح میں نے ان سے استفادہ کیا ہے اسی طرح میرا بیٹا غلام فخرالدین بھی ان کے مطالعے سے مستفید ہوگا۔ جب وہ یہ نثریں جمع کر چکے تو انھوں نے پہلے تین آہنگ، جو ان کے پاس موجود ہی تھے، ان پر اضافہ کردیے ..... اور مرزا کے احباب نے ان کے خطوط لے کر انھیں آہنگِ پنجم کا نام دیا اور یوں "پنج آہنگ" مرتب ہوئی۔ مرزا کی زندگی میں پنج آہنگ کے مستقل دو ہی ایڈیشن شائع ہوئے۔ دونوں

اشاعتوں میں پہلے تین آہنگ یکساں ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں۔ آہنگِ چہارم طبع اول میں "تقریظ آثار الصنادید" پر ختم ہو جاتا ہے، لیکن طبع دوم میں اس کے بعد اور بھی دو نثریں ملتی ہیں۔ اول "دیباچہ دیوانِ ریختہ نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر" و دوم "دیباچہ تذکرہ الموسوم بہ طلسم راز فراہم آوردہ میر مہدی" اسی طرح طبع اول میں آہنگ پنجم کا آخری خط شیخ بخش الدین مارہروی (کذا) کے نام ہے۔ طبع دوم میں یہ خط صفحہ ۳۰۸، ۳۰۹ پر ہے اور اس کے بعد ۲۵ خطوط کا اضافہ کیا ہے جو ۳۵ صفحات پر محیط ہیں۔ اس میں آخری خط مرزا یوسف کے نام ہے۔

(مالک رام، نگار، لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۰ء)

سید وزیر الحسن عابدی نے "پنج آہنگ" کے تین قلمی نسخوں کا ذکر کیا ہے:

۱۔ پنج آہنگ، کتابت شدہ ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء مخزونہ شیرانی کلکشن، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور

۲۔ پنج آہنگ، کتابت شدہ ۱۸۳۰ء مخزونہ نذیریہ پبلک لائبریری، دہلی

۳۔ پنج آہنگ مندرجہ کلیاتِ نثرِ فارسی، کتابت شدہ، ۷ جمادی الثانی ۱۲۷۸ھ، ۱۰ دسمبر ۱۸۶۸ء

(یہ تاریخ "پنج آہنگ" کی کتابت کی ہے جو اس مجموعے میں شامل ہے)

ان قلمی نسخوں سے استفادے کے بعد عابدی صاحب نے بعض اہم اور نئے نتائج اخذ کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اب تک کی غالبیات میں پنج آہنگ کے بارے میں یہ تصور رہا ہے کہ

لہ "یہ نسخہ دراصل کلیاتِ نثرِ فارسی کا ہے، جسے میر مہدی مجروح کے برادرِ بزرگ نے خود مجروح کی فرمائش پر نقل کیا تھا۔" (دیباچہ فرہنگِ غالب، عرشی، ۱۹۴۷ء، صفحہ ۲۲) یہ نسخہ جس کی کتابت دسمبر ۱۸۶۱ء سے وسط جولائی ۱۸۶۳ء کی مدت میں میر مہدی مجروح کے لیے میر حسن موسوی دہلوی نے کی۔ ڈاکٹر اظہر علی کلکشن پنجاب پبلک لائبریری (لاہور) میں "۹۶، ۸۷۱ھ پنج" کے نمبر پر محفوظ ہے۔

اس کے پہلے آہنگ کا موضوع ہے "القاب وآداب و مراتب متعلقہ آن" دوسرے کا "مصادر و مصطلحات و لغات فارسی" پھر تیسرا آہنگ غالب کے منتخب فارسی اشعار پر مشتمل ہے جو اس عنوان کے تحت درج ہیں: "اشعار مکتوبی منتخب از دیوانِ رشکِ گلستان کہ در مکاتبات بکار آید" اس کے بعد ہے آہنگِ چہارم بعنوان: خطب کتب و تقاریظ و عبارات متفرقہ" اور پھر آہنگِ پنجم "مکاتبات" پر مشتمل ہے۔

اسی ترتیب کو نظر میں رکھ کر اور پنج آہنگ کے دیباچہ نگار اور مرتب میرزا علی بخش رنجور کے اس بیان کی بنیاد پر "چون در آن ایام دیوان فیض عنوان کہ مسمی بہ "میخانہ آرزو سرانجام است تازہ فراہم آمدہ و پیرایہ اتمام پوشیدہ بود آنچہ از نثر در آن ہمایون صحیفہ صورت ارقام داشت ہمہ را بخدمت والای آن خسرو اقلیم سخنوری خواندم و بخاطر چنان گذشت کہ ہمگی نثر از دیوان برچیدہ یکجا کنم و عبارات متفرقہ دیگر بآن ربط دہم و سواد اور اقی کہ نزد من است ضمیمہ آن سازم۔ لاجرم این ارادہ صورت ظہور گرفت و سازِ سخنے مشتمل بر پنج آہنگ آراستہ شد" یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ کتاب کے مندرجہ بالا تین آہنگ ۱۲۴۱ھ (۲۶-۱۸۲۵ء) میں بھرت پور کی دوسری یورش (دسمبر ۱۸۲۵ء تا ۱۶ جنوری ۱۸۲۶ء) کے موقع پر مرتب ہو چکے تھے، جس کے بعد ۱۲۵۱ء (۱۸۳۵ء) میں غالب کا فارسی دیوان مرتب ہوا ہے دو آہنگ بڑھا دیے گئے جو غالب کی مختلف فارسی نگارشات اور فارسی خطوط پر مشتمل ہیں۔

دراصل پنج آہنگ کی اولین تدوین میں آہنگوں کی ترتیب یہ نہ تھی جو مطبوعہ نسخوں میں ہے۔ اولین تدوین وہ ہے جو ہمیں ۱۸۳۵ء اور ۱۸۴۰ء کے قلمی نسخوں میں ملتی ہے اور جس میں آہنگوں کی ترتیب یہ ہے:

۱- نثرہای داخل دیوان

۲- نثرہای خارج از دیوان

۳- القاب و آداب

۴- مصادر و مصطلحات و لغات

۵- اشعارِ مکتوبی

اس اولین ترتیب کو نظر میں رکھ کر رنجور کے اس جملے پر غور کیا جائے "ہگی نثر از دیوان برچیدہ یکجا کنم و عبارات متفرقہ دیگر بآن ربط دہم و سواد اوراقے کہ نزد من است ضمیمۂ آن سازم" تو واضح ہو جاتا ہے کہ مختلف نثری نگارشات اور خطوط "ضمیمہ" نہیں ہیں بلکہ:

۱- القاب و آداب ۲- مصادر و مصطلحات و لغات اور ۳- اشعار مکتوبی

ان تین آہنگوں کے لئے لفظ "ضمیمہ" استعمال ہوا ہے۔ ان میں سے "القاب و آداب والا آہنگ جسے رنجور نے "ضمیمہ" کے نام سے تعبیر کیا ہے مسلّم طور پر ۱۸۲۵ء سے پہلے جیسا کہ سمجھا جاتا ہے موجود تھا۔ یہ وہی آہنگ ہے جسے ۱۸۲۵ء کی تصنیف اور کتاب کی بنیاد مانا گیا ہے۔ رنجور نے اپنے دیباچے میں مندرجہ بالا اقتباس سے پہلے کی سطور میں اسی آہنگ کے بارے میں بتایا ہے "حسب الالتماس من ورقے چند از آداب و القاب و شکر رسید خطوط و شکوۂ عدم رسی مکاتبات رقم فرمودہ بمن عطا نمود"

خود غالب نے بھی آداب و القاب والے حصے کے آغاز میں جو مطبوعہ نسخوں میں آہنگِ اول کے عنوان سے درج ہے کہا ہے: "در عرض سہ روز سواد این اوراق بپایان می رسد" ہمارے استنباط کے مطابق صرف یہی ایک آہنگ تین دن میں لکھا گیا تھا نہ کہ تینوں آہنگ (جو مطبوعہ نسخوں میں شروع کے آہنگ ہیں) جیسا کہ اب تک کہا گیا ہے۔

دوسرا آہنگ اس کے کچھ مدت بعد مرتب ہوا۔ اس دوسرے آہنگ کے آغاز میں غالب نے جو کچھ لکھا ہے اس سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس آہنگ کی نگارش کے وقت غالب کا قیام ریگستانی علاقے میں تھا، لیکن اس بات میں "عرض سہ روز" کسی قسم کا کوئی اشارہ ہے، نہ ایسا کوئی قرینہ موجود ہے جس سے معلوم ہو کہ یہ آہنگ بھی عرض "سہ روز" کے تحت آتا ہے۔ "ریگستانی علاقے" کا حوالہ بتا رہا ہے کہ یہ آہنگ بھرت پور میں نہیں جو دوآبے میں واقع ہے بلکہ فیروز پور میں لکھا گیا جو

ریگستانی علاقے میں ہے۔

تیسرے آہنگ کے ۱۸۳۵ء سے پہلے مرتب ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ اس کے علاوہ اس آہنگ میں یہ بات بھی اب تک مجہول یا مبہم رہی ہے کہ رنجور کے اس جملے میں "ہگی نثر از دیوان برچیدہ یکجا کنم" "ہگی نثر" سے کون سی نگارشات مراد ہیں۔ اب تک یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ یہ وہی نثر ہے جو دیوانِ فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء کے شروع میں درج ہے یا کچھ کلیاتِ نظم فارسی مطبوعہ ۱۸۶۳ء کے شروع میں یعنی "دیباچہ" اور کچھ آخر میں یعنی "تقریظ" ۔ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ پنج آہنگ کے ۱۸۳۵ء اور ۱۸۴۰ء کے قلمی نسخوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ نگارشات وہ ہیں جو ان نسخوں میں "نثرہای داخلِ دیوان کرامت نشان" کے عنوان سے آہنگ اول میں درج ہیں۔ ان کے عنوان حسب ذیل ہیں :

۱۔ دیباچۂ دیوان فارسی
۲۔ دیباچۂ گل رعنا
۳۔ دیباچۂ دیوانِ ریختہ
۴۔ نامہ بنام نواب سید اکبر علی خاں متولی امام باڑۂ ہگلی بندر
۵۔ خاتمۂ گل رعنا
۶۔ خاتمۂ عبارت و باعث ترتیبِ دیوان فارسی
۷۔ خاتمۂ دیوانِ فارسی
۸۔ مندرجہ بالا نمبر ۷ کے آخر میں علی بخش خاں رنجور کی لکھی ہوئی چند سطریں ہیں، جو مطبوعہ نسخوں میں حذف کر دی گئی ہیں۔ یہ سطور حسب ذیل ہیں :

"بللہ الحمد کہ جامع این اوراق یعنی علی بخش سخن مشتاق ہگی نثر از دیوان قبلۂ اہل نظر جناب حضرت غالب دام برکاتہ درین اجزا نقل کرد و آہنگ اول را سرانجام داد و آمادۂ گزارش دومین آہنگ شد۔

مخفی نماند کہ نثرہای خارج از دیوان بسیار است و جمع کردن آن بر تفحص دشوار زیرا کہ دستور حضرت رضوان پناہی مدظلہ آنست کہ در مکاتبات ہرگز مسودہ نمی فرمایند و ہمچنیں قلم برداشتہ می نویسند. ناچار آنچہ سرِدست میسّر آمد، درین آہنگ رقم می پذیرد و اوراقِ سادہ گذاشتہ می شود تا بعد ازیں آنچہ دست بہم دہد نگارش یابد و نیز باحباب اجازت این معنی دادہ می آید کہ ہرچہ از عبارات غالبی در زمانہائے مختلف بنظر گذرد آنرا درین آہنگ جا دہند و بر جامع این پنج آہنگ منت نہند۔"

چنانچہ ۱۸۳۵ء کے نسخے میں خطوط کے آخر میں نو صفحے بطور بیاض چھوڑ دیے گئے ہیں۔

اس کے بعد آہنگ دوم شروع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے "نثرہای خارج از دیوان" دیوانِ فارسی کے قدیم ترین فارسی نسخے میں (جو ۱۸۳۵ء کا کتابت شدہ ہے اور جس کی مرمت اور تکمیل کی تاریخ ۲۱ جنوری ۱۸۳۸ء ہے) جو نگارشات شامل ہیں ان میں سے صرف دیباچۂ دیوانِ فارسی اور خاتمۂ دیوانِ فارسی کو دیوانِ فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء اور کلیاتِ نظمِ فارسی مطبوعہ ۱۸۶۳ء میں شامل کیا گیا اور دیباچے کے آخر میں وہ عبارت بڑھادی گئی جو مذکورۂ بالا آہنگِ اول میں جداگانہ عنوان "خاتمۂ عبارت و باعثِ ترتیبِ دیوانِ فارسی" کے تحت چھٹی نگارش تھی۔ دیباچے کو شروع میں اور خاتمۂ دیوانِ فارسی کو آخر میں رکھا گیا اور اسے تقریظ کا نیا عنوان دیا گیا۔

پنج آہنگ کے ۱۸۳۵ء کے نسخے میں آہنگ دوم کا عنوان ہے "نثرہای خارج از دیوان"۔ ۱۸۴۰ء کے نسخے میں یہ عنوان نہیں ہے، لیکن اس کے مندرجات ترتیب وار وہی ہیں، جو ۱۸۳۵ء کے نسخے میں ہیں، لیکن یہ ۱۸۴۰ء کا نسخہ، ناقص الآخر ہے اور جو اوراق غائب ہیں ان میں آہنگ دوم کے آخر کا کچھ حصہ بھی شامل ہے۔

جس طرح آہنگ اول میں متفرق عنوان کے ساتھ ایک خط بھی ہے، آہنگ

دوم میں، جس میں بیشتر خطوط ہیں، چند متفرق نثریں بھی شامل ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ عنوان: "تقریظ تذکرۂ اُردو کہ تالیف نواب مصطفیٰ خان بہادر است۔"

۲۔ عنوان: "نثرے کہ بر پشت دیوان ریختہ رقم فرمیدہ بخدمت شیخ امام بخش ناسخ فرستادہ اند۔"

۳۔ عنوان: "بفرمان نواب غلام حسین"

۴۔ "بفرمان نواب غلام حسین"

۵۔ عنوان: "تقریظ دیوان حافظ"۔

پنج آہنگ کے مطبوعہ نسخوں میں تمام متفرق نثریں یک جا کرکے آہنگ چہارم میں اور تمام خطوط الگ کرکے آہنگِ پنجم میں رکھے گئے۔

پنج آہنگ مطبوعہ ۱۸۴۹ء کے آہنگ چہارم میں حسب ذیل متفرق نثریں ہیں جو قلمی نسخوں کے آہنگ اوّل اور آہنگ دوم سے اسی ترتیب سے لی گئی ہیں جس ترتیب سے وہاں درج ہیں:

۱۔ دیباچۂ دیوانِ فارسی

۲۔ دیباچۂ گل رعنا

۳۔ دیباچۂ دیوان ریختہ

۴۔ خاتمۂ گل رعنا

۵۔ خاتمۂ دیوانِ فارسی

۶۔ تقریظ تذکرۂ اُردو تالیف نواب مصطفیٰ خان بہادر

۷۔ نثرے کہ بعنوانِ قصیدۂ مدح رقم فرمودہ اند

۸۔ نثرے کہ بر پشت دیوان ریختہ رقم نمود بہ شیخ امام بخش ناسخ فرستادہ شد

۹۔ "آرائشِ گفتار در ظہورِ ھور و نموداری صبح" (یہی عنوان ۱۸۲۵ء کے نسخے میں بھی ہے) ۱۸۴۰ء کے نسخے میں یہ عنوان نہیں ہے۔ اس کے بجائے صرف یہ الفاظ ہیں "بفرمان نواب غلام حسین"۔

۱۰- سخن در ہجوم ظلمتِ شب (یہی عنوان ۱۸۳۵ء کے نسخے میں بھی ہے) لیکن ۱۸۴۰ء کے نسخے میں نہیں۔ وہاں پھر وہی الفاظ ہیں "بفرمان نواب غلام حسین"

۱۱- تقریظ دیوان خواجہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ

۱۲- دیباچۂ دیوان میرزا رحیم الدین بہادر

۱۳- عبارت در صنعت مقطع الحروف

۱۴- از عبارت تقریظ رسالہ موارد الکلم از منشآت شیخ ابو الفضل فیضی (کذا) در صنعت تعطیل حسب گفتن ضیاء الدین احمد خان بہادر از زبان کابخش فخر الدین محمد خان در بسط نگارش در آمدہ

۱۵- دیباچۂ دیوان منشی ہرگوپال تفتہ

۱۶- تقریظ آثار الصنادید

پھر ۱۸۵۳ء کے مطبوعہ نسخے میں دو نثروں کا اضافہ ہوا:

۱- دیباچہ دیوانِ ریختہ نواب حسام الدین حیدر خان بہادر

۲- دیباچہ تذکرہ موسوم بہ طلسم راز فراہم آوردہ میر مہدی

اس کے بعد کلیاتِ نثر فارسی (مطبوعہ ۱۸۶۸ء) کی پنج آہنگ کے آہنگ چہارم میں مذکورہ مندرجات کے آخر میں ذیل کی تین نگارشوں کا اضافہ ہوا:

۱- وہ نگارش جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے "بسم اللہ الرحمن الرحیم کمال کلام وابستہ بہ"

۲- وہ نثر جس کا آغاز ہے "بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ خدای را سپاس"

۳- پھر وہ تقریظ ہے جو غالب نے مولوی ظہور علی کے تالیف کردہ تذکرہ شعرائے اردو کے لیے لکھی تھی۔

پنج آہنگ کی اولین تدوین میں رنجور کے دیباچے کے علاوہ جو توضیحات رنجور کی طرف سے تھیں یا خطوط کے جو عنوانات ایسے تھے جو ان کی طرف سے تھے وہ

کتاب کی پہلی طباعت (۱۸۴۹ء) میں خارج کر دیے گئے۔ چنانچہ بعد کی اشاعتوں میں بھی نہیں ہیں۔ پنج آہنگ کے یہ محذوفات حسب ذیل ہیں:

۱۔ پہلی تدوین کے آہنگ اول (مطبوعہ پنج آہنگ کے آہنگ چہارم) کا مختصر خاتمہ جو رنجور کی طرف سے تھا۔

۲۔ پہلی تدوین کے آہنگ دوم (مطبوعہ پنج آہنگ کے آہنگ پنجم) میں رنجور کے نام غالب کے پہلے خط کا عنوان تھا "نامہ کہ از دہلی بنام این مستہام رقم فرمودہ" اس کے بجائے یہ عنوان رکھا گیا "نامہ کہ از دہلی بنام مرزا علی بخش خان بہادر رقم شد"۔ دوسرے خط کا عنوان تھا: "رقعہ بنام جامع کتاب" جس کے بجائے "ایضاً" لکھا گیا۔

تیسرے اور چوتھے خط کے عنوانات بہ ترتیب یہ تھے: "خط بنام کمترین کہ از کلکتہ فرستادہ اند" اور "خط کہ از کلکتہ بہ عقیدت کیش نگاشتہ اند"۔

مولوی محمد صدرالدین آزردہ کے نام کے پہلے خط کا عنوان چند توضیحی الفاظ کے ساتھ یوں تھا "رقعہ بنام نامی مولوی صاحب والا مناقب مولوی محمد صدرالدین خان بہادر صدرالصدور کہ روزے جناب اخوی صاحب قبلہ بہ دولت خانہ شان تشریف بردہ بودند و حضرت مولوی صاحب بہ کچہری رفتہ بودند"۔ یہاں یہ الفاظ "اخوی صاحب قبلہ" رنجور کی طرف سے تھے۔ اس عنوان کی بجائے صرف یہ عنوان لکھا گیا "بنام مولوی محمد صدرالدین خان بہادر صدرالصدور"۔

نواب مصطفیٰ خان کے نام کے پہلے خط کے عنوان میں مکتوب الیہ کے نام کے بعد یہ توضیحی الفاظ تھے: "کہ نواب صاحب غزلے از غزل ہائے خود فرستادہ فرمائش تحریر اشعار فرمود"۔ یہ الفاظ حذف کر دیے گئے۔

پہلی تدوین (جو قلمی نسخوں میں ملتی ہے) اور دوسری تدوین (جو اولین طباعت کے لیے کی گئی) کے درمیان مذکورہ اختلافات کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ پنج آہنگ کے مرتب کی حیثیت سے رنجور کا اس کتاب سے تعلق واضح ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ

دوسری تدوین میں رنجور پسِ پردہ رہ جاتے ہیں اور کتاب اب غالب کی طرف سے مرتب ہو کر شائع ہوتی ہے، البتہ رنجور کا دیباچہ رہنے دیا گیا ہے۔

آہنگوں کی اولین ترتیب بھی جس کی تفصیل شروع میں بیان ہو چکی ہے۔ غالب نے دوسری تدوین میں بدل دی اور مکتوب الیہم کے ناموں کے ساتھ کے القاب میں جزوی تبدیلیاں کیں۔ اس کے علاوہ ان خطوں اور نگارشوں کا بھی اضافہ کیا جو قلمی نسخوں میں درج نہیں ہیں، پہلے مطبوعہ نسخے میں ہیں اور پھر ان میں ۱۸۶۸ء کی اشاعت تک مزید اضافے کیے جاتے رہے۔ اس اشاعت کے لیے جو ۱۸۶۸ء میں ہوئی غالب نے مختصر خاتمہ لکھا تھا۔ ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۳ء کی اشاعتوں میں خاتمہ نہیں ہے۔ لیکن پنج آہنگ کا دیباچہ آخر تک وہی رنجور کا لکھا ہوا رہا۔ غالب نے پوری کتاب کا کوئی دیباچہ نہیں لکھا تھا، نہ بعد میں لکھا۔ چند سطروں کی تمہید ضرور غالب کی لکھی ہوئی ہے جو کتاب کی تمہید نہیں، آہنگِ اول کی تمہید ہے جو آہنگِ اوّل کی تصنیف کے ساتھ لکھی ہے۔

اس تمہید میں سببِ تالیف بیان کرتے ہوئے غالب نے لکھا ہے "درسال یک ہزار و دوصد و چہل و یک ہجری کہ گیتی ستانان انگلشیہ بر بھرت پور لشکر کشیدہ و آن روئین دژ را درمیان گرفتہ اند من دریں یورش با جناب مستطاب عالی مقدار فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ دام اقبالہٗ و زاد افضالہ رفیقم و وگرامی برادر ستودہ خوی مرزا علی بخش خان بہادر ہمسفر است۔ روزانہ بر رفتار ہمقدیم و وشبانہ بیک خیمہ فرود می آئیم۔ برادر والا قدر کہ سیمای سعادتمندی و فروغِ دانش جوی دارد از من آرزو کرد کہ القاب و آدابِ متعارف و رسمیہ بروی ہم ریختہ و الفاظ شکر و شکوہ و شادی و غم باہم آمیختہ برائے نامہ نگاران دستور العمل موجزی ساختہ آید۔"

اس تمہید کا اختتام ان جملوں پر ہوتا ہے: "دریں پردہ آرائشِ سخن نمی کنیم و خواہش سائل سرانجام می دہم۔ در عرض سہ روز سواد ایں اوراق بہ پایان می رسد و پیش از شروع در مقصود گفتہ می شود" اس کے بعد آہنگ اوّل کی اصل عبارت

شروع ہوتی ہے ۔ تمہید کے اختتامی الفاظ جو فعلِ حال کے ساتھ ہیں اور پھر بیان کا انداز صاف بتا رہا ہے کہ یہ تمہید آہنگِ اول کی تصنیف کے کچھ دن بعد نہیں، اسی موقع پر لکھی گئی جب آہنگ اوّل لکھا گیا ہے اور اس طرح اس کی نگارش کی تاریخ وہی ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۵ء) ہے جو غالب نے تمہید میں درج کی ہے ۔

اس کے مقابل عیسوی سال ۲۶-۱۸۲۵ء ہے اور سال ۱۲۴۱ھ کا آغاز ۱۲ ماہ اگست ۱۸۲۵ء سے ہوتا ہے، اس لیے جیسا کہ جناب غلام رسول مہر نے اپنے مقالے "پنج آہنگ" (رسالہ آج کل، دہلی فروری ۱۹۵۸ء) میں بتایا ہے انگریزوں کی یہ لشکرکشی جس کے موقع پر غالب بھی ساتھ تھے اور ان کا قیام بھرت پور کے مقام پر لشکر کی خیمہ گاہ میں تھا وہ ہے جو دسمبر ۱۸۲۵ء میں ہوئی تھی اور چند ہی دن میں یعنی ۱۶ جنوری ۱۸۲۶ء کو انگریزوں نے بھرت پور لے لیا تھا"

"پنج آہنگ کی تالیف پہلی مرتبہ ۱۸۳۵ء میں ہوئی ۔ "آہنگ اوّل اور آہنگ دوم" کی تالیف کے وقت پانچ آہنگوں کا تصور نہ رنجور کے دیباچے میں ملتا ہے نہ غالب کی تمہید میں، بلکہ "آہنگِ اول" کی اس تمہید میں تو لفظ "آہنگ" بھی نہیں آتا۔ البتہ دوسرے آہنگ کے آغاز میں یہ لفظ پہلی مرتبہ ملتا ہے ۔ پنج آہنگ کا منصوبہ غالب کے سفرِ کلکتہ سے واپسی کے بعد کی چیز ہے ۔ کلکتہ میں قتیل کے شاگردوں اور پیرووں نے غالب کے کلام پر اعتراضات کے ضمن میں قتیل کی تصنیف "چار شربت" کے حوالے دیے تھے ۔ کچھ بعید نہیں کہ غالب نے "چار شربت" کے مقابل "پنج آہنگ" کا منصوبہ بنایا ہو ۔" (دیباچہ، پنج آہنگ، وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲-۲۱)

پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور میں "پنج آہنگ" طبع دوم (اپریل ۱۸۵۳ء) کے دو نسخے میری نظر سے گزرے ہیں ۔ ایک ناقص الآخر کیفی کلکشن میں جس کا نمبر ہے : Pi KX 4B ۔ یہ نسخہ صفحہ ۲۴۰ تک ہے ۔ اس کے بعد کے صفحات ضائع ہو گئے ہیں ۔ اس کے سرورق پر "بعلم کیفی" برجموہن دتاتریہ کیفی ۔ لاہور ۱۶ جولائی ۲۴ء درج ہے ۔ دوسرا شیرانی کلکشن میں ہے : Pi SX 6D یہ نسخہ بھی ناقص ہے ۔

اس میں صفحہ ۳۲۰ تا ۳۲۴ (چار صفحات) ندارد ہیں۔ (نسخۂ کیفی میں یہ صفحات محفوظ) لیکن شیرانی کلکشن کا یہ نسخہ بوجوہ اہم ہے۔ اس کے سرورق پر "میر سرفراز حسین" کی دو مہریں ثبت ہیں (پیمائش ۹×۱۰ سوت)۔ مہر پر سنہ ہجری بھی کندہ ہے جو پڑھا نہیں جاتا۔ آخری صفحے (ص ۳۴۳) پر "خاتمۃ بالخیر" کے جلی الفاظ کے بعد بائیں طرف نیچے کونے میں ایک سرخ مہر ہے "عنایت حسین" کی (پیمائش ۱۳×۱۲ سوت)۔ دائیں جانب بغلی حاشیے میں اوپر سے نیچے (عموداً) ایک جلی قلمی تحریر ہے: "اور جس پر مہر نہیں وہ کتاب چوری کی ہے"۔ اسی آخری صفحے کی دائیں جانب بغلی حاشیے میں ایک سیاہ مہر ۸×۹ سوت کی ثبت ہے اس کی قطع اور اسم و سنہ یہ ہے:

قلب احمد علی ۱۲۹۶
علی احمد از

اس نسخے کے سرورق سے متصل ایک دبیز سادہ بادامی کاغذ مطبوعہ اصل سے الگ لگا ہوا ہے جس پر یہ عبارت درج ہے:

> "کتاب ہذا بقیمت حکا۔ روپیہ خریدہ شد در مقام پانی پت ۳۰ ذی الحجہ ۱۲۷۴ ہجری"

۳۰ ذی الحجہ ۱۲۷۴ ہجری مطابق ہے، ۱۰ اگست ۱۸۵۸ء کے۔ گویا یہ نسخہ اشاعت کے پانچ سال چار ماہ بعد پانی پت میں خریدا گیا۔ خریدار کون تھا، قطعیت سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ میر سرفراز حسین ہو سکتے ہیں، جن کی مہریں اس نسخے کے سرورق پر ثبت ہیں اور ۱۸۵۸ء میں جن کا پانی پت میں ہونا ثابت ہے۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ:

> "۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اہلِ دہلی شہر سے نکلے تو مجروح، اپنے بھائی سرفراز حسین اور میرن کے ساتھ پانی پت چلے گئے، جہاں انصاریوں کے محلے میں جو خواجہ حالی کا محلہ تھا، کئی برس تک مقیم رہے ..."

(خطوطِ غالب، جلد اول، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۹ء ص ۳۲۲)

"پنج آہنگ" کی مستقل اور جداگانہ کتابی اشاعتیں (اگست ۱۸۴۹ء اور

اپریل ۱۸۵۳ء) کے بارے میں غالب کا اپنا تأثر لطف سے خالی نہ ہوگا۔ ۱۱ دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں منشی شیو نرائن آرام کو لکھتے ہیں:

"..... پنج آہنگ تم نے مول لے لی، اچھا کیا۔ دو چھاپے ہیں، ایک بادشاہی چھاپے خانے کا اور ایک منشی نورالدین کے چھاپے خانے کا۔ پہلا ناقص ہے، دوسرا سراسر غلط ہے۔"

صاحب عالم کے نام ایک خط میں غالب نے "پنج آہنگ" (مطبوعہ) کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

"..... چھاپے کی پنج آہنگیں اب بھی بکتی ہیں؛ ور معیوب، یہ دو عیب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو بعد انطباع، از قسم نثر، تحریر ہوا ہے، وہ اس میں نہیں۔ دوسرے یہ کہ کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کو دی ہے کہ میرا جی جانتا ہے۔ اگر کہوں کہ کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اغراق ہے۔ بے مبالغہ یہ ہے کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں۔

"پنج آہنگ کی اشاعت اوّل (۱۸۴۹ء) کے نسخے نہایت کمیاب ہیں اس کا منظوم اشتہار، اسعد الاخبار، آگرہ ۱۲ مارچ ۱۸۴۹ء میں چھپا تھا..... غلام نجف خان جن کے نام سے یہ اشتہار ہے، غالب کے شاگرد تھے (خطوط، ۲۶۴، ۲۳۲)۔ لیکن یہ تلمذ ظاہراً فارسی پڑھنے تک محدود تھا۔ شاعر کی حیثیت سے ان کا ذکر کہیں نظر نہیں آیا۔ اشتہار غالب کی طرز میں ہے اور قریب بہ یقین ہے کہ انہیں کا لکھا ہوا ہے۔ غالب کے لیے خودستائی کوئی نئی بات نہیں، اور اشتہار کی تو ذمہ داری بھی اُن کے سر نہیں۔"
(قاضی عبدالودود، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء؛ آثارِ غالب ص ۵۰، ۵۱)

عرشی صاحب بھی اس اشتہار کو غالب کا زائیدۂ فکر مانتے ہیں۔ چنانچہ دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی ۱۹۵۸ء، صفحہ ۲۶۷ و بہ بعد میں ۳۳ اشعار کی یہ مثنوی (اشتہار) شامل ہے۔ اس منظوم اشتہار کے ۱۷ شعر امداد صابری صاحب نے اپنے ایک مضمون "اردو اخبارات کے ابتدائی عہد کے حالات اور مسائل" میں نقل کیے ہیں۔
(قومی زبان، کراچی، ستمبر ۱۹۶۵ء، صفحہ ۴۰)

پنج آہنگ میں سے صرف آہنگِ پنجم (خطوط) کچھ مدت کے لیے سلطنتِ آصفیہ دکن کے امتحانات علوم شرقیہ کے نصاب میں شامل رہا۔ اس لیے طلبا کی سہولت کے لیے صرف یہ حصہ ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) میں مطبع انوار الاسلام، حیدرآباد دکن میں چھپا تھا۔
(مالک رام، ذکرِ غالب، طبع چہارم، صفحہ ۱۸۲)

پنج آہنگ کے ۲۷ خطوط "رقعاتِ بینی پرشاد" کے حاشیے پر بھی شائع ہوئے ہیں۔ اس کے سرورق کی عبارت یہ ہے:

"رقعاتِ بے نظیر — مرزا نوشہ متخلص بہ غالب در حاشیہ بیدار السلطنت گوکل چند متصل حمام سیتقلی داس بہ محلہ چوڑیکوین (کذا) طبع شد ۱۸۵۲ء۔"
(فاضل لکھنوی، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، فروری ۱۹۵۲ء، صفحہ ۵۳)

اکبر علی خاں عرشی زادہ نے "نکات و رقعات" (غالب کا ایک نادر مجموعہ) مطبوعہ سری نگر ۱۹۶۲ء کے تعارف میں (صفحہ ۱۳) انشائے آنند رام مخلص کے نسخے کا ذکر کیا ہے جس کے حاشیوں پر پنج آہنگ کا، آہنگ پنجم چھپا ہے۔ یہ کتاب مطبع شمس المطابع دہلی سے ۱۸۵۲ء میں طبع ہوئی۔

اخیر عمر میں غالب نے "آہنگ دوم" کا آزاد اردو ترجمہ کیا۔ یہ رسالہ نامزد بہ "نکاتِ غالب و رقعاتِ غالب" فروری ۱۸۶۷ء میں مطبع سراجی، دہلی، سے غالب کے پندرہ فارسی رقعات کے ضمیمے کے ساتھ الگ شائع ہوا۔

غالب صدی کے موقع پر محمد عمر مہاجر نے "آہنگ پنجم" کے فارسی خطوط کا بہت اچھا اُردو ترجمہ کیا۔ یہ "پنج آہنگ" کے نام سے کتابی صورت میں ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی کی طرف سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔

★ طبع چہارم در: "کلیاتِ نثرِ غالب، مطبع نولکشور (لکھنؤ) ۱۸۷۱ء
(اس اشاعت کے آخر میں دو خطوں کا اضافہ ہے جو بظاہر صاحبِ مطبع کی جانب سے ہوا ہے۔)

اُنیسویں صدی کی بعض دوسری اشاعتیں در: کلیاتِ نثرِ غالب ؟

★ نولکشور، لکھنؤ : ۱۸۷۵ء

★ نولکشور، کانپور : ۱۸۷۵ء، ۱۸۸۴ء، ۱۸۸۸ء

ایک حالیہ علاحدہ کتابی اشاعت، مرتبہ : سید وزیر الحسن عابدی، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۹ء

مہر نیمروز

★ طبع اول : فخر المطابع، دہلی، ۲ ربیع الاول ۱۲۷۱ھ، ۲۴ دسمبر ۱۸۵۴ء
بحکم : مرزا فتح الملک غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو ولی عہد بہادر
باہتمام : حافظ عبداللہ

★ اشاعت در : "کلیاتِ نثرِ غالب" مطبع نولکشور، لکھنؤ جنوری ۱۸۶۸ء۔

سببِ تالیفِ کتاب میں غالب نے بتایا ہے کہ پنجشنبہ ۲۲۔ شعبان ۱۲۶۶ھ مطابق ۴ (جولائی)[1] ۱۸۵۰ء کو شاہی کارکن مجھے بادشاہ ظفر کے حکم سے خلعت خانے میں لے گئے اور میرے قامت کو خلعت شش پارچہ سے آراستہ کرکے سلام گاہ میں لائے دنیا و دین کے بادشاہ نے جگر گوشہ ہائے معدن یعنی جیغہ و سرپیچ میرے سر پر باندھا اور رگِ جانِ ابرِ نیساں یعنی موتیوں کی حمائل میری گردن میں ڈالی۔ نقیب مبارک سروش نے فرمانِ شاہی سنایا، غالبِ سخن سرا کو نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کے خطاب سے سرفراز کیا، اور شاہانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا فرمان میرے نام صادر ہوا۔[2]

---

[1] غالب یہاں سہواً جولائی کے بجائے "جون" لکھ گئے ہیں۔

[2] "دستنبو" (۱۸۵۸ء) کے ایک اقتباس سے اس تقرری پر کچھ مزید روشنی پڑتی ہے — "سات آٹھ سال ہوئے کہ بادشاہ دہلی نے مجھ کو بلایا اور مجھ سے فرمائش کی کہ میں تیموری خاندان کے بادشاہوں کی تاریخ لکھوں جس کے عوض چھ سو روپے سالانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ میں نے اس خدمت کو قبول کر لیا اور کام میں مشغول ہو گیا۔" (غالب اور انقلاب ستاون، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور ۱۹۷۴ء، صفحہ ۸۱)

نامہ نگار کا بھی ایسا ہی ارادہ تھا اور حکم بھی ایسا ہی ہوا کہ اس خرد افزا کتاب کا آغاز بادشاہِ رستم سرہنگ امیر تیمور سے ہو مگر اس سے پہلے کہ بادشاہِ جہان کے مبارک اسلاف کے مبارک حالات قلمبند کروں یکایک حکم صادر ہوا کہ کتاب میں ابتدائے آفرینش سے کلام کا آغاز کیا جائے اور اس تحریر میں اپنا طریقہ یہ بنائے کہ جو کچھ وزیرِ دانا، احترام الدولہ (حکیم احسن اللہ خان) اس کو بتائے، اس کے بیان کرنے کو اپنے لیے عزت سمجھے۔ اس رازگو دانشور (یعنی احترام الدولہ) نے اس کتاب میں ابتدائے افلاک سے لے کر اس والی عصر کے آستانِ سپہر نشان تک کے اسرار کی شرح بیان کی ہے۔

البتہ عقل نے مجھے یہ تعلیم دی کہ جس وقت لکھنا شروع کروں تو حالات کو دو حصوں میں لکھوں، خواہ ان دو حصوں کا، جن کا دیباچہ ایک ہی ہوگا، ملا دیں خواہ ان کی الگ الگ شیرازہ بندی کروں۔ پہلا نصف ابتدائے آفرینش سے شہنشاہِ آسمان خرگاہ، نصیر الدین ہمایوں بادشاہ کی جہاں گردی و جہانگیری تک اور دوسرا نصف آسمانِ عز و جاہ کے آفتابِ جہاں تاب، جلال الدین اکبر بادشاہ کی جہانگیری سے شہنشاہِ وقت (ظفر) کی جہاں آرائی تک۔ ہم نے اس کتاب کو پرتوستان کے نام سے موسوم کر کے پہلی نگارش کا نام "مہر نیمروز" اور دوسری نگارش کا "ماہِ نیم ماہ" رکھا ہے اور جہاں کہیں فصل واقع ہوگی تو اس کو اندازِ جداگانہ کے ساتھ پرتو سے تعبیر کیا جائے گا۔" (مہر نیمروز، اردو ترجمہ: سید عبدالرشید فاضل، کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۸ و بعد)

تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور ہونے کے چار برس بعد ۱۸۵۴ء میں مجوزہ کتاب "پرتوستان" کا صرف پہلا حصہ یعنی "مہر نیمروز" مرتب و شائع ہو سکا۔ دوسرا حصہ "ماہِ نیم ماہ" جس میں وہ جلال الدین اکبر سے بادشاہ ظفر تک کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہتے تھے بوجوہ معرضِ تحریر ہی میں نہ آیا، یہاں تک کہ بادشاہ ہی نہ رہے جو اس منصوبے کے سرپرست مجوز اور محرک تھے ...... حکیم محب علی کے نام ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں غالب لکھتے ہیں :

"ماہِ نیم ماہ" مانگتے ہو، یہ نہیں جانتے کہ ہو کہ وہ آسمان ہی ٹوٹ پڑا جس پہ ماہ نیم، طلوع کرتا۔ بات یہ ہے کہ جس طرح مسافر سفر میں آدھی منزل طے کر کے دم لیتا ہے، میں نے آدم سے ہمایوں تک کا حال لکھ کر دم لیا تھا۔ قصد تھا کہ اب جلال الدین اکبر کی سلطنت کا حال لکھوں گا کہ ناگاہ یہ فتنۂ عظیم حادث پیدا ہوا اور اکبر و ہمایوں کے خاندان کا نام و نشان جاتا رہا.... عرفت ربی بفسخ العزائم۔"
(غالب کی نادر تحریریں، ڈاکٹر خلیق انجم، دہلی ۱۹۹۱ء، ص ۵۳)

یہاں چودھری عبدالغفور سرور کے نام، غالب کے ایک خط کا اقتباس بھی بے محل نہ ہوگا:

"اکثر صاحب، اطراف و جوانب سے "ماہِ نیم ماہ" بھیجنے کا حکم بھیجتے ہیں اور میں جی میں کہتا ہوں کہ جب "مہرِ نیمروز" کی عبارت کو نہیں سمجھے تو "ماہِ نیم ماہ" کو لے کر کیا کریں گے۔ صاحب! "مہرِ نیمروز" کے دیباچے میں میں نے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام "پرتوستان" ہے اور اس کی دو مجلد ہیں۔ پہلی جلد میں ابتدائے خلقتِ عالم سے ہمایوں کی سلطنت تک کا ذکر ہے دوسرے حصے میں اکبر سے بہادر شاہ ظفر تک کی سلطنت کا بیان۔ پہلے حصے کا نام "مہرِ نیمروز"، دوسرے کا اسم "ماہِ نیم ماہ"۔ بارے پہلا حصہ تمام ہوا، چھاپا گیا، جا بجا پہنچا۔ قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا کہ امیر تمر تک کا نام و نشان مٹ گیا۔ "آں دفتر را گاؤ خورد، گاؤ را قصاب برد، و قصاب در راہ مُرد۔" جو کتاب میں نے لکھی ہی نہ ہو، وہ بھیجوں کہاں سے؟[1]"

ان ہی چودھری عبدالغفور سرور نے "عودِ ہندی" کا دیباچہ لکھتے ہوئے "ماہِ نیم ماہ" کو منجملہ تصانیفِ غالب شمار کیا ہے:

---

[1] خطوطِ غالب، مہر، جلد ۲، ص ۵۵۹

"---- ابوالفضل نثر پردازی میں بے ہمتا ہے مگر یہ برگ و ساز کہاں! چنانچہ "مہرِ نیمروز" کی تابش اور "ماہِ نیم ماہ" کی نمائش اور "دستنبو" کی خوشبو و رنگینی، "قاطع برہان" کے دلائل کی دل نشینی شاہدِ مدّعا ہے۔"

سرور کا یہ دیباچہ، غالب کی اصلاح کے بعد چھپا ہے یعنی بنظرِ تعمّق ان کا دیکھا ہوا ہے اور، اس پر سرور نے غالب سے داد بھی پائی ہے۔ سرور کے نام اپنے ایک خط میں غالب لکھتے ہیں کہ:

"آپ نے دیباچہ بہت اچھا لکھا ہے۔ کتاب کو اس سے رونق ہو جائیگی"

آفاق حسین آفاقی دہلوی نے اچھا نکتہ اٹھایا ہے کہ "عودِ ہندی" مرزا کی زندگی میں شائع ہو گئی تھی، مرزا نے اس کا دیباچہ صرف دیکھا ہی نہیں تھا بلکہ اس کی داد بھی دی تھی۔ اگر مرزا نے "ماہِ نیم ماہ" نہیں لکھی تھی تو اس کی تردید کیوں نہ کی گئی؟ ممکن ہے مرزا نے مصلحت اندیشی سے کام لے کر اس کے چند قلمی نسخے خاص خاص احباب کو بھیج دیے ہوں، کیونکہ اس زمانے میں "ماہِ نیم ماہ" کا شائع ہو جانا مرزا کے مفاد کے خلاف تھا۔ بہرحال ابھی یہ امر تحقیق طلب ہے۔"[۱]

اس سے قطع نظر کہ ماہِ نیم ماہ لکھی گئی یا نہیں اور مصلحت اندیشی اس کی اشاعت میں مانع آئی، یہ ثابت ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد غالب، کم از کم "مہرِ نیمروز"

---

[۱] نادراتِ غالب، کراچی، ۱۹۴۷ء، حصہ اوّل، ص ۶۲

کی اشاعتِ ثانی کو اپنے مفاد کے خلاف ضرور سمجھتے تھے۔ غالب کے شاگرد اور مطبع مفید خلائق، آگرہ کے مالک منشی شیو نرائن آرام نے، جنہوں نے ۱۸۶۳ء میں غالب کا اُردو دیوان شائع کیا، نومبر ۱۸۵۸ء میں "دستنبو" کی اشاعت سے فرصت پاکر، غالب سے "مہرِ نیم روز" اور "ماہ نیم ماہ" میں التماس کرتے ہوئے اس کو چھاپنے کی تحریک اور پیش کش کی۔ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب جواباً شیو نرائن کو سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں :

"مہرِ نیم ماہ" نہیں، اس کا نام "مہرِ نیم روز" ہے اور وہ سلاطینِ تیموریہ کی تواریخ ہے، اب وہ بات ہی گئی گزری۔ بلکہ وہ اب چھپانے کے لائق ہے، نہ چھپوانے کے قابل۔"

منشی نبی بخش حقیر کے نام غالب کے خطوں (مشمولہ: "نادراتِ غالب" مرتبہ و متعارفہ: آفاق حسین آفاق) سے "مہرِ نیم روز" کے بارے میں بے حد قیمتی معلومات میسّر آتی ہیں، تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ملاحظہ کیجیے: "نادراتِ غالب" صفحہ ۸، ۹، ۱۱، ۱۷، ۱۸، ۲۳، ۲۵، ۲۸، ۲۹، ۳۴، ۹۳ اور ۸۴ ـ

"مہرِ نیم روز" طبع اوّل (فخر السلطان دہلی، دسمبر ۱۸۵۴ء) کے کتابیاتی کوائف مولانا غلام رسول مہر نے یہ بتائے ہیں :

"اس کے کل ۱۱۶ صفحے ہیں۔ ہر صفحے میں ۲۱ سطریں اور ہر سطر میں قریباً اکیس لفظ ہیں۔ سرورق کے پہلے صفحے پر کتاب کا نام ہے۔ دوسرے صفحے سے کتاب شروع ہو کر ۱۱۳ صفحے پر ختم ہو جاتی ہے۔ صفحہ ۱۱۴ اغلاط نامہ کے لیے وقف ہے۔ بقیہ دو صفحوں میں نواب ضیاء الدین احمد خان کی منظوم تقریظ اور تاریخ طباعت ہے۔ سرورق کی پیشانی پر ولی عہد بہادر کی مہر کا نقشہ ہے۔" (غالب، طبع چہارم، ص ۴۱۵)

پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور کے آزاد کلکشن میں مندرجہ بالا کوائف پر مبنی "مہرِ نیم روز" کا ایک نسخہ موجود ہے (دیکھیے کیٹلاگ نمبر: APeI - 28) لیکن

یونیورسٹی لائبریری ہی کے شیرانی کلکشن میں "مہر نیم روز" کا ایک مختلف نسخہ (کیٹلاگ نمبر: SPE 1-13) ، آزاد کلکشن کے نسخے سے اچھے اور روشن خط میں موجود ہے۔ اس کا متن صفحہ ۱۱۲ پر ختم ہو گیا ہے۔ صفحہ ۱۱۳ کا مذکور ہی نہیں۔ صفحہ ۱۱۴ پر "غلط نامہ" ہے جس کی پشت (صفحہ ۱۱۵) بالکل خالی ہے ، یعنی نیّر درخشاں کی منظوم فارسی تاریخ انطباع شامل نہیں ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ "غلط نامہ" مندرجات کے اعتبار سے ہو بہو وہی ہے جو آزاد کلکشن والے ایڈیشن میں شامل ہے ! شیرانی کلکشن کے نسخے میں تاریخ طباعت کا کہیں ذکر نہیں جبکہ آزاد کلکشن والے نسخے میں بصراحت سالِ طباعت ۱۲۷۱ھ درج ہے۔

دونوں نسخے ، سرورق کی اطلاع کے مطابق : در فخر المطابع باہتمام بندۂ درگاہ حافظ عبد اللہ بہ پیرایہ انطباع جلوہ گر شد"۔ دونوں نسخوں کے سرورق پر "مہر دفتر خاص ولی عہد بہادر ۱۲۶۸ھ" ثبت ہے ، لیکن سرورق کی جدولیں مختلف ہیں گو مصور (خدا بخش نامی) ایک ہی ظاہر کیا گیا ہے۔ سرورق کی پشت سے اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے ۔ شیرانی کلکشن کے نسخے کا پہلا صفحہ بیل دار جدولوں سے مرصّع ہے لیکن آزاد کلکشن کے نسخے میں یہ اہتمام نہیں ہے۔

میرا قیاس یہ ہے کہ "مہر نیم روز" کا پہلا ایڈیشن جلد نکل گیا۔ "اطراف و جوانب" کی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے فوراً بعد اسے پھر چھاپنا پڑا ۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ غالب کی زندگی ہی میں ان کی اجازت کے بغیر یا مابعد، کسی دوسرے مطبع سے "مہر نیم روز" کا جعلی ایڈیشن شائع کیا گیا اور اسے "مطابق طبع اول" رکھنے کی کوشش کی گئی ، لیکن پوری طرح اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

"مہر نیم روز" کا ایک خطی نسخہ[۱] مجھے جناب خلیل الرحمٰن داؤدی (لاہور) کے

---

۱ (الف) "مہر نیم روز" کے ایک مخطوطے کا تعارف' سید قدرت نقوی نے کرایا ہے ، دیکھیے:
ماہِ نو ، کراچی جنوری فروری ۱۹۶۹ء ، صفحہ ۲۶۹ - ۲۷۱
(ب) "مہر نیم روز" کے ایک خاص نسخے کا تعارف (جسے غالب نے والیٔ ٹونک کی خدمت میں بطور
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ہاں دیکھنے کو ملا۔ یہ نسخہ ۹۹ اوراق پر مشتمل ہے (بقدرِ قلیل ناقص الآخر)۔ کاغذ بہت خستہ ہے جس سے کہنگی کے آثار ظاہر ہیں۔ چمڑے کی جلد ہے جسے دیمک نے بہت کچھ چاٹ لیا ہے۔ تاریخِ کتابت شروع اور اخیر میں کہیں درج نہیں۔ ایک دیمک زدہ کاغذ کے پرزے پر موجود اندراج سے، جو جلد کے اندرونی رُخ چسپاں ہے، یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اس کی کتابت معاصر ہے۔ اندراج یہ ہے:

"(فرد انتخاب معافی موضع سیرام پور کمبوہان علاقہ جگادری
ضلع انبالہ بابت سال ۱۸۵۱ء ....."

اس نسخے کے خط ایک سے زیادہ ہیں لیکن کسی کاتب کا سراغ نہیں ملتا۔ ابتدائی حصہ، خصوصیت سے صفحۂ اول کے حواشی بخطِ غالب معلوم ہوتے ہیں۔ ان حواشی کی عبارتیں مطبوعہ سے مختلف ہیں۔ ایک حاشیہ، مطبوعہ کے مقابلے میں زیادہ ہے یعنی "مہرِ نیمروز" (مطبوعہ) میں یہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ اس لیے یہاں ان حواشی کو درج کیا جاتا ہے:

۱۔ جیغہ جیغہ کردن : نوعِ از آرائش است کہ تار ہائے زرین را ریز ریز کردہ بر ہر دو ابرو می فشانند [۵]

(بقیہ حاشیہ از گزشتہ صفحہ)

نذرانہ بھیجا اور جس کے حاشیوں پر بعض لغات کے معنی غالب کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے ہیں اور کئی جگہ کتابت وطباعت کی تصحیح کی گئی ہے) سید جمیل الدین نے کرایا ہے، دیکھیے :

۱۔ نوائے ادب بمبئی جلد ۲ شمارہ ۳، جولائی ۱۹۵۱ء

۲۔ نوائے ادب بمبئی جلد ۲ شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۵۱ء

۳۔ نوائے ادب بمبئی جلد ۳ شمارہ ۱، جنوری ۱۹۵۲ء، صفحہ ۵-۲۲

[۵] "مہرِ نیمروز" (مطبوعہ) میں حاشیے کے الفاظ یہ ہیں:۔
"جیغہ جیغہ کردن ابرو آنست کہ تار ہای زرینہ ریزہ ریزہ کردہ برابرو فشانند"

۲- انگاره : نقشِ ناتمام را گویند و آنرا در ہندی خاکا نامند[۱]

۳- ستاک : سین مکسور، ہندی آن کونپل[۲]

۴- شیدستان : شید بروزن عید بمعنی نور و شیدستان بمعنی نورالانوار[۳]

۵- قدر اندازانہ : آنکہ تیرے خطا نکند[۴]

۶- تیر دو کمانہ : تیرے کہ خطا کند و بہ ہدف نرسد[۵]

"کلیاتِ نثرِ غالب" (نولکشور، لکھنؤ، جنوری ۱۸۶۸ء) میں "مہرِ نیمروز" صفحہ ۱۲۳ تا ۱۸۷ شامل ہے۔ "کلیات" کے پہلے ۱۲۲ صفحات میں "پنج آہنگ" آئی ہے) صفحہ ۱۸۸ خالی ہے گو صفحے کا نمبر درج ہے۔ اس کے بعد دو صفحوں میں "فرہنگ" ہے جو پہلی بار، اسی اشاعت میں اضافہ ہوئی ہے۔ "فرہنگ" کے ان دو صفحات کو نمبر نہیں دیے گئے اور صفحہ ۱۸۹ سے "دستنبو" شروع ہو جاتی ہے۔

اُنیسویں صدی کی بعض اشاعتیں در "کلیاتِ نثرِ غالب":

- ★ نولکشور، لکھنؤ : ۱۸۷۱ء، ۱۸۷۵ء
- ★ نولکشور کانپور : ۱۸۷۵ء، ۱۸۸۴ء، ۱۸۸۸ء

بیسویں صدی کی بعض جداگانہ اشاعتیں :

- ★ نولکشور، لکھنؤ : ۱۹۱۵ء
- ★ شیخ مبارک علی، لاہور : ۱۹۲۵ء (مرتبہ : شاداں بلگرامی)
- ★ مطبع کریمی، لاہور : ۱۹۲۷ء
- ★ ایک حالیہ اشاعت : مرتبہ : ڈاکٹر عبدالشکور احسن، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۹ء۔
- ★ انجمن ترقی اردو کراچی نے ۱۹۶۹ء میں "مہرِ نیمروز" کا مکمل اردو ترجمہ مع حواشی و فرہنگ (از سید عبدالرشید فاضل) شائع کیا ہے۔

---

[۱] تا [۳] "مہرِ نیمروز" (مطبوعہ) میں علی الترتیب حاشیے کے الفاظ یہ ہیں :
۱: انگارہ، نقشِ ناتمام، ہندی آن خاکا۔ ۲: ستاک شاخِ نورستہ ہندی کونپل۔ ۳: شیدستان بمعنی نورالانوار

[۴] "مہرِ نیمروز" (مطبوعہ) میں یہ توضیحی عبارت موجود نہیں۔

[۵] "مہرِ نیمروز" (مطبوعہ) میں حاشیے کے الفاظ یہ ہیں :
"تیر دو کمانہ تیری را گویند کہ بر ہدف نشیند و خطا کند ۱۲۔"

دستنبو :

" دستنبو" غالب کی زندگی میں تین بار شائع ہوئی ۔ دو بار جداگانہ اور ایک بار "کلیاتِ نثرِ غالب" کے ساتھ۔ ان تین اشاعتوں کے کتابیاتی کوائف یہ ہیں :

۱۔ طبع اول : مطبع مفید خلائق، آگرہ، نومبر ۱۸۵۸ء
نگرانِ اشاعت : تفتہ، حقیر، مہر اور آرام
ضخامت : ۸۰ صفحات
مسطر : ۱۲ سطری

۲۔ طبع دوم : مطبع لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ، بریلی ۱۸۶۵ء
باہتمام : منشی پھندن لال
ضخامت : ۷۱ صفحات
مسطر : ۱۵ سطری

۳۔ طبع سوم در : "کلیاتِ نثرِ غالب" :
مطبع نولکشور، لکھنؤ، جنوری ۱۸۶۸ء
باہتمام : منشی نولکشور
ضخامت : ۲۳ صفحات (صفحہ ۱۸۹ تا ۲۱۲)
مسطر : ۲۹ سطری

" دستنبو" طبع اول (۱۸۵۸ء) کے سرورق پر کتاب کے موضوع اور حدِ موضوع کو ان کلمات سے ظاہر کیا گیا ہے :

"کتاب مستطاب نایاب ---- جس میں مصنف نے اپنی سرگذشت ابتدائے ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے۔"

پہلی بات تو یہ کہ غالب نے صرف "اپنی سرگذشت" ہی نہیں لکھی، بہ حیثیت اقتضائے مقام، کتاب

میں عام واقعات وحالات اور بربنائے تقریب شہر وسپاہ کی روداد بھی درج کی ہے اور دوسری بات یہ کہ اس سرگذشت کا آغاز، ۱۸۵۷ء کی ابتداء سے نہیں ہوا، بلکہ کتاب بعد تو طیہ و تمہید ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے شروع ہوتی ہے :

"میں نے گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد نثر میں لکھی ہے۔
"دستنبو" اس کا نام رکھا ہے اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے۔"
(نامۂ غالب بنام : انوار الدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اسی[1] دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل، زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگزشت لکھنی شروع کی، جو سنا گیا، وہ بھی ضمیمۂ سرگزشت کرتا گیا۔"
(چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء)

"میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی ویکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے۔"
(منشی ہرگوپال تفتہ، ۱۷ر اگست ۱۸۵۸ء)

"مئی کی گیارہویں ۱۸۵۷ء سے جولائی کی اکتیسویں ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا حال میں نے لکھا ہے۔"
(یوسف علی خاں عزیز، ۱۸۵۹ء)

---

[1] شفق کو (اوپر) لکھ چکے ہیں کہ "دستنبو" میں اپنی سرگذشت اور "مشاہدے" سے کام رکھا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ فساد شروع ہونے کے پہلے دن ۱۱ر مئی ہی سے انہوں نے گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا تھا تو پھر "مشاہدے" کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ غالب نے قلعۂ معلّیٰ کی حاضری بیک قلم ترک نہیں کی جیسا کہ والئ رامپور کے نام اُن کے ایک فارسی خط مورخہ ۲۴ر جنوری ۱۸۵۸ء سے ہویدا ہے۔ غالب کی مصلحت بیں طبیعت کے پیش نظر بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انہوں نے بیک آن ترکِ تعلق کر لیا ہوگا۔ بعض معاصر شہادتیں بھی اس امر کی موجود ہیں کہ غالب "فساد" کے ایام میں قلعے جاتے رہے ہیں۔ عبداللطیف اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں کہ: ۱۹ر رمضان ۱۲ر مئی ۱۸۵۷ء صبح کے وقت مرزا اسداللہ خاں غالب، ایوان شاہی میں آداب بجالانے کے لئے حاضر ہوئے اور زمیں بوسی سے سرخروئی حاصل کی اور ایک خرمہرہ پیش کیا۔ بادشاہ کے حکم سے ہر روز کے لئے مرتبۂ "خانہ زادی" سے بہرہ اندوز ہوئے۔" (ترجمہ، صفحہ ۱۲۳) عبداللطیف نے ۱۹ ذی الحجہ/ ۱۱ر اگست ۱۸۵۷ء کی تاریخ میں لکھا ہے کہ نجم الدولہ نواب اسداللہ خاں غالب نے ایک قصیدہ لکھ کر سنایا اور خلعت زیب تن کیا" (۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ از عبداللطیف، مرتبہ و ترجمہ خلیق احمد نظامی دہلی ۱۹۵۸ء) نیز رجوع کیجیے، غدر کی صبح شام، حسن نظامی، دہلی ۱۹۲۶ء، صفحہ ۱۶۹)

"مئی سال گزشتہ سے جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد میں نے لکھی ہے۔ یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔" (ترجمہ خاتمۂ دستنبو)

"یکم اگست (۱۸۵۸ء) تک میں نے پندرہ مہینے کا حال لکھا اور آئندہ لکھنا موقوف کیا۔"

(میر مہدی مجروح، ۸ر اگست ۱۸۵۸ء)

"میں نے بعد توطیہ و تمہید آغاز مئی ۱۸۵۷ء سے اپنی سرگزشت لکھی ہے اور بہ حیثیت اقتضائے مقام، وقائع بھی اس میں درج کیے ہیں۔" (بنام نامعلوم، ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء)

"میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا، صرف اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت لکھی ہے، تقریباً شہر و سپاہ کا بھی ذکر آگیا ہے اور وہ اپنی سرگزشت جو میں نے لکھی ہے، سو ابتدا ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے۔ شہر ستمبر میں فتح ہوا۔ اس کا بیان بھی ضمناً آگیا۔" (منشی شیو نرائن آرام، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

غالب کے خطوں میں، دوسری تصانیف کے مقابلے میں "دستنبو" کا ذکر اور اس کی اشاعت کی روداد بالتفصیل محفوظ ہے۔ اس کا ذکر سب سے پہلے ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں آیا ہے جس کے مکتوب الیہ کا نام معلوم[1] نہیں۔ غالب لکھتے ہیں:

"میں نے بعد توطیہ و تمہید آغاز مئی ۱۸۵۷ء سے اپنی اپنی سرگذشت لکھی ہے اور بہ حیثیت اقتضائے مقام وقائع بھی اس میں درج کیے ہیں۔ شیوۂ لزوم مالایلزم مرعی رکھا ہے، یعنی فارسی بے آمیزش لفظ عربی لکھی ہے اور فارسی بھی وہ فارسی قدیم کہ جس کا اب پارس کے بلاد میں نشان بھی نہیں۔ تا بہ ہندوستان چہ رسد؟ چالیس صفحے لکھ چکا ہوں۔ اتمام میں انتظار یہی ہے کہ پنسن

---

[1] رسالہ "تصویر جذبات" کے ایڈیٹر سید احمد عزیز کیفی نے اس خط کو اپنے رسالے، شمارہ فروری ۱۹۲۷ء میں شائع کیا اور لکھا کہ یہ خط ان کے جدامجد کے نام ہے لیکن اپنے دادا کا نام نہیں بتایا۔ اس رسالے سے صفدر مرزاپوری نے اس خط کو اپنی تالیف مرشد ادب (ج ۲، ص ۲۴۔۲۵) میں نقل کیا اور اس طرح یہ خط غالب کے مختلف مجموعۂ مکاتیب کا حصہ بنا۔ فاضل لکھنوی نے (اردوئے معلّیٰ، صدی ایڈیشن، ص ۹۸۹۔۹۹۰) اسے شیونرائن آرام کے نام قرار دیا ہے جو صریحاً غلط ہے، اس لیے کہ آرام سے غالب کا تعارف تفتہ کے ذریعے ہوا اور اس خط کی تاریخ تحریر کے کئی ہفتے بعد ہوا۔ بعض داخلی شہادتوں کی بنا پر مجھے یہ خط حکیم غلام نجف خاں کے نام معلوم ہوتا ہے۔ یہ جس کسی کے نام بھی ہے اُس سے غالب کی پرانی مراسلت ہے، نیا تعلق نہیں۔

کا تصفیہ ہو چکے، ملے یا جواب ملے اور میں بہر حال کسی جگہ اقامت گزیں ہو لوں، ہاں اس کے وقوع تک جو کچھ قابلِ تحریر جوانبِ اجانب سے معلوم ہوگا، وہ ناچار لکھوں گا۔ یہاں کوئی چھاپہ خانہ نہیں ہے اگر اجازت دو گے تو بعد اختتام ان اوراق کو تمہارے پاس بھیج دوں گا تاکہ ہزار جلدیں طبع ہو کر اُجڑی ہوئی قلمرو ہند میں پھیل جائیں۔"

۱۸؍ جولائی ۱۸۵۸ء تک غالب چالیس صفحے لکھ چکے تھے۔ اتمام میں انتظار یہ تھا کہ پنشن کا معاملہ طے ہو لے اور عزم یہ تھا کہ وقوع تک جو کچھ قابلِ تحریر جوانبِ اجانب سے ہوگا وہ اسے قلمبند کریں گے لیکن انہی ایام میں منشی امید سنگھ اندور والے دلی آئے، ایک دوست انہیں غالب کے ہاں لے آئے۔ انہوں نے مسودہ دیکھا اور مالی اعانت سے کتاب چھپوانے کا قصد ظاہر کیا۔ اس ہنگام رستخیز میں طباعت کا انتظام ہونا عجائبات میں سے تھا۔ غالب نے "خوبان روزگار" منشی امید سنگھ کی اس پیش کش کو غنیمت خیال کیا اور پنشن کے مقدمے کے طے پانے کا انتظار کیے بغیر اس تحریر کو علی الاطلاق ۳۱؍ جولائی ۱۸۵۸ء پر ختم کر دیا:

"منشی امید سنگھ اندور والے، دلی آئے تھے۔ سابقۂ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست اُن کو میرے گھر لے آیا۔ انہوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا (آگرہ میں)۔۔۔۔۔۔ بھائی! میں نے ۱۱؍ مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔۔۔۔۔ کیا کرتا، اگر تحریر موقوف نہ کرتا۔ منشی امید سنگھ، اندور جانے والے تھے۔ اگر ختم کر کے مسودہ، اُن کے سامنے آگرہ نہ بھیج دیتا تو پھر چھپواتا کون؟"

(بنام میر مہدی مجروح، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

مجروح کے نام ایک خط مرقومہ ۸؍ اگست ۱۸۵۸ء میں غالب لکھتے ہیں کہ:

"صاحب! ہم نے گھبرا کر اس تحریر فارسی کو تمام کیا، دفتر بند کیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے پندرہ مہینے کا حال لکھا اور آئندہ لکھنا موقوف کیا۔"

"دستنبو" کے سلسلے کا پہلا مفصل خط تفتہ کے نام ہے۔ یہ ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء کا ہے اور ان معنوں میں اہم ہے کہ اس سے "دستنبو" کے قلمی نسخہ کے کتابیاتی کوائف احاطۂ علم میں آتے ہیں اور کتاب کے انداز و اہتمامِ نگارش اور اشاعتِ کتاب کے بارے میں غالب کی توقعات اور ہدایات کا پتہ چلتا ہے:

"اب ایک اور امر سنو: میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی ویکم جولائی ۱۸۵۸ء تک

رویدادِ شہر یعنی پندرہ مہینے کا حال، نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ "دساتیر" کی
عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے، جو نظم اس نثر میں درج ہے
وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام بدلے نہیں جاتے۔ وہ عربی، انگریزی،
ہندی جو ہیں وہ لکھ دیے ہیں۔ یہی میرا خط جیسا اس رقعے میں ہے، نہ چھدرا، نہ گنجان، اوراق
بے مسطر پر اس طرح کہ کسی صفحے میں بیس سطر اور کسی میں بائیس سطر بلکہ کسی میں اکیس سطر بھی آئے
چالیس صفحے یعنی بیس ورق ہیں۔ اگر اکیس سطر کے مسطر سے کوئی گنجان لکھے تو شاید دو جزو میں آ
جائے یہاں کوئی مطبع نہیں ہے، سنتا ہوں کہ ایک ہے اس میں کاپی نگار خوش نویس نہیں
ہے۔ اگر آگرے میں اس کا چھاپہ ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو، اس تہی دستی اور بے نوائی میں
پچیس کا میں بھی خریدار ہو سکتا ہوں۔ لیکن صاحبِ مطبع، اتنے پر کیوں مانے گا اور البتہ چاہیے
کہ اگر ہزار نہ ہوں تو پانسو جلد تو چھاپی جائے۔ یقین ہے کہ پان سات سو جلد چھاپنے کی صورت
میں تین یا چار آنے قیمت پڑے، کاپی تو ایک ہی ہوگی، رہا کاغذ، وہ بھی بہت نہ لگے گا۔
لکھائی، متن کی تو آپ کو معلوم ہو گئی، حاشیے پر البتہ لغات کے معنی لکھے جائیں گے۔ یہ ہر حال
اگر ممکن ہو تو اس کا تکرار کرو اور حساب معلوم کر کے مجھ کو لکھو ——— ضرور! ضرور! ضرور!"

تفتہ نے کتاب کا مسودہ دیکھا نہیں تھا۔ غالب نے بہت کچھ لکھا۔ لیکن کانٹے کی اس بات کی وضاحت رہ گئی کہ "رودادِ شہر" کس کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے؟ یہ نئی عملداری کی تنقیص میں ہے؟ یا قلعۂ معلّیٰ کی تائید میں؟ جس سے غالب کا تعلق ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں غالب، تفتہ کو لکھ چکے تھے کہ:

"مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور دار و گیر
میں مبتلا ہیں۔"

اور یہ باز پرس اور دار و گیر افراد و اشخاص ہی سے خاص نہیں تھی۔ طباعتی ادارے اور اخبار بھی شدت اور دار و گیر کا نشانہ بن رہے تھے۔ ۱۳ جون ۱۸۵۷ء کو اخبارات پر پابندی لگا دی گئی اور اخباروں کے اُن قواعد اور قوانین کو منسوخ کر کے جو ۱۸۳۵ء سے بلا کسی ضرورتِ ترمیم کے نافذ چلے آرہے تھے اور جن کے نتیجے میں آغاز نفاذ سے مئی ۱۸۵۷ء تک کے قریب بائیس برس کے طویل عرصے میں "اخباروں کے ایڈیٹروں اور حکومت کے افسروں میں تصادم کا کوئی قابلِ ذکر

واقعہ پیش نہ آیا" ایک نیا سخت پریس ایکٹ نافذ کر دیا گیا۔ اس کارروائی کے پس پشت گورنر جنرل کا یہ ذہن اور احساس کام کر رہا تھا کہ:

"اس بات کو لوگ نہ تو جانتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں کہ گزشتہ چند ہفتوں میں دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔"
(گورنر جنرل لارڈ کیننگ، ۱۳ جون ۱۸۵۷ء)

جیسا کہ محمد عتیق صدیقی نے لکھا ہے "دارالحکومت کلکتہ جو انگریزی اور دیسی اخباروں کا بھی بہت بڑا مرکز تھا اور جو دار و گیر کی دوڑ میں بھی کسی اور علاقے سے پیچھے نہ رہا تھا۔ وہاں کے متعلق پارلیمنٹری کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ:

"بہت سے ہندوستانی اڈیٹر اس ایکٹ (پریس ایکٹ) کی زد میں آئے۔ باغیانہ مضامین چھاپنے کے جرم میں دو دربین، سلطان الاخبار اور سماچار سدھا بھرشن کے طابع و ناشر پر سپریم کورٹ میں مقدمات چلائے گئے ۔۔۔ ایک اور اخبار "گلشن نو بہار" کا چھاپہ خانہ بحق سرکار ضبط کر کے اخبار بند کر دیا گیا۔[2]"

"باغیانہ مضامین" کی اشاعت پر مقدمات چلائے جا رہے تھے، پریس ضبط ہو رہے تھے اور اخبار جبری بندش کی زد میں آ رہے تھے۔ اس پس منظر میں کسی ایسی کتاب کی طباعت و اشاعت کی ہند میں کیا گنجائش ہو سکتی تھی جو کمپنی بہادر کے حکام کی تائید میں نہ ہو۔ چنانچہ جب ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء کے مذکورہ خط میں اُستاد شاہ غالب نے تفتہ سے کہا کہ:

"میں نے ۔۔۔۔ روداد شہر یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے ۔۔۔۔ اگر آگرے میں اس کا چھاپہ ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو۔"

تو منشی ہرگوپال تفتہ جو خود بھی غالب کے شاگرد تھے، تذبذب اور مشکل میں پڑ گئے ہوں

---

[1] محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۵۷ء، صفحہ ۲۵۸

2. Natarajan : History of Indian Journalism, p. 68 also :
Barns : Indian Empire, p. 257

(بحوالہ ہندوستانی اخبار نویسی، ایضاً، صفحہ ۳۰۴)

تو عجب نہیں کہ یہ روداد' انگریز عملداری کی تنقیص میں نہ ہو؟ تازہ عاید پریس ایکٹ کی موجودگی میں از قسم "باغیانہ" کسی تحریر اور وہ بھی کتابی حجم کی تحریر کی طباعت اشاعت کے لئے کسی پریس کو آسانی سے کیوں کر تیار کیا جاسکتا تھا؟ غالباً تفتہ نے اس نوع کے اندیشوں کا اظہار کیا تو جواباً غالب نے انہیں "دستنبو" کے اوراق بھیجے اور لکھا کہ:

"چھاپنے کے باب میں جو آپ نے لکھا ہے، وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے تب جانو گے اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں، اس واسطے ہے کہ اس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نظر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ اُن کے جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کر دوں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرز تحریر کیا ہوگی؟ اور صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامطبوع ہوگا؟"

اس معنی خیز اور اطمینان بخش وضاحت کے بعد' تفتہ کے خدشات جاتے رہے اور کتاب کا مسودہ انہوں نے طباعت کے لئے مطبع مفید خلائق' آگرہ کے مالک و مہتمم منشی شیو نرائن آرام کے سپرد کر دیا:

"صاحب! عجب تماشا ہے تمہارے کہنے سے منشی شیو نرائن صاحب کو خط لکھا تھا، سو کل اُن کا خط آیا اور انہوں نے "دستنبو" کی رسید لکھی۔ ڈاک کا ہرکارہ تو اُن کے پاس لے نہ گیا ہوگا آخر تمہیں نے بھیجا ہوگا۔ یہ کیا۔ تم نے مجھ کو' اس کی رسید اور میرے خط کا جواب نہ لکھا؟ مجھے تو صورت ایسی نظر آتی ہے کہ گویا تم الگ ہو گئے ہو، کتاب مطبع میں حوالے کر دی۔"

یہ محض وہم تھا تفتہ الگ نہیں ہوئے۔ وہ کتاب کی طباعت سے تا آخر وابستہ رہے اور کتاب اُن کی نگرانی میں چھپی۔ کتاب کے مندرجات اور "اندازِ تحریر" سے تفتہ کے اطمینان کے باعث، صاحبِ مطبع نے چھاپنے سے پہلے احتیاطاً مسودۂ کتاب آگرے کے حکام کو بھی دکھایا اور کتاب حکام کے پیشگی ملاحظے کے بعد ان کی اجازت سے چھپنا شروع ہوئی:

"صاحبِ مطبع نے بشمول سعی منشی ہرگوپال تفتہ' چھاپنا شروع کیا، آگرہ کے حکام کو دکھایا' اجازت چاہی۔ حکام نے بہ کمال خوشی اجازت دی۔" (مجروح ۱ اکتوبر ۱۸۵۸ء)

اس سے پہلے ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں مجروح کو کتاب کا نام تجویز کر لینے کی اطلاع دے چکے ہیں:

"کتاب کا نام "دستنبو" رکھا گیا۔ آگرے میں چھاپی جاتی ہے۔"

انوار الدولہ شفق کے نام اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد لکھی ہے اور وہ پندرہ سطر سے چار جزو کی کتاب آگرے کو مطبع مفید خلائق میں چھپنے کو گئی ہے "دستنبو" اس کا نام رکھا ہے۔"

مجروح کے نام غالب کے ایک خط مرقومہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۸ء سے معاملت کی بعض اور جزئی تفصیلات سامنے آتی ہیں،

"میاں کیا باتیں کرتے ہو؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں، لحاف توشک کی فکر ہے، کتابیں کیا چھپواؤں گا؟ منشی امید سنگھ نے وہ نسخہ دیکھا، چھپوانے کا قصد کیا، آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا۔ اس کو میں نے لکھا۔ اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنے فی جلد قیمت ٹھہری، پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لیں، پچیس روپے چھاپے خانے میں بطور ہنڈوی بھجوا دیے ۔۔۔۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے۔"

کتاب والیٔ اندور کے اتالیق، رائے امید سنگھ کی، ان معنوں میں مالی اعانت سے چھپ رہی تھی کہ وہ پچاس جلدوں کے پیشگی خریدار ہوئے تھے جن میں سے چالیس انہوں نے غالب کو ہدیتہً دے دینا تجویز کیا تھا۔ رائے صاحب کے آگرہ پہنچنے کی اطلاع دیتے ہوئے ۲۸ اگست ۱۸۵۸ء کے خط میں غالب نے تفتہ کو ہدایت کی ہے کہ،

"تم اس رقعہ کو دیکھتے ہی اُن کے پاس حاضر ہونا اور جب تک وہاں رہیں، حاضر ہوا کرنا اور "دستنبو" کے باب میں جو ان کا حکم ہو بجا لانا، اُن کو (دستنبو) پڑھا بھی دینا اور فی جلد کا حساب سمجھا دینا۔ پچاس جلد کی قیمت عنایت کر دیں گے، وہ لے لینا، جب کتاب چھپ چکے، دس جلدیں رائے صاحب کے پاس اندور بھیج دینا اور چالیس جلدیں بموجب اُن کے حکم کے میرے پاس ارسال کرنا۔"

یکم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ ہی کو لکھتے ہیں،

"جانتا ہوں کہ تم رائے امید سنگھ سے بھی نہ ملے ہو گے، عیاذاً باللہ! میں ان سے شرمندہ رہا کہ میں نے کہا تھا کہ ہاں مرزا تفتہ "دستنبو" کو اچھی طرح پڑھا دیں گے۔"

۳۱ اگست ۱۸۵۸ء کے ایک خط بنام منشی شیونرائن میں بھی ان رائے صاحب کا ذکرِ خیر آیا ہے،

"ایک خریدار پچاس جلد کے وہاں پہنچے ہیں۔ واسطے خدا کے مرزا تفتہ سے کہیے کہ اُن کو ملیں،

یعنی امید سنگھ بہادر اندور والے، وہ چیلی اینٹ میں پولیس کے پچھواڑے رہتے ہیں۔"
تفتہ رائے صاحب سے مل لیے اور کاربراری میں کامیاب ہوئے:
"رائے امید سنگھ نے مجھ پر عنایت اور مطبع کی اعانت کی۔ حق تعالیٰ ان کو اس کارسازی اور فقیر نوازی کا اجر دے۔" (تفتہ، ۳ ستمبر ۱۸۵۸ء)
۳۱ اگست ۱۸۵۸ء کے خط میں منشی شیونرائن آرام کو کتاب کی تزئین اور تصحیح کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بات یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ کتاب دو جزو یا چار جزو کی ہو۔ چھ جزو سے کم نہ ہو مسطر دس گیارہ سطر کا ہو، مگر حاشیہ تین طرف سے بڑا رہے۔ شیرازہ کی طرف کا کم ہو۔ اس کے سوا یہ ہے کہ کاپی کی تصحیح ہو، غلط نامہ کی حاجت نہ پڑے، آپ خود متوجہ رہیئے گا اور منشی نبی بخش صاحب کو اگر کہیئے گا تو وہ بھی شریک رہیں اور مرزا تفتہ تو مالک ہی ہیں۔ کاغذ "شیورام پوری" ہو، خیر۔ مگر سفید اور مہرہ کیا ہوا اور لعاب دار ہو۔ پھر یہ کہ حاشیہ پر جو لغات کے معنی لکھے جائیں تو اس کی طرز تحریر اور تقسیم، دل پسند اور نظر فریب ہو، حاشیہ کا قلم بہ نسبت متن کے قلم کے، خفی ہو ...."

یکم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

"مجھے تو صورت ایسی نظر آتی ہے کہ گویا تم الگ ہو گئے ہو، کتاب مطبع میں حوالے کر دی اب اس کی تزئین و تصحیح سے کچھ غرض نہیں۔ پس اگر یوں ہے تو میں اس انطباع سے درگزرا۔ سیکڑوں مطالب و مقاصد رہ جائیں گے۔"

"جمعہ سوم ستمبر ۱۸۵۸ء ہنگام نیمروز" تفتہ کو ارشاد ہوتا ہے:

"صاحب! کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے اور پھر کام کیسا کہ جس میں میری جان الجھی ہوئی ہے اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلو تہی نہ کرو اور بہ دل توجہ فرماؤ ــــ میں نے ہرگز نہیں لکھا کہ عبارت دو جزو میں آجائے میں نے یہ لکھا تھا کہ عبارت اس قدر ہے کہ دو جزو میں آجائے لیکن میں چاہتا ہوں کہ حجم زیادہ ہو، لغات کے معنی حاشیے پر چڑھیں۔ اس کی روش دل آویز اور تقسیم نظر فریب ہو۔"

تصحیح پر زور اس وجہ سے تھا کہ "عبارت کا ڈھنگ نیا ہے" اور تزئین کی فکر اس لیے تھی کہ کتاب کو حکام عالی مقام کی نذر گزارنا تھا:

"مبالغہ اس کتاب کی تصحیح یوں اس واسطے کرتا ہوں کہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے اگر غلط ہو جائے تو وہ عبارت تری خرافات ہے۔ بارے بسبب التفات بھائی منشی نبی بخش صاحب کے، صحتِ الفاظ سے خاطر جمع ہے۔ متوقع ہوں کہ وہ تکلیف سہیں اور ختم کتاب تک متوجہ رہیں۔ منشی شیو نرائن صاحب نے کاپی میرے دیکھنے کو بھیجی تھی، سب طرح میرے پسند آئی۔ چنانچہ اُن کو لکھ بھیجا ہے اگر ہو سکے تو سیاہی ذرا اور بھی رنگت کی اچھی ہو۔"

(مرزا حاتم علی بیگ مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"حضرت! چار جلدیں یہاں کے حکام کو دوں گا اور دو جلدیں ولایت کو بھیجوں گا۔ اللہ اللہ کیا غفلت ہے اور کیا اعتماد ہے زندگی پر، بہر حال یہ ہوس تھی اور شاید اب بھی ہو کہ ان چھ جلدوں کی کچھ تزئین و آرائش کی جاوے، آپ اور بھائی صاحب اور ان کا فرزند رشید منشی عبداللطیف اور منشی شیو نرائن، یہ چاروں صاحب فراہم ہوں اور یہ اجلاس کونسل یہ امر تجویز کیا جائے کہ کیا کیا جائے۔"

(مرزا حاتم علی بیگ مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"خلاصہ یہ کہ ان جلدوں میں سے دو جلدیں ولایت کو جائیں گی۔ ایک جناب فیض مآب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر اور ایک آقائے قدیم لارڈ الن برا بہادر کی نذر اور چار جلدیں یہاں کے چار حاکموں کی نذر کروں گا۔"

(منشی شیو نرائن آرام، ۳۱ راگست ۱۸۵۸ء)

آرام کے نام سوم ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک غالب کو یہ علم نہیں تھا کہ "چھاپہ شروع ہو گیا یا نہیں؟ اور اگر شروع نہیں ہوا تو کیا سبب؟" اس کے دو تین روز بعد غالب کے پاس تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے۔ غالب نے ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تقطیع، شمارِ سطور، کاپی کے حسنِ ضبط، صحتِ الفاظ، غرض، قلم، خط، طرزِ تصحیح اور جدول وغیرہ پر خوشنودی کا اظہار کیا ہے اور کاغذ، کاپی کی سیاہی اور رنگت نیز جلدوں کی تزئین اور آرائش کے باب میں ضروری ہدایات دی ہیں:

"تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے ہیں۔ شاید میرے دکھانے کے واسطے بھیجے گئے ہیں، ورنہ رسم تو یوں ہے کہ پہلے صفحے پر کتاب کا نام اور مصنف کا نام اور مطبع کا نام چھاپتے ہیں اور دوسرے صفحے پر لوح، سیاہ قلم سے بنتی ہے اور کتاب لکھی جاتی ہے۔ اس کا بھی چھاپا اسی طرح ہو گا۔ غرض کہ تقطیع اور شمارِ سطور اور کاپی کا حسنِ ضبط اور الفاظ کی صحت، سب میرے پسند، صحت الفاظ کا کیا کہنا ہے واللہ بے مبالغہ کہتا ہوں کہ بھائی منشی نبی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں تو اگر اپنا تا اصل نسخے میں

سہو کاتب سے غلطی واقع ہوئی تو اُس کو بھی صحیح کر دیں گے۔ خدا کرے انجام تک یہی قلم اور یہی خط اور یہی طرزِ تصحیح چلی جائے۔ جدول بھی مطبوع ہے۔ پہلے صفحے کی صورت اور دوسرے صفحے کی لوح بھی خدا چاہے تو دل پسند اور نظر فریب ہو گی۔ کاغذ کے باب میں یہ عرض ہے کہ "فرنچ" کا غذ اچھا ہے۔ چھ جلدیں جو نذر حکام ہیں، وہ اس کاغذ پر ہوں اور باقی چاہو "شیو رام پوری" یہ اور چاہے نیلے کاغذ پر چھپواؤ اور یہ بات کہ دو جلدیں جو ولایت جانے والی ہیں، اس کاغذ پر چھاپی جائیں اور باقی شیو رام پوری یا نیلے کاغذ پر، یہ تکلف محض ہے۔ یہاں کے حاکموں نے کیا کیا ہے کہ ان کی نذر کی کتابیں، اچھے کاغذ پر نہ ہوں؟ مگر جو ایسا ہی صرف اور خرچ، زائد پڑتا ہو تو خیر، دو جلدیں اس کاغذ پر اور چار جلدیں شیو رام پوری پر ہوں باقی جلدوں میں تمہیں اختیار ہے۔ ہاں صاحب! اگر ہو سکے تو کاپی کی سیاہی ذرا اور سیاہ اور درخشندہ ہو اور آخر تک رنگ نہ بدلے۔"

لیکن خاص جلدیں جو حکام کی نذر کرنا تھیں، ایک مرحلے پر چھ کے بجائے سات ہو گئیں، ان کی تفصیل اور مرسل الیہ کے اسمار کی تفصیل مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام غالب کے ایک خط مرقومہ ۱۲ر ستمبر ۱۸۵۸ء سے معلوم ہوتی ہے:

"رات، ایک بات اور خیال میں آئی ہے لیکن چونکہ تحکّم درکار فرمائی ہے، کہتے ہوئے ڈرتا ہوں، ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ دو جلدیں طلائی لوح کی، ولایت کے واسطے تیار ہوں گی اور وہ چار جلدیں جو یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہوں گی۔ ان کی صورت یہی ٹھہری ہے کہ سیاہ قلم کی لوح اور انگریزی جلد، پھر سمجھا چاہیے کہ یہ چار جلدیں کس کس کی نذر ہیں؟ نواب گورنر جنرل بہادر، چیف کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر دہلی۔ ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی۔ یہ میری کیا بد وضعی ہے کہ جناب ایڈمنسٹن صاحب کی نذر نہ بھیجوں۔ آخر گورنمنٹ کی نذر انہیں کی معرفت بھیجوں گا۔ نہ صاحب، ایک جلد، اُن کی نذر بہت ضروری ہے آپ گنجائش نکال کر جیسی یہ چار جلدیں بنوائیں ایک اور بھی ایسی ہی بنوالیں۔ یقین ہے کہ آپ اس رائے کو پسند فرمائیں گے اور چار کی جگہ، پنج بنوالیں گے۔ یہ عرض قبول اور یہ گستاخی کہ بار بار آزار دیتا ہوں، معاف ہو۔"

کتاب کی تزئین و طباعت کی اطلاع ملی تو اشتیاقِ دید کو شاعرانہ اسلوب میں اس طرح بیان کیا:

"کتاب کا حسن کانوں سے سُنا، دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آیا ...، مگر آنکھوں کو رشک ہے کانوں پر اور کان چشمک زنی کر رہے ہیں آنکھوں پر، یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق۔ آنکھوں کو کب تک ملے گا؟"

[illegible]

سات طلائی لوح کی پرتکلف جلدوں کے علاوہ جو حکامِ عالی مقام کو نذر جانا تھیں۔ ایک مزید خاص نسخے کی فرمائش، خاص اپنے لیے صاحبِ مطبع، منشی شیونرائن سے کی گئی۔ جنہیں ۱۹؍اکتوبر کے خط میں لکھ چکے ہیں کہ "برخوردار منشی شیونرائن کو معلوم ہو کہ میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو؟ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزندِ دلبند ہو۔"

"دو جلدیں پرتکلف اور پانچ جلدیں بہ نسبت اُس کے اکم پرتکلف، میرزا حاتم علی صاحب کے عہدۂ اہتمام میں ہیں۔ اس سے ہم کو اور تم کو کچھ کام نہیں۔ وہ جیسی چاہیں بنوا کر بھیج دیں، تم ایک جلد، بس۔ زیادہ صرف کیوں کرو؟ اپنے طور پر اپنی طرف سے جیسی چاہو بنوا کر بھیج دو۔ میں تم کو اپنے پیارے ناظر بنسی دھر کی نشانی جانتا ہوں۔ اس کو تمہاری نشانی بیان کر اپنی جان کے برابر رکھوں گا۔ باقی حال، اپنے خاندان اور تمہارے خاندان کا اور باہم ملِ کر اپنا اور بنسی دھر کا بڑے ہونا سب تم کو لکھ چکا ہوں، مکرر کیا لکھوں؟"

(شیونرائن آرام، ۲۳؍اکتوبر ۱۸۵۸ء)

غالب کا اندازہ یہ تھا کہ کتاب کی طباعت اکتوبر میں انجام پا جائے گی:

"پرسوں خط تفتہ کا آیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ ("دستنبو" کا) ایک فرمہ چھپنا باقی رہا ہے۔ یقین ہے کہ اسی اکتوبر میں قصہ تمام ہو جائے"

(مجروح، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

۲۳؍اکتوبر ۱۸۵۸ء تک انہیں کتاب کے چھاپے کے خاتمے کی اطلاع نہیں ملی تھی:

"اب چھاپا تمام ہو گیا ہو گا۔ وہ پانچ اور دو سات کتابیں جو میرزا صاحب کی تحویل میں ہیں وہ، اور وہ ایک جلد جو تم نے مجھ کو دینی کی ہے، وہ سب لوح اور جلد کی درستی کے بعد پہنچ جائیں گی۔ مگر وہ چالیس سرسری جو مجھے چاہیئں ہیں، وہ تو آج کل میں روانہ کر دو، اور ہاں میری جان یہ چالیس کتابوں کا پشتارہ کیوں کر پہنچے اور محصول اس کا کیا ہو گا؟ اور یہ بھی تو بتاؤ کہ وہ دس جلدیں رائے امید سنگھ کے پاس کہاں بھیجی جائیں گی؟ میرزا تفتہ...... اُن کا اندور نہ ہونا اور پھر شاید آگرہ اور دلی کا آنا مجھ کو لکھ چکے ہیں۔"

(بنام: شیونرائن آرام، ۲۳؍اکتوبر ۱۸۵۸ء)

کتاب کا چھاپا تمام ہو چکا، اب بے تابی سے اُن کا انتظار ہے تا خاص و عام کو جابجا بھیجی جائیں:

"صاحب! کتابیں کب روانہ ہوں گی؟ دوالی بھی ہو لی۔ اگر گنگا جانے کا قصد ہو تو بھائی میری کتابیں بھیج کر جانا اور ہاں یہ میں نہیں سمجھا کہ میرزا مہر کی بنوائی ہوئی سات کتابیں بھی انہیں کے ساتھ بھیجو گے یا وہ اپنے طور پر جداگانہ روانہ کریں گے؟ وہ تم نے اپنی بنی ہوئی کتاب کا آٹھ دن کا وعدہ کیا تھا اور اس وعدے سے یہ بات تراوش کرتی تھی کہ سادہ کتابیں پہلے روانہ ہوں گی اور وہ ایک کتاب بننے کے بعد سو وہ ہفتہ بھی گزر گیا۔ یقین

ہے کہ اب وہ سب یکجا پہنچیں اور شاید کل پرسوں آجائیں۔"

(بنام: شیو نرائن، ۹ ؍ نومبر ۱۸۵۸ء)

"مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں بعد لینے منہائی سات جلدوں کے اسی ہفتے میں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ سات جلدیں کب آئیں گی؟ ہرچند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو، مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو، خدا کرے ان تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز آگے پیچھے، یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں، تا خاص و عام کو جا بجا بھیجی جائیں۔"

(بنام: حاتم علی بیگ مہر نومبر ۱۸۵۸ء)

کتاب بالآخر چھپ گئی اور غالب کے حصۂ رسد کی چالیس کتابوں میں سے تینتیس انہیں ۱۲ ؍ نومبر ۱۸۵۸ء کو مل گئیں۔ بے حد خوش ہوئے اور تفتہ کو لکھا:

"کل جمعہ کے دن ۱۲ تاریخ نومبر کی تینتیس جلدیں بھیجی ہوئی برخوردار شیو نرائن کی پہنچیں۔ کاغذ، خط، تقطیع سیاہی، چھاپا سب خوب، دل خوش ہوا، اور شیو نرائن کو دعا دی۔"

لیکن اُن کا جی، اُن سات کتابوں میں گڑا ہوا تھا۔ جن کا طلائی کام اور انگریزی جلد کے ساتھ تیار ہونا مقصود تھا۔ ۱۳ ؍ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں:

"بھائی صاحب! تینتیس کتابیں بھیجی ہوئی برخوردار منشی شیو نرائن کی۔ کل جمعہ کے دن ۱۲ ؍ نومبر کو پہنچیں کاغذ اور سیاہی اور خط کا حسن دیکھ کر میں نے از روئے یقین جانا کہ طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس بہشت بن جائیں گی، حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی۔ یہ تو سب درست۔ مگر دیکھیے کہ مجھ کو ان کا دیکھنا کب تک میسر ہو۔ آپ پر گمان تساہل کا گزرے، یہ تو کیوں کر ہو، ہاں! صحاف جلد کے بنانے کی نسبت سے میرے حق کا جلاد نہ بن جائے۔ یعنی مدت متناسب سے زیادہ دیر نہ لگائے۔ اور ہاں حضرت! کچھ ایسی پختگی ارسال کے وقت کر لیجئے گا کہ یہ پارسل آشوبِ تلف سے محفوظ رہے۔ بہت عزیز اور بہت کام کی چیز ہے۔ مجھ کو وہ ایک ایک مجلد اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ یا الٰہی! یہ خط راہ میں ہو اور وہ ساتوں کتابوں کا پارسل تیرے حفظ و امان میں مجھ تک پہنچ جائے اور یہ نہ ہو تو بھلا یہ ہو کہ اس خط کا جواب لکھیے اس میں مرقوم ہو کہ آج ہم نے کتابوں کا پارسل روانہ کیا ہے۔"

(خطوطِ غالب۔ مہر، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء، جلد ۱، صفحہ ۲۰۲)

خاص جلدیں ابھی پہنچی نہیں ہیں کہ کتاب کے سادہ نسخے تقسیم بھی ہو گئے۔ خاص نسخوں کی پل پل راہ تکی جا رہی ہے۔

"صاحب تینتیس کتابیں پہنچ گئی اور تقسیم بھی ہوگیئں۔ سات کتابیں میرزا مہر کی بھیجی ہوئی موافق اُن کی تحریر کے آج شام تک اور مطابق منشی شیونرائن کی اطلاع کے کل تک، میرے پاس پہنچ جائیں گی اور منشی شیونرائن نے اندور کی کتابوں کی روانگی کی بھی اطلاع دی ہے۔"

(بنام، تفتہ، ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء)

"دیکھیے مرزا مہر (کتابیں) کب روانہ کرتے ہیں۔ اگر بھیج چکے ہیں تو یقین ہے کہ آج یہاں آپہنچیں، آج نہ آئیں، کل آئیں۔ کل سے میں شام تک راہ دیکھتا ہوں۔"

(بنام، شیونرائن، ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء)

یہاں تک کہ ۱۹ر نومبر ۱۸۵۸ء کو وہ سات خاص مجلد بھی غالب کو مل گئے، منشی شیونرائن کو مطلع کیا:

"کل جمعہ کے دن ۱۹ر نومبر ۱۸۵۸ء کو سات کتابوں کے دو پارسل پہنچے، واقعی جیسا کہ میرا جی چاہتا تھا، اُسی روپ کی ہیں۔"

تفتہ کو لکھتے ہیں:

"کل جمعہ کے دن ۱۹ر نومبر کو سات کتابوں کا پارسل بھیجا ہوا مولانا مہر کا پہنچا۔ زبان نہیں جو تعریف کروں۔ شاہانہ آرائش ہے۔ آفتاب کی سی نمائش ہے۔"

مہر کو، ان جلدوں کی تزئین اور آرائش پر بہت ہی کھلے دل سے داد دیتے ہوئے لکھا کہ:

"کل جو جمعہ، روز مبارک وسعید تھا، گویا میرے حق میں روز عید تھا۔ چار گھڑی دن رہے، نامۂ فرحت فرجام اور چار گھڑی کے بعد، وقت شام:

سات جلدوں کا پارسل پہنچا
واہ کیا خوب، برمحل پہنچا

آدمی کو موافق اُس کی تمنا کے آرزو برآنی بہت محال ہے۔ میری آرزو ایسی برآئی کہ وہ برتر از وہم وخیال ہے۔ یہ بناؤ تو میرے تصور میں بھی نہیں گزرتا تھا۔ میں صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی، دو کی لوحیں زریں اور پانچ کی لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ! اگر تصور میں بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔ میرا مقصود یہ تھا کہ ایک کتاب مثل اُن چار کے بن جائے، نہ یہ کہ دو کتابوں کا سا رنگ دکھلائے۔"

ایک جگہ سے کتاب کی رسید آئی، ۲۷ر نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ کو اس کی اطلاع دیتے ہیں نیز یہ کہ کچھ حکام کو کتاب بھیج چکے اور کچھ اعلیٰ حکام کی نذر کے پارسل آج روانہ ہوں گے:

"ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے صاحب ہیں۔ ان کے دنوں میں ایک ملاقات میری، اُن کی ہوئی تھی۔ میں نے ایک کتاب سادہ بے جلد ان کو بھیجی تھی۔ کل اُن کا خط، مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا، بہت تعریف لکھتے تھے کہ یہ "دستنبو" پہلے اس سے کہ تم بھیجو، مطبع مفید خلائق نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمہارا خط مع کتاب کے پہنچا۔ اُن کے اس لکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ مطبع میں سے گورنر کی نذر بھی ضرور گئی ہوگی۔ کیا اچھی بات ہے کہ وہاں بھی میرے بھیجنے سے پہلے، میرا کلام پہنچ جائے گا۔ میں چیف کمشنر پنجاب کو یہ کتاب بھیج چکا ہوں اور نواب گورنر کی نذر اور ملکہ کی نذر اور سیکرٹریوں کی نذر، یہ پارسل انشاء اللہ تعالیٰ آج روانہ ہو جائیں گے، دیکھوں، چیف کمشنر کیا لکھتے ہیں اور گورنر کیا فرماتے ہیں:

تا نہال دوستی کے بر دہد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

۳۰ر جنوری ۱۸۵۹ء کے ایک خط بنام منشی غلام غوث بے خبر سے پتہ چلتا ہے، کہ صدائے بر نخواست:

"پیشگاہ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھجوایا ہے، بقلم چیف سکرتر بہادر، اس کا جواب پایا ہے۔ اب کی بار دو کتابیں بھیجیں: ایک پیش کش گورنمنٹ اور ایک نذر شاہی ہے، نہ اس کے قبول کی اطلاع، نہ اس کے ارسال سے آگاہی ہے۔ جناب ولیم میور صاحب بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی۔ ان کی بھی کوئی تحریر مجھ کو نہ آئی۔"

اگلے روز، بے خبر ہی کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ:

"پیشگاہ گورنمنٹ میں بتوسط چیف سکرتر بہادر سابق اور لفٹیننٹ گورنر بہادر حال، دو مجلد پیش کیے ہیں۔ ایک نذر گورنمنٹ اور دوسری کے واسطے یہ سوال کہ میری عزت بڑھائی جائے اور یہ مجلد حضور شہنشاہی میں بھجوائی جائے۔ رد و قبول، نفرین و آفرین، کچھ بھی نہیں۔"

جہاں تہاں سے کتاب کی رسیدیں آنے لگیں اور غالب کے لئے یک گونہ خوشی اور خوش نفسی کا سامان فراہم کرنے لگیں:

"مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غمزدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ تم کو یاد ہوگا کہ ایک "دستنبو" نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دن ہے کہ نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کا خط مقام الہ آباد سے بہ سبیل ڈاک آیا۔ وہی کاغذ افشانی، وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات، کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا۔ پنشن کے بھی ملنے کا حکم آج کل آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع پڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔"

(بنام: مجروح، ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء)

"حقیقت میری مجملاً یہ ہے کہ راہ و رسم مراسلت حکام عالی مقام سے بدستور جاری ہو گئی ہے۔ نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر غرب و شمال کو نسخہ "دستنبو" بہ سبیل ڈاک بھیجا تھا۔ ان کا خط فارسی مشعر تحسین عبارت و تبدل، صدقِ ارادت و مودت بہ سبیل ڈاک آگیا۔ پھر قصیدہ بہاریہ تہنیت و مدحت میں بھیجا، اس کی رسید آگئی۔ وہی "خان صاحب بسیار مہربان دوستان" القاب، اور کاغذ افشانی ازاں بعد ایک قصیدہ جناب رابرٹ منٹگمری صاحب لیفٹیننٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب کی مدح میں بتوسط صاحب کمشنر بہادر دہلی گیا، اس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ بتوسط کمشنر بہادر، مجھ کو آگیا۔ پنشن ابھی تک مجھ کو نہیں ملی۔"

(بنام چودھری عبدالغفور سرور، اپریل ۱۸۵۹ء)

"صاحب! بندہ نے "دستنبو" جناب اشرف الامرا جارج فریڈرک ایڈمنسٹن صاحب بہادر، لیفٹیننٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی نذر بھیجی تھی، سو اُن کا فارسی خط محررہ دہم مارچ، مشتمل بر تحسین و آفرین و اظہار خوشنودی، بطریق ڈاک آگیا۔ پھر میں نے تہنیت میں لیفٹیننٹ گورنر کی قصیدہ فارسی بھیجا۔ اس کی رسید میں نظم کی تعریف اور اپنی رضامندی پر متضمن خط فارسی، بسبیل ڈاک مرقومہ چہاردہم آگیا۔ پھر ایک قصیدہ فارسی مدح و تہنیت میں جناب رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر، دہلی بھیجا گیا تھا کل ان کا مہری خط بذریعہ صاحب کمشنر بہادر، دہلی آگیا۔ پنسن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ اسباب توقع فراہم ہوتے جاتے ہیں۔"

(بنام، مہر، مارچ، اپریل ۱۸۵۹ء)

"اسباب توقع" فراہم ہونے لگے لیکن "دستنبو" کی غایتِ تصنیف معمولی پنشن کی واگزاشت ہی نہیں تھی۔ وہ ملکہ وکٹوریہ انگلستان سے مزید خطاب و خلعت اور پنشن کے بھی اُمیدوار تھے، جس

کے لئے وہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے زمین ہموار کر چکے تھے اور ان کی گزارشات پر ضروری کارروائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قلعۂ معلّٰی سے تعلق کے بعد غالب کے:

" ۵، ۶ برس آرام سے گزرے۔ پنشن کے: سات سو پچاس روپے سالانہ، بادشاہ سے، چھ سو روپے سالانہ۔ شہزادہ ولی عہد میرزا فخرو، اُن کے شاگرد ہو گئے تھے، اُن سے چار سو روپے سالانہ ۱۸۵۴ء کے آخر آخر غالب، اس کی بھی سبیل پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ انہیں اودھ کے علم دوست اور فنکار بادشاہ واجد علی شاہ سے بندھی ہوئی رقم مل جایا کرے۔ چنانچہ وہاں سے بھی پانچ سو روپے سالانہ مقرر ہو گئے۔ اِدھر اُدھر کی ریاستوں اور قدردان امیروں کی طرف سے بھی "فتوح"، بھیج جایا کرتی تھی لیکن یہ سب کچے ٹھکانے تھے اور غالب کو جو درباروں کے رازداں اور بدلتے ہوئے حالات کے نبّاض تھے، آگے کی طرف سے کھٹکا لگا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ اس تیزی سے ڈھلتی ہوئی عمر اور صحت کے ساتھ اپنے مستقبل کی حیثیت کا پکّا بندوبست کر لینا چاہتے تھے اور اس کی خاطر انگریزی اقتدار کا خوش رکھنا اور گورنر جنرل کے دفتر میں مقام بنانا ضروری تھا۔"

" ۱۸۵۶ء کے ختم ہوتے ہوتے برطانوی اقتدار سے خود کو منوانے کی کوشش سنجیدہ ہو گئیں اور انہوں نے ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں پُر زور قصیدہ لکھ کر لندن بھیجا جس کا سارا زور حاجت روائی پر تھا اور ساتھ میں ایک عرضی بھی تھی کہ بادشاہوں کی شاعر نوازی کے چلن کے مطابق۔ مجھے بھی خطاب، خلعت اور پنشن سے نوازا جائے۔ اس قصیدے اور عرضی کی رسید اُن کو ۱۸۵۷ء کے آغاز میں لندن سے مل گئی تھی اور نہ جانے کیسی کیسی امیدیں بندھ گئی تھیں کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو شمالی ہند میں برطانوی اقتدار کے خلاف سُلگتی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔"[۵۲]

"دستنبو" میں اس کی تفصیل درج کرنے کے بعد، غالب نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ:

"اگر ہندوستان کا نظم و نسق (غدر میں) تباہ نہ ہوتا اور ناخدا ترس اور ناشکرے سپاہیوں کے ہاتھوں، عدالتیں نہ اُجڑتیں تو گلستانِ انگلستان سے ایسا فرمان صادر ہوتا، جس سے (خطاب، خلعت اور پنشن کی میری) مُرادیں پوری ہو جاتیں اور میری آنکھیں اور میرا دل" دونوں ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے۔"

"دستنبو" کے خاتمے کی عبارت سے بھی غرضِ تصنیف پر روشنی پڑتی ہے:

[۵۱، ۵۲] ڈاکٹر ظ۔ انصاری، شاعر، بمبئی، فروری مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۹۶

"کاش! میری ان تین خواہشوں یعنی: خطاب، خلعت اور پنشن کے اجرار کا حکم شہنشاہِ فیروز بخت کے حضور سے آجائے جن کے متعلق، میں نے اس تحریر میں بھی (کچھ) لکھا ہے۔ میری آنکھیں اور میرا دل انہیں کی طرف لگا ہوا ہے ـــــ اگر ملکۂ عالم کی بخشش سے میں کچھ حاصل کر لوں گا تو اس دنیا سے ناکام نہیں جاؤں گا۔"

خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام غالب کے ایک خط مورخہ ۲۱ر جنوری ۱۸۵۹ء سے "دستنبو" کی غرض تصنیف بالکل آئینہ ہو جاتی ہے:

"۷ر دسمبر ۱۸۵۶ء کا لکھا ہوا حکم وزیر اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ قصیدے کے صلے اور جائزے کے واسطے کہ جو بتوسط لارڈ (کیننگ) سائل نے بھیجا ہے، خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز ضرور ہے جو حکم صادر ہوگا، سائل کو بتوسط گورنمنٹ اس کی اطلاع دینی منظور ہے یہ حکم مورخہ ۷ر دسمبر ۱۸۵۶ء، آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں، میں نے پایا۔ فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گزرے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا۔ اب اس کتاب (دستنبو) اور دوسرے قصیدے (مشمولہ "دستنبو") کے جابجا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل، محکمۂ ولایت کو یاد دہی کرتا ہے اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔"

لیکن یہ "یاد دہی" "زود اثر" نہ رہی اور نئے انعام اور اعزاز کا تو کیا مذکور، اشاعتِ کتاب کے ایک سال بعد تک غالب کو دستورِ قدیم کی بحالی کی طرف سے بھی اطمینان نہیں تھا:

"مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی جو نئے انعام کا مستحق ہوں۔ لیکن کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستورِ قدیم کو برہم مارے۔"

(بنام، نواب محمد یوسف علی خاں، ۲۷ر نومبر ۱۸۵۹ء)

اور پھر خدا خدا کر کے پنشن مقرری مئی ۱۸۶۰ء[۱] میں کھل گئی۔ زرِ مجتمعہ سہ سالہ یکمشت پا لیا اور مارچ ۱۸۶۳ء میں پچھلے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم بھی آگیا لیکن ملکۂ انگلستان کے ہاں سے مزید خطاب و خلعت اور پنشن کی تجویز و تحریک جہاں کی تہاں رہ گئی۔

کتاب کی طباعت کے دوران میں غالب کو ایک اور سوجھی، ۲۱ر ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں مہر کو لکھتے ہیں:

۱؎ "نظر لطف بر دستنبو" ہی پنشن کے اجرار کا باعث ہوئی۔ رجوع کیجیے خط بنام میر مہدی مجروح، مارچ ۱۸۵۹ء

"ہاں صاحب! ایک بات اور ہے اور وہ محل غور ہے میں نے حضرت ملکۂ معظمہ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ ان دنوں میں لکھا ہے "تہنیت فتح ہند اور عملداری شاہی" ساٹھ بیت کا ہے۔ منظور یہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ ایک اور کاغذِ مُذَہَّب پر لکھ کر بھیجوں۔ پھر یہ خیال آیا کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی گئی ہے، یعنی چھاپا ہوئی ہے۔ اگر یہ چھ صفحے یعنی تین ورق اور چھپ کر اس کتاب کے آغاز میں شامل ہو جائیں تو بات اچھی ہے۔ آپ اور منشی نبی بخش صاحب اور مرزا تفتہ، منشی شیو نرائن صاحب سے کہہ کر اس کا طور درست کریں اور پھر مجھ کو اطلاع دیں تو میں مسودہ آپ کے پاس بھیج دوں۔ جب کتاب چھپ چکے تو یہ چھپ جائے۔ دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ چھپے بعد کتاب کے اور لگایا جائے پہلے کتاب کے، دوسری یہ کہ اس کی سیاہ قلم کی لوح الگ ہو' اور پہلے صفحہ پر جس طرح کتاب کا نام چھاپتے ہیں، اسی طرح یہ بھی چھاپا جائے کہ قصیدہ در مدح جناب ملکۂ انگلستان خلداللہ ملکہا (کذا) میرا نام کچھ ضرور نہیں، کتاب کے صفحے پر تو ہو گا۔ اس مطلب خاص کا جواب باصواب یعنی نوید قبول جلد لکھیے۔"

دوسرے دن منشی نبی بخش حقیر کو اسی مضمون کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"بھائی جان! میں نے ایک قصیدہ جناب ملکۂ معظمہ انگلستان کی مدح میں لکھا ہے۔ ساٹھ شعر ہیں، چھ صفحے یعنی تین ورق پر چھپ کر "دستنبو" سے پہلے شیرازہ میں شامل کر دیے جائیں تو کتاب کو قصیدے سے عزت، اور قصیدے کو کتاب کے سبب شہرت ہو جائے گی۔ مہتمم مطبع کو اگر کچھ تامل ہو تو ہو، ورنہ بات آسان ہے۔"

۲۹ ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط موسومہ حاتم علی بیگ مہر میں لکھتے ہیں:

"قصیدے کا شاملِ کتاب ہونا بہت ضروری ہے، پر دیکھا چاہیے کہ صاحب مطبع کو کیا منظور ہے اگر وہ کاغذ کی قیمت کا عذر کریں تو ہم پانچ سات روپے سے اور بھی ان کا بھرنا بھریں گے۔"

لیکن صاحب مطبع کی "منظوری" آ گئی، ۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کو تفتہ کو لکھا:

"صاحب! قصیدے کے چھاپے جانے کی بشارت صاحب مطبع نے مجھ کو بھی دی ہے، خدا اُن کو سلامت رکھے۔"

تفتہ نے پوچھا تھا کہ اس قصیدے کو، کتاب کا دیباچہ کیوں نہ بنا دیا جائے؟ لیکن یہ کتاب کے اِدعائے تحریر کے منافی تھا۔ کتاب کی نثر و نظم، فارسی قدیم میں تھی یعنی بے آمیزشِ لفظِ عربی اور قصیدہ فارسیٔ متعارفہ و مروجہ میں تھا۔ غالب نے ان دونوں کے اجتماع کی یہ صورت نکالی:

"قصیدے کا نثر سے پہلے لگانا، از راہِ اکرام و اعزاز ہے، ورنہ نثر میں اور صنعت اور نظم کا اور انداز ہے۔ یہ اس کا دیباچہ کیوں ہو؟ بلکہ صورت ان دونوں کے اجماع کی یوں ہو کہ سررشتہ آمیزش توڑ دیا جائے اور قصیدے کے اور "دستنبو" کے بیچ میں ایک ورق سادہ چھوڑ دیا جائے۔"

(بنام: تفتہ، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

یہ "قصیدۂ برگزیدہ" "دستنبو" طبع اوّل میں چھ صفحوں پر مشتمل ہے اور سرورق کے بعد آغازِ کتاب میں شامل ہے اور اس کے بعد نئے سرے سے صفحوں کا شمار ہوتا ہے۔

"دستنبو" طبع اوّل کے بیلدار سرورق کی سات سطری عبارت یہ ہے:

(سطر: ۱)	العلمہ طاقۃ[1]
(سطر: ۲)	کتاب مستطاب نایاب بزبانِ فارسی قدیم بے آمیزش لفظ عربی
(سطر: ۳)	تصنیف فردوسی ہند نواب اسد اللہ خاں بہادر غالب تخلص دہلوی موسوم بہ
(سطر: ۴)	دستنبو
(سطر: ۵)	جس میں مصنف نے اپنی سرگزشت ابتدای ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک
(سطر: ۶)	لکھی ہے مع قصیدہ تہنیت فتح ہند کہ وہ بزبانِ فارسی متعارفہ مروجہ ہے
(سطر: ۷)	مطبع مفید خلایق آگرہ میں واسطے افادہ خاص و عام کے بہ اہتمام شیونرائن کے چھاپی گئی

سرورق کی پہلی سطر "العلمہ طاقۃ" پر مشتمل ہے۔ یہ نسبتاً جلی قلم سے ہے اور صاحب مطبع، منشی شیونرائن آرام کی اپج ہے۔ اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب انہیں لکھتے ہیں: "العلمہ طاقۃ" شوق سے لکھو" اس کے علاوہ سرورق کی ساری عبارت جسے سات سطروں میں تقسیم کیا گیا ہے، غالب کی اپنی ترتیب اور ہدایت کے مطابق ہے۔ اس کا ابتدائی مسودہ آگرہ میں تیار ہوا تھا جس میں غالباً انگریزوں کی فتح کے مفصل حالات کی طرف بھی اشارہ تھا۔ غالب نے اسے خلافِ مضمونِ کتاب قرار دیتے ہوئے آرام کو لکھا کہ خوب ہوا جو تم نے مجھ سے پوچھ لیا ورنہ بڑی قباحت ہوتی اور مطبع پر بات آتی:

---

[1] "العلمہ" کی جگہ "العلم" چاہیئے تھا، مگر مطبع مفید خلایق کی چھپی ہوئی "دستنبو" کی لوح پر بھی العلمہ طاقۃ ہی چھپا ہوا ہے۔"

(ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، خطوطِ غالب، مالک رام، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص: ۲۲۵)

"صفحے کے آخر[1] کی دو سطریں از روئے مضمون سراسر کتاب کے مضمون کے خلاف ہیں۔ میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا۔ صرف اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت جو میں نے لکھی ہے سو ابتدائے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے۔ شہر ستمبر میں فتح ہوا، اس کا بھی بیان ضمناً آگیا۔ خوب ہوا جو تم نے مجھ سے پوچھ لیا ورنہ بڑی قباحت ہوتی۔ اب میں جس طرح سے کہوں، سو کرو۔ پہلے سوچو کہ تقسیم یوں ہے کہ تین سطریں اوپر تین سطریں نیچے اور بیچ میں ایک سطر، اس میں کتاب کا نام۔ کیوں میاں، تقسیم یوں ہی ہے؟ اب میں دوسرے صفحے پر ساتوں[2] سطریں لکھ دیتا ہوں، اس کو ملاحظہ کرو، اور میرا کہا مانو ورنہ کتاب کی حقیقت غلط ہو جائے گی اور مطبع پر بات آئے گی۔"

(شیو نرائن آرام، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

اوائل اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک دوسرے خط میں غالب نے آرام کو لکھا کہ:

"دستنبو" کے آغاز کی عبارت از روئے احتیاط دوبارہ ارسال کی ہے۔ یقین ہے کہ پہنچ گئی ہو گی اور چھاپی گئی ہو گی۔"

سرورق کی تقسیم غالب کی ہدایت کے عین مطابق ہے۔ یعنی تین سطریں اوپر، تین سطریں نیچے اور بیچ میں ایک سطر، اس میں کتاب کا نام، لیکن ۱۸۵۷ء سے پہلے "۱۱ مئی" کا ٹکڑا سرورق کی مطبوعہ عبارت سے محذوف ہے جس کی وجہ سے کتاب کی حقیقت کسی قدر غلط ہو گئی۔

"دستنبو" (طبع اوّل) کے سرورق پر مصنف کا نام "نواب اسد اللہ خاں بہادر غالب" درج ہے یہ غالب کی اپنی پسند اور ہدایت کے مطابق ہے۔ صاحبِ مطبع منشی شیو نرائن نے ایک خط کے لفافے پر "مرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا تھا۔ غالب اس سے بددل ہوئے اور یکم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں مرزا تفتہ کو لکھا کہ:

"صاحبِ مطبع نے خط کے لفافے پر لکھا ہے: "مرزا نوشہ صاحب غالب"۔ للہ غور کر دیکھتا ہے جو جملہ ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں صفحۂ اول پر بھی نہ لکھ دیں۔ آیا فارسی کا دیوان، یا اردو، یا پنج آہنگ یا مہر نیمروز

---

[1] سہواً "اردوئے معلیٰ" میں "آخر کے صفحے" چھپا ہے۔ یہ غالب کا سہوِ قلم ہے یا کاتب کی لغزش، یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ غلطی "اردوئے معلیٰ" کی پہلی طباعت سے اب تک چلی آرہی ہے۔

[2] فاضل لکھنوی کو ان سات سطروں کے ضمن میں صریح التباس ہوا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اردوئے معلیٰ، مجلس ترقی ادب لاہور، صدی ایڈیشن، ص ۴۷۱

چھاپے کی، یہ کوئی کتاب، اس شہر میں نہیں پہنچی جو وہ میرا نام دیکھ لیتے، تم نے بھی ان کو میرا نام نہیں بتایا۔ صرف اپنی نفرت، عرف سے، وجہ اس واویلا کی نہیں، بلکہ سبب یہ ہے کہ دلّی کے حکام کو تو عرف معلوم ہے مگر کلکتہ سے ولایت تک یعنی وزراء کے محکمے میں اور ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا۔ پس اگر صاحب مطبع نے "مرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا، کھویا گیا! میری محنت رائیگاں گئی۔ گویا کتاب کسی اور کی ہو گئی!"

سوم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ کو بتاکید لکھتے ہیں کہ:

"منشی شیو نرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار عرف نہ لکھیں، نام اور تخلص بس۔ اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے۔ مگر ہاں، نام کے بعد لفظ "بہادر" کا، اور "بہادر" کے بعد تخلص "اسد اللہ خان بہادر غالب"۔"

تفتہ نے پوچھا تھا کہ آیا کتاب پر نام محمد اسد اللہ خان لکھا جائے؟ نیز "مرزا" و "مولانا" و "نواب" میں سے کیا لکھا جائے؟ ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء کو جواباً لکھتے ہیں کہ:

"سنو صاحب! لفظ مبارک میم، حا، میم، دال (محمدؐ) اس کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ یعنی "محمد اسد اللہ خان" نہیں لکھا جاتا میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔ رہا "میرزا" و "مولانا" و "نواب" اس میں تم کو اور بھائی کو اختیار ہے جو چاہو سو لکھو۔"

۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں تفتہ کو کھلی چھٹی دے دی کہ "نام میرا، جس طرح چاہو لکھ دو۔" لیکن اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں خود شیو نرائن کو بڑی ملائمت سے سمجھاتے ہیں کہ:

"سنو میری جان! نوابی کا مجھ کو خطاب ہے "نجم الدولہ" اور اطراف و جوانب کے اُمراء سب مجھ کو "نواب" لکھتے ہیں، بلکہ بعض انگریز بھی۔ چنانچہ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے جو ان دنوں میں ایک روبکاری بھیجی ہے تو لفافے پر "نواب اسد اللہ خان" لکھا لیکن یہ یاد رہے کہ نواب کے لفظ کے ساتھ "میرزا" یا "میر" نہیں لکھتے۔ یہ خلاف دستور ہے۔ یا "نواب اسد اللہ خاں" لکھو۔ یا "میرزا اسد اللہ خان" لکھو اور "بہادر" کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔"

"دستنبو" (طبع اول) کا متن صفحہ ۷۹ پر ختم ہو جاتا ہے۔ آخر میں "تمام شد" کے الفاظ کے بعد یہ جملہ ثبت ہے:

"اس کتاب کو بغیر اجازت مہتمم مفید خلائق کے کوئی صاحب چھاپنے کا ارادہ نہ کریں، فقط۔"

یہ امر بھی خطوں میں زیر غور رہا ہے۔ تفتہ کے نام سوم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے،

"اَوروں کے چھاپنے کی ممانعت ضرور ہے، مگر اُسس کی عبارت کیا بتاؤں؟ صاحب مطبع اس امر کو اُردو میں آخر کتاب پر لکھ دیں ــــــــ۔ خاتمے پر ممانعت کا حکم صاحب مطبع سے لکھوا دو۔"

اس کے بعد ایک دوسرے خط میں تفتہ ہی کو لکھتے ہیں :

"بھائی تم نے بھی اور منشی شیو نرائن صاحب نے بھی لکھا۔ میں ایک عبارت لکھتا ہوں، اگر پسند آئے تو خاتمۂ کتاب میں چھاپ دو :

"نامہ نگار غالب خاکسار کا یہ بیان ہے کہ یہ جو میری سرگزشت کی داستان ہے، اس کو میں نے مطبع مفید خلائق میں چھپوایا ہے اور میری رائے میں اس کا یہ قاعدہ قرار پایا ہے کہ اور صاحبانِ مطابع جب تک مجھ سے طلب رخصت نہ کریں، اپنے مطبع میں اس کے چھاپنے کی جرأت نہ کریں"۔ اس کے سوا اگر کوئی طرح کی تحریر منظور ہو تو منشی شیو نرائن صاحب کو اجازت ہے کہ میری طرف سے چھاپ دیں۔ یہ پہلے بھی لکھ چکا ہوں"۔

چنانچہ غالب کی "میں" زدہ عبارت کے بجائے "مہتمم مفید خلائق" کی جانب سے ممانعت کا وہ مختصر اور مؤثر جملہ چھاپا گیا، جو اُوپر نقل ہوا ہے۔

"دستنبو" (طبع اوّل) میں آخری صفحے ۸۰ پر دو قطعاتِ تاریخ ہیں۔ ایک آغازِ کتاب کا، اور دوسرا انجامِ کتاب کا :

۱۔ قطعۂ تاریخ

آغازِ کتاب از میرزا حاتم علی بیگ مہر تخلص سلمہ اللہ تعالیٰ

اسد اللہ خان غالب مہر ‏ ‏ جُنبد از درقمِ چہ دستنبو

نامہ خود سالِ خویش داد نشان ‏ ‏ یدِ بیضا ستم چہ دستنبو

۱۸۵۷ء

۲۔ قطعۂ تاریخ

انجام کتاب از میرزا تفتہ سلمہ اللہ تعالیٰ

کتابی زد رقم غالب کہ آنرا ‏ ‏ بجان و دل جہانی گشت طالب

نوشتم تفتہ سالِ اختتامش ‏ ‏ بیا بنگر چہ دستنبوی غالب

۱۸۵۸ء

ان قطعات کا ذکر بھی خطوں میں موجود ہے۔ میرزا مہر کو ان لفظوں میں قطعۂ تاریخ پر داد اور اصلاح دی ہے:

"بندہ پرور! آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آپ کی مہر انگیز اور محبت خیز باتوں نے غم بے کسی بھلایا۔ کہاں دھیان لڑا ہے! کہاں سے "دستنبو" کی مناسبت کے واسطے "ید بیضا" ڈھونڈ نکالا ہے! آفرین!

تیسرا مصرع اگر یوں ہو تو فقیر کے نزدیک بہت مناسب ہے:

نامہ خود سال خویش داد نشان"

"دستنبو" کے مطبوعہ قطعہ تاریخ میں مصرع کی یہی روایت چھپی ہے۔ میرزا مہر کو مادۂ تاریخ کے سقیم ہونے کے بارے میں کچھ وہم رہا ہوگا۔ قطعہ موزوں کرنے سے پہلے انہوں نے اس بارے میں غالباً ایک دو بار استفسار کیا۔ ۲۹ ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں انہیں لکھتے ہیں:

"مادۂ تاریخ میں کیا برائی ہے جو تمہارے جی میں یہ بات آئی ہے کہ مجھ سے بار بار پوچھتے ہو؟ مادہ اچھا ہے، قطعہ لکھو اور خاتمہ کتاب پر لگا دو۔ ایک قطعہ مرزا صاحب (تفتہ) کا، ایک قطعہ تمہارا، یہ دونوں قطعے رہیں اور اگر وہاں کوئی اور صاحب شاعر ہوں تو وہ کہیں۔ اس عبارت سے یہ نہ سمجھنا کہ روئے سخن ساری خدائی کی طرف ہے، بلکہ خاص یہ اشارہ بھائی (نبی بخش حقیر) کی طرف ہے مولانا حقیر کو توجہ اس باب میں چاہیئے اور ان کا نام بھی اس کتاب میں چاہیئے۔"

۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں تفتہ کو بھی لکھا ہے کہ:

"بھائی میرزا تفتہ! ایک قطعہ میرزا صاحب (حاتم علی بیگ مہر) کا، ایک قطعہ تمہارا، بلکہ ایک حقیر سے بھی لکھواؤ۔"

لیکن حقیر کا کوئی قطعہ "دستنبو" میں شامل اشاعت نہیں۔ اس طرح ان کا نام تو جیسا کہ غالب چاہتے تھے، کتاب میں نہیں آسکا۔ لیکن اس کتاب کے سلسلے میں ان کا نام، ان معنی میں ناگزیر ہے کہ کتاب کی کاپیاں پڑھنے، تصحیح کرنے اور غلطیاں بتانے کی سراسر ذمہ داری، ان ہی کی رہی۔

"کاپی کی تصحیح ہو، غلط نامے کی حاجت نہ پڑے، آپ خود متوجہ رہیئے گا اور منشی نبی بخش صاحب کو اگر کہیئے گا تو وہ بھی شریک رہیں گے۔"

(بنام شیو نرائن، ۳۱ اگست ۱۸۵۸ء)

"صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے ۔ اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے ۔ بارے بہ سبب التفات بھائی منشی نبی بخش صاحب کے، صحتِ الفاظ سے خاطر جمع ہے ۔ متوقع ہوں کہ وہ تکلیف سہیں اور ختمِ کتاب تک متوجہ رہیں۔"

(بنام حاتم علی بیگ مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"کاپی کی تصحیح کا ذمّہ بھائی (نبی بخش حقیر صاحب) کا ہو گیا ہے ۔ جلدوں کی آراستگی کا ذمہ برخوردار عبداللطیف کا کر دو ۔ میری طرف سے دعا کہو اور کہو کہ تصحیح بھائی کریں، تزئین تم کرو ۔ بھتیجے کی دستکاری اور صناعی اور ہوشیاری ان کی، میرے کس دن کام آئے گی۔"

(بنام ہرگوپال تفتہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"بھائی نبی بخش صاحب کی شفقت کا حال پوچھنا ضروری نہیں ۔ مجھ پر مہربان اور حسنِ کلام کے قدردان ہیں ۔ اس کی تصحیح میں بے پروائی کریں گے تو کیا میری تفضیح (رسوائی) کے روادار ہوں گے ؟"
(بنام تفتہ، مابین سوم و ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"صحتِ الفاظ کا کیا کہنا ہے، واللہ بے مبالغہ کہتا ہوں کہ بھائی منشی نبی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں تو اگر احیاناً اصل نسخے میں سہوِ کاتب سے غلطی واقع ہوئی تو اس کو بھی صحیح کر دیں گے خدا کرے انجام تک یہی طرزِ تصحیح چلی جائے۔"

(بنام تفتہ، ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"بھائی صاحب (منشی نبی بخش حقیر) کو کاپی کی تصحیح سے فراغت ہو گئی ؟ بھائی صاحب کو بعد از سلام کہیے گا کہ حضرت اپنے مطلب کی تو مجھ کو جلدی نہیں ہے ۔ آپ کی تخفیفِ تصدیع چاہتا ہوں، یعنی اگر کاپی کا قصہ تمام ہو جائے تو آپ کو آرام ہو جائے۔"

(بنام تفتہ، ۱۶ اکتوبر ۱۸۵۸ء)

غرض یہ کہ کاپی کی تصحیح کا ذمہ منشی نبی بخش حقیر کا تھا اور وہ اس میں پورے اُترے کہ "دستنبو" غلط نامے کی حاجت سے بے نیاز رہی ۔ گو دو تین غلطیاں

پھر بھی رہ گئیں[1]" اور یہ کوئی ایسی بات نہیں اس لئے کہ مولانا غلام رسول مہر کے لفظوں میں :

> "ہمارے ہاں طباعت کے انتظامات ابھی تک اس اعلیٰ پیمانے پر نہیں پہنچ سکے کہ صحتِ متن کے متعلق فارغ البالی کا وثیقہ حاصل کر لیا جائے[2]"۔

غالب نے "دستنبو" کو بزبانِ فارسیِ قدیم لکھنے کا ادّعا کیا ہے، یعنی التزام یہ رکھنا چاہا ہے کہ تمام کی تمام عبارت خواہی نظم ہو، خواہی نثر جو متنِ کتاب میں آئے بے آمیزشِ لفظِ عربی ہو۔ "دستنبو" طبعِ اول کے سرورق پر اپنے اس کمالِ فن کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے :

> "کتابِ مستطاب نایاب بزبانِ فارسی قدیم، بے آمیزشِ لفظِ عربی"

کتاب کی اشاعت سے پہلے مختلف خطوں میں، فارسیِ قدیم کی خود اختیاری قید کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے :

> "فارسی، بے آمیزش لفظ عربی لکھی ہے اور فارسی بھی وہ فارسی قدیم کہ جس کا اب پارس کے بلاد میں نشان نہیں، تا بہ ہندوستان چہ رسد؟"
>
> (بنام : نامعلوم، ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء)

> "التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے، جو نظم اس نثر میں درج ہے، وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے، وہ عربی، انگریزی، ہندی، جو ہیں، وہ لکھ دیے ہیں۔"
>
> (بنام منشی ہرگوپال تفتہ، ۱۷ر اگست ۱۸۵۸ء)

> "میں نے گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی رُوداد نثر میں بعبارتِ فارسی ناآمیختہ بہ عربی لکھی ہے۔ "دستنبو" اس کا نام رکھا ہے۔"
>
> (بنام : انور الدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

کتاب چھپ جانے کے بعد لکھتے ہیں :

---

[1] : نامۂ غالب بنام شیو نرائن، مرقومہ ۱۹ر اپریل ۱۸۵۹ء

[2] (الف) اردوئے ادب، علی گڑھ، شمارہ ۳، ۱۹۷۰ء، صفحہ ۱۰۶

(ب) نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، صفحہ ۲۱۴

"بطریق لزوم مالایلزم، اس کا التزام کیا ہے کہ بزبانِ فارسی قدیم، جو دساتیر کی زبان ہے، اُس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اسمار کے کہ وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغت عربی اس میں نہ آوے۔"
(بنام: چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء)

"نثر فارسی زبانِ قدیم میں ہے کہ جس میں کوئی لفظ عربی نہ آوے۔"
(بنام: یوسف علی خاں عزیز، ۱۸۵۹ء)

کتاب کی طباعت کے دوران میں غالب کو احساس ہوا کہ وہ ایک عربی لفظ "نہیب" استعمال کر گئے ہیں۔ یہ اُن کے ادّعائے تحریر کے منافی تھا۔ چنانچہ اُنھیں صبر کہاں، وہ بے چین ہو گئے:

"ایک اور کام، آپ کو کرنا چاہیے کہ شاید تیسرے صفحے کے آخر میں یا چوتھے صفحے کے اوّل میں یہ فقرہ ہے، اگر دردم دیگر بہ نہیب مباش بہم زند۔ "نہیب" کا لفظ عربی ہے۔ یہ سہو سے لکھا گیا ہے۔ اس کو چھیل ڈالیے گا اور اس کی جگہ "نوائے مباش" بنا دیجیے گا۔ "نہیب" کی جگہ "نوائے" کا لفظ بنا کر مجھ پر عنایت کیجیے۔"
(بنام: شیونرائن، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"بہت ضروری یہ امر ہے اور میں منشی شیونرائن صاحب کو آج صبح لکھ چکا ہوں، تیسرے صفحے کے آخر یا چوتھے صفحے کے اول یہ جملہ ہے: اگر دردم دیگر بہ نہیب مباش بہم زند، "نہیب" کی جگہ "نوائے" بنا دینا: "بہ نوائے مباش بہم زند"۔ "نہیب" لفظ عربی ہے۔ اگر یہ رہ جائے گا تو لوگ مجھ پر اعتراض کریں گے۔ تیز چاقو کی نوک سے "نہیب" کا لفظ چھیلا جائے اور اسی جگہ "نوائے" لکھ دیا جائے۔"
(بنام: تفتہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"نہیب" کے لفظ کو چھیل کر "نوائے" بنا دیا ہوگا؟"
(بنام: تفتہ مابین سوم و ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"آنکہ ہمہ را دریک دم بہ نوید لشو پدید آورد، اگر دردم دیگر بہ نہیب مباش بہم زند الخ" اس میں "نہیب" کا لفظ کچھ میری سہل انگاری سے اور کچھ سہوِ کاتب سے رہ گیا ہے۔ اس کو تیز چاقو سے چھیل کر "بہ نوائے" لکھ دینا یعنی: "بہ نوائے مباش بہم زند"۔ ضرور، ضرور، اور اس کا انتظار۔

نہ کیجیو کہ جب یہاں چھاپا آئے گا بنا دیں گے۔ نہ اصل کتاب میں غلط رہے، نہ چھاپے میں غلط ہو۔ اگر اجزائے اصل میرا میر علی صاحب کاپی نویس کے پاس ہوں تو ان کو یا بھائی نبی بخش صاحب کو یہ رقعہ دکھا کر سمجھا دینا اور بنوا دینا۔"

(بنام تفتہ، ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء)

اس واویلے کے باوجود معلوم ہوا کہ "نہیب" کی درستی نہیں ہو سکتی۔ وہ حصّہ کتاب جس میں یہ لفظ آیا ہے، چھپ چکا۔ اس پر اپنی تہیدستی کے باوجود غالب نے بہت حساس ہونے کا ثبوت دیا:

"اچھا میرا بھائی! "نہیب" والے دو ورقے چار سو ہوں، پانسو ہوں، سب بدلوا ڈالنا۔ کاغذ کا جو نقصان ہو وہ مجھ سے منگوا لینا۔ اس لفظ کے رہ جانے میں ساری کتاب نکمی ہو جائے گی اور میرے کمال کو دھبّہ لگ جائے گا۔ یہ لفظ عربی ہے۔ ہر چند مسودے میں بنا دیا تھا، لیکن کاتب کی نظر سے رہ گیا۔ "نہیب" کے نہیب سے مرا جاتا ہوں، اس کی درستی کی خبر بھیجو۔"

(بنام تفتہ، ۱۶ ستمبر ۱۸۵۸ء)

یہاں تک کہ بالآخر اس غلطی کی درستی ہو گئی:

"نہیب" کی جگہ "نوائے" "بن جانے سے خاطر جمع ہو گئی۔ بھائی! میں فارسی کا محقق ہوں۔ کاتب ان اجزا کا، جن کی رو سے کاپی لکھی جاتی ہے (یعنی غالب) فارسی کا عالم ہے، علم اس کا غیاث الدین رامپوری اور حکیم محمد حسین دکنی سے زیادہ ہے۔ تصحیح سے غرض یہ ہے کہ کاپی سراسر موافق، ان اوراق کے ہو، نہ یہ کہ فرہنگوں میں دیکھا جائے۔"

(بنام تفتہ، ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء)

لیکن اس اہتمام و کاوش، حزم و احتیاط اور "نفس مطمئنہ" کے باوجود وہ اس التزام میں تمام و کمال پورا نہیں اُتر سکے کہ "بزبان فارسی قدیم، جو دساتیر کی زبان ہے۔ اُس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اسمار کے کہ وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغت عربی اس میں نہ آوے۔" "نہیب" کی ہر قیمت پر انھوں نے صحت کر دی تھی، ـــ بایں ہمہ بعض لغات ان کی نظر سے رہ گئے۔ جن سے سیّد جمیل الدین نے اپنے ایک مقالے میں جو "دستنبو کا ایک خاص نسخہ" کے زیرِ عنوان

سہ ماہی "نوائے ادب" بمبئی کی چار اشاعتوں[۱] میں قسط وار چھپا ہے، بہت اچھی بحث کی ہے ان میں سے کچھ عربی کلمات مثلاً ماتم، زمزمہ، شرر، صاحب، قلعہ، کیسہ، غوغا، خنجر کی مثال دی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن کے بقول:

"ان میں سے بعض الفاظ بظاہر فارسی کے ہیں۔ یہاں تک کہ لفظ "خنجر" کے بارے میں تو رضا قلی ہدایت کو لکھنا بھی پڑا کہ اگرچہ در اشعار پارسی بسی مشہور است اما عربیست و دشنہ، پارسی آنست[۲]" مگر ان سب کی اصل عربی ہے۔ بہر حال ان چند مستثنیات کے سوا کتاب کی زبان وہ ہے۔ جسے میرزا غالب نے خالص فارسی سمجھا ہے اور جس کے لکھنے میں انہوں نے بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔"

(مقدمہ، دستنبو پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۸، ۲۹)

کاوش ہی سے کام نہیں لیا، اس پر جا بجا، پایسے جا فخر بھی کیا ہے:

"دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے میں آپ کو اختیار ہے، مگر یہ چار جزو کا رسالہ (دستنبو) جواب بھیجا ہے۔ اس کا دیکھنا ضرور درکار ہے۔ فارسی قدیم اور بہر حسنِ معنی اور صنعتِ الفاظ۔ بایں ہمہ ہر امر کی احتیاط اور رعایت کا لحاظ۔"

(بنام: نواب محمد یوسف علی خاں، نومبر ۱۸۵۸ء)

اس عبارت کا خط کشیدہ ٹکڑا، رکنے پر مجبور کرتا ہے اور معنویت سے بھر پور ہے۔ "ہر امر کی احتیاط اور رعایت کا لحاظ" رکھا گیا، تب ہی یہ کتاب ۱۸۵۷ء کے تازہ عائد سخت پریس ایکٹ کی موجودگی میں حکام کے پیشگی ملاحظے کے بعد چھپ سکی اور صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع، نامطبوع نہیں ہوا۔ انگریز حکام نے "بہ کمال خوشی" اس کے چھاپنے کی اجازت دی تو اسی بنا پر کہ اس کا طرزِ تحریر یک طرفہ، مدحیہ، تائیدی اور تحسینی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ "دستنبو" میں غالب بقول شخصے انگریز کی زبان سے بولے ہیں اور انہوں نے مصلحت کی قلم سے اسے لکھا ہے۔

۱۔ (الف) جلد ۶ شمارہ ۱، جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۲۱

(ب) جلد ۶ شمارہ ۲، اپریل ۱۹۵۵ء، ص ۳۷

(ج) جلد ۶ شمارہ ۳، جولائی ۱۹۵۵ء، ص ۵۱

(د) جلد ۷ شمارہ ۴، جولائی اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص ۳۱

۲۔ فرہنگ انجمن آرای ناصری، تہران ۱۲۸۸ھ

کتاب کو بالقصد اور بالاعلان فارسیٔ قدیم میں پیش کرنا بھی حکمت سے خالی نہیں تھا یہ مصلحتوں کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے۔ اس روزنامچے کو دساتیر کی جناتی زبان میں لکھ کر غالب نے دوہرا فائدہ اٹھایا۔ پہلی بات تو کمالِ فن کا اظہار تا شہبازیعنی غالب نے "دستنبو" کو اپنے اس احساس کے منہ بولتے ثبوت کے طور پر پیش کیا کہ وہ فارسی کے علم میں یکتا و یگانہ ہیں اور خالص فارسی زبان پر جیسی قدرت اور دسترس انہیں حاصل ہے، آج اُس کی نظیر اور مثال، کیا ہند اور کیا پارس، کہیں نہیں۔

اس سلسلے کی دوسری بات یہ کہ غالب جس معاشرے کے فرد تھے، وہ پرانے نظام کا حامی اور نئی عملداری سے نفور تھا۔ جمیع اہلِ ہند، کیا ہندو، کیا مسلمان، بہادر شاہ ظفر سے کسی نہ کسی درجے میں عقیدت اور محبت رکھتے تھے اور ان کے دل بادشاہ کی عزت اور عظمت سے یکسر خالی نہیں تھے۔ بہادر شاہ کی ذاتی اہلیت کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، مگر اس میں شبہ نہیں کہ "اُس کی حیثیت ایک علامت اور ایک نشانی کی تھی۔ وہ ڈوبتا ہؤا سورج سہی، لیکن وہ ایک ایسی صبح کی شام تھا جس میں ہندوستان نے اپنے سیاسی وقار اور تمدنی عظمت کے نادر جلوے دیکھے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ طاقتیں تک جو کچھ عرصے سے سلطنتِ مغلیہ کے مدِمقابل آ گئی تھیں (۱۸۵۷ء میں) بہادر شاہ کے گرد جمع ہو گئیں[۱]"

شاہ کے مقابلے میں، فرنگیوں کے لئے ہندوستانیوں کے دل میں، گو پہلے بھی کوئی جگہ نہیں تھی لیکن ۱۸۵۷ء کی دار و گیر نے اُن کے لئے دلوں میں فاصلہ بہت ہی بڑھا دیا۔ انگریز حکام کی بے جواز تحسین و تائید میں کتاب لکھنے کا نتیجہ معاشرے میں انگشت نمائی کا باعث ہو سکتا تھا۔ اس سے بچنے کے لئے غالب نے یہ سرگزشت متعارفہ اور مروجہ فارسی میں لکھنے کے بجائے فارسی قدیم میں لکھی اور فارسی بھی وہ فارسی قدیم کہ جس کا ہندوستان کا تو کیا مذکور، پارس کے بلاد میں بھی نشان نہیں رہا تھا، تاکہ کتاب کے مندرجات بیشتر اہلِ ہند کے لئے سربستہ راز رہیں۔

مختصر یہ کہ اپنے عہد کی متعارفہ اور مروّجہ فارسی کی جگہ، بعبارتِ فارسی، نا آمیختہ بہ عربی میں یہ رُوداد لکھنے میں ایک حکمت تو یہ تھی کہ اس نا... و یگانہ روشِ تحریر کو اپنے کمالِ فن کے طور پر پیش کرنا مقصود تھا اور دوسری مصلحت اس میں یہ تھی کہ معاصر اہلِ ہند کے لئے کتاب

---

[۱] خلیق احمد نظامی۔ مقدمہ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۵۸ء، صفحہ ۳۱

قفلِ ابجد ہو کر رہ جائے۔ انگریز حکام کو تو جو اس کتاب کے مخاطب تھے، بہر نوع اپنے فارسی خواں عملے کے ذریعے، اس قفل کو کھلوانا ہی تھا۔ غالب کی چال یہ تھی کہ کتاب اپنے ناآشنا طرزِ تحریر کی وجہ سے ہندوستانیوں کے لئے سربستہ راز رہے تاکہ وہ ان میں معصوم رہیں اور ہدفِ ملامت بننے سے محفوظ رہیں۔

غالب کو اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ ایک طرف انگریز حکام نے اُن کے کمالِ فن کی داد دی، پنشن کی بحالی کی سفارش ہوئی۔ عالی مقام حکام سے رہ و رسمِ مراسلت بدستور جاری ہو گئی اُن کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل ہو گئی۔ قلعۂ معلیٰ سے تعلق کی صفائی ہو گئی۔ عذرِ بے گناہی مسموع ہوا۔ اِک گونہ سکون ہوا۔ پنشن کا زرِ مجتمعہ سہ سالہ، پائی پائی مل گیا۔ آئندہ کے لئے خرخشہ نہ رہا۔ پچھلا خلعت بحال ہو گیا اور دوسری طرف کتاب اہلِ ہند میں بالعموم نہیں سمجھی گئی۔ غالب کے ایک سے زیادہ خطوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "دستنبو" اچھے اچھوں کی سمجھ سے بالا رہی۔

غالب کا احساس یہ تھا کہ "دستنبو" کی عبارت کو محض درست پڑھنا بھی بڑی بات ہے یہ آسان نہیں۔ فہمِ عبارت تو بہت دور کی بات ہے اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے اور یہ طرزِ تحریر نادر نہ سہی، بیگانہ و ناآشنا ضرور ہے اس لئے اہلِ علم و فضل بھی اس عبارت پر سے سرسری گزر سکتے ہیں:

"مبالغہ اس کتاب کی تصحیح میں اس واسطے کرتا ہوں کہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے۔ صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے، اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔"

(بنام، مرزا حاتم علی بیگ مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"یہ کتاب (دستنبو) جو مُرسل الیہ (لیفٹیننٹ گورنر صوبہ غرب و شمال) کے مطالعے میں ہے۔ قیمت کی اچھی ہے یعنی خود ملاحظہ فرما رہے ہیں اور اگر کہیں پوچھنا ہوگا تو یقین ہے کہ آپ سے پوچھیں گے۔"

(خواجہ غلام غوث بے خبر، دسمبر ۱۸۵۸ء)

"جن کو اس (دستنبو) کے دیکھنے کا حکم ہوا ہے، وہ اہلِ علم و فضل میں سے ہیں۔ لیکن یہ طرزِ تحریر ایسی نہیں کہتا کہ یہ نادر ہے، مگر بیگانہ و ناآشنا ہے۔ خدا کرے کہ وہ جو اس کی سیر کریں

مامور ہیں، ان اوراق کو بہ مشورت آپ کے دیکھا کریں اور کہیں کہیں آپ سے پوچھ لیا کریں۔"

(خواجہ غلام غوث بے خبر، دسمبر ۱۸۵۸ء)

کتاب چھپنے سے پہلے "آرام نے" دستنبو" کے بعض حصے غالباً ایلن براؤن کو سنائے تھے اور اس کا ذکر اپنے خط میں کیا۔[۲] اس پر غالب، ۲۱ راگست ۱۸۵۸ء کے خط میں آرام سے پوچھتے ہیں کہ:

"یہ جو تم نے لکھا ہے کہ صاحب نے سن کر اس کو پسند کیا، میں حیران ہوں کہ کون سا مقام تم نے پڑھا ہوگا، کیوں کر کہوں کہ صاحب اس عبارت کو سمجھے ہوں گے؟ اس کی جو حقیقت ہو ــــ مفصل لکھو۔"

ــــ

اس کی تفصیل پہلے آچکی کہ اندور کے رائے امید سنگھ کی دل چسپی اور مالی اعانت سے "دستنبو" کا ڈول ڈالا ــــ مولانا غلام رسول مہر کے بقول[۱] "رائے امید سنگھ نے دہلی کالج میں تعلیم پائی پھر مہاراجہ ہلکر والیٔ اندور کے اتالیق مقرر ہوئے۔ ہلکر نے عنانِ حکومت سنبھالی تو امید سنگھ کو مشیر الدولہ کا خطاب دیا۔" رائے صاحب کے آگرہ پہنچنے کی اطلاع دیتے ہوئے، غالب نے تفتہ کو ہدایت کی تھی کہ:

"رائے صاحب مکرم و معظم رائے امید سنگھ بہادر کے پاس حاضر ہوتا اور جب تک وہاں (آگرہ میں) رہیں، تب تک حاضر ہوا کرنا اور "دستنبو" کے باب میں جو اُن کا حکم ہو بجا لانا، ان کو پڑھا بھی دینا۔"

(۲۸ راگست ۱۸۵۸ء)

چار روز بعد کے ایک خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں کہ:

"جانتا ہوں کہ تم رائے امید سنگھ سے بھی نہ ملے ہوں گے۔ عیاذاً باللہ! میں، اُن سے شرمندہ رہا کہ میں نے کہا تھا کہ ہاں مرزا تفتہ "دستنبو" کو اچھی طرح پڑھا دیں گے۔"

(یکم ستمبر ۱۸۵۸ء)

مشیر الدولہ رائے امید سنگھ، نہ صرف یہ کہ دہلی کالج کے فارغ التحصیل تھے، بلکہ والیٔ اندور کے اتالیق بھی تھے لیکن "دستنبو" کی عبارت فہمی، غالب کے نزدیک اُن تک کے بس کی بات نہیں

۱۔ مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اول، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۴۶

۲۔ ایضاً، صفحہ ۶۳

تھی، اس لئے وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ "دستنبو" رائے صاحب کو باقاعدہ پڑھائی جائے۔

غالب نے تفتہ، مہر، آرام، حقیر اور ان کے صاحبزادے منشی عبداللطیف پر مشتمل ایک "کونسل"[1] تشکیل دے دی تھی جو آگرہ میں کتاب کی طباعت واشاعت، کتابت، تصحیح، تصحیف، تزئین اور تجلید کے لئے سرگرم عمل تھی۔ ترتیب وکتابت اور اشاعت وطباعت کی ساری جزئیات ان اصحاب کے باہم مشورے سے طے پاتی تھیں۔ ایک ایسی شہادت موجود ہے کہ یہ "کونسل" جو غالب کے بعد کتاب سے سب سے زیادہ متعلق تھی، کتاب کی "حقیقت" جاننے سے معذور رہی۔ کتاب کے سرورق کی عبارت آگرہ میں تجویز ہوئی۔ اس کا مسودہ، آرام نے غالب کے ملاحظے اور مشورے کے لئے بھیجا، جس میں کتاب کو انگریزوں کی فتح کے مفصل حالات کی حامل ظاہر کیا گیا تھا۔ غالب نے اسے خلافِ مضمون کتاب قرار دیتے ہوئے لکھا کہ:

"آخر..... کی..... سطریں از روئے مضمون سراسر کتاب کے خلاف ہیں۔ میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا، صرف اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت لکھی ہے، تقریباً شہر دسپاہ کا بھی ذکر آگیا ہے اور وہ اپنی سرگزشت جو میں نے لکھی ہے، سو ابتداء ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ر جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے شہر ستمبر میں فتح ہوا۔ اس کا بیان بھی ضمناً آگیا۔ خوب ہوا کہ تم نے مجھ سے پوچھا، ورنہ بڑی قباحت ہوتی۔ اب میں جس طرح سے کہوں، سو کرو..... میں دوسرے صفحے پر ساتوں سطریں لکھ دیتا ہوں اس کو ملاحظہ کرو، اور میرا کہنا مانو ورنہ کتاب کی حقیقت غلط ہو جائے گی اور مطبع پر بات آئے گی۔"

(بنام: شیو نرائن آرام، اواخر اکتوبر ۱۸۵۸ء)

غالب، دلّی میں تھے اور کتاب آگرہ میں چھپ رہی تھی۔ نظر اور شہر سے دُور، آگرہ میں کتاب چھپنے کا باعث یہ تھا کہ دلّی میں اُن دنوں طباعت وکتابت کا انتظام تسلّی بخش رہا تھا اور نہ صحافی اور نقاشی کا:

"یہاں کوئی مطبع نہیں ہے۔ سنتا ہوں، ایک ہے، اُس میں کاپی نگار خوش نویس نہیں ہے، اگر آگرہ میں اس کا چھاپا ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو۔"

(بنام: تفتہ، ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء)

"میرزا تم بڑے بے درد ہو، دلّی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا۔ بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔

---

[1] خطوطِ غالب، ایضاً، صفحہ ۷۰، ۷۶، ۱۹۲، ۱۹۵ وغیرہ وغیرہ۔

یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں، صحاف اور نقاش کہاں؟ شہر آباد ہوتا تو میں آپ کو کیوں تکلیف دیتا؟ یہیں سب درستی میری آنکھوں کے سامنے ہو جاتی۔"

(بنام، تفتہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء ہنگام نیمروز)

کتاب اپنی نظر اور اپنے شہر سے دُور چھپ رہی تھی، ایک قباحت ــــــ پھر یہ کہ بوجوہ غالب کتاب کی خوبصورت، صحیح اور جلد تر اشاعت کے متمنی تھے اس ضمن میں "روز" ہی انہیں کوئی نہ کوئی فکر لاحق ہو جاتی تھی اور کسی نہ کسی تجویز، وضاحت اور ہدایت یا استفسار کی ضرورت پیش آجاتی تھی ۲۲ ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب، حقیر کو لکھتے ہیں:

یہ ہم، تم اور میرزا تفتہ میں مراسلت، گویا مکالمت ہو گئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اللہ! یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط لکھے گئے ہیں۔ مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا تو لفافے بناؤں گا۔ غنیمت ہے کہ "محصول آدھ آنہ ہے" ورنہ باتیں کرنے کا مزا معلوم ہو جاتا!"

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا، غالب نے آگرہ میں جہاں کتاب زیرِ طبع تھی، میرزا ہرگوپال تفتہ، مرزا حاتم علی بیگ مہر، منشی شیو نرائن آرام، منشی نبی بخش حقیر اور اُن کے صاحبزادے منشی عبداللطیف پر مشتمل ایک "کونسل" قائم کر دی تھی۔ ایک سرسری اندازے کے مطابق "دستنبو" کی تجویز (جولائی ۱۸۵۸ء) سے اس کی اشاعت (نومبر ۱۸۵۸ء) تک کی تہائی سال کی مدت میں غالب نے "کونسل" کو چالیس پینتالیس خط لکھے، لکھے یقیناً اس سے بہت زیادہ، لیکن محفوظ اتنے ہی رہ سکے۔

اِس مراسلتِ ہر روزہ نے وہ مواد فراہم کر دیا جس نے آگے چل کر "عودِ ہندی" اور پھر "اُردوئے معلیٰ" کی خشتِ اول کا کام کیا۔ تھوڑی سی مدت میں ایک جگہ، ایک حلقے میں غالب کے بہت سے خط جمع ہو گئے۔ غالب کا جی کتاب کی اشاعت میں گڑا ہوا تھا۔ اس لیے اشاعتِ کتاب کے سلسلے کے یہ خط بڑے پُر زور ہیں اور کھلے دل سے لکھے گئے ہیں۔ مکتوب الیہم کے حق میں جو نسبتاً کم نام اصحاب تھے، غالب کی یہ تحریریں، سرٹیفکیٹ کا درجہ رکھتی تھیں۔ انہوں نے اسے اپنی بڑی پونجی خیال کیا، انہیں احتیاط سے رکھا اور اس کی اشاعت کی طرف دھیان دیا۔ ان کی اشاعت میں مکتوب الیہم کو اپنی شہرت کا پہلو بھی دکھائی دیا ہو تو تعجب نہیں۔ اس طرح کچھ ان خطوں کا حُسنِ ذاتی اور کچھ اپنے کو نامور بنانے کی شخصی اور فطری کمزوری، اس خیال کا باعث ہوئی کہ انہیں چھاپا جائے۔ چنانچہ جب نومبر ۱۸۵۸ء کے پہلے ہفتے میں آرام "دستنبو" کی طباعت سے

فارغ ہوئے تو انہوں نے خطوطِ غالب چھاپنے کی فکر کی۔ غالب کے لئے یہ قطعی نئی اور زائد بات تھی۔ انہوں نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے بڑے واضح لفظوں میں شیو نرائن آرام کو لکھا کہ :

"اُردو کے خطوط، جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا کہ میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلافِ طبع ہے۔"

یہ ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء کا خط ہے۔ اُردو خطوں کی اشاعت کی، اس تجویز میں منشی ہر گوپال تفتہ بھی شیو نرائن کے شریک تھے اور پسند کرتے تھے کہ خط ضرور چھاپے جائیں۔ ۲۰ر نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے تفتہ کو لکھا کہ :

"رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلافِ رائے ہے۔"

اسی روز یعنی ۲۰ر نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک دوسرے خط میں غالب نے اپنے پچھلے خط کے حوالے سے شیو نرائن کو لکھا کہ :

"رقعوں کے چھاپنے کے باب میں ممانعت لکھ چکا ہوں۔ البتہ اس باب میں میری رائے پر تم کو اور میرزا تفتہ کو عمل کرنا ضرور ہے۔"

آرام اور تفتہ کی یہ تحریک، تجویز جسے ۱۸۵۸ء میں زائد بات کہہ کر جھٹک دیا گیا تھا۔ ٹھیک دس برس بعد ۱۸۶۸ء میں "عودِ ہندی" کے نام سے حقیقت بن کر اُبھری اور اس کی خوشبو چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ "عودِ ہندی" بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی اور اس کے بعد غالب کے اُردو مکاتیب کی جمع و ترتیب کے کام کا ایک تار بندھ گیا، جس کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں عہدِ موجودہ تک چلا آتا ہے لیکن جب بھی اس سلسلے کے آغاز کی جستجو کی جائے گی، بات "دستنبو" تک پہنچے گی۔ "دستنبو" کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

منشی شیو نرائن، کتاب باہتمام چھاپ تو رہے تھے لیکن کم و بیش ہر طابع کی طرح، انہیں یہ فکر بھی رہی ہو تو کچھ عجب نہیں کہ کتاب پڑی ہی نہ رہ جائے۔ تفتہ نے اس طرف توجہ دلائی یا خود غالب کا دھیان اس طرف گیا۔ صورت خواہ کچھ بھی رہی ہو، ۱۶ر ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں تفتہ سے پوچھتے ہیں :

"ہمارے منشی شیو نرائن صاحب اپنے مطبع کے اخبار میں اس کتاب کے چھاپے کا اشتہار کیوں نہیں چھاپتے تاکہ درخواستیں خریداروں کی فراہم ہو جائیں؟"

اشتہار، اور اس کے مضمون کی طرف اشارہ شیو نرائن کے ایک خط مرقومہ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں بھی ملتا ہے:

"دستنبو" کے آغاز (سرورق) کی عبارت از روئے احتیاط دوبارہ ارسال کی ہے۔ یقین ہے کہ پہنچ گئی ہو گی، اور چھاپی گئی ہو گی اور آپ نے اسی عبارت سے اشتہار بھی اخبار میں چھاپا ہو گا یا چھاپیے گا۔"

غالب کے خطوں میں ایسا کوئی حوالہ میری نظر سے نہیں گزرا کہ کتاب کا یہ مجوزہ اشتہار مطبع مفید خلایق آگرہ کے اخبار میں چھپا یا نہیں، لیکن کتاب کے چھپ چکنے کے بعد غالب کے ایک خط بنام شیو نرائن کا یہ جملہ صورتِ حال کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے:

"یہ صاحب لوگ، اطراف و جوانب سے مجھ پر فرمائشیں بھیجتے ہیں، تم سے یہ قیمت کوئی نہیں منگواتا۔"

(۴ر جنوری ۱۸۵۹ء)

غالب کے ایک خط سے "دستنبو" کی نکاسی کے بارے میں کتاب کے طابع شیو نرائن کی ایک تجویز ہویدا ہے (جو ضروری نہیں کہ برینائے تشویش ہی ہو) کہ غالب ہنری اسٹورٹ ریڈ سے جو صوبہ غرب و شمال میں محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے، "دستنبو" کی خریداری کی تحریک کریں۔ غالب نے جواباً لکھا کہ ریڈ صاحب نے مجھ سے اردو میں کتاب مرتب کرنے کی فرمائش کر رکھی ہے وہ پوری ہو تو "دستنبو" کی خریداری کے لیے لکھوں۔ غالب کے خطوں کے لفظ یہ ہیں:

"جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا۔ ان کی فرمائش ہے اُردو کی نثر، وہ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں۔"

(بنام شیو نرائن ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۸ء)

"ریڈ صاحب کے باب میں، میں نے یہ لکھا تھا کہ جب اُردو کی نثر ان کے واسطے لکھ دوں گا تو "دستنبو" کی خریداری کی خواہش کروں گا۔"

(بنام شیو نرائن، ۱۵ر دسمبر ۱۸۵۸ء)

یہاں "خریداری کی خواہش" سے مراد ہے کہ ہنری اسٹورٹ ریڈ، اپنے محکمے یعنی مدارس وغیرہ کے لیے "دستنبو" کی کچھ جلدوں کی اکٹھی خریداری کا انتظام کر دیں، نہ یہ کہ وہ "اپنے لیے" ایک نسخہ

خریدیں! اُن کے ذاتی ملاحظے کے لئے تو شیونرائن اور غالب دونوں الگ الگ "دستنبو" کا ایک ایک نسخہ ہدیہ کر چکے تھے:

"ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب تھے۔ ان کے دنوں میں ایک ملاقات، میری اُن کی ہوئی تھی۔ میں نے اب ایک کتاب سادہ بے جلد ان کو بھیجی تھی۔ کل اُن کا خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا۔ بہت تعریف لکھتے تھے اور ہاں بھئی ایک تماشا اور ہے۔ مجھ کو لکھتے تھے کہ یہ "دستنبو" پہلے اس سے کہ تم بھیجو، مطبع مفید خلائق نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمہارا خط مع کتاب کے پہنچا۔"

(بنام تفتہ، ۲۷ر نومبر ۱۸۵۸ء)

ظاہر ہے شیونرائن، کہ "دستنبو" کے ناشر تھے، جائز طور پر اس بات کی فکر میں تھے کہ کتاب پڑی نہ رہ جائے، جلد نکل جائے۔ غالب نے ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں انہیں لکھا کہ:

"ایک قرینے سے مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ شاید گورنمنٹ سو دو سو "دستنبو" کی خریداری کرے گی اور ان نسخوں کو ولایت بھیجے گی۔ کیا بعید ہے کہ ہفتے دو ہفتے میں الہ آباد سے تمہارے پاس حکم پہنچے۔"

شیونرائن کو "قرینے" کی جستجو ہوئی جو قدرتی بات تھی لیکن غالب سے بات بنائے نہیں بنی:

"میاں! کیا قرینہ بتاؤں، گورنمنٹ کی خریداری کا؟ ایک بات ایسی ہے کہ ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ خدا کرے اس کا ظہور ہو جائے۔ ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔"

(مرقومہ، ۱۸ر دسمبر ۱۸۵۸ء)

کوئی بات اگر "واقعی" تھی بھی تو اس کا "ظہور" بہرحال نہیں ہوا، اس لئے کہ شیونرائن کے نام غالب کا ایک خط مرقومہ ۱۹ر اپریل ۱۸۵۹ء اس بات کا مظہر ہے کہ کتاب کا ایڈیشن اپریل ۱۸۵۹ء میں سب کا سب نکل گیا اور اس میں غالب کی کسی کوشش کو دخل نہیں تھا۔

"کتب "دستنبو" کے بک جانے سے میں خوش ہوا۔ خدا کرے جس کسی کو دی ہو، دو تین غلطیاں جو معلوم ہیں، وہ بنا دی ہوں۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ صاحب لوگوں نے خریدیں یا ہندوستانیوں نے لیں؟ تم مجھ کو یہ بات ضرور ضرور لکھو۔ میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبانِ انگریز کی خریداری آئی ہو گی، یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی، پورب میں کم بکی ہوں گی۔"

غالب کا قیاس صحیح نکلا۔ ۲۲ر اپریل ۱۸۵۹ء کے خط میں آرام کو لکھتے ہیں:

"دستنبو" کی خریداری کا حال معلوم ہو گیا۔ میرا بھی یہی گمان تھا کہ لاہور کے ضلع میں گئی ہوں گی۔"

کتاب کا ایڈیشن ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء سے پہلے نکل گیا تھا لیکن پھر اس کا ایک نسخہ ولایت بھیجنے کی ضرورت پیش آگئی۔ آرام آگرہ سے دہلی آرہے تھے۔ چنانچہ ۲۲ جولائی ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں غالب نے انہیں لکھا کہ :

"اگر 'دستنبو' باقی ہوں تو دو اپنے ساتھ لے آنا۔"

آرام کے نام ۱۷ اگست ۱۸۵۹ء، ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۹ء اور ۲۷ اکتوبر ۱۸۵۹ء کے خطوں میں بھی کتاب "دستنبو" اور ولایت کے لئے انگریزی عرضی کا ذکر آیا ہے یہ دونوں چیزیں اس وقت تک غالب کو فراہم نہیں ہوئی تھیں اور اگلے برس غالباً وسط جنوری تک یہ کہیں انہیں مل سکیں، اس لئے کہ ۳ مارچ ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں جو غالب نے رامپور کے دورانِ قیام میں آرام کو لکھا ہے کتاب اور عرضی کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے :

"کتاب اور عرضی اواسطِ ماہِ جنوری میں ولایت کو روانہ کرکے یہاں آیا ہوں۔"

اپریل ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں جو رامپور سے دہلی لوٹ آنے کے بعد آرام کو لکھا گیا ہے غالب کہتے ہیں :

"۱۹ یا ۲۰ جنوری ۱۸۶۰ء کو کتاب اور دونوں عرضیاں ولایت کو روانہ کرکے رامپور گیا ہوں۔"

گویا ولایت بھیجنے کے لئے "دستنبو" کے ایک نسخے کی فراہمی کی جو فرمائش غالب نے جولائی ۱۸۵۹ء میں کی تھی، آرام، اُسے چھ ماہ کے بعد پورا کر سکے۔ یہ تاخیر بظاہر اسی بنا پر واقع ہوئی ہوگی کہ کتاب آرام کو تلاشِ بسیار کے باوجود، اس درمیان میں نہ مل سکی ہوگی۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ "دستنبو" کا پہلا ایڈیشن جو نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپا۔ اشاعت کے قریب آٹھ نو ماہ کے اندر اندر سب کا سب نکل گیا تھا اور اسی زمانے میں اس کا ہاتھ آنا آسان نہیں رہا تھا۔

○

"دستنبو" میں غالب نے انگریزوں کی چیرہ دستیوں کے لئے عذر وضع کئے ہیں اور ان مظالم کے لئے جواز پیدا کرکے انہیں بے اثر اور پردہ پوش کرنے کی کوشش کی ہے :

"غضب ناک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے سروسامان لوگوں کو قتل کرنا اور مکانوں کو جلانا جائز سمجھا۔ ہاں جس مقام کو لڑ کر فتح کرتے ہیں، لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کی جاتی ہیں۔"

"یہ جو گھربار اور جان و مال محفوظ رہنے کی ذمہ داری نہیں لی گئی ہے، اس کی وجہ صرف یہ

ہے کہ بے گناہوں اور گناہ گاروں میں امتیاز رہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو شخص اظہار اطاعت کرے، اُس کو قتل نہ کیا جائے، مال چھین لیا جائے اور جو شخص مقابلہ کرے، مال کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی بھی چھین لی جائے۔ مقتولین کے متعلق یہ خیال ہے کہ انہوں نے یقیناً اطاعت نہیں کی، اسی وجہ سے اُن کو قتل کر دیا گیا۔"

غالب نے ایک طرف تو انگریزوں کی سختیوں کو امرِ معمولی قرار دیا ہے۔ دوسری طرف ان کے لئے سپر فراہم کرنے اور پناہ گاہیں تراشنے میں بھی مستعدی دکھائی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ غالب نے انگریز سپاہیوں کے مظالم کو کم کر کے پیش کیا ہے اور ان کی معقولیت اور امن پسندی کے گن گائے ہیں:

"------ انگریز بے گناہوں کو قتل نہیں کرتے ہیں۔"

"(انگریز سپاہی) عموماً سامان لوٹ لیتے ہیں، قتل نہیں کرتے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے اور وہ بھی صرف دو تین کوچوں میں کہ پہلے قتل کر دیا، پھر سامان لوٹ لیا۔ (البتہ) بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے۔"

"انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی (کا بدلہ لینے) کے لئے لڑنے اٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لئے لشکر آراستہ کیا، چوں کہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع تو اس کا تھا کہ شہر پر قابض ہونے کے بعد کتے بلی (تک کو) زندہ نہ چھوڑتے (لیکن انہوں نے) ضبط کیا۔ (اگرچہ) اُن کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی، عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔"

غالب کے یہ بیانات صریحاً انگریزوں کی تائید میں ہیں لیکن خود غیر جانبدار انگریز مؤرخین کی شہادتیں اس کے برعکس ہیں۔ دلی کے شہریوں پر انگریز سپاہیوں کے جاں سوز مظالم کے بارے میں لارڈ الفنسٹن، سر جان لارنس کو لکھتے ہیں کہ،

"(دہلی کے) محاصرے کے ختم ہونے کے بعد سے ہماری فوج نے جو ظلم کئے ہیں، انہیں سن کر دل پھٹنے لگتا ہے۔ بغیر دوست یا دشمن میں تمیز کیے، یہ لوگ سب سے یک سا بدلہ لے رہے ہیں۔ لوٹ میں تو حقیقت میں ہم نادر شاہ سے بھی بڑھ گئے۔"

[Life of Lord Lawrence, by : Baswarth Smith, vol. II p. 262]

پنڈت سندر لال کا بیان ہے کہ:

"محاصرے کے دنوں میں قلعے کے چھتے میں بیمار اور زخمی سپاہیوں کا ایک اسپتال تھا۔ کمپنی کی فوج جس وقت قلعے کے اندر گھسی، جتنے زخمی اور بیمار اسپتال کے اندر دکھائی دیے، اُن سب کو اُن سب نے اپنی گولیوں سے ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیا۔ اسی طرح اور بھی کئی جگہ جہاں زخمی اور بیمار پائے گئے۔ قتل کر دیے گئے۔"

(سن ستاون، ص ۱۶۲، بحوالہ: تاریخ ہند، منشی ذکاء اللہ خاں، ص ۶۴۶)

اہلِ دہلی کے قتلِ عام کے بارے میں مانٹ گمری مارٹن لکھتا ہے کہ:

"جس وقت ہماری فوج شہر میں داخل ہوئی تو جتنے شہری، شہر کی دیواروں کے اندر پائے گئے، انہیں اسی جگہ سنگینوں سے مار ڈالا گیا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اُن کی تعداد کتنی زیادہ رہی ہوگی جب میں آپ کو یہ بتاؤں کہ ایک ایک مکان میں چالیس چالیس اور پچاس پچاس آدمی چھپے ہوئے تھے یہ لوگ بلوائی نہ تھے۔ بلکہ شہر کے باشندے تھے۔ جنہیں ہماری مشہور ترحم دلی اور معافی پر بھروسہ تھا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ انہیں مایوسی ہوئی۔"

[Letter in the Bombay Telegraph, by : Montgomery Martin]

ایک دوسرا انگریز مؤرخ لکھتا ہے کہ:

"دلی کے باشندوں کے قتلِ عام کا کھلا اعلان کر دیا گیا، حالانکہ ہم جانتے تھے کہ اُن میں سے بہت سے ہماری فتح چاہتے ہیں۔"

[The Chaplain's Narrative of the Seige of Delhi,
quoted by : Kaye]

اس خوفناک قتلِ عام کے دنوں میں صرف ایک دن کے منظر کو بیان کرتے ہوئے لارڈ رابرٹس لکھتا ہے کہ:

"ہم صبح کو لاہوری دروازے سے چاندنی چوک گئے تو ہمیں شہر، حقیقت میں مُردوں کا شہر نظر آتا تھا۔

کوئی آواز سوائے ہمارے گھوڑوں کے ٹاپوں کے سنائی نہیں دیتی تھی۔ کوئی زندہ آدمی نظر نہیں آیا سب طرف مُردوں کا بچھونا بچھا ہُوا تھا۔ جن میں سے کچھ مرنے سے پہلے پڑے سسک رہے تھے۔"

"چلتے ہوئے بہت دھیرے دھیرے بات کرتے تھے۔ اس ڈر سے کہ کہیں ہماری آواز سے مُردے نہ چونک پڑیں۔ ایک طرف مُردوں کی لاشوں کو کُتے کھا رہے تھے اور دوسری طرف لاشوں کے آس پاس گدھ جمع تھے جو ان لاشوں کو نوچ نوچ کر مزے سے کھا رہے تھے اور ہمارے چلنے کی آواز سے اُڑ اُڑ کر تھوڑی دور جا بیٹھتے تھے۔"

"خلاصہ یہ کہ ان مُردوں کی حالت بیان نہیں ہو سکتی ہے جس طرح ہمیں ان کے دیکھنے سے ڈر لگتا تھا اسی طرح ہمارے گھوڑے انہیں دیکھ کر ڈر سے بدکتے اور ہنہناتے تھے۔ لاشیں پڑی سڑتی تھیں۔ اُن کے سڑنے سے ہوا میں بیمار کرنے والی بدبو پھیل رہی تھی۔"

[Forty Years in India, by : Lord Roberts]

ان میں سے بہت سے لوگوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دے دے کر مارا گیا۔ لیفٹیننٹ ماجنڈی نے اپنی آنکھوں دیکھا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ سکھوں اور گوروں نے مل کر ایک زخمی آدمی کے چہرے کو پہلے اپنی سنگینوں سے بار بار بیندھا اور پھر دھیمی آنچ کے اوپر اُسے زندہ بھون دیا:

"اُس کا گوشت چٹخا، لپٹوں میں کالا ہو گیا اور جلتے گوشت کی سڑی بدبو نے اُوپر اُٹھ کر ہوا کو زہریلا بنا دیا۔"

[Up Among the Pandies, by :
Lieut. Majendie, p. 187]

"ٹائم اخبار کے نامہ نگار سر ولیم رسل نے لکھا ہے کہ:

"میں نے اس شخص کی جلی ہوئی ہڈیاں کئی دن بعد میدان میں پڑی ہوئی دیکھیں۔"

[My Diary in India in the year 1856—59, Vol. I, p. 301—302]

گاربرے ٹامسن نے سر ہنری کاٹن سے کہا تھا کہ دلی میں کچھ مسلمانوں کو ننگا کر کے زمین سے باندھ کر سر سے پاؤں تک جلتے ہوئے تانبے کے ٹکڑوں سے اچھی طرح داغ دیا گیا تھا۔

[Indian and Home Memories, by : Sir Henry Cotton, p. 143]

ان لوگوں کو مارنے سے پہلے کبھی کبھی بے دین کرنے کے لئے بھی کوشش کی جاتی تھی ایک انگریز پادری کی بیوہ نے لکھا ہے کہ:

بہت سے لوگوں کو پکڑ کر پہلے ان سے سنگینوں کے بل گرجا میں جھاڑو دلوائی گئی اور پھر سب

کو پھانسی دے دی گئی ہے۔"

[A Lady's Escape from Gwalior, p. 243]

رسل لکھتا ہے کہ کبھی کبھی :

"مسلمانوں کو مارنے سے پہلے اُنہیں سؤر کی کھالوں میں سی دیا جاتا تھا' اُن پر سؤر کی چربی مل دی جاتی تھی اور پھر اُن کے جسم جلا دیے جاتے تھے اور ہندؤں کو زبردستی دھرم سے گرایا جاتا تھا۔"

[Russell's Diary, Vol. II, p. 43]

پنڈت سندر لال نے ٹھیک کہا ہے کہ "اُن دردناک واقعات کے بارے میں زیادہ مثالیں دینا بہت تکلیف دہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار ساری دلی خالی اور ویران ہو گئی بلکہ اُن اِنے گنے گھرانوں کو چھوڑ کر جن سے کمپنی کی فوج کو مدد مل رہی تھی، باقی سب شہریوں کو جو قتل یا پھانسی سے بچ سکے، زبردستی شہر سے باہر نکال دیا گیا۔ مورخ ہومس لکھتا ہے :

"دلی کے باشندوں نے باغیوں کے جرموں کا کئی گنا کفارہ ادا کر ڈالا۔ دسوں ہزار مرد، عورت اور بچے بغیر گھر بار کے اِدھر اُدھر کے علاقے میں گھوم رہے تھے جنہوں نے کوئی خطا نہیں کی تھی۔ اپنا جو کچھ مال اسباب وہ شہر میں پیچھے چھوڑ گئے تھے، اُس سے وہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو چکے تھے کیونکہ سپاہیوں نے گلی گلی اور گھر گھر جا کر ہر قیمتی چیز کو ڈھونڈ کر نکال لیا تھا اور جو کچھ سامان وہ اٹھا کر نہ لے جا سکے' اسے انہوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔"

[A History of the Indian Mutiny, by : Holmes, p. 386]

سر جان لارنس نے، انگریزی کمانڈر کے نام دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں اعتراف کیا ہے کہ :

"مجھے یقین ہے کہ ہم نے جس طریقے سے بلا امتیاز تمام طبقوں کو لوٹا ہے' اس کے لئے ہم پر ہمیشہ لعنت بھیجی جائے گی اور یہ فعل حق بجانب ہو گا۔"

[Life of Lord Lawrence, by : Baswarth Smith, Vol. II, p. 158]

خود انگریزوں کے ان اعترافات کے بعد، غالب کے اُن بیاناتِ صفائی کی کیا وقعت رہ جاتی ہے جو "دستنبو" میں انہوں نے انگریزوں کے ضبط و تحمل کی ذیل میں دیے ہیں۔ غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ انگریزوں نے :

لے : سن ستاون، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۵۷ء، ص ۱۶۶

"بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا۔"

" ـــــ عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا ـــ"

انگریز مورخین ہی کی شہادتوں سے غالب کے اس بیان کی جو صریحاً انگریزوں کی مدافعت میں ہے تردید ہو جاتی ہے۔ "انگریز فوج کے سپاہی جہاں گھستے، جتنے آدمی انہیں راستے میں ملتے، انہیں وہ بغیر کسی امتیاز کے تلوار کے گھاٹ اتار دیتے تھے یا گولی سے اڑا دیتے تھے۔ جگہ جگہ پر پھانسی کے تختے کھڑے کیے گئے۔ جن پر چوبیس چوبیس گھنٹے برابر کام جاری رہتا تھا۔ جب ان سے بھی کام نہ چلا تو انگریز افسروں نے درختوں کی شاخوں سے پھانسی کا کام لینا شروع کیا۔"

[Narrative of the Indian Revolt, p. 69]

کے اور مالسن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جو لوگ پھانسی پر لٹکائے جاتے تھے اُن کے ہاتھوں اور پیروں کو تفریح کے لئے انگریزی کے آٹھ اور نو (8 اور 9) ہندسوں کی شکل میں باندھ دیا جاتا تھا جب یہ ترکیبیں بھی کافی نہ دکھائی دیں تو انگریز افسروں نے گاؤں کے گاؤں جلانے شروع کر دیے۔ گاؤں کے باہر توپیں لگا دی جاتیں تھیں۔ اور سب مردوں، عورتوں اور بچوں اور جانوروں سمیت گاؤں کو آگ لگا دی جاتی تھی کئی انگریز افسروں نے بڑے فخر کے ساتھ ان دردناک نظاروں کو اپنے خطوط میں بیان کیا ہے آگ اتنی ہوشیاری سے لگائی جاتی تھی کہ ایک بھی گاؤں والا نہ بچ سکے۔

[Kaye and Malleson's History of the Indian Mutiny,
Vol. II, p. 177]

چارلس بال لکھتا ہے کہ:

"مائیں اپنے دودھ پیتے بچوں سمیت اور بے شمار بوڑھے مرد اور عورتیں، جو اپنی جگہ سے ہل نہ سکتے تھے، بچھونوں کے اندر جلا کر خاک کر دیے گئے۔"

[Charles Ball's
History of the Indian Mutiny, Vol. I, p. 243—244]

ایک انگریز اپنے خط میں لکھتا ہے کہ:

"ہم نے ایک بڑے گاؤں کو آگ لگائی جس میں لوگ بھرے ہوئے تھے۔ ہم نے انہیں گھیر لیا اور جب وہ آگ کی لپٹوں میں سے نکل کر بھاگنے لگے تو ہم نے اُنہیں گولیوں سے اڑا دیا۔"

[Charles Ball's History of the Indian Mutiny,
Vol. I, p. 243—244]

مؤرخ سرجان کے لکھتا ہے کہ:

"فوجی اور سول دونوں طرح کے انگریز افسر اپنی اپنی خونی عدالتیں لگا رہے تھے یا بغیر کسی طرح کے مقدمے کا ڈھونگ رچائے اور بغیر مرد، عورت یا چھوٹے بڑے کا خیال کیے ہندوستانیوں کا قتل عام کر رہے تھے ہندوستان کے گورنر جنرل نے جو خط انگلستان بھیجے اُن میں ہماری برٹش پارلیمنٹ کے کاغذوں میں یہ بات درج ہے کہ بوڑھی عورتوں اور بچوں کو اُسی طرح سے ذبح کیا گیا جس طرح اُن لوگوں کو جو بغاوت میں شامل تھے۔ انگریزوں کو فخر کے ساتھ یہ کہتے ہوئے یا خطوط میں لکھتے ہوئے بھی جھجک نہ محسوس ہوئی کہ ہم نے ایک بھی ہندوستانی کو نہیں چھوڑا، اور کالے ہندوستانیوں کو گولیوں سے اڑانے میں ہمیں بڑا لطف آتا تھا اور حیرت انگیز خوشی ہوتی تھی۔ ہندوستانیوں کی تاریخی کتابوں میں یا اگر کتابیں نہ ہوں تو اُن کی کہانیوں اور بیانوں میں ہمارے قوم کے خلاف یہ یادگار رہے گی کہ ہندوستان کی مائیں، بیویاں اور بچے جن کے نام سے ہم اتنی اچھی طرح واقف نہیں ہیں، انگریزوں کے انتقام کی پہلی باڑھ میں بے رحمی کے ساتھ شکار ہوئے۔"

[Kay 's History of the Sepoy War, Vol. II, p.]

خود گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے ۲۴ر دسمبر ۱۸۵۷ء کو اپنی کونسل کے اندر کہا تھا:

"نہ صرف چھوٹے بڑے ہر طرح کے مجرم ہی بلکہ وہ لوگ بھی جن کا قصور کم سے کم بہت ہی مشکوک تھا، بغیر کسی تمیز کے پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔ گاؤں کو عام طور پر جلا ڈالا گیا اور لوٹ لیا گیا۔ اس طرح قصوردار اور بے قصور مرد اور عورت بچے اور بوڑھے سب کو بلا کسی تمیز کے سزا دی گئی۔"

(بحوالہ: سن ستاون، ص ۲۵۰)

غالب نے انگریزوں کے مظالم اور ان کی بے رحمی اور سفاکی کا تاثر ہلکا کرنے کی ایک صورت یہ بھی نکالی کہ "باغی" سپاہیوں کے طرز عمل کو حاشیہ آرائی کے ساتھ بڑھا چڑھا کر بیان کیا:

"۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء (کو) میرٹھ کی فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر (دہلی) میں آئے۔ نہایت ظالم و مفسد اور نمک حرامی کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے... (یہ) مدہوش سوار اور اکھڑ پیادے، دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑ پڑے۔ جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابلِ احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے، جب تک ان افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا۔ ادھر سے رُخ نہیں پھیرا۔"

"زمین ہر طرف گل انداموں (انگریزوں) کے خون سے رنگین ہو گئی۔ باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہاروں کا مدفن بن گیا۔ افسوس وہ پیکرِ علم و حکمت، انصاف سکھانے والے خوش اخلاق و نیک نام حاکم! اور صد افسوس وہ پری چہرہ نازک بدن خاتونیں جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن بھی چاندی کی طرح دمکتے تھے! حیف وہ بچے جنہوں نے ابھی دُنیا کو (اچھی طرح) دیکھا بھی نہیں تھا، جن کے ہنس مکھ چہرے گلاب و لالہ کے پھولوں کو شرماتے تھے اور جن کی خوش رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بدنما معلوم ہوتی تھی۔ یہ سب ایک دم قتل و خون کے بھنور میں پھنس کر (بحرِ فنا میں) ڈوب گئے۔"

"(ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اُٹھائی۔ بے چاری عورتوں اور گہوارے میں کھیلتے ہوئے بچوں کو قتل کیا۔"

غالب کا بیان ہے کہ شوریدہ سر، ظالم، مفسد، دیسی سپاہی انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے انہوں نے دیوانوں کی طرح انگریز افسروں کو قتل کیا۔ ان اکھڑ اور مدہوش انقلابیوں نے پری چہرہ، نازک بدن انگریز خواتین اور گہوارے میں کھیلتے ان کے ہنس مکھ، معصوم بچوں کے قتل عام سے بھی دریغ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ زمین ان گل اندام کے خون سے رنگین ہو گئی۔ یہ بیان مبالغہ آمیز اور مغالطہ انگیز ہے اور ایک معتبر معاصر شہادت سے اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ انگلستان کی پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر لے یارڈ نے ہندوستانی سپاہیوں کی مشتبہ غارت گری کی تحقیقات کرنے کی غرض سے خود انقلاب پسنداں کے دنوں میں ہندوستان کا دورہ کیا اور واقعات کی اصلیت کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگانے کی سعیٔ بلیغ کی۔ مسٹر لے یارڈ نے اپنی تحقیق اور تفتیش کے نتائج کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"نہایت غور اور ہوشیاری کے ساتھ تحقیق کرنے کے بعد، اچھے سے اچھے اور سب سے زیادہ اہم اور معتبر لوگوں اور سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ذریعوں سے جو اطلاعیں مجھے ملی ہیں، ان سے مجھے اس بات کا پورا یقین ہو گیا ہے کہ دلی، کانپور، جھانسی اور دوسرے مقامات پر جو بہت ہی خوفناک مظالم کہا جاتا ہے کہ انگریز عورتوں اور بچوں پر کئے گئے، وہ سب کے سب بلا ایک بھی استثنا کے جھوٹے اور فرضی ہیں، اور کہنے والوں کے خود اپنے من سے گھڑے ہوئے ہیں، جس کے لئے انہیں شرم آنی چاہیئے۔"

[Mr. Layard, M.P., in : The Time, 25th August, 1858]

(بحوالہ، سن ستاون، ص ۱۴۱، ۲۴۹)

آرام نے غالب کو کتاب کے نکل جانے کی اطلاع دی۔ اس کے جواب میں غالب ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"دیکھو صاحب! تم گھبراتے تھے، آخر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی۔ بھائی ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے۔ جو زندہ ہیں، ان میں سیکڑوں گرفتارِ بند بلا ہیں۔ جو زندہ ہے اس میں مقدور نہیں۔ میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبانِ انگریز کی خریداری آئی ہو گی یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی پورب میں کم بکی ہوں گی۔"

کتاب کا ایڈیشن نکل جانے کی اطلاع ملنے پر غالب نے اس خط میں ہند کی صورتِ حال کے بارے میں جو غیر رسمی رائے دی ہے، وہ مطبوعہ اصل اور کل کتاب پر بھاری ہے "دستنبو" میں انہوں نے ہندوستانیوں کو متہم کیا ہے اور انگریز سپاہیوں کی معقولیت اور امن پسندی کا گن ان لفظوں میں گایا ہے:

"خدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرزِ عمل یاد کرو۔ اس کے بغیر کہ پہلے سے دشمنی کی کوئی بنیاد اور عداوت کا کوئی سبب ہو (ان ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اٹھائی۔ بے چاری (انگریز) عورتوں اور گہوارے میں کھیلتے ہوں بچوں کو قتل کیا (حالانکہ) سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے (اس کے مقابلے میں) ان انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی (کا بدلہ لینے) کے لئے لڑنے اٹھے اور گنہ گاروں کو سزا دینے کے لئے لشکر آراستہ کیا چونکہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع تو اس کا تھا کہ شہر پر قابض ہونے کے بعد کتے بلی تک کو زندہ نہ چھوڑتے (لیکن انہوں نے ضبط کیا (اگرچہ) ان کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی، عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔"

اس پس منظر میں مذکورہ خط، بنام شیو نرائن کی خط کشیدہ عبارت کے وزن اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ:

"ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے، جو زندہ ہیں، ان میں سیکڑوں گرفتارِ بند بلا ہیں۔ جو زندہ ہے اس میں مقدور نہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ "دستنبو" کی غرضِ تصنیف، قلعۂ معلیٰ سے اپنے تعلق کے داغ کو مٹانا، اور تحریکِ آزادی کو "رستخیزِ بے جا" قرار دے کر انگریز حکامِ با اختیار کی نظر میں سرخرو ہونا تھا ـــــ اور سرخرو ہونا، محض سرخرو ہونے ہی کے لئے نہیں تھا۔ حکامِ وقت کو اپنی وفاداری کے یقین دلانے کی غایتِ اصلی، پنشن کے اجرا کی آرزو اور خطاب و خلعت پانے کی تمنا تھی۔ انگریز

حکام کے لئے پر تکلف جلدوں کا اہتمام، ملکۂ معظمہ کے لئے "قصیدۂ برگزیدہ در تہنیت فتح ہند" کی تصنیف اس کے شہرت پا جانے کی آرزو و تدبیر، اور اُن تک کتاب پہنچانے کی عجلت اور عالی مقام صاحبانِ انگریز سے روابط بڑھانے اور راہ و رسم مراسلت کی فکر تجدید، اپنے مقصودِ اصلی کے لئے راہ ہموار کرنے ہی کی کڑیاں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ غالب نے "غیر ملکی فاتحین سے جیسی سوچی سمجھی وفاداری کا اظہار کیا ہے، اگر ہم اس زمانے کے بے دریغ اور بہیمانہ قتلِ عام کو ذہن میں رکھیں تو اس کی نوعیت کا اندازہ کرنے میں دقت نہیں ہوگی[۱]" یہ بھی صحیح ہے کہ اس انقلاب سے اُن کے تعلق یا اس سے اُن کی ہمدردی کا ذرا سا بھی شبہ انہیں دار و رسن کی آزمائش میں مبتلا کر سکتا تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ غالب کی گزر اوقات کا وسیلہ پنشن (رہ گئی) تھی اور قبل اس کے کہ انگریز حاکموں کو اس کے دوبارہ اجراء کے لئے رضامند کیا جائے اس کے لئے اپنے استحقاق (یعنی بے گناہی) کو ثابت کرنا ضروری تھا۔ (بلاشبہ) یہ بات ایک ایسے شخص کے لئے اور بھی ضروری تھی جس کا تعلق اُمراء سے رہا ہو اور جو دہلی کے مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کا اُستاد، درباری اور دوست رہا ہو[۲]" یہی ہوا بھی، کہ غالب نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے اور پنشن کے لئے اپنا استحقاق جتلانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ہر عام آدمی، ان حالات میں یہی کرتا، غالب سے ہمیں روش خاص کی توقع تھی، وہ پوری نہیں ہوئی "صورتِ حال جیسی بھی ہو، یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جب حالات غالب کے لئے ناساز گار ہوئے تو انہوں نے بھی اپنے بہت سے دوسرے احباب کی طرح ذاتی مدافعت کو دوسری تمام چیزوں پر ترجیح دی[۳]"

ذاتی تحفظ اور فروغ مراتب کی غرض سے لکھی گئی، اس کتاب کے مندرجات کو ہر چند "حقیقتِ واقعی" کے بمنزلہ نہیں سمجھا جاسکتا، اس سرگزشت کی تسوید و تحریر خاص مصلحتوں کے تابع رہی ہے۔ پھر بھی ڈاکٹر محمد اشرف کے بقول:

> "یہ بات یقینی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے ہر حساس طالب علم کے لئے یہ کتاب ایک قابلِ قدر دستاویز ہے۔"
>
> (اردوئے معلیٰ، دہلی، فروری ۱۹۶۱ء، ص ۱۱۲)

غالب نے "دستنبو" کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا اور بنایا، گو اس سے انہوں

---

[۱]تا[۳] ڈاکٹر محمد اشرف، اردوئے معلیٰ، دہلی، فروری ۱۹۶۱ء ص ۱۱۰

نے جیسی توقعات وابستہ کر لی تھیں، وہ پوری نہ ہوئیں۔ بایں ہمہ کتاب کی یہ اہمیت بھی مسلّم ہے کہ اس سے غالب کے کچھ سوانح پر روشنی پڑتی ہے اور بالخصوص اُن کے اُفتادِ مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

○

"دستنبو" کا دوسرا ایڈیشن سات برس بعد ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے بھی کچھ خاص محرکات تھے۔ "دستنبو" (نومبر ۱۸۵۸ء) کی اشاعت کو غالب نے اپنے لیے بہت سے مقاصد و مطالب کے حصول کا ذریعہ جانا تھا، لیکن اس سے انہیں کوئی فوری فائدہ نہیں ہوا جیسا کہ مالک رام نے لکھا ہے:

"مزید خطاب و خلعت تو درکنار، پہلا دربار و خلعت اور پنشن بھی جاری نہ ہوئے اور لگے تین برس انہیں واگزاشت کرانے کی دوڑ دھوپ میں گزر گئے۔ آخر جب مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن اور مارچ ۱۸۶۳ء میں دربار و خلعت جاری ہو گئے تو پھر اپنا پرانا مطالبہ یاد آیا۔ اس پر انہوں نے ۱۸۶۵ء کے آغاز میں دوبارہ درخواست دی کہ:

۱۔ مجھے ملکہ عالیہ کا شاعرِ دربار مقرر کیا جائے۔
۲۔ دربار میں پہلے سے اونچی جگہ دی جائے۔
۳۔ میری کتاب "دستنبو" حکومت اپنے خرچ پر شائع کرے۔

اس پر گورنر جنرل نے لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سے ان کے بارے میں رپورٹ طلب کی۔ چیف سکرٹری گورنمنٹ پنجاب نے لکھا کہ میرے خیال میں کمشنر دہلی کی یہ سفارش معقول ہے کہ علیا حضرت ملکہ معظمہ کا تو نہیں، لیکن انہیں وائسرائے کا درباری شاعر مقرر کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بھی لازم نہیں کہ عہدے کے ساتھ کوئی تنخواہ مقرر ہو۔ ہاں، سالانہ خلعت مزید دیا جائے اور اگر سال کے دوران میں بھی کسی خاص تقریب پر وہ قصیدہ پیش کریں تو بے شک خلعت دیا جا سکتا ہے۔ اس سے میرزا غالب کی بھی اشک شوئی ہو جائے گی اور علوم شرقیہ کی حوصلہ افزائی بھی، جو اس وقت بہت کم نگاہی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس پر مزید تحقیقات کا حکم ہوا کہ غدر کے دنوں میں ان کے رویے کی تفتیش کی جائے، نیز ان سے "دستنبو" کا ایک نسخہ طلب کر کے اس پر بھی رائے لکھی جائے۔ جب میرزا سے "دستنبو" کا نسخہ طلب کیا گیا اس وقت وہ رامپور میں تھے۔" (ذکرِ غالب، طبع چہارم، صفحہ ۱۵۱، ۱۵۲)

میرزا غالب رامپور میں نواب کلب علی خان کی تخت نشینی کے "جشن جمشیدی" سے لطف اندوز

ہو رہے تھے کہ حکومتِ پنجاب کی طرف سے انہیں "دستنبو" کا ایک نسخہ بغرضِ ملاحظہ چیف سکرٹر کے پاس بھیجنے کا حکم ملا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ رامپور میں میرزا کو غالباً پہلے ایڈیشن کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا، اگر ملا، تو وہ اس قابل نہیں تھا کہ اسے حکومت کو بھیجا جا سکے۔ چونکہ حکومت کی طرف سے مطالبہ ہوا تھا اور میرزا کی اس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں، اس لئے انہوں نے پہلے ایڈیشن کا یہ نسخہ صحیح کر کے، اسے لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ، بریلی کے مطبع میں دوبارہ طبع کرایا اور دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ حکومت پنجاب کو بھیج دیا۔"

"حکومت کے میر منشی نے "دستنبو" کو دیکھ کر رپورٹ کی کہ اس کتاب کی زبان پرانی پارسی ہے۔ قدرتی طور پر اس میں ایسے لفظ آ گئے ہیں جو اب بہت کم استعمال ہوتے ہیں اور عام طور پر رائج نہ ہونے کی وجہ سے نامانوس اور بعید الفہم ہیں۔ اس صورت میں حکومت کا اسے اپنے خرچ پر شائع کرنا کچھ ضروری نہیں۔" (ذکرِ غالب، ایضاً، ص ۱۵۳، ۱۵۴)

"دستنبو، طبع دوم کے خاتمے کی عبارت یہ ہے:

"الحمد للہ کہ کتاب افادات انتساب بفرہنگ و دانش مرسوم و بدستنبوی موسوم، پیکیدۂ قلم جادو رقم، نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب، عرفِ میرزا نوشہ مد اللہ ظلال فیوضہ با ہتمام منشی بیندان لال صاحب در قالب طبع آمد، از نسخۂ صحیحہ مرسلۂ مصنف صاحب نقل شد و تصحیح تمام در ۱۸۶۵ احسن اختتام یافت۔"

---

[1] "لطیفہ یہ ہے کہ جن دنوں "دستنبو" کا پہلا ایڈیشن مطبع مفید خلائق آگرہ میں چھپ رہا تھا۔ چھاپے خانے کے مالک منشی شیو نرائن نے میرزا کو ایک خط لکھا، جس کے لفافے پر پتے میں "میرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا۔ اس پر میرزا نے فوراً تفتہ کو لکھا کہ خدا کے لئے کہیں "میرزا نوشہ" کے الفاظ کتاب پر بھی چھپ نہ جائیں! اس نالائق عرف "کو دو کلکتے کے سرکاری حلقوں میں کوئی جانتا ہے، نہ ولایت میں، لیکن ان کا یہ خیال غلط تھا۔ دونوں جگہ کے حاکم ان کے اس عرف سے خوب واقف تھے۔ بہر حال جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے، انہوں نے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں اس عرف کی موجودگی میں کوئی قباحت یا اعتراض نہیں دیکھا۔ غالباً اس لئے کہ ساتھ نام اور تخلص بھی موجود ہیں، یا شاید یہ سبب ہو کہ وہ اب اسے حکامِ بالا کو تحفے کے طور پر نہیں بھیج رہے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عبارت لکھتے وقت ان سے استصواب کیا ہی نہ گیا ہو۔"

(مالک رام، ذکرِ غالب، حاشیہ ص ۱۸۹ و بہ بعد) بقیہ اگلے صفحہ پر

اس دوسرے ایڈیشن میں دو ایک جگہ لفظی تغیر ملتا ہے۔ ترتیب بھی بدل دی ہے۔ یعنی، اب سب سے پہلے اصل کتاب ہے جو پندرہ سطری مسطر صفحہ ۵۶ پر ختم ہوئی ہے۔ اسی صفحے سے اُس قصیدے کا آغاز ہے (شمار یافت، روزگار یافت) جو طبع اول میں شروع میں رکھا گیا تھا۔ یہ قصیدہ صفحہ ۶۰ پر ختم ہوا ہے، اور اس کے بعد اُس قطعے کا اضافہ کیا گیا ہے جو "فتح دہلی" کی خوشی میں (روزگار چراغاں، اشتہار چراغاں) چراغاں کے موقع پر اُنہوں نے اکتوبر ۱۸۵۸ء میں لکھا تھا۔ یہ ایڈیشن ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ قدرتی طور پر اس سے طبع اول کی دونوں تاریخیں (قطعات تاریخ آغاز و انجام کتاب از مہر و تفتہ) حذف کر دی گئی ہیں کہ اب ان کی کوئی مناسبت نہیں تھی۔ "دستنبو" کے صرف یہی مستقل ایڈیشن میرزا غالب کی زندگی میں شائع ہوئے۔"

(مالک رام، نگار، لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۲)

" دستنبو، طبع دوم کے تین برس بعد غالب کی زندگی میں "دستنبو" کی تیسری اشاعت جنوری ۱۸۶۸ء میں "کلیات نثر غالب" کے ساتھ شائع ہوئی "کلیات" علی الترتیب "پنج آہنگ"، "مہر نیمروز" اور "دستنبو" پر مشتمل ہے۔ یعنی "دستنبو" کلیات کی نثر سوم کے طور پر شامل کتاب ہے اور صفحہ ۱۸۹ سے ۲۱۲ کو محیط ہے۔ "دستنبو" کا متن صفحہ ۱۹۰ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۰۷ پر ختم ہو جاتا ہے صفحہ ۲۰۷ ہی سے، قصیدہ در مدح ملکہ معظمہ انگلستان، چار کالم میں طبع ہوا ہے اور ۲۰۸ پر تمام ہوتا ہے۔ صفحہ ۲۰۸ ہی کے آخر میں قطعہ در بیان روشنی دہلی درج ہے۔ صفحہ ۲۰۹ تا ۲۱۲ "دستنبو" کی فرہنگ ہے۔ "کلیات" میں "دستنبو" کا متن جوں کا توں ہے، لیکن مالک رام کے لفظوں میں "آخر میں مشکل الفاظ کے فرہنگ مرتب کر دا کے اضافہ کیے گئے ہیں جو یقیناً مفید ہیں کیونکہ (اس کتاب) میں نادر اور نامانوس الفاظ بہ کثرت استعمال ہوئے ہیں جو عام فہم نہیں تھے[1]۔"

پنجاب پبلک لائبریری، لاہور میں کیٹلاگ نمبر "۹۶" ۱۷۸ پنج "کے تحت" کلیات نثر غالب" کا ایک خطی نسخہ موجود ہے۔ یہ نسخہ ڈاکٹر اظہر علی (ایم۔ اے، ایم۔ او۔ ایل، پی ایچ۔ ڈی، ۱۲ ڈی، ماڈل ٹاؤن لاہور) نے پنجاب پبلک لائبریری کو ہدیہ کیا ہے۔ کلیات کے اس قلمی نسخے میں بالترتیب "پنج آہنگ"

(پچھلے صفحے سے آگے) یہی زیادہ قرین صواب معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبارت صاحب مطبع کی صوابدید سے لکھ دی گئی اس کے لئے غالب سے استصواب نہیں کیا گیا۔ تام کے ساتھ خطابات کے اعلان سے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ اُن کے نزدیک تو اس کتاب میں "اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر" تھا۔

(بنام تفتہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء)

[1] نگار، لکھنؤ، خاص نمبر جولائی ۱۹۶۰ء ص ۱۰۳

"مہر نیمروز" اور "دستنبو" شامل ہیں۔ خط بہت روشن ہے۔ کتابت بہت صاف صاف اور قلم سنبھال کر کی گئی ہے۔ اوّل تا آخر پندرہ سطری مسطر ہے۔ سر عنوان وغیرہ سُرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ "دستنبو" کے خاتمے پر قطعات آغاز و انجام (از مہر و تفتہ) کے بعد یہ فقرہ ہاتھ سنبھال کر صاف صاف لکھا گیا ہے:

"ایں رسالہ بہ قرۃ العین میر سرفراز حسین فرستادہ آمد"

اس فقرے کا قلم اور قط وہی ہے جس سے پوری "کلیات" لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد خفی قلم سے پختہ و شکستہ رواں انداز میں ترقیمہ ہے:

"ایں رسالہ را بہ استمداد فرخندہ سیر، سعادت گستر، آسایش رواں، عزیز از جان اسوۂ آل نبی و اولاد علی سید مہدی حفظہ اللہ تعالیٰ فی الارض بتاریخ بست و ہشتم محرم سنہ ۱۲۸۰ ہجریہ قدسیہ (مطابق ۱۵ جولائی ۱۸۶۳ء) بمقام دہلی در حویلی مہابت خاں، خاکسار پریشاں روزگار، گنہ گار، بارگاہ ستار و غفار، سید حسن موسوی مشہور میر حسن بہ وقت سہ پہر روز پنجشنبہ ختم نمود:

ہر کہ خواند دعا طمع دارم
زاں کہ من بندۂ گنہ گارم

والسلام علی من اتبع الہدیٰ۔"

ترقیمے کی اس عبارت سے، اس کے زمانۂ کتابت، کاتب، اور نسخے کے مِلک کا پتہ چلتا ہے۔

"دستنبو" کی تیسری جداگانہ اور مستقل اشاعت (بمطابق طبع دوم) غالب کے انتقال کے دو برس بعد عمل میں آئی، در مطبع لٹریری سوسائٹی، روہیل کھنڈ، واقع بریلی، ۱۸۷۱ء

انیسویں صدی کی بعض دیگر اشاعتیں در "کلیات نثر غالب":

- نولکشور، لکھنؤ: ۱۸۷۱ء، ۱۸۷۵ء
- نولکشور، کانپور: ۱۸۷۵ء، ۱۸۸۴ء، ۱۸۸۸ء

بعض دوسری اشاعتیں:

- مرتبہ، ڈاکٹر عبدالشکور احسن، لاہور ۱۹۶۹ء
- متن مع اُردو ترجمہ مشمولہ: غالب اور انقلاب ستاون، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء

نکاتِ غالب (اردو) و رقعاتِ غالب (فارسی):

★ طبع اول : مطبع سراجی، دہلی، فروری ۱۸۶۷ء
باہتمام : بابو پیارے لال آشوب دہلوی
ضخامت : نکاتِ غالب : ۲۰ صفحات
رقعاتِ غالب : ۱۷ صفحات
سائز : ۱۸ × ۲۲/۸ مسطر : سترہ سطری

دو مختصر سے رسالوں پر مشتمل یہ مجموعہ غالب کی کوئی باقاعدہ نئی اور مستقل تصنیف نہیں ہے۔ پہلا رسالہ "نکاتِ غالب"، معمولی تبدیلیوں کے ساتھ "پنج آہنگ" مطبوعہ کے آہنگ دوم کا اُردو ترجمہ ہے، دوسرے رسالے "رقعاتِ غالب" میں "پنج آہنگ" سے پندرہ فارسی خطوں کو لے لیا گیا ہے۔ سرورق طبع اوّل کی عبارت یہ ہے :

حسب الحکم میجر فلر صاحب بہادر ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک پنجاب کے
یہ دو رسالے نامزد
بہ نکاتِ غالب و رقعاتِ غالب
تصنیف جناب نواب اسداللہ خاں غالب
محمد سعادت علی خاں کے مطبع سراجی میں طبع ہوئے

سرورق کی پشت خالی ہے۔ اس کے بعد سے صفحوں کا شمار شروع ہوتا ہے۔ صفحہ ایک پر پیارے لال آشوب کی "التماس" ہے جس سے اس کتابچے کے بارے میں

بعض ضروری باتیں معلوم ہوتی ہیں :

"خوشہ چینِ خرمنِ اہلِ کمال پیارے لال اسسٹنٹ ماسٹر مدرسہ ضلع دہلی گزارش کرتا ہے کہ درین ولا نواب اسداللہ خان بہادر نے قواعدِ صرف، فارسی میں بہ زبان اُردو کئی ورق لکھے اور چند خط اپنے مجموعۂ نثر میں سے جس کا "پنج آہنگ" نام ہے، ضمیمہ ان اوراق کے کیے۔ پہلے نسخے نے "نکاتِ غالب" نام پایا اور دوسری تحریر بہ "رقعاتِ غالب" موسوم ہوئی۔ جب یہ دونوں رسالے جنابِ فیض مآب میجر فلر صاحب بہادر کی خدمت میں بھیجے گئے۔ میجر صاحب کے بھی مقبول نظر ہوئے اور انجمن علمی لاہور میں بھی سزاوارِ درس و تدریس و شائستہ آفرین و تحسین قرار پائے۔ چنانچہ میجر صاحب ممدوح نے اس احقر العباد کے پاس بھجوائے اور حکم دیا کہ پانسو نسخے چھاپے جائیں تاکہ مدارس میں پڑھنے پڑھانے کے کام آئیں۔ انصاف یہ ہے کہ جیسا صاحبانِ مبتدی اس نگارش سے فائدہ پائیں گے صاحبانِ منتہی بھی لطفِ عبارت و کمالِ تحقیق کا حظ اٹھائیں گے۔ احسانِ خدا کہ حضرت فلک رفعت جنابِ معلی القاب سر ڈانلڈ مکلوڈ صاحب بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی فرمانروائے قلمرو وسیعۂ دہلی و پنجاب کے عہد میں قدردانِ علم و علمان جنابِ میجر صاحب بہادر کے حکم سے باہتمام اِس ذرۂ بے مقدار کے، مطبع سراجیہ میں اس کتابِ کثیر المطالب، قلیل الحجم نے حلیۂ طبع سے زینت بلکہ خود چھاپے نے اس کتاب سے رونق پائی۔

هزار و هشت صد و شست و هفت سالِ مسیح
که ماهِ عید و مه فروری بهم بوداست
کر این نکات گران مایۂ درخشنده
ز انطباع خود انوارِ مطبع افزوداست

صفحہ ۲ سے ۲۰ تک رسالہ "نکاتِ غالب" آیا ہے جس کی آغاز کی ضروری عبارت یہ ہے :

"..... نمبر ۱: اس زمانے (۱۸۶۷ء) سے تیس برس پہلے میں نے اپنی نثریں جمع کیں اور ان کا "پنج آہنگ" نام رکھا۔ "آہنگ" لغت فارسی ہے اور اس کے دو معنی ہیں: قصد و آہنگ۔ چونکہ وہ مجموعہ پانچ باب کا ہے، میں نے باب کو آہنگ قرار دیا ہے۔ یہ لغت دونوں معنوں کی رو سے بجائے باب سزاوار ہے۔ چالیس برس کی عمر میں وہ رسالہ لکھا ہے اور اب اکتیس برس کے بعد یہ ارادہ کیا ہے کہ "پنج آہنگ" کی چوتھی آہنگ[۵] جس میں فارسی کی صرف کا بیان ہے، اس کا اردو میں ترجمہ کیا جائے تاکہ وہ اوراق ...... میکلوڈ صاحب بہادر فرمانروائے ممالک وسیعہ پنجاب .... کی نذر کیے جائیں خدا کرے مجھ ترک، جاہل کا بیان حضرت کی پسند آئے اور یہ رسالہ اُن کی زبانِ مبارک سے "نکاتِ غالب" نام پائے۔" (صفحہ ۲ و بہ بعد)

"..... فقیر حقیر کو اس تحریر سے ان صاحبان انگریز کی خدمت گزاری مراد ہے جو ولایت سے تشریف لائیں اور فارسی اور اُردو اچھی طرح نہ جانتے ہوں۔ پس ضرور آپڑا ہے کہ لغات مشکل، کم تر درج کروں بلکہ الفاظ زبان زدِ عوام سے کام لوں ..... اپنی عبارت کا لفظ بہ لفظ ترجمہ نہ کروں گا۔ مطالب مندرجہ فارسی، مطابق روزمرّۂ اُردو درج کردوں گا۔ اب نمبر نمبر نہ لکھوں گا اور مطابق اصل کتاب کے، ہر مطلب کو نکتہ تعبیر کروں گا...." (صفحہ ۴۰)

---

۵ یہاں غالب کا "چوتھی آہنگ" لکھنا "پنج آہنگ" کی اولین قلمی تدوین کے مطابق ہے جو ۱۸۳۵ء اور ۱۸۴۰ء کے خطی نسخوں (مخزونہ شیرانی کلکشن پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور و نذیریہ پبلک لائبریری، دہلی) میں ملتی ہے۔ "پنج آہنگ" طبع اول، ۱۸۴۹ء و بہ بعد میں آہنگوں کی ترتیب بدل گئی ہے۔ اس کے مطابق "آہنگ دوم" چاہیے۔

یہ مہلا رسالہ ان کلمات پر تمام ہوتا ہے :

"..... اب میں اس تحریر کو ختم کر کے مسودہ اٹھا رکھتا ہوں اور ایک کاتب خوش نویس سے اس کی نقل کو لکھوا کر نورِ چشم اقبال نشان بابو پیارے لال ستودہ خصال کو دیتا ہوں۔ الشاءاللہ گورنمنٹ بہادر کا کیا اقبال ہے کہ غالبِ ناتوان نیم جان با آنکہ چہ طرح کے ضعفوں میں مبتلا ہے : ضعفِ پیری، ضعفِ بصارت، ضعفِ اعضاء، ضعفِ دل، ضعفِ دماغ، ضعفِ طالع، قلم اٹھا سکا اور مطلب کو دل سے زبان تک اور زبان سے قلم تک لا سکا۔ واللہ علیٰ کلّ شیٔ قدیر۔ تمام شد"

(صفحہ ۱۹ و مابعد)

"رُقعاتِ غالب" صفحہ ۲۰ پر ختم ہو جاتا ہے (اس صفحے پر صرف سات سطریں آئی ہیں، اور آخری سطر صرف "تمام شد" کی عبارت پر مشتمل ہے) صفحہ ۲۰ کے بعد نئے سرے سے صفحوں کا شمار کر کے "رُقعاتِ غالب" کا حصہ شروع ہوتا ہے۔ یہ رقعات جو تعداد میں پندرہ ہیں، ۱۶ صفحوں پر تمام ہو گئے ہیں۔ صفحہ ۱۷ پر ہر دو حصوں : "نکات و رقعات" کا صحت نامہ ہے۔

"غالب کی تصنیفات میں پیشِ نظر مجموعہ کوئی نئی تصنیف نہیں ہے ..... اس کے باوجود، اس مجموعے کی اہمیت اپنی جگہ ..... ہے اور یہ مُطالعۂ غالب میں ایک مفید اور کار آمد اضافہ ہے۔ "نکاتِ غالب" خود غالب کا ترجمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمے میں وہ کس حد تک آزادی کے قائل تھے۔ یہ ترجمہ لفظی ترجمہ نہیں ہے، بلکہ غالب نے اس میں اُردو کا اپنا منفرد انداز برقرار رکھا ہے۔ اس کتاب کے ابتدائی حصے میں اُنھوں نے اُردو زبان کی اس فراخ دامنی کو بھی سراہا ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ بغیر تکلیف اور تکلّف کے اپنا لیتی ہے۔ اس پسندیدگی ہی کی وجہ ہے کہ خود غالب کے کلام نظم و نثر میں انگریزی الفاظ کی بڑی تعداد مل جاتی ہے، اگرچہ ان میں سے اکثر کا تلفظ اور املا وہ اُردو کے مزاج کے مطابق کرتے ہیں۔" اکبر علی خاں تعارف : نکات و رقعات سری نگر ۱۹۶۲ء، صفحہ -

دو ضمیمتاً عالیہ اشاعتیں :

★ مرتبہ : اکبر علی خاں، سری نگر، اکتوبر ۱۹۶۲ء

★ مرتبہ : خلیل الرحمن داؤدی، مشمولہ : مجموعۂ نثر غالب اردو، لاہور، ۱۹۶۷ء، صفحہ ۱-۵۸

کلیّاتِ نثرِ غالب :

★ طبع اوّل : مطبع نولکشور، لکھنؤ جنوری ۱۸۶۸ء

ضخامت : ۲۱۲ صفحات مسطر : ۱۹ سطری

سائز : ۳/۴ ۸ × ۱/۴ ۱۱ متن (حروف) : ۱/۲ ۶ × دو سوت کم دس انچ

یہ کتاب علی الترتیب، پنج آہنگ، مہر نیمروز اور دستنبو پر مشتمل ہے۔ شروع میں دو صفحات پر پھیلی ہوئی پوری کتاب کے مندرجات کی فہرست ہے : "فہرست کلیات غالب"۔ پھر دبیز بادامی کاغذ پر ٹائٹل پیج ہے :

• بہ افضال و فیض مفیض مطلق و حسن توفیق موفق برحق و میامن فیض حق تعا

کُلیّاتِ نثرِ غالب

مترشحہ ابر سیاہ خامۂ گہر بار دبیر سحر نگار شاعر ہمہ دان مستند جہان رشک سحبان

نجم الدولہ دبیر الملک نواب اسد اللہ خان غالب

در مطبع خاص و فیض اختصاص منشی نولکشور بہ طبع تنویری رونق دلپذیری یافت

اس کی پشت پر مالک مطبع کی جانب سے "گزارش" چھپی ہے :

"...... ہرسہ نثر جناب نواب صاحب موصوف، یعنی پنج آہنگ[۱] و "مہر نیمروز" و "دستنبو[۲]" در شش جہت کالشمس فی النصف النہار محتاج اظہار اوصاف نیست.... الحمد للہ والمنۃ کہ مرادم از قوۃ بفعل آمد و انطباعش موجب ازدیاد افتخار در ہم عصران گردید...."

اس دبیز بادامی کاغذ کے سرورق اور "گزارش" کے بعد، اس عام باریک کاغذ پر، جس پر ساری کتاب چھپی ہے، پھر سرورق کی لوح اور عبارت ہے، اس کی پشت سے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کا عنوان دے کر کتاب کا متن شروع ہو جاتا ہے۔ کتاب ۲۹ سطری مسطر پر چھپی ہے۔ پہلے صفحے (یعنی صفحہ ۲) پر سترہ سطریں آئی ہیں۔ ابتدائی بارہ سطروں کی جگہ لوح نے گھیری ہے۔

نثرِ اول: "پنج آہنگ": صفحہ ۲ تا ۱۲۲

دیباچہ: صفحہ ۲، آہنگ اول: ۳، آہنگ دوم: ۱۱، آہنگ سوم: ۱۸، آہنگ چہارم: ۲۳، آہنگ پنجم: صفحہ ۴۵ تا ۱۲۱۔ صفحہ ۱۲۲ پر "خاتمۂ پنج آہنگ" کی عبارت، غالب کے قلم سے اضافہ ہوئی ہے۔

کلیات کی اس اشاعت میں "پنج آہنگ" طبع دوم، جداگانہ (۱۸۵۳ء) کے مقابلے میں "آہنگ چہارم" میں تین تحریریں اور "آہنگ پنجم" کے آخر میں بارہ خط زیادہ ہیں۔ "پنج آہنگ" (۱۸۵۳ء) میں "آہنگ چہارم" "دیباچہ تذکرہ موسوم بہ طلسمِ راز فراہم آوردۂ میر مہدی" پر ختم ہوا تھا۔ "کلیات" کے زیرِ بحث ایڈیشن میں بتفصیلِ ذیل مزید تین نثری تحریریں ملتی ہیں:

- پہلی عبارت کے ابتدائی کلمات: "کمالِ کلام وابستۂ افتتاحِ باب کلام بمفتاح حمد احد و مدح احمد است ...."

  (صفحہ ۴۳، ۱۲ سطریں)

- دوسری عبارت کے ابتدائی کلمات: جہان خدای را سپاس وجہانیان ...

  (صفحہ ۴۳ (۷ سطریں)، صفحہ ۴۴ (۲۹ سطریں)

  صفحہ ۴۵ (۲ سطریں) کل: ۳۸ سطریں)

ان دونوں تحریروں کا سرعنوان "بسم اللہ الرحمن الرحیم" ہے اور یہ رامپور کے زمانۂ قیام کی یادگار ہیں۔ تیسری عبارت کا جلی عنوان یہ درج کیا گیا ہے:

٭ تقریظ ریختہ خامہ جناب فیض مآب نواب والا جناب نجم الدولہ دبیر الملک نواب محمد اسد اللہ خان غالب نظام جنگ دام اقبالہ

یہ مولوی ظہور علی کے مرتبہ تذکرے کی تقریظ ہے۔ آغاز ایک شعر سے ہوتا ہے۔ مصرعۂ اولیٰ یہ ہے : "خدایا چہ گویم کی شاہی ترا است"۔ اس ۱۹ سطری تقریظ (صفحہ ۴۵) کا آخری ٹکڑا یہ ہے : ".... از عمر و دولت برخوردار باد، فقط"

"پنج آہنگ" (طبع دوم، ۱۸۵۳ء) کا پانچواں آہنگ، یوسف مرزا کے نام ایک خط پر ختم ہوتا ہے جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے "... دیگران چشم پوشیدہ و در افزون آگاہی خویش کوشند، اسد اللہ، فقط" (صفحہ ۲۴۴) "کلیات" کے زیر نظر ایڈیشن میں یوسف مرزا کے نام مذکورہ خط کے بعد، بارہ خطوط کا اضافہ ہوا ہے، تفصیل یہ ہے :

۱۔ بنام، مولوی عبدالوہاب لکھنوی : صفحہ ۱۱۶

۲۔ بنام سلطان زادہ بشیر الدین میسوری : صفحہ ۱۱۶

۳۔ بنام گل محمد خاں ناطق مکرانی : صفحہ ۱۱۷

۴۔ بنام مولانا محمد عباس بھوپالی : صفحہ ۱۱۸

۵۔ بنام مولوی محمد حبیب اللہ منشی نواب مختار الملک نائب والیٔ حیدر آباد : صفحہ ۱۱۸

۶۔ عرضداشت بنام نامی نواب مختار الملک، نائب والی حیدر آباد : صفحہ ۱۱۹

۷۔ عرضداشت بہ اسم سامی اشرف شہزادگان میسور بہ اعلیٰ حضرت سلطان محمد بہادر : صفحہ ۱۱۹

۸۔ ۹ اور ۱۰۔ بنام : منشی جواہر سنگھ جوہر : صفحہ ۱۲۰

۱۱۔ بنام دو تن از فرزانگانِ پنجاب : صفحہ ۱۲۱

۱۲۔ بنام : محمد آغا حسین ناخدای شیرازی : صفحہ ۱۲۱

نثرِ دوم : "مہرِ نیمروز" : صفحہ ۱۲۳ - ۱۸۸

صفحہ ۱۲۳ کی صورت "پارٹیشن پیج" یا ذیلی سرورق کی سی ہے. کتاب کا متن صفحہ ۱۲۴ سے شروع ہو کر ۱۸۷ پر ختم ہو گیا ہے۔ صفحہ ۱۸۸ کا نمبر دیا گیا ہے لیکن صفحہ معریٰ چھوڑ دیا ہے۔ اس کے بعد دو صفحات (جن کے نمبر نہیں دیے گئے) "مہرِ نیمروز" کی "فرہنگ" پر مشتمل ہیں۔

نثرِ سوم : "دستنبو" : صفحہ ۱۸۹-۲۱۲

کتاب ۱۹۰ سے شروع ہوتی ہے اور ۲۰۷ پر ختم ہو جاتی ہے۔ صفحہ ۲۰۷ ہی سے قصیدہ در مدح ملکہ معظمہ انگلستان، چار کالم میں طبع ہوا ہے اور ۲۰۸ پر ختم ہوتا ہے۔ صفحہ ۲۰۸ ہی کے آخر میں قطعہ در بیان روشنی، دہلی درج ہے، صفحہ ۲۰۹ تا ۲۱۱ "دستنبو" کی فرہنگ ہے۔ مالک رام کے بقول "کلیات" میں "مہرِ نیمروز" اور "دستنبو":

> "دونوں کتابوں کا متن جوں کا توں ہے. لیکن دونوں کے آخر میں مشکل الفاظ کے فرہنگ مرتب کروا کے اضافہ کیے گئے ہیں، جو یقیناً مفید ہیں کیوں کہ ان کتابوں میں نادر اور نامانوس الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں جو عام فہم نہیں ہیں ..." (نگار، لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۰۳)

کلیات کے آخری صفحہ ۲۱۲ پر "خاتمہ الطبع" کی عبارت (از : مولوی عیش شاہد) یہ ہے:

> "کلیات نثر" مشکیو اعنے پنج آہنگ[۱]، و مہرِ نیمروز[۲] و دستنبو[۳] کہ در سلاست و متانت عبارت لاجواب و بے مثال ست در مطبع ....
> .... منشی نولکشور صاحب دام اقبالہ خوش خط و عمدہ بہ نہایت تصحیح و تنقیح بسعی کارگزاران مطبع موصوف، بماہ جنوری ۱۸۶۸ء مطابق شہر رمضان المبارک ۱۲۸۴ ہجری لباس انطباع پوشیدہ مرغوب انام و مطبوع خواص و عوام گردید فقط :

قطعۂ تاریخ از راقمہ

زہے این کلیات نثر غالب — کہ شد مسرور ہر طبعے ز طبعش

رقم زد بہر سال از رہ انصاف — بود مطبوع دلہا نثر دلکش

۱۲۸۴ھ

تمّت

پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور کے کیفی کلکشن میں "کلیاتِ نثرِ غالب" طبع اوّل کا ایک نسخہ راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے۔ اس کا کیٹلاگ نمبر یہ ہے: (Kpi x 4 a)۔ اِس نسخے کے سرورق پر بقلم کیفی نام و تاریخ وغیرہ درج ہے:

"B.m.Dattatrya, Kaifi,Lahore 16.7.1934"

پنجاب پبلک لائبریری، لاہور میں "۹۶، ۸۷۱ پنج" کے نمبر و حروف کے ساتھ "کلّیاتِ نثرِ غالب" کا ایک خطی نسخہ موجود ہے۔ یہ اصلاً ڈاکٹر اظہر علی (لاہور) کی ملکیت تھا، انھوں نے اسے پبلک لائبریری کو ہدیہ کیا ہے۔ کلیات کا یہ قلمی نسخہ بالترتیب "پنج آہنگ"، "مہرِ نیم روز" اور "دستنبو" پر مشتمل ہے۔ خط بہت روشن ہے، کتابت بہت صاف صاف اور قلم سنبھال کر کی گئی ہے۔ اول تا آخر پندرہ سطری مسطر ہے۔ سرعنوان وغیرہ شرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ "پنج آہنگ" کی عبارت ورق ۱۵۹/ب پر ختم ہوئی ہے۔ آخری خط بنام "صاحب عالم میرزا بشیر الدین بہادر" کی آخری عبارت یہ ہے "..... ارمغان خواہد بود شبہا شب عید و روزہا نوروز باد فقط"۔ ورق ۱۵۹/ب پر صرف چار سطریں آئی ہیں، صفحے کا بقیہ حصہ خالی ہے۔ ورق ۱۶۰/الف بیاض چھوڑ دیا گیا ہے۔ ورق ۱۶۰/ب کے آخر میں بخطِ شکستہ صرف ترقیمے کی یہ عبارت درج ہے:

"کتاب ہٰذا بتاریخ ہفتم شہر جمادی الثانی ۱۲۷۸ ہجریہ[1] قدسیہ روز سہ شنبہ دو پاس از روز گزشتہ باصرار دالسراج خاطر فرخندہ سیر نور البصر قوۃ باصرہ بخت بلندی عزّہ ناصیہ سعادت مندی، گنجینۂ ارادت و فرخندگی مقبولِ بارگاہ لم یزل سید مہدی موسوی معروف میر مہدی

---

[1] مطابق: ۱۰ دسمبر ۱۸۶۱ء

حفظ اللہ تعالیٰ عن الآفات الدہر بقلم سید حسن موسوی مشہور میر حسن اختتام یافت"

ورق ۱۹۱ الف/ب، نیز ۱۹۲/الف بیاض چھوڑ دیا گیا ہے۔ "مہر نیم روز" ورق ۱۹۲/ب سے شروع ہو کر ۲۴۹/ب کی پہلی چار سطروں پر ختم ہوتی ہے۔ آخری سطر ان تین لفظوں پر مشتمل ہے: "گرم شود فقط"۔ صفحے کا بقیہ حصہ سادہ ہے۔ ورق ۲۵۰/الف خالی ہے۔ ورق ۲۵۰/ب کے آخر میں پختہ و شکستہ خط میں ترقیمہ ہے:

"المنت للہ تعالیٰ کہ تاریخ لہٰذا بتاریخ چہاردہم شہر ربیع الثانی ۱۲۷۹ ہجریہ[1] قدسیہ بمقام دہلی حسب فرمائش قوۂ باصرہ بخت بلندی غرہ ناصیۂ سعادت مندی نور البصر فرخندہ سیر عزیز از جان آسائش روان میر مہدی حفظہ اللہ تعالیٰ عن الآفات الدہر بدستخط خاکسار پریشان روزگار سید حسن موسوی معروف میر حسن اختتام یافت:

ہر کہ خواند دعا طمع دارم

زان کہ من بندۂ گنہگارم

"مہر نیم روز" کے اس ترقیمے کی کتابت کے بعد متعدد اوراق معریٰ چھوڑ دیے گئے ہیں، "مہر دستنبو" کی عبارت نقل ہوئی ہے۔ "دستنبو" کے قطعات تاریخ آغاز و انجام (از مہر و تفتہ) کے بعد یہ فقرہ ہاتھ سنبھال کر صاف صاف لکھا گیا ہے:

"این رسالہ بہ قرۃ العین میر سرفراز حسین فرستادہ آمد"

اس فقرے کا قلم اور خط وہی ہے جس سے پوری "کلیات" لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد ماقبل کے ترقیموں کی طرح خفی قلم سے رواں و شکستہ انداز میں ترقیمہ ہے:

"این رسالہ را بہ استمداد فرخندہ سیر، سعادت گستر، آسائش روان، عزیز از جان اسوۂ آلِ نبیؐ و اولادِ علی، سید مہدی حفظہ اللہ تعالیٰ فی الارض بتاریخ بست و ہشتم[28]

---

[1] مطابق: ۹؍ اکتوبر ۱۸۶۲ء

محرم سنہ ۱۲۸۰ ہجریہ[1] قدسیہ بمقام دہلی در حویلی مہابت خان،
خاکسار پریشان روزگار، گنہ گار بارگاہ ستار و غفار، سید حسن
موسوی مشہور میر حسن بہ وقت سہ پہر روز پنجشنبہ ختم نمود ؎

ہر کہ خواند دعا طمع دارم
زان کہ من بندۂ گنہگارم

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ ۔"

ترقیمے کی یہ عبارتیں اہم ہیں، ان سے زمانۂ کتابت، کاتب اور نسخے کے ملک کا پتہ چلتا ہے۔

انیسویں صدی کی مطبع نولکشور کی بعض دیگر اشاعتیں :

- ★ کانپور : ۱۸۷۵ء
- ★ لکھنؤ : ۱۸۷۱ء ۱۸۷۵ء، ۱۸۸۴ء، ۱۸۸۸ء۔

---

[1] مطابق : ۱۵۔ جولائی ۱۸۶۳ء

پانچواں باب

تصانیفِ غالب : (قضیۂ برہان) : فارسی

۱۔ قاطع برہان : لکھنؤ، ۱۸۶۲ء

۲۔ درفش کاویانی : دہلی، ۱۸۶۵ء

۳۔ قطعہ غالب : دہلی، ۱۸۶۶ء

قاطع بُرہان :

طبع اول : مطبع نولکشور اودھ اخبار، لکھنؤ، ۲۱، مارچ ۱۸۶۲ء
ضخامت : ۹۸ صفحات　　مسطر : ۲۳ سطری
سائز : تقریباً ½ ۱۰ × ½ ۷ انچ

انقلاب ۱۸۵۷ء کے پُر آشوب زمانے میں غالب زیادہ تر خانہ نشین رہے قلعۂ معلیٰ کی حاضری اور مراسلت کا سلسلہ جو اُن کے لیے وقت کٹی کا بڑا اچھا شغل تھا، موقوف ہو گیا تو بیکاری کی اذیت سے بچنے کے لیے انھوں نے اپنی سرگزشت لکھنی شروع کی، ۱۸، نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط بنام سرور میں لکھتے ہیں کہ :

"۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اسی دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگزشت لکھنی شروع کی۔ جو سُنا گیا، وہ بھی ضمیمۂ سرگزشت کرتا گیا..... مگر بطریق لزوم مالا یلزم' اس کا التزام کیا ہے کہ بزبانِ فارسیٔ قدیم، جو دساتیر کی زبان ہے، اُس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اسمار کے، کہ وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغت عربی، اس میں نہ آوے...."

یہ "سرگزشت" "دستنبو" کے نام سے شائع ہوئی۔

"قاطع بُرہان" کو شیخ محمد اکرام کے بقول : "دستنبو" کا ثمرِ معنوی سمجھنا چاہیے۔ "دستنبو" کی تحریر میں مرزا غالب نے، عربی الفاظ استعمال نہ کرنے کا التزام کیا تھا۔ اب، انھیں الفاظ کے اصل اور معانی پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت پڑی جس کے لیے انھوں نے مشہور

فارسی لغت "برہانِ قاطع"[1] کا غائر مطالعہ کیا۔ علاوہ ازیں، اس وقت ان کے پاس پارسیوں کی کتاب "دساتیر" بھی تھی، اور چوں کہ عربی الفاظ ترک کرنے کی وجہ سے قدیم فارسی کے کئی الفاظ انہیں استعمال کرنے پڑے، انہوں نے دیکھا ہو گا کہ "برہان قاطع" میں جو معنی دیے گئے ہیں وہ "دساتیر" کی عبارت پر نہیں پھبتے۔ چنانچہ جب "دستنبو" ختم ہو گئی اور انہیں "برہان" کو بغور پڑھنے کی فرصت ملی تو انہیں کئی بے قاعدگیاں نظر آئیں[2]..... "وہ "برہانِ قاطع" کے زیرِ مطالعہ نسخے کے حاشیے پر اپنے اعتراضات لکھتے رہے۔ فروری مارچ ۱۸۵۹ء میں وہ "برہان قاطع" کو دیکھتے اور اس کے فہم کی غلطیاں نکالنے میں مصروف تھے اور یہ ارادہ کر چکے تھے کہ ان نکات کو جمع کر کے، اس نسخے کا نام "قاطع برہان" رکھیں گے۔ چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں غالب صاحبِ عالم کی طرف روئے سخن کر کے لکھتے ہیں :

"جن لوگوں کے محقق ہونے پر اتفاق ہے جمہور کو، اُن کا حال کیا گزارش کروں۔ ایک ان میں صاحبِ "برہان قاطع" ہے، اب ان دنوں میں "برہانِ قاطع" کو دیکھ رہا ہوں اور اس کے فہم کی غلطیاں نکال رہا ہوں۔ اگر زیست باقی ہے تو ان نکات کو جمع کر کے اس نسخے کا نام "قاطع برہان" رکھوں گا....." (فروری مارچ ۱۸۵۹ء)

---

[1] "برہانِ قاطع" یہ فرہنگ محمد حسین برہان ابن خلف تبریزی ثم دکنی نے قطب شاہی دربار کے لیے ۱۰۶۲ھ مطابق ۱۶۵۲ء میں لکھی۔ مولانا مہر کے بقول "برہانِ قاطع" کے مولف تبریزی مشہور تھے، اس لیے کہ ان آبا و اجداد تبریز سے ہندوستان آئے تھے لیکن وہ خود ہندوستان میں پیدا ہوئے اور دکن میں ان کی ساری عمر گزری اسی وجہ سے غالب ان کو جابجا "دکنی" کہتے ہیں۔ (غالب، طبع چہارم، ص ۴۲۴) ..... عصرِ حاضر کے ایرانی دانشور اور لغوی دکتر محمد معین نے "برہانِ قاطع" کو ۱۹۶۳ء میں تہران سے "بسرمایۂ کتاب فروشی ابن سینا" بتفصیل ذیل شائع کیا ہے :

مقدمہ مرتب، دکتر محمد معین : ۱۵۰ صفحات، دیباچہ مولف محمد حسین برہان : ۴۰ صفحات

جلد اوّل : آ تا ث، صفحہ ۱ - ۵۵۰ جلد دوم : ج تا س، صفحہ ۵۵۱ - ۱۲۱۶

جلد سوم : ش تا ل، صفحہ ۱۲۱۷ - ۱۹۲۳ جلد چہارم : م تا ی، صفحہ ۱۹۲۴ - ۲۴۶۹

جلد پنجم : تعلیقات، دکتر محمد معین : ۲۸۷ صفحات

[2] غالب نامہ، آثار غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۹۷ و بعد

"برہانِ قاطع" کے حاشیوں پر جو تعلیقات اور اشارے وہ لکھتے رہے تھے، اسے اُنھوں نے خوشنویس سے الگ لکھوا لیا اور تیسری چوتھی نظر میں یہ مختصر تحریریں اور یادداشتیں اچھی خاصی کتاب کی صورت اختیار کر گئیں۔ صاحب عالم کے نام ۱۸۵۹ء کے لگ بھگ وسط کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"حضرت! نسخہ "قاطعِ بُرہان" تیسری چوتھی نظر میں مکمل ہو کر، مسودات، ایک کاتب کے حوالے ہوئے۔ آٹھ جزو لکھے گئے، کم و بیش دو جزو باقی ہیں۔ پرسوں تک آجائیں گے۔ بعد اس کے انطباع کی فکر ہوگی۔ جب وہ عزیمت امضا پذیر ہو جائے گی، حضرت کی نظر سے شرف پائے گی۔"

جولائی ۱۸۵۹ء کے ایک خط بنام مجروح سے "تیسری چوتھی نظر" والی بات ذرا کھل کر سامنے آتی ہے:

"قاطعِ بُرہان" کے مسودے سب میں نے پھاڑ ڈالے، اس واسطے کہ ہر نظر میں اس کی صورت بدلتی گئی، وہ تحریر بالکل مغشوش ہو گئی۔ ہاں، اس کی نقلیں صاف، کہ جس میں کسی طرح کی غلطی نہیں نواب صاحب (؟) نے کر لی ہیں، ایک میرے واسطے، ایک بھائی ضیاء الدین خاں کے واسطے۔ میری ملک کی جو کتاب ہے، اس کی جلد بندھ جائے تو بطریقِ مستعار بھیج دوں گا۔ تم اس کی نقل لے کر میری کتاب مجھ کو پھیر دینا.....؟

اگست، ستمبر ۱۸۵۹ء کے ایک خط بنام چودھری عبدالغفور سرور میں صاحبِ عالم سے کہتے ہیں:

"اس واماندگی کے دنوں میں چھاپے کی "برہانِ قاطع" میرے پاس تھی، اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط، ہزارہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارات پادر ہوا۔ میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر، ایک مجموعہ بنایا ہے اور "قاطعِ بُرہان" اس کا نام رکھا ہے۔ چھپوانے کا مقدور نہ تھا۔ مسودہ، کاتب سے صاف کروا لیا ہے۔ اگر کہو تو بہ سبیل مستعار بھیج دوں؟ تم اور چودھری صاحب اور جو اور سخن شناس اور منصف ہوں، وہ اس کو دیکھیں اور پھر میری کتاب میرے پاس پہنچ جائے.....؟

اواخر ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں پھر رُوئے سخن، صاحبِ عالم کی طرف ہے اور خط چودھری

عبدالغفور سرور کے نام ہے :

" قاطع برہان" چودھری صاحب کی نثر کے اجزا کے ساتھ بھیجا جائے گا۔ بمقابلہ "برہان قاطع" منطبعہ دیکھا جائے اور بے حیف و بے میل، از راہِ انصاف دیکھا جائے ...."

" قاطع برہان" میں غالب برابر اضافہ کرتے رہے اور بشرطِ مقدور اسے اپنے خرچ پر چھپوانے کا عزم بھی تھا :

" قاطع برہان" کے خاتمے میں کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں، اگر مقدور مساعدت کرے گا تو مَیں، بے شرکتِ غیر اس کو چھپواؤں گا، مگر یہ خیال محال ہے۔ میرے مقدور کی تیاری کا حال مجتہد العصر کو معلوم ہے ....."

(بنام مجروح، جولائی ۱۸۶۱ء)

اوائل اکتوبر ۱۸۶۱ء تک وہ اس کی اشاعت کی فکر ہی میں تھے اور کوئی صورت ابھی سامنے آئی نہیں تھی :

" مَیں " برہانِ قاطع " کا خاکہ اڑا رہا ہوں۔ " چار شربت[1] " اور " غیاث اللغات[2] " کو حیض کا لتہ سمجھتا ہوں۔ ایسے گمنام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا؟ " برہانِ قاطع " کے اغلاط بہت نکالے ہیں۔ دس جزو کا ایک رسالہ لکھا ہے، اس کا نام " قاطع برہان " رکھا ہے۔ اب، اس کے چھاپے کی فکر ہے۔ اگر یہ مدعا حاصل ہو گیا تو ایک جلد چھاپے کی تم کو بھیج دوں گا، ورنہ کاتب سے نقل کروا کر قلمی، ایک جلد بھیج دوں گا۔ بہت سود مند نسخہ ہے ....." (بنام : تفتہ، ۴، اکتوبر ۱۸۶۱ء)

یہ بہت " سود مند نسخہ " بالآخر تالیف و تکمیل کے قریب تین سال بعد مطبع نولکشور، لکھنو سے مارچ ۱۸۶۲ء کے اواخر میں اشاعت پذیر ہوا۔

---

[1] چار شربت : محمد حسن قتیل کی تالیف، جس میں عروض و قافیہ، اصطلاحات اہلِ زبان، آداب و اصولِ نثر نگاری اور رقعات و مکاتیب ہیں۔

[2] غیاث اللغات : درسیات قدیم سے متعلق مواد پر مشتمل، ملا غیاث الدین رامپوری کا لغت نامہ۔

اودھ اخبار لکھنؤ کی اشاعت یکم جنوری ۱۸۶۲ء میں بزبانِ فارسی "اشتہار قاطع برُہان" شائع ہوا ہے[1] جس کے مطابق :

"طبع ایں کتاب کہ از دہ جز بیش نباشد قریب اختتام رسید۔ یقین کہ در دو ہفتہ طیار گردد و قابل تماشائے اولی الابصار گردد۔"

یہ اشتہار اخبار اودھ کی مابعد اشاعت ۸۔ جنوری ۱۸۶۲ء میں بھی شائع ہُوا۔ اشتہار میں اس یقین کا اظہار کیا گیا تھا کہ کتاب کی طباعت دو ہفتے میں مکمل ہو جائے گی لیکن اس کی تیاری اور تکمیل میں دو مہینے سے زیادہ لگ گئے تا آنکہ اودھ اخبار کی اشاعت ۲۶۔ مارچ ۱۸۶۲ء میں "اشتہار اختتام قاطع برُہان" شائع ہوا جس میں یہ نوید دی گئی کہ "طبعش بانجام رسیدہ"

"قاطع برُہان" کی اشاعت کا یہ "اشتہار اختتام" مابعد اودھ اخبار کی اشاعت ۲۔ اپریل ۱۸۶۲ء اور ۹۔ اپریل ۱۸۶۲ء میں بھی چھاپا گیا۔[2]

طبع اوّل کی کتابت، اُردو کے مشہور شاعر منشی امیر اللہ تسلیم نے کی تھی جو، اُس زمانے میں خوشنویس کی حیثیت سے مطبع نولکشور سے وابستہ تھے۔ اِس اَمر کا ذکر خود تسلیم نے، اُس قطعۂ تاریخ میں کیا ہے جو کتاب کے آخر میں چھپا ہے۔ منشی امیر اللہ

---

[1] بحوالہ محمد عتیق صدیقی، غالب نامہ، نئی دہلی جلد ۱، شمارہ ۳۔۴، ص ۲۶

[2] محمد عتیق صدیقی کی تصدیق کے مطابق "اشتہار قاطع برُہان" اور "اشتہار اختتام قاطع برُہان" دونوں کی عبارتیں ایک ہی ہیں البتہ آخری سطروں میں حسبِ ضرورت معمولی سی ترمیم کی گئی تھی۔

غالب نامہ، نئی دہلی، شمارہ ۳۔۴، ص ۲۷

تسلیم کے بشمول جن مختلف اصحاب کی تاریخیں، "قاطع برہان" (صفحہ ۹۳ - ۹۷) میں چھپی ہیں، اُن میں غالب کے شاگرد سیّد مقصود عالم مقصود پھپانوی، مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب، مرزا یوسف علی خاں عزیز اور منشی جواہر سنگھ جواہر بھی شامل ہیں۔

کتاب کے مباحث صفحہ ۹۲ پر ختم ہو گئے ہیں۔ صفحہ ۹۲، ۹۳ پر "خاتمۃ الطبع" کی عبارت مطبع کی طرف سے ہے جس کے مطابق کتاب کا چھاپا ۲۰ رمضان سنہ ۱۲۷۸ ہجری، مطابق ۲۱ مارچ ۱۸۶۲ء کو تمام ہوا۔ صفحہ ۹۳ - ۹۷ پر قطعاتِ تاریخ اور صفحہ ۹۸ پر کتاب کا صحت نامہ ہے۔ قطعاتِ تاریخ کے بعد صفحہ ۹۷ ہی پر غالب کی نوشتہ ایک مختصر سی تقریظ ہے، جس کے آخر میں غالب کی خطابی مہر ہے۔ یہ عبارت اس امر پر مظہر ہے کہ کتاب منشی نولکشور صاحب کی توجہ اور مہربانی سے چھپی۔ غالب لکھتے ہیں کہ :

"سراپا دانش و ہمہ تن بینش منشی نولکشور بجای آرکہ بخریداری دوکانِ بے رونق کمر بست تا نقش ایں کلکتیرہ ہا در انطباع درست نشست۔ اگر ایں جواں مرد بیدار دل بہ بستن شیرازہ اوراق پریشان نہ پرداختی، کاغذ مسودات "قاطع برہان" را یا کاغذ گر بردی و بآب آغشتہ فرو کوفتی یا سر مر فروش خریدی تا پکسر باساختی۔"

لیکن غالب کے ایک خط مرقومہ ۳۰ جولائی ۱۸۶۵ء سے پتہ چلتا ہے کہ "قاطع برہان" نواب یوسف علی خاں ناظم، والیٔ رام پور کی مالی اعانت سے چھپی تھی۔ میاں داد خاں سیّاح کو لکھتے ہیں :

"میرے پاس روپیہ کہاں جو "قاطع برہان" کو دوبارہ چھپواؤں؟ پہلے بھی نواب مغفور (ناظم، والیٔ رامپور) نے دو سو روپے بھیج دیے تھے۔ تب پہلا مسوّدہ صاف ہو کر چھپوایا گیا تھا۔۔۔۔"

مولانا غلام رسول مہر اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "نواب یوسف علی خاں نے جو دو سو روپے بسلسلہ طباعت "قاطع" بھیجے تھے، دوسری ضروریات میں صرف ہو گئے۔ کتاب منشی نولکشور نے چھاپ دی[1]۔۔۔" قاضی عبدالودود کہتے ہیں کہ "قاطع برہان" کی تقریظِ غالب کے الفاظ

---

[1] غالب، طبع چہارم، لاہور، ۱۹۴۶ء، صفحہ ۴۲۶

سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ "قاطع" کے چھاپنے کے لیے نواب یوسف علی خاں کا دو سو روپے دینا افسانۂ محض ہے۔"[1]

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ مختلف اوقات میں اپنی تصانیف میں سے دستنبو، دیوانِ اردو[2] اور کلیات فارسی[3] کے نسخوں کا نواب یوسف علی خاں بہادر والئ رام پور کو بطریق ارمغان بھیجا جانا، غالب کے خطوں سے ثابت ہے لیکن "قاطع برہان" کے بارے میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ نواب یوسف علی خاں کے نام خطوں میں سے کسی میں "قاطع برہان" کا ذکر تک نہیں آیا۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی لکھتے ہیں کہ طباعت "قاطع برہان" کے لیے دو سو روپے کی جس رقم کا ذکر خود میرزا غالب نے سیاح کے نام کے مذکورہ خط میں کیا ہے رامپور کے سرکاری خزانے کی "کسی مثل میں اس کا حوالہ نہیں ملتا"[4] کہ یہ کب عطا ہوئی۔

بہر نوع، کتاب، مطبع منشی نولکشور، اودھ اخبار، لکھنؤ سے چھپی اور گو خاتمۃ الطبع، کی عبارت کے مطابق کتاب کا چھاپا ۲۱ مارچ ۱۸۶۲ء کو تمام ہوا لیکن اوائل مئی ۱۸۶۲ء تک غالب کو اس کی بھی اطلاع نہیں تھی کہ کتاب کی جلد بندی ہو چکی یا نہیں؟ قدر بلگرامی سے' جو غالب ہی کے ایما پر مطبع نولکشور میں ملازم ہوئے تھے، پوچھتے ہیں کہ:

"قاطع برہان" کے اجزا کی جلدیں بندھ گئی ہیں یا نہیں؟"

(پنجم مئی، ۱۸۶۲ء)

وسط مئی ۱۸۶۲ء کے ایک خط موسومہ مجروح سے پتہ چلتا ہے کہ "قاطع برہان" حلیۂ انطباع سے آراستہ ہو کر ان تک پہنچ گئی اور یہ کہ کتاب کی قیمت ایک روپیہ فی نسخہ مقرر ہوئی اور غالب نے پچاس نسخے خریدنا طے کیے تھے:

"قاطع برہان" کا چھاپا ختم ہوا۔ ایک جلد بطریق نمونہ آگئی۔ میں نے پچاس جلدوں کی درخواست پہلے سے دے رکھی ہے۔ اب پچاس روپے بھیجوں'

---

[1] آثارِ غالب، در: علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۴۸

[2]، [3] مکاتیب غالب، عرشی، طبع دوم ۱۹۴۳ء، مکاتیب، صفحہ ۱۰ و بر بعد، نیز صفحہ ۲۰ (علی الترتیب)

[4] مکاتیب غالب، عرشی، طبع دوم ۱۹۴۳ء، دیباچہ، صفحہ ۱۲۸

تو انچاس جلدیں منگواؤں۔ دیکھیے تو من تیل کب میسّر ہو اور رادھا کب ناچے۔"

(۱۵، ۱۶، مئی ۱۸۶۲ء)

وسط جون ۱۸۶۲ء میں علائی کو لکھتے ہیں:

"قاطع برہان" کا چھاپا تمام ہو گیا۔ حقّ التصنیف کی ایک جلد میرے پاس آگئی۔ وہ تمہارے عمّ نامدار (نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں) کی نذر ہوئی۔ باقی جلدیں، جن کا میں خریدار ہوں اور درخواست میری مطبع میں داخل ہے، جب تک قیمت نہ بھیج دوں، کیوں کر آئیں؟ روپے کی تدبیر میں ہوں اگر بہم پہنچ جائے تو بھیج دوں...."

اسی خط میں مزید لکھتے ہیں کہ:

"تمہارے پاس جو "قاطع برہان" پہنچی ہے، اگر چھاپے کی ہے تو صحیح ہے۔ جہاں تردّد ہو غلط نامہ ملحقہ دیکھ لو۔ زیادہ انکشاف منظور ہو، مجھ سے پوچھ لو۔ اگر قلمی ہے تو درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ اس کو میری تالیف نہ سمجھو، بلکہ مجھ سے مول لے لو اور اس کو پھاڑ ڈالو...."

قلمی نسخے کے درجۂ اعتبار سے ساقط ہونے والی بات کا پس منظر یہ ہے کہ یہ کتاب تیسری چوتھی نظر میں مکمل ہوئی اور ہر نظر میں اس کی صورت بدلتی گئی۔ کتاب کی ابتدائی ترتیب و تسوید (فروری مارچ ۱۸۵۹ء) سے اس کی اشاعت (مارچ ۱۸۶۲ء) تک، اس میں حک و اصلاح اور ترمیم و اضافے کا عمل برابر جاری رہا۔ اس درمیانی عرصے میں اس کی قلمی نقلیں احباب اور تلامذہ میں گشت کرتی رہیں۔ یہ جرح و نقد کی کتاب تھی۔ غالب کے نزدیک پچھلے قلمی مسودے مغشوش تھے اس لیے، اپنے نام سے ان ناقص قلمی نسخوں کا انتساب انہیں قبول نہیں تھا اور وہ کتاب کی ان ابتدائی قلمی صورتوں کو تلف کر دینے کے حق میں تھے تاکہ اپنے ابتدائی بیانات کا بوجھ ان پر نہ آئے اور وہ ان کی قباحتوں سے بری الذمہ رہیں۔

پھر روپے کی کوئی تدبیر، جس کی وہ فکر میں تھے ہو گئی اور انہوں نے مطبع سے پچاس جلدیں مول لیں، یہ جلد ہی تقسیم ہو گئیں اور ستمبر ۱۸۶۲ء تک ان کے پاس کوئی نسخہ باقی نہیں رہا تھا۔

سید بدرالدین کاشف نے کتاب کی فرمائش کی تھی، انہیں لکھتے ہیں:

"یہ حقیقت مجھ سے سنیے، ۱۸۶۲ء یعنی سال گزشتہ میں "قاطع برہان" چھپی۔ پچاس جلدیں میں نے مول لیں اور یہ وہ زمانہ ہے کہ آپ دلی آئے۔ میں نے یہ سمجھ کر کہ یہ تمہارے کس کام کی ہے، تمہیں نہ دی۔ تم مانگتے اور میں نہ دیتا تو گنہ گار تھا، اب کوئی جلد باقی نہیں ہے۔" (ستمبر ۱۸۶۳ء)

"قاطع برہان" مطبوعہ کا صفحۂ آخر (۹۸) کتاب کے صحت نامے پر مشتمل ہے، بایں ہمہ کتاب کے صفحہ ۸۵ پر چند غلطیاں نظر انداز ہو گئی تھیں۔ یہ اُس وقت نظر میں آئیں جب کتاب کے متعدد نسخے قیمتاً یا تحفے میں دوسروں تک پہنچ گئے تھے۔ میرزا غالب نے ان اغلاط پر مطلع ہو کر مطبع احمدی، دہلی میں ۵ اگست ۱۸۶۲ء کو ایک "تتمہ غلط نامہ" چھپوا کر ان نسخوں میں شامل کیا جو باقی تھے اور جن حضرات کے پاس بے تتمے کے نسخے پہنچ گئے تھے، اُن سے درخواست کی کہ اس تتمے کے مطابق اپنے نسخے میں اصلاح فرمائیں یا اسے غلط نامۂ شاملہ کے بعد لگا لیں۔ چنانچہ ۱۱ اگست ۱۸۶۲ء کے ایک خط بنام انور الدولہ شفق میں لکھتے ہیں کہ:

"پیر و مرشد! آداب۔ "تتمہ غلط نامہ قاطع برہان" کو بھیجے ہوئے تین دن ہوئے ..... وہ ورق چھاپے کا جو آپ کے پاس بھیجا ہے، اس کو غلط نامہ شاملہ کے بعد لگا کر جلد بندھوا لیجئے گا ....."

چونکہ عام طور پر یہ تتمہ شاملِ کتاب نہیں ہے نیز اس کے ساتھ غالب کی ایک تحریر بھی چھپی ہے، اس لیے مولانا امتیاز علی عرشی نے ایک موقع پر اسے جوں کا توں نقل کر دیا ہے۔[1]

"قاطع بُرہان" مطبوعہ کا مختصر دیباچہ، غالب کے اس قطعۂ تاریخ پر تمام ہوتا ہے:

یافت چوں گو شمال زیں تحریر
آنکہ برہان قاطعش نامست
شد مسمی بہ "قاطع برہان"
"درس الفاظ" سال اتمامست

---

[1] تحریک، دہلی، اپریل، مئی ۱۹۶۱ء

اس قطعے سے کتاب کے مزاج اور بالخصوص اس کے اندازِ نگارش کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ "درسِ الفاظ" مادۂ تاریخ ہے جس سے ۱۲۷۶ کا عدد برآمد ہوتا ہے جو اس کتاب کا ہجری سالِ اتمامِ تالیف ہے اور ۱۸۵۹ء سنہ عیسوی کے مطابق ہے۔ حالی "یادگارِ غالب" میں سہواً جو یہ لکھ گئے ہیں کہ "قاطع برہان ۱۲۷۶ھ میں چھپ کر شائع ہو گئی" اس سہو کی بنیاد یہی "درسِ الفاظ" کے لفظ ہیں۔ اس سال کتاب لکھی گئی چھپی ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں جیسا کہ "قاطع برہان" کے آخر کے (صفحہ ۹۳-۹۷) قطعاتِ تاریخ اور "خاتمۃ الطبع" کی عبارت (صفحہ ۹۳) سے ظاہر ہے۔

"قاطع برہان" کے آغاز میں ایک دیباچہ اور خاتمے میں ایک تقریظ ہے جس کا اوپر ذکر آچکا۔ دیباچۂ مختصر کے مطالب مختصر تر الفاظ میں یہ ہیں: دید و دانش عطا کرنے والا خدا ہے۔ میں خدا سے دانش اور خلقِ خدا سے داد کا طالب ہوں۔ نہ مجھے محمد حسین دکنی سے بحث ہے، نہ اس کی تالیف "برہانِ قاطع" کی شہرت پر رشک ہے۔ مجھے اس مردۂ دو صد سالہ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ میں ۱۸۵۷ء کے ہمہ جہتی انقلاب کے دنوں میں تنہائی و بے نوائی کا شکار تھا۔ اپنے سائے کے علاوہ بجز "دساتیر" اور "برہان قاطع" ستم آباد، دہلی میں کوئی میرا ہم نشیں نہیں تھا۔ میں کنج کاشانہ میں پڑا تھا، اگرچہ نظربند نہیں تھا لیکن بے گزند بھی نہیں تھا۔ اپنی سرگزشت موسوم "دستنبو" کی نگارش سے فرصت پا چکا اور غمِ تنہائی نے زور کیا تو وقت کشی کے لیے "برہانِ قاطع" کو اٹھا کر سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ پہلی ہی نظر میں کچھ بے ربطیاں سی معلوم ہوئیں، پھر زیادہ غور سے دیکھا تو اکثر لغات کی تعریف غلط پائی۔ ایک ایک لفظ، متعدد فصلوں میں مختلف صورتوں سے لکھا دیکھا۔ شعراء نے جو الفاظ بطور مجاز و کنایہ کے استعمال کیے ہیں، ان کا ذکر بطور مستقل لغات کے دیکھا۔

طریقۂ بیان اکثر بھونڈا اور اصولِ لغت نگاری کے خلاف پایا[۱]۔ جامع لغات کو نہ حسنِ معنی سری سے کوئی تعلق، نہ جوہرِ لفظ پر اُس کی نظر۔ پراگندہ سر ژولیدہ بیاں۔ نہ اسے قاعدۂ استخراج کی پروا، اور نہ اندراج میں مہملات کو لغت ٹھہرانے میں اسے کوئی دریغ۔ ہر مصدر لغت اور ہر کلمہ مشتق لغت "ہر دیدہ ور کہ مغزِ سخن خواہد کافت"،

---

[۱] حالی نے بھی "قاطع برہان" کے بارے میں دیباچے کے پیشِ نظر یہی لفظ لکھے ہیں۔

بسا شورابہ ہای ناگوار رواں خواہد یافت۔" یہ کوئی آسمانی صحیفہ نہیں کہ اس میں چون وچرا کی گنجائش نہ ہو۔ گفتارِ آدمی ہے جو چاہے اسے میزانِ نظر میں تول سکتا ہے:

"کتاب آسمانی نیست کہ چوں وچرا دراں نہ گنجد، گفتار آدمی است ہر کہ خواہد بمیزان نظر سنجد۔ در نگرستن ایں نامہ کہ من سیاہ کردہ ام، شرط آنست کہ چوں بدیدن ایں سواد سویدا مداد دل نہند "برہان قاطع" در مقابل نہند چشم بسوی آں دارند وچشمی بسوی ایں، امّا چشم حقیقت نگر، نہ چشم غلط بین..."

اور چونکہ غالب کے نزدیک یہ سفینہ یعنی "برہان قاطع"، "گفتار ہائے نادرست" کا مجموعہ تھا اور لوگ اسی سے رہنمائی حاصل کرتے تھے، اس لیے علمی خیراندیشی یعنی عام فارسی دانوں کی صحیح سمت میں جادہ نمائی کی غرض سے انھوں نے، کہ تعلیم وتدریس اُن کا شغل تھا "قاطع برہان" تالیف کی تاکہ کم از کم اُن کے تلامذہ گمراہ اور بے راہ نہ ہوں۔

دیباچے کے آخر میں انھوں نے اپنے طریقِ بحث کو واضح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انھوں نے اس مجموعے میں اپنی بات دو طرح سے کہی ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ پہلے "برہان قاطع" کی عبارت کا اقتباس درج کیا گیا ہے اور پھر "قاطع برہان" کا عنوان قائم کرکے برہان کی پیش کردہ عبارت اور اس کے مطالب پر تنقید کی گئی ہے اور دوسری صورت میں انھوں نے اپنے انتقاد کا عنوان "تنبیہ" قرار دے کر، اس کے تحت برہان کے کسی ایک یا زیادہ کلمات پر جرح وتعدیل سے کام لیا ہے۔ دیباچے میں اس کا ذکر نہیں آیا لیکن "قاطع برہان" کے خاتمے پر کچھ "فوائد" بھی ملحق ہیں۔

غالب نے "قاطع برہان" کو کئی برس کی جگر پڑوہی اور گہرے تفحص کے بعد اتمام کو پہنچایا تھا اور فارسی لغات پر، اس میں انھوں نے جس وضع وسطح پر دادِ تحقیق دی تھی، اس پر وہ بہت نازاں تھے۔ قدر بلگرامی کو ہدایت کرتے ہیں کہ:

"جناب منشی (نولکشور) صاحب سے کہہ کر وہ جو پچاس جلدیں میں نے لی ہیں، ان میں سے ایک جلد لے کر جناب فیض مآب، خداوند نعمت، آیۂ رحمت، قبلہ وکعبہ، جناب مجتہد العصر کی خدمت میں حاضر ہو اور میری طرف سے کورنش عرض کرو اور کتاب نذر کرو اور کہو کہ غلام نے بہت خونِ جگر کھا کر، فارسی کی

تحقیق کو اس پایے پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں۔ یہ مجال کہاں کہ داد کا طلب گار ہوں۔ صرف عزِ قبول کا اُمید وار ہیں.....؟

(پنجم مئی ۱۸۶۲ء)

قدر بلگرامی نے تعمیلِ ارشاد میں مستعدی دکھائی۔ ۲۴ مئی ۱۸۶۲ء کے خط میں انہیں ارشاد ہوتا ہے کہ :

"سید صاحب! آپ کا خط جس میں قبلہ وکعبہ کا مہری و دستخطی توقیع ملفوف تھا، پہنچا۔ میں تم سے بہت راضی ہُوا کہ تم نے تکلیف اٹھائی اور میری نذر وہاں پہنچائی۔ اب ایک اور تکلیف دیتا ہوں کہ جناب منشی صاحب سے میرا سلام کہہ کر، ان کے حکم سے ایک اور نسخہ "قاطع برہان" کا مطبع میں سے لو اور مکان معلوم کر کے جناب مفتی میر عباس صاحب کے پاس جاؤ اور میرا سلام کہو اور کتاب دو اور عرض کرو کہ جو خونِ جگر میں نے اس تالیف میں کھایا ہے، یقین ہے کہ اُس کی داد تمہارے سوا اَور سے نہ پاؤں گا۔"

مفتی میر محمد عباس سے غالب نے بصورتِ مکتوب دادؔ پائی جواباً ۱۶ اگست ۱۸۶۲ء کو انہیں لکھتے ہیں :

"قبلہ! حضرت کا نوازش نامہ آیا۔ میں نے اس کو حرزِ بازو بنایا۔ آپ کی تحسین میرے واسطے سرمایۂ عزو افتخار ہے۔ فقیر اُمیدوار ہے کہ یہ دفترِ بے معنیٰ نہ سرسری بلکہ سراسر دیکھا جائے۔ نہ پیشِ نظر دھرا رہے، بلکہ اکثر دیکھا جاوے۔ میں نے جو نسخہ وہاں بھجوایا ہے، گویا کسوٹی پر سونا چڑھایا ہے۔ نہ ہٹ دھرم ہوں، نہ مجھے اپنی بات کی پچ ہے۔ دیباچہ و خاتمہ میں جو کچھ لکھ آیا ہوں، سب سچ ہے۔

کلام کی حقیقت کی داد جُدا چاہتا ہوں، طرزِ عبارت کی داد جُدا چاہتا ہوں۔ نگارش ظرافت سے خالی نہ ہوگی، گزارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔

لہ مفتی صاحب کے اس خط کے لیے دیکھیے: عودِ ہندی، فاضل لکھنوی، لاہور، ۱۹۶۷ء حواشی، ص ۵۰۰ و بہ بعد

علم و ہنر سے عاری ہوں لیکن پچپن برس سے محو سخن گزاری ہوں۔ مبدا فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبتِ ازلی و سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہل پارس کے منطق کا بھی فرہ ایزدی لایا ہوں۔ مناسبت خداداد تربیت استاد سے حسن و قبح ترکیب پہچاننے لگا، فارسی کے غوامض جاننے لگا...."

یعنی غالب نے مفتی میر محمد عباس سے داد تو پائی لیکن جیسا اور جس قدر چاہتے تھے، اتنی نہیں۔ چنانچہ اصرار ہے کہ اسے سرسری نہیں بلکہ سراسر دیکھا جائے، پیش نظر یہ نسخہ کیمیا محض دھرا ہی نہ رہے، بلکہ اکثر اور بار بار اس کا مطالعہ کیا جاتا رہا کرے تاکہ مخفی اسرار و غوامض روشن ہو سکیں۔ کلام کی حقیقت اور طرز عبارت دونوں ملحوظِ خاطر رہیں یعنی نفس مضمون فارسی کی تحقیق کی داد کے خواہاں بھی ہیں جسے انہوں نے اپنے تئیں اس پایے پر پہنچایا ہے جس سے بڑھ کر متصور نہیں اور طرز نگارش کی داد کے الگ آرزو مند ہیں جو ان کے نزدیک ظرافت اور لطافت سے عبارت ہے۔ نیز اس پر بھی مصر ہیں کہ دیباچہ و خاتمہ میں جو کچھ لکھ آیا ہوں سب سچ ہے۔ اس خط کا پس منظر دراصل یہ ہے کہ مولانا غلام رسول مہر صاحب کے بقول[1] مفتی صاحب نے کتاب کی انتہائی تحسین کے ساتھ یہ بھی فرما دیا تھا کہ ظرافت اور درشتی سے احتراز مناسب تھا:

ظرافت نے آفت کو برپا کیا
درشتی نہ کرنی تھی یہ کیا کیا

غالب کو اس کتاب کی اشاعت سے بہت پہلے یہ اندازہ تھا کہ انہیں اپنی اس تالیف اور محنت کی خاطر خواہ داد نہیں ملے گی چنانچہ اشاعت کتاب سے کوئی تین برس پہلے کے ایک خط موسومہ مجروح میں لکھتے ہیں:

"یاد رہے کہ جو صاحب (میری کتاب "قاطع برہان") کو دیکھیں گے، وہ ہرگز نہ سمجھیں گے، صرف "برہان قاطع" کے نام پر جان دیں گے۔ کئی باتیں

---

[1] خطوطِ غالب، لاہور، ۱۹۶۹ء، جلد ۲، صفحہ ۳-۹

جس شخص میں جمع ہوں گی وہ اس کو مانے گا :

(الف) پہلے تو عالم ہو۔

(ب) دوسرے، فنِ لغت کو جانتا ہو۔

(ج) تیسرے، فارسی کا علم خوب ہو اور اس زبان سے اس کو لگاؤ ہو، اساتذہ سلف کا کلام بھی بہت کچھ دیکھا ہو اور کچھ یاد ہو۔

(د) چوتھے، منصف ہو، ہٹ دھرم نہ ہو۔

(ہ) پانچویں، طبع سلیم و ذہن مستقیم رکھتا ہو۔ معوّج الذہن اور کج فہم نہ ہو، نہ یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا...."

(جولائی ۱۸۵۹ء)

اس معیار پر ہند میں ان کے نزدیک کوئی پورا نہیں اُترتا تھا، گویا ان کے نزدیک "زمانہ مجمع جہّال است" والا مضمون تھا اور خود وہ فارسی کے غوامض کے منتہی تھے اور تلامذہ کی تہذیب کے خیال سے انہوں نے یہ کتاب لکھی تھی لیکن اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ حالی کے لفظوں میں "ہر کس و ناکس مرزا غالب کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گیا۔[۱]" خود غالب کے بقول، اوّل خود :

".... فارسی کے غوامض جاننے لگا۔ بعد اپنی تکمیل کے تلامذہ کی تہذیب کا خیال آیا۔ "قاطع برہان" کا لکھنا کیا تھا، گویا باسی کڑھی میں ابال آگیا۔ لکھنا کیا تھا کہ سہامِ ملامت کا ہدف ہوا۔ ہے ہے یہ تنگ مایہ، معارض اکابرِ سلف ہوا۔" (بنام مفتی میر محمد عباس، ۱۶، اگست ۱۸۶۲ء)

۱۱، اگست ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں نواب انور الدولہ شفق کو لکھتے ہیں کہ :

"معتقدان "برہانِ قاطع" برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ہنوز دو اعتراض مجھ تک پہنچے ہیں :

(الف) ایک تو یہ کہ "قاطع برہان" غلط ہے، یعنی یہ ترکیب خلافِ قاعدہ ہے۔

---

[۱] یادگارِ غالب، مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۶۵

"کلام" قطع کیا جاتا ہے، "برہان" قطع نہیں ہو سکتی (ہے) ۔ لو صاحب!
"برہانِ قاطع" صحیح اور "قاطع برہان" غلط..... مگر "برہان" "قطع" کی
فاعل ہو سکتی ہے اور "قاطع" کا فعل آپ نہیں قبول کرتی؟ "قاطع برہان"
میں جو "برہان" کا لفظ ہے، یہ مخفف "برہان قاطع" ہے۔ "برہان قاطع"
کے رد کو قطع سمجھ کر "قاطع برہان" نام رکھا تو کیا گناہ ہوا؟

(ب) دوسرا ایراد یہ ہے کہ مصرع: "بایں انگلیسیان ستیز بے جا"، انگلس کا
نون تلفظ میں نہیں آتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ خدا کے واسطے "انگلش" اور
"انگریز" کا نون بہ اعلان کہاں ہے؟ اور اگر ہے بھی تو ضرورتِ شعر کے
واسطے لغاتِ عربی میں سکون و حرکت کو بدل ڈالتے ہیں۔ اگر "انگلش"
کے نون کو غنہ کر دیا تو کیا گناہ ہوا؟ ..."

مفتی میر محمد عباس کے نام خط مرقومہ ۱۶ اگست ۱۸۶۲ء میں پہلے اعتراض کے بارے میں
لکھتے ہیں:

"ایک صاحب فرماتے ہیں کہ "قاطع برہان" کی ترکیب غلط ہے۔ عرض
کرتا ہوں کہ حضرت "برہانِ قاطع" نے کیا لٹھا، نیزہ، تیغ، سکہ قطع کیا ہے جو
آپ نے اس کو "قاطع" کا لقب دیا ہے؟ "برہان" جب تک غیر کی کسی برہان
کو قطع نہ کرے گی کیوں کر "برہانِ قاطع" نام پائے گی؟ "برہانِ قاطع" کی صحت
میں جتنی تقریر کیجیے گا، وہ "قاطع برہان" کی صحت کے ثبوت کے کام آئے گی۔"

یہ تو ذکر ہے محض متفرق انتقادات اور اعتراضات کا۔ ان سے قطع نظر، "قاطع برہان"
کے رد میں کتابی حجم کی متعدد مستقل تنقیدیں بھی منظرِ عام پر آئیں جن میں سے کم از کم فارسی
نثر میں چار مندرجہ ذیل کتابوں کا غالب کی نظر سے گزرنا ثابت ہے:

۱۔ محرق قاطع برہان، منشی سید سعادت علی، دہلی ۱۸۶۲ء
۲۔ ساطع برہان، میرزا رحیم بیگ، میرٹھ، ۱۸۶۵ء
۳۔ موید برہان، مولوی احمد علی، کلکتہ، ۱۸۶۶ء

۴۔ قاطع القاطع، مولوی امین الدین (پٹیالہ)، دہلی، ۱۸۶۷ء

غالب کے نزدیک "قاطع برہان" میں ان کی نگارش، ظرافت سے اور گزارش، لطافت سے خالی نہیں لیکن اس ظرافت نے جس میں درشتی کی آمیزش، غالب کے قدر دان معاصرین نے بھی محسوس کی، آفت برپا کی کچھ اندازِ نگارش کی دل آزاری اور کچھ ارضِ ہند پر جامد مقلدین کی فراوانی ـــ مولانا امتیاز علی عرشی کے بقول میرزا غالب نے رد و قدح کا جو ڈھنگ اختیار کیا تھا، وہ غیر عالمانہ، بلکہ کہیں کہیں کسی قدر سوقیانہ ہوگیا تھا۔ کچھ تو ہندوستانی تقلید کے دل دادہ ہیں، اور کچھ اس کا اندازِ تحریر دل آزار تھا۔ کتاب کے شائع ہوتے ہی مخالفت کا ایک طوفان برپا ہوگیا۔[1]" اور جیسا کہ بتایا جا چکا "برہان" کے حامیوں کی طرف سے غالب کی "قاطع برہان" کی تردید میں کتابوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جو غالب کی وفات کے بعد تک[2] جاری رہا اور مالک رام کے بقول: اگر میرزا غالب زندہ رہتے تو ممکن ہے کہ یہ بحث چندے اور جاری رہتی[3]......"

"مصنف "برہان قاطع" کے معتقدوں نے جب' ان کے حق میں بہت کچھ لکھا تو مرزا غالب تو زندہ تھے، وہ بذاتِ خود اور ان کے طرف دار کیوں کر کچھ نہ لکھتے[4]...." غالب نے ۱۸۶۵ء میں "قاطع برہان" کو "بعد اضافۂ مطالبِ دیگر" "درفشِ کاویانی" کا خطاب دے کر شائع کرایا۔ نیز بتفصیلِ ذیل، معترضین اور مخالفین کے جواب میں یہ کتابیں اور

۱۔ مکاتیبِ غالب، طبع دوم، ۱۹۴۳ء، حواشی، صفحہ ۲۷

۲۔ اس سلسلے کی آخری کتاب مولوی احمد علی کی "شمشیر تیز تر" ہے جو کتاب کا اسم تاریخی ہے جس سے ۱۸۶۷ء برآمد ہوتے ہیں لیکن کتاب پر تاریخِ طباعت ۱۸۶۸ء درج ہے لیکن مصنف کے قطعۂ تاریخ سے ۱۲۸۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔ مالک رام نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "اگرچہ کتاب میرزا کی زندگی میں چھپنا شروع ہوگئی تھی لیکن ابھی اس کی طباعت مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ۱۲۸۵ھ میں ان کا انتقال ہوگیا.... گویا "قاطع برہان" کی اشاعت سے جو ہنگامہ ۱۸۶۲ء میں شروع ہوا تھا وہ "شمشیر تیز تر" کے ساتھ ۱۸۶۹ء میں (غالب کے انتقال کے بعد) ختم ہوا...."

(مالک رام، ذکرِ غالب، طبع چہارم، ۱۹۶۴ء، صفحہ ۲۲۵)

۳۔ ذکرِ غالب، ایضاً، صفحہ ۲۲۵

۴۔ مہیش پرشاد، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۱۳۲

رسالے ضبطِ تحریر میں آئے:

۱۔ دافع ہذیان، مولوی نجف علی، دہلی، ۱۸۶۴ء

۲۔ لطائفِ غیبی، غالب، دہلی، ۱۸۶۴ء

۳۔ سوالاتِ عبدالکریم، غالب، دہلی، ۱۸۶۴ء

۴۔ نامۂ غالب، دہلی، ۱۸۶۵ء

۵۔ قطعۂ غالب، دہلی ۱۸۶۶ء

۶۔ تیغِ تیز، غالب، دہلی، ۱۸۶۷ء

۷۔ ہنگامۂ دل آشوب، حصّہ اوّل و دوم، آرہ ۱۸۶۷ء

غالب کی مدافعت میں جو کچھ ہے وہ بیشتر غالب کے قلم سے ہے۔ "لطائفِ غیبی" میاں داد خاں سیاح کے نام سے چھپی لیکن یہ دراصل غالب ہی کی تصنیف ہے وقس علیٰ ہذا "سوالاتِ عبدالکریم" بھی۔ خطوطِ غالب سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اس قلمی مجادلے میں غالب کو اپنے متعدد احباب اور "تلامذہ" سے توقع مددگاری تھی۔ خصوصیت سے نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں سے انہیں مدد ملی اور نواب علاء الدین احمد علائی، میر غلام حسنین قدر بلگرامی اور منشی حبیب اللہ ذکا سے انہوں نے استمداد طلب کی اور انہیں اپنی تائید میں لکھنے اور مخالفین کا خاکہ اڑانے پر ابھارا ۔۔۔

یہاں یہ امر لطف سے خالی نہ ہوگا کہ اس بحثا بحثی کے زمانے میں غالب کو منشی غلام غوث بے خبر کے بارے میں جن سے غالب کے بے حد مخلصانہ مراسم تھے، یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ وہ غالب کی تردید میں کچھ لکھ رہے ہیں۔ ۱۸۶۴ء کے ایک خط میں انہیں لکھتے ہیں کہ:

> "قبلہ! ..... یہ معاملہ میرا اور آپ کا ہے۔ خارج سے مسموع ہوا کہ میں نے جو اغلاط "برہان قاطع" کے نکال کر، ایک نسخہ موسوم بہ "قاطع برہان" لکھا ہے، اور ایک مجلد اس کا آپ کو بھی بھیج دیا ہے، آپ اس کی تردید میں کوئی رسالہ لکھ رہے ہیں۔ اگرچہ باور نہیں آیا، لیکن عجب آیا۔"

بے خبر، اس استفسار پر آزردہ ہوئے کہ اس امرِ بے بنیاد پر غالب نے اعتبار کیسے کیا؟ جواباً

غالب نے عذر و معذرت کے طور پر انہیں لکھا کہ :

"پیرو مرشد! خفا نہیں ہوا کرتے۔ یوں سنا، مجھے باور نہ آیا۔ یہاں تک تو میں موردِ عتاب نہیں ہو سکتا، جھگڑا استعجاب پر ہے، محلِ استعجاب وہ ہے کہ آپ کا دوست[1] کہتا ہے کہ میر منشی نواب لفٹننٹ گورنر بہادر میرے شاگرد ہیں اور وہ "قاطع برہان" کا جواب لکھ رہے ہیں۔ اولیار کا یہ حال ہے، وائے بر حال ہم اشقیا کے!"

"یادگارِ غالب" میں حالی نے لکھا ہے کہ "قاطع برہان" لکھتے وقت غالب کے پیشِ نظر "برہان قاطع" کا قلمی[2] نسخہ تھا۔ یہ صحیح نہیں، خود غالب کا بیان ہے کہ :

"اس واماندگی کے دنوں میں میرے پاس چھاپے کی "برہانِ قاطع" تھی..."

(بنام سرور، اگست ستمبر ۱۸۵۹ء)

"برہان قاطع" کا وہ مطبوعہ نسخہ جو غالب کے پیشِ نظر رہا تھا اور جس کے حاشیے پر غالب نے اپنے اعتراضات لکھے تھے، اُنہوں نے علائی کو تحفتاً دے دیا تھا۔ ۲ر جولائی ۱۸۶۰ء کے خط میں غالب انہیں لکھتے ہیں کہ :

"مجھ سے کتاب مستعار مانگتے ہو، یاد کرو کہ تم کو لکھ چکا ہوں کہ "دساتیر" اور "برہانِ قاطع" کے سوا کوئی کتاب میرے پاس نہیں۔ ازاں جملہ "برہانِ قاطع" تم کو دے چکا ہوں — "دساتیر" میرا ایمان و حرزِ جان ہے...."

یہ نسخہ نوابانِ لوہارو کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ رہا۔ ۱۹۵۷ء میں نواب صاحب لوہارو نے اپنا سارا ذخیرہ رضا لائبریری رام پور کو منتقل کر دیا جس کے ساتھ "برہان قاطع" کا یہ تاریخی اہمیت کا نسخہ رام پور پہنچا، اب یہ رضا لائبریری، رامپور کے لوہارو کلیکشن میں محفوظ ہے۔ اسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے "قاطع برہان" میں اپنے تمام اعتراض شامل

---

[1] مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی لکھتے ہیں کہ "دوست" سے شاید غلام امام شہید مراد ہیں۔
(عودِ ہندی، لاہور، ۱۹۶۷ء، حاشیہ صفحہ ۳۲۵)

[2] یادگارِ غالب، مجلس ترقیٔ ادب لاہور، ۱۹۶۳ء، صفحہ ۶۴

نہیں کیے اور حسبِ ضرورت، ان کی زبان وغیرہ میں بھی تبدیلی کی تھی۔ مولانا امتیاز علی عرشی[1] کے بیان کے مطابق "برہان قاطع" کا یہ نسخہ افضل المطابع، کلکتہ میں سنہ ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۶ء میں بڑے سائز کے ۹۲۴ صفحات پر چھپا تھا۔

○ ایک حالیہ اشاعت: قاطع بُرہان و رسائل متعلقہ، مرتّبہ: قاضی عبدالودود مصحیین: مالک رام و رشید حسن خاں، ناشر: ادارہ تحقیقاتِ اُردو، پٹنہ، ۱۹۶۷ء

درفشِ کاویانی:

طبع اوّل: اکمل المطابع، دہلی، نومبر ۱۸۶۵ء

ضخامت: ۱۵۴ صفحات مسطر: ۱۹ سطری

سائز: ۱/۲-۱۰" × ۱/۲-۶"، ۸۶۷ × ۴۶۶"

یہ کوئی نئی کتاب نہیں ہے، "قاطع بُرہان" ہی کی متبدل صورت ہے لیکن غالب نے اسے "درفشِ کاویانی" کے اضافی نام سے شائع کیا، اس لیے اس کی شمار بندی الگ کی گئی ہے اور اس کا تذکرہ جداگانہ کیا جارہا ہے۔ مولوی نعمان احمد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "جو" قاطع برہان، میں کہیں کہیں سہوطبعی واقع تھا، ناچار اس کی ترمیم و تکمیل کے واسطے اسی نسخے میں کچھ بڑھایا اور ایک دیباچہ اور لکھا اور اس رسالے کا درفش کاویانی نام رکھا..." (۵ستمبر ۱۸۶۶ء)

---

[1] اِس نسخے اور "قاطع بُرہان" کے پہلے مسودے کے تعارف میں ملاحظہ کیجیے امتیاز علی خاں عرشی کے مقالات در: —

۱۔ آج کل، دہلی، مارچ ۱۹۵۸ء، ص ۴-۱۳

۲۔ تحریک، دہلی، اپریل مئی ۱۹۶۱ء، ص ۹ — ۲۹

۳۔ آئینہ غالب، دہلی، ۱۹۶۴ء ص ۱۹۱ — ۲۱۴

۴۔ نیادور، لکھنؤ، جنوری ۱۹۶۵ء

۵۔ ماہِ نو، کراچی، مارچ ۱۹۶۵ء، ص ۶۵ - ۷۳ کے ۱۳۱

۶۔ نقوش، لاہور، ستمبر ۱۹۶۵ء، ص ۵۲۵ - ۵۳۷

۷۔ ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۶۷ء، ص ۹ - ۲۰، ۸۶

۸۔ ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۶۹ء، ص ۲۴۳ - ۲۵۵

۹۔ نذرِ عابد، مرتبہ: مالک رام، نئی دہلی ۱۹۷۲ء، ص ۱۸۱ — ۲۱۸

"درفش کاویانی" کا نسخہ مولوی عبدالرزاق شاکر کو ہدیۃً بھیجتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ہاں صاحب! 'قاطع برہان' میں اور مطالب بڑھائے اور ایک دیباچہ دوسرا لکھا اور "درفش کاویانی" اس کا نام رکھا اور اس کو چھپوایا۔ ایک مجلّد اس کا آج اس خط کے ساتھ ڈاک میں بھیجتا ہوں ...... یہ نسخہ میری طرف سے آپ کی نذر......" (یکم اپریل ۱۸۶۶ء)

"درفشِ کاویانی" طبع اوّل کے سرورق کی عبارت یہ ہے :

الحمد للہ کہ کتاب خرد پسند ہوش افزا موسوم بہ

قاطع برہان

مولفہ جناب نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالب کہ پیش ازیں در مطبع اودھ اخبار لکھنو طبع شدہ بود بہ توجہ حضرت مولف بعد اضافہ مطالب دیگر و یافتن خطاب

درفش کاویانی

در اکمل المطابع دہلی باہتمام میر فخر الدین آرایش انطباع پزیرفت

سرورق کی پشت یعنی صفحہ ۲ سے کتاب کا دیباچہ ہو جاتا ہے۔ بیلدار منقوش لوح نے اس صفحے کا قریب ایک تہائی حصہ گھیرا ہوا ہے۔

دیباچہ، جس کا عنوان ہے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" صفحہ ۲ سے شروع ہو کر (۱۲ سطریں) صفحہ ۴ کی سطر ۱۵ پر تمام ہوتا ہے۔ پندرہویں سطر ہی کے نصف آخر سے "دیباچہ ثانی جدید" کا عنوان قائم کر دیا گیا ہے۔ یہ دیباچہ ثانی صفحہ ۷ پر ختم ہوا ہے اور اسی صفحے سے کتاب کے مباحث شروع ہو گئے ہیں۔ دیباچے کے آخری حصے میں غالب نے لکھا ہے کہ :

"قاطع برہان" کہ صنعت نقشبند خیال من است، نہ نامۂ اعمال من است کہ در آں جہاں بمن خواہند سپرد، ہمدریں جہاں خواہد ماند۔ در دل فرود آمد کہ بہ مقامی چند کلامی چند بیفزایم و ایں مجموعہ را "قاطع برہان" نام نہادہ ام سپس "درفش کاویانی" خطاب دہم :

نازم بہ خرام کلک و طرز رقمش   ما ناست ز تیزی بدم تیغ دمش

چوں اسم کتاب "قاطع برہان" بود   گردید "درفش کاویانی" علمش

(طبع اوّل، صفحہ ۷)

کتاب کا متن صفحہ ۱۵۲ پر ختم ہوگیا ہے۔ صفحہ ۱۵۳ کے نصف اوّل پر غالب کے تین شاگردوں کے تین قطعات تاریخ ہیں۔ پہلا قطعہ سیاح کا ہے جنہیں "جامع لطائف غیبی" بتایا گیا ہے، دوسرا قطعہ میرزا یوسف علی خاں عزیز کا اور آخری منشی جواہر سنگھ جوہر کا۔ ان قطعات سے ۱۸۶۵ء اور ۱۲۸۲ھ کے سال برآمد ہوتے ہیں۔ صفحہ ۱۵۳ ہی کے بقیہ نصف آخر سے دو کالمی "صحت نامہ اغلاط قاطع برہان" ہے جو آخری صفحہ ۱۵۴ پر ختم ہوتا ہے۔ "قاطع برہان" کے آخر میں غالب نے کچھ فوائد بڑھائے تھے۔ مجروح کو جولائی ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں اس کی اطلاع دی ہے:

"قاطع برہان" کے خاتمے میں کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں۔"

"درفش کاویانی" میں ان "فوائد" کے آغاز کی عبارت یہ ہے:

"...... اکنون ہرچہ از خجستہ آموزگار شنیدہ ام و ہرچہ بہ نیروی خرد خداداد بداں فرا رسیدہ ام بہ بند نگارش می آرم و ہر کجا فصلی رو میدہد بہ "فائدہ" تعبیر می کنم و از مبداء فیاض چشم دارم کہ ہر فائدہ اسم با مسمیٰ باشد"

فائدہ اوّل کا ماحصل حالی[۱] کے لفظوں میں یہ ہے کہ "ان فوائد کے پیش کرنے میں چوں کہ خود نمائی کی بو آتی ہے، اس لیے شاید لوگ یہ کہیں کہ خود ہندوستانی ہوکر اور ہندستانیوں کو مسلم نہ جاننا اور خود زبان دانی کا دعویٰ کرنا بے معنی ہے۔ سو میں اقرار کرتا ہوں کہ میرا دادا توران سے آیا تھا اور میرا باپ دلّی میں پیدا ہوا اور میں آگرے میں:

"نیای من از ماوراء النہر بود و پدرم در دہلی پیکر پذیرفت و من در آگرہ منشور ہستی یافتم"   (درفش کاویانی، طبع اوّل، ص ۱۳۱)

حاشا کہ میں اپنے تئیں اہلِ زبان سمجھتا ہوں۔ میں بلاشبہ زبان داں ہوں اور میری زبان دانی اوّلاً خداداد سلامتیِ طبع کی بدولت ہے جو غلطی کو قبول نہیں کرتی اور بغیر سچائی کے تسلی نہیں

---

[۱] یادگارِ غالب، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، صفحہ ۷۰ و ما بعد

پاتی۔ دوسرے اس وجہ سے کہ میری طبیعت فارسی زبان سے فطرۃً مناسب واقع ہوئی ہے۔ تیسرے مولانا عبدالصمد ہرمزد کے فیضِ صحبت سے جو مجھ کو دو برس تک برابر حاصل رہا چودہ برس کی عمر میں میں نے اس سے تربیت پائی اور باون برس مشقِ سخن کی۔ اب کہ مجھ کو چھیاسٹھواں سال ہے میں خدا کا شکر کرتا ہوں اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا کہ ان باون برسوں میں اُس نے کس قدر معنی کے دروازے مجھ پر کھولے ہیں اور میری فکر کو کس درجہ کی بلندی بخشی ہے۔ افسوس ہے کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا اور زیادہ افسوس یہ کہ وہ شانِ ایزدی کی شناخت سے محروم رہے اور میری نظم و نثر کے کرشموں کو آنکھ اٹھاکر نہ دیکھا۔"

ان فوائد کے ساتھ ہی کتاب اس عبارت پر ختم ہو جاتی ہے:

"یزدان را سپاس کہ گوینده راز از کوشش خویش کام یافت، و نگارش فوائد، کہ از ملحقات "قاطع برہان" است، در سال رستخیز انجام یافت۔ از نفرین معتقدان برہان قاطع و پرخاش فارسی دانانِ ہند باک ندارم، و شادم کہ بدین آویزش دانش من نخواہد کاست و یدان نکوہش ارزش آمرزش خواہد فزود۔ واللہ ذوالفضل العظیم....." (طبع اول، صفحہ ۱۵۲)

"رستخیز" سے ۱۲۷۷ کا عدد برآمد ہوتا ہے جو ان "فواید" کے لکھے جانے کا ہجری سال ہے۔ ۱۲۷۷ھ از روئے تقویم ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء سے شروع ہو کر ۸ جولائی ۱۸۶۱ء پر ختم ہوتا ہے۔ جولائی ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں جس کا حوالہ اُوپر آچکا انھوں نے مجروح کو اس کی اطلاع بھی دی ہے کہ "قاطع برہان" کے خاتمے میں کچھ فواید بڑھائے گئے ہیں ....." "درفشِ کاویانی" طبع اوّل میں یہ فوائد صفحہ ۱۳۱ سے شروع ہوئے ہیں اور تا آخر یہی ہیں۔

غالب نے "درفشِ کاویانی" کی اشاعت کے لیے اپنے شاگرد منشی میاں داد خاں سیاح کے توسط، یہ تحریک کی تھی کہ اگر نواب سید غلام بابا خاں رئیس سورت کتابی کی سو دو سو جلدیں پیشگی خرید لیں تو طباعت میں اس سے خاصی مدد ملے گی اور اس طرح، اشاعتِ کتاب کا ڈول ڈل جائے گا جو بصورتِ دیگر محال نظر آتا ہے۔ سیاح غالباً خود سمجھ نہیں سکے یا وہ بات ٹھیک سے نواب صاحب کو سمجھا نہیں سکے، صورت خواہ کچھ بھی رہی ہو، نواب

صاحب نے معلوم نہیں کیا سمجھا کر غالب کو ایک گھڑی بھیج دی۔ اس پر غالب نے، سیاح پر اپنا مافی الضمیر واضح کیا اور دھرایا اور کہا کر یہ گھڑی میرے کس کام کی؟ اس سے مجھے طباعتِ کتاب میں کیا مدد مل سکتی ہے؟ غالب کے لفظ یہ ہیں:

"منشی صاحب! یہ کیا اتفاق ہے کہ میری بات کوئی نہیں سمجھتا:

کس زبان مرا نمی فہمد به عزیزان چه التماس کنم

یاد کرو، اصل مقدمہ یہ تھا کہ میں "قاطع برہان" کو دوبارہ چھاپا چاہتا ہوں، نواب صاحب مدد دیں، یعنی سو دو سو جلدیں خرید لیں۔ حضرت نے ایک گھڑی عنایت فرمائی۔ بھلا یہ میرے کس کام کی؟ چار دن سوچا کیا پھیر دوں، پھر سوچا کہ برا مانیں گے۔ آخر کو گھڑی رکھ لی اور یہ خیال کیا کہ کتاب کے انطباع کے بعد سو ڈیڑھ سو جلدیں بھیج دوں گا۔ اسی خط کے ساتھ نواب صاحب کے نام کا خط گھڑی کی رسید کا پہنچتا ہے اور یہ بھی تم کو معلوم رہے کہ گھڑی کی کنجی نہیں آئی۔ ظاہرا سہو سے وہیں رہ گئی ہو گی....." (۳، دسمبر ۱۸۶۴ء)

اور سوم دسمبر ۱۸۶۴ء ہی کے خط میں نواب میر غلام بابا خاں کو لکھتے ہیں کہ:

"گھڑی کے عطیے کا شکر، ہر گھڑی اور ہر ساعت بجا لاتا ہوں۔ پہلے تو آپ دوست اور پھر امیر اور پھر سید۔ نظر ان تین امور پر اس ارمغان کو میں نے بہت عزیز سمجھا اور اپنے سر اور آنکھوں پر رکھا۔ خدائے عالم آرائے آپ کو سلامت رکھے اور ہر گھڑی آپ کا مدد و مددگار رہے۔ ظاہرا، بوقت روانگی کنجی کا رکھنا سہو ہو گیا، خیر یہاں بن جائے گی۔"

گھڑی کی کنجی آئی یا مقامی طور پر بنوالی گئی، اس کی کوئی خبر نہیں لیکن یہ طے ہے کہ کنجی سمیت بھی یہ گھڑی، اشاعتِ کتاب میں کچھ کام نہ آسکتی تھی، یہی ہوا کہ اصل مقدمہ یعنی "برہانِ قاطع" کی طباعتِ ثانی کا مسئلہ جہاں کا تہاں رہا۔ گھڑی کا قصہ دسمبر ۱۸۶۴ء کا ہے جولائی ۱۸۶۵ء میں نواب غلام بابا خاں نے طباعتِ کتاب کے بارے میں میانداد خاں سیاح کے ذریعے غالب سے استفسار کیا۔ غالب سیاح کو لکھتے ہیں:

"صاحب! تمہارا مہربانی نامہ کہ گویا الفاظ اس کے سراسر نواب میر غلام بابا خاں صاحب کی زبانی تھے، پہنچا۔ جواب لکھتا ہوں اور پرسش کا شکر بجا لاتا ہوں۔۔۔۔۔ میرے پاس روپیہ کہاں جو "قاطع برہان" کو دوبارہ چھپواؤں۔ پہلے بھی نواب مغفور (یوسف علی خاں ناظم والیٔ رامپور) نے دو سو روپے بھیج دیئے تھے، تب پہلا مسودہ صاف ہو کر چھپوایا گیا تھا۔ اب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہ مقرری کے ساتھ دو سو پہنچیں گے۔ وہ آخر اپریل ۱۸۶۵ء حال میں مر گئے۔ اپریل کا روپیہ رئیسِ حال (نواب کلب علی خاں) سے میں نے پایا، مصرفِ کتاب کا روپیہ نہ آیا۔ یاد دلاؤں گا۔ مگر اس مرحوم کا وعدہ سررشتۂ دفتر سے نہ تھا جو از روئے دفتر، اس کی تصدیق ہو بہر حال فکر میں ہوں، اگر اسباب نے مساعدت کی، فھو المراد۔ ورنہ:

آنچہ ما در کار داریم اکثرے در کار نیست

(۳۰ جولائی ۱۸۶۵ء)

یہ خط میاں داد خاں سیاح کے نام ہے لیکن تخاطب، نواب میر غلام بابا خاں عرف چھوٹے صاحب سے ہے۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور تیر نشانے پر لگا۔ یعنی یہ خط، ان معنوں میں "فھو المراد" ثابت ہوا کہ میاں داد خاں کے ذریعے اس خط پر غالب کو نواب چھوٹے صاحب سے اخراجات طباعت کی مد میں سو روپیہ مرحمت ہوئے! اس پر سیاح کو لکھا جاتا ہے کہ:

"دعا اور سلام اور شکر اور سپاس۔ تمہارا خط مرقومہ ۳۰ اگست پرسوں بروز جمعہ ۸ ستمبر ۱۸۶۵ء کو پہنچا۔ کل دسویں ستمبر سال حال کو سو روپیہ مندرجہ اس کے، ایک صرّاف سے موصول ہو گئے۔ چھوٹے صاحب نے بڑی جواں مردی اور بڑی ہمت کی۔ اس صرف میں میرا کام ہوا اور ان کا نام ہوا۔ اللہ اللہ! اب بھی ہندوستان میں ایسے لوگ ہیں کہ نہ میں نے ان کو دیکھا، نہ انھوں نے مجھ کو دیکھا۔ نہ میرا کوئی حق ان پر ثابت۔ نہ ان کو کوئی خدمت مجھ سے لینی منظور۔ خیر فقیر ہوں۔ جب تک جیوں گا، دعا دوں گا۔ تمام عمر ممنون اور شرمندہ رہوں گا۔

تمہارا بھی احسان مانوں گا۔ اب دو ایک دن میں کاغذ آجائے تو اس کا انطباع شروع ہوجائے۔ تم نواب صاحب کو میرا سلام کہو اور یہ خط دکھادو اور عرض کرو کہ آج تک کسی بھائی یا کسی دوست کا روپے پیسے کا احسان مند نہیں ہوا[1] تھا۔ اب احسان بھی اٹھایا تو اپنے آقا یعنی علی مرتضیٰ علیہ السلام کے فرزند کا۔"

(۱۱، ستمبر ۱۸۶۵ء)

چھ روز بعد ۱۷، ستمبر ۱۸۶۵ء کو پھر سیاح کو ہی لکھتے ہیں کہ:

"ہاں صاحب! سو روپیہ کا نوٹ پہنچا اور روپیہ وصول ہوا۔ کاپی آج شروع ہوگئی۔ جس دن نوٹ پہنچا، اس کے دوسرے دن روپیہ مل گیا۔ تیسرے دن میں نے تم کو تمہارے رجسٹری دار خط کا جواب لکھ بھیجا۔ یقین ہے کہ بہ موجب میری خواہش کے نواب صاحب کو دکھادیا ہوگا ...."

اور سیاح کے نام اس خط کے ساتھ ہی ۱۷، ستمبر ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں نواب میر غلام بابا کو لکھتے ہیں کہ:

"عطیہ حضرت بتوسط جناب (میاں داد خاں المخاطب بہ) سیف الحق پہنچا اور میں نے اس کو بے تکلف عطیۂ مرتضوی سمجھا۔ علی مرتضیٰ علیہ التحیۃ والثناء آپ کا دادا اور میرا آقا۔ خدا کا احسان ہے کہ میں احسان مند بھی ہوا تو اپنے خداوند کے پوتے کا..... آج سے کاپی لکھی جانے لگی اور تصحیح کو میرے پاس آنے لگی۔ چھاپے کے واسطے برسات کا موسم اچھا ہے۔ بس اب اس کے چھپ جانے میں دیر کیا ہے ...."

خلاصہ یہ کہ ۸، ستمبر ۱۸۶۵ء کو "درفش کاویانی" کی طباعت کے لیے غالب کو سیاح کے ذریعے میر غلام بابا خاں کی طرف سے سو روپیہ کی ہنڈوی ملی۔ دسویں ستمبر ۱۸۶۵ء کو صراف سے نقد روپیہ وصول ہوگیا۔ اس کے دو دن بعد "درفشِ کاویانی" کے انطباع کے لیے کاغذ

---

[1] یعنی تلامذہ سے نذرانہ قبول کرلیتے تھے کیونکہ وہ بھی غالب سے اپنے مسودات کی اصلاح کی خدمت لیتے تھے اور چھوٹے صاحب کو غالب سے تلمذ نہیں تھا، محض برادرانہ یا دوستانہ مراسم تھے۔

لے لیا گیا۔ ۱۷ ستمبر ۱۸۶۵ء کو "درفشِ کاویانی" کی کاپی لکھی جانی شروع ہوئی اسی روز سے کتابت شدہ کاپی تصحیح کے لیے غالب کے پاس آنے لگی۔ چھاپے کے واسطے برسات کا یہ موسم اچھا تھا اور غالب کا خیال تھا کہ اب اس کے چھپ جانے میں کچھ دیر نہ لگے گی لیکن اسی زمانے میں انہیں عازم رام پور ہونا پڑا۔

"تقریب وہاں جانے کی رئیس مرحوم (نواب یوسف علی خاں) کی تعزیت اور رئیس حال (نواب کلب علی خاں) کی تہنیت[۱]۔" رامپور جاتے ہوئے غالب "درفشِ کاویانی" کے مقابلے اور تصحیح کے کام کی ذمہ داری اپنے شاگرد میرزا شمشاد علی بیگ رضوان کے سپرد کر گئے۔ ہفتم اکتوبر ۱۸۶۵ء کو دلّی سے رام پور کو روانہ ہوئے[۲]، دوسرے ہی روز کہ ابھی رامپور نہیں پہنچے تھے، اثنائے سفر میں رات بھر ہاپوڑ کی سرائے میں رہے ہیں، وہاں سے علی الصبح چار بجے پانچ کے عمل میں چل کر سورج نکلے بابوگڑھ کی سرائے میں پہنچے ہیں۔ یہاں سے کھانا کھاتے ہی پھر چل دینا ہے، گھوڑے تیار ہیں، اس عالم میں بابوگڑھ کی سرائے سے مرزا شہاب الدین ثاقب کو خط لکھتے ہیں جو اس ہدایت پر ختم ہوتا ہے:

"شمشاد کو کتاب کے مقابلے اور تصحیح کی تاکید کر دینا[۲]...."

معلوم ہوتا ہے کہ میرزا شمشاد بیگ نے "درفشِ کاویانی" کی طباعت کا کام تا آخر انجام دیا اور طباعت کے مصارف کی نگرانی بھی انہی کے سپرد رہی۔ رامپور کے دورانِ قیام ہی میں ۴ نومبر ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں غالب انہیں لکھتے ہیں:

"فرزند دلبند، شمشاد علی بیگ خاں کو اگر خفا نہ ہوں تو دعا اور اگر آزردہ ہوں تو بندگی! ... پنجم دسمبر (سے) تین دن جشن رہے گا، اس کے دو چار روز بعد غالب رخصت ہو گا۔ خدا کرے تم تک زندہ پہنچ جائے.... "قاطع برہان" (درفشِ کاویانی) کا حال لکھنا۔ میں نے تیس روپیہ کی ہنڈوی

---

[۱] بنام: مولوی محمد عبدالرزاق شاکر، خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، لاہور ۱۹۶۹ء، جلد ۲، صفحہ ۵۶۰

[۲] بنام: حکیم سید احمد حسن مودودی، خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، ۱۹۶۹ء، جلد ۲، صفحہ ۶۵۴

[۳] خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، لاہور، ۱۹۶۹ء، جلد ۱، صفحہ ۳۲۴

سو روپیہ کی باقی حکیم جی کو بھیج دی ہے ..... سب جلدوں کے شیرازے بندھ جائیں اور موٹا کاغذ دونوں طرف لگ جائے۔ خبردار کوئی نسخہ بے جلد نہ رہے۔ تین سو مجلد کے تیار ہونے کی خبر اور بقیہ حساب میرے پاس بھیج دینا۔ یا روپیہ فوراً بھیج دوں گا یا آکر دوں گا ..... مجھے ان مقاصد کے جواب کا منتظر سمجھنا۔ آج شنبہ چوتھی نومبر کی ہے۔ آٹھ دن میں خط کی آمد و شد یقینی ہے۔ نو دن راہ دیکھوں گا۔ دسویں دن اگر تمہارا خط نہ آیا تو میں تمہارا رافضی بن جاؤں گا .....؟[1]

گویا کتاب تین سو کی تعداد میں چھپی اور ۴ نومبر ۱۸۶۵ء تک گویا یہ چھپ چکی تھی اور شیرازہ بندی اور جلد سازی کے مرحلے میں تھی۔ کتاب دہلی میں چھپ رہی تھی اور رامپور میں فروکش غالب کا دل، اس کی اشاعت و طباعت میں گڑا ہوا تھا ..... غالب، رامپور کے اس سفر سے ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو واپس دہلی پہنچے اور کتاب انہیں تیار ملی —

منشی میاں داد خاں سیاح المخاطب بہ سیف الحق کو ۲۳ جنوری ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"اجی ہاں! میاں سیف الحق! رامپور سے آکر تین سو جلدیں درفش کاویانی کی تیار پائیں۔ نواب میر غلام بابا خاں صاحب سے حصہ برادرانہ کیا، ڈیڑھ سو جلد کا پشتارہ بنایا، اس پر ٹاٹ لپٹوایا، ڈاک گھر بھجوایا، مسترد آیا۔ سرکاری ڈاک والوں نے ہرگز اس کا بھیجنا قبول نہ کیا۔ ٹھیکے والے، پمفلٹ پاکٹ والے، ریل والے، متفق اللفظ، اس کے ارسال سے انکار کرتے ہیں۔ تم یہ رقعہ حضرت کو پڑھواؤ اور اس باب میں جو وہ فرمائیں، وہ مجھ کو لکھو، مدعا یہ ہے کہ کسی طرح یہ پشتارہ وہاں تک پہنچ جائے۔ اس خط کا جواب جس قدر جلد لکھو گے مجھ پر زیادہ احسان کرو گے ....."

لیکن خط کا جواب غالباً جلد نہیں آیا اور غالب زیادہ انتظار نہیں کر سکے اور انہوں نے از خود کتاب کو ایسے چھوٹے حجم کے پارسلوں کی شکل میں بھیجنا تجویز کیا جو سرکاری ڈاک والوں کو

---

[1] بنام، حکیم سید احمد حسن مودودی، خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر، ۱۹۶۹ء، جلد ۲، صفحہ ۶۵۴۔

قابلِ قبول ہوں۔ چنانچہ اس طرح ۲۰، فروری ۱۸۶۶ء کی صبح کو پہلی قسط کے طور پر چھ چھ کتابوں پر مشتمل انہوں نے چھ پارسل نواب غلام بابا خان صاحب کی خدمت میں ارسال کر دیئے۔ ابھی شام سیاح کا خط آ گیا کہ زیادہ تعداد میں نسخے لینا نواب غلام بابا خاں کو منظور نہیں۔ چنانچہ سیاح کو لکھتے ہیں کہ:

"کل سہ شنبہ ۲۰ فروری صبح کے وقت چھ پارسل، چھتیس "درفش کاویانی" کے نواب میر غلام بابا خاں صاحب کی خدمت میں ارسال کیئے۔ کل ہی شام کے وقت آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ حال معلوم ہوا۔ خیر، اب اور نہ بھیجوں گا..."
(۲۱، فروری ۱۸۶۶ء)

نواب غلام بابا خان نے ان کتابوں کی رسید بھیجی جواباً انہیں لکھتے ہیں:

"چھتیس "درفش کاویانی" کی رسید پہنچی۔ حسب الارشاد اب اور نہ بھیجوں گا۔ قبلہ! غرض، شہرت ہے۔ اس قلمرو میں مَیں نے جلدیں تقسیم کی ہیں، اُس ملک میں آپ بانٹ دیں"
(۲۲، مارچ ۱۸۶۶ء)

"غرض، شہرت ہے" سے مراد یہ تھی کہ کتاب "ہند تا سند" پھیل جائے، پڑی نہ رہے، غالب نے اپنے احباب اور تلامذہ میں کتاب تقسیم کی اور کہیں سے اس مباحثے میں کچھ اپنے خلاف لکھے جانے کی سن گن ملی تو وہاں بطور خاص کتاب کی زیادہ جلدیں ارسال کیں۔[1] اس سے غالباً ان کا مقصود یہ رہا ہو گا کہ ان پر وارد اعتراضات سے اگر کچھ ذہن مسموم ہو جائیں تو اس علاقے میں دو چار جلدیں ان کی کتاب کی بھی گشت میں ہوں کیا عجب، کسی کو توفیق انصاف ہو جائے۔ غالب کے ایک خط موسومہ محمد عبدالرزاق شاکر سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کتاب کے قیمتاً نکاس سے بھی وہ یکسر بے نیاز نہیں تھے "درفش کاویانی" کا ایک نسخہ انہیں ہدیتہً بھیجتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"..... اگر اور اصحاب، اس کے طالب اور خریدار ہوں تو مجھ کو لکھیے گا۔ دس پانچ، دو چار جلدیں بھیج دوں گا۔ یہ نسخہ میری طرف سے آپ کی نذر...."
(یکم اپریل ۱۸۶۶ء)

---

[1] بنام، حبیب اللہ ذکا، خطوط غالب، مولانا غلام رسول مہر، لاہور، ۱۹۶۹ء، جلد ۲، ص ۱۱۷

"قاطع برہان" کے سالِ اتمام کا مادۂ تاریخ غالب نے "درسِ الفاظ" سے نکالا تھا حقیقتاً انہوں نے اسے اپنے تلامذہ کی تہذیب و تدریس کے خیال سے پیش بھی کیا تھا۔ اہل نظر احباب تک سے وہ اس بات کے امید وار تھے کہ اسے :

"نہ سرسری بلکہ سراسر دیکھا جائے، نہ پیش نظر دھرا رہے بلکہ اکثر دیکھا جاوے۔"[1]

چنانچہ اگر وہ اپنے شاگردوں کو مطالعے کے لیے یہ کتاب تجویز کرتے ہیں یا اس کا وقتِ نظر سے مطالعہ کرنے اور کرتے رہنے کی ہدایت کرتے ہیں تو یہ کوئی نازروا بات نہیں ہے :

"ایک جلد قلمی (قاطع برہان کی) تم کو بھیج دوں گا ..... بہت سودمند نسخہ ہے ....." (بنام تفتہ، ۴، اکتوبر ۱۸۶۱ء)

"ہاں صاحب! "قاطع برہان" میں اور مطالب بڑھائے اور ایک دیباچہ دوسرا لکھا اور "درفشِ کاویانی" اس کا نام رکھا اور اس کو چھپوایا۔ ایک مجلد اس کا آج اس خط کے ساتھ ڈاک میں بھیجتا ہوں۔ بعد پہنچنے کے اس کو دیکھیے گا اور اکثر وقتِ فرصت، پیشِ نظر رکھیے گا....." (بنام شاکر، یکم اپریل ۱۸۶۶ء)

صدر الصدور مراد آباد کے نام ۱۱ر جنوری ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں خود غالب نے اپنی اس کتاب کو "گنجِ اسرارِ حکمت" قرار دیا ہے :

"قاطع برہان" ثم "درفشِ کاویانی" کا پارسل پہنچا ہے۔ خدا کے واسطے اس کو دیکھنا اور غور سے دیکھنا ..... تم نقادِ نقودِ معنی ہو۔ تم ہی داد نہ دو گے تو کون دے گا! یہ کتاب نہیں، گنجِ اسرارِ حکمت ہے۔ مَن قال سے قطع نظر ما قال کو دیکھو۔"

"درفشِ کاویانی" کو منطبعہ صورت میں دیکھنے کے بعد اس کے بارے میں اُن کا یہ پہلا تاثر ہے۔ وہ ۸ر جنوری ۱۸۶۶ء کو رامپور سے واپس آئے ہیں اور رامپور سے آتے ہی انہیں چھاپے کی تیار کتاب ملی، تیسرے روز ہی اس کا پارسل صدر الصدور مراد آباد کو ارسال ہوا۔ ان سے پہلے کسی اور کو "درفشِ کاویانی" کا بھیجا جانا غالب کے خطوں سے ثابت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ نواب میر غلام بابا خان کو بھی جن کی مالی اعانت سے یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی،

---

[1] بنام، مفتی میر محمد عباس، ۱۶، اگست ۱۸۶۵ء

"درفشِ کاویانی" کے نسخے ۲۰ فروری ۱۸۶۶ء کو بھیجے گئے ہیں ..... "درفشِ کاویانی" کے بارے میں ان کا یہ "پہلا تاثر" کہ "یہ کتاب نہیں، گنجِ اسرارِ حکمت ہے" کتاب کا بڑا بلیغ تعارف ہے۔

غالب کا یہ شعر بہت معروف ہے:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

یہاں وہ "قاطع بُرہان" المخاطب بہ "درفشِ کاویانی" کو "گنجِ اسرارِ حکمت" قرار دے رہے ہیں مولانا غلام رسول مہر کے بقول "یہ دعویٰ اس اعتبار سے بالکل درست ہے کہ فارسی یا کسی بھی زبان کے متعلق اس میں محکم بنیادی اصول پیش کر دیے گئے ہیں جن کی روشنی میں کوئی شخص غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا ...۱"

شیخ محمد اکرام نے "قاطع بُرہان / درفش کاویانی" کی علمی قدر و قیمت، کا بہت محتاط اور مسکت تعین کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ غالب نے ۱۸۶۲ء میں "دس جزو کا ایک رسالہ" "قاطع بُرہان" کے نام سے شائع کیا۔ یہ رسالہ تو اب کمیاب ہے[۳] لیکن اس کی اشاعت کے تین چار سال بعد مرزا نے دوسرا ایڈیشن "درفشِ کاویانی" کے نام سے شائع کرایا تھا۔ جس کی ایک جلد برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے[۴]۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت جو ایک سرسری مطالعے سے بھی واضح ہوتی ہے مرزا کی آزاد قوتِ فیصلہ ہے جس طرح مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے کورانہ تقلید کے خلاف لوگوں کو اُبھارا تھا، مرزا رائے عامہ کے پابند نہ تھے اور ہر ایک مسئلہ پر آزادانہ تنقید جائز بلکہ ضروری سمجھتے تھے۔ وہ "درفشِ کاویانی" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"مرا نیز خردے و روانی دادہ اند۔ فراز آوردۂ اندیشۂ بیگانگان را چوں پذیرم و از تیر دئے خرد خدا داد کار چرا نگیرم؟ ....."

وہ نہ صرف اپنے معاصرین کی رائے کو بہ نظرِ تنقید دیکھتے تھے بلکہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی طرح

---

۱ خطوطِ غالب، لاہور، ۱۹۶۹ء، جلد ۲، صفحہ ۹۰۷
۲ غالب نامہ: آثارِ غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۶۸
۳ قاطع برہان طبع اوّل (۱۸۶۲ء) راقم الحروف کے ذاتی ذخیرۂ غالبیات کی زینت ہے۔
۴ "درفشِ کاویانی" طبع اوّل (۱۸۶۵ء) کا ایک نسخہ راقم الحروف کے ذاتی ذخیرۂ غالبیات میں بھی موجود ہے۔

اگلوں کے فیصلے کے سامنے اندھا دھند سر نہ جھکاتے تھے۔ چنانچہ وہ تفتہ کو اسی زمانے میں ایک خط میں لکھتے ہیں "یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں، وہ سب حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے ....." "لطائفِ غیبی" میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ:

"محققین، امورِ دینی میں مجتہدین کے قیاسات میں متأمل رہتے ہیں، حالاں کہ وہ منقولات کا مقولہ ہے اور نقل کا مدار مجتہدوں کے قیاس کو مان لینے پر ٹھہرا ہے۔ عقلاً امورِ معقول میں اپنے تعقل کو کیوں دخل نہ دیں اور اپنی عقل و قیاس کو کیوں بے کار چھوڑ دیں؟ نقیضیں حق نہیں ہیں، ہم کیوں کر نقائضِ متعدّدہ کو حق مانیں؟

ہاں، اگر زردشتیوں میں سے کسی نے فرہنگِ لغاتِ فارسی لکھی ہوتی یا ساسان پنجم نے کوئی مجموعہ فراہم کیا ہوتا یا متاخرین میں آذر کیوان کی کوئی تحریر موجود ہوتی اور ہم اس کو نہ مانتے اور وہاں اپنے قیاس کو دوڑاتے تو عقل کے فتوے کے مطابق کافر ہو جاتے۔

کیا مزے کی بات ہے! رودکی و فردوسی و عسجدی و دقیقی سے لے کر مولوی عبدالرحمٰن جامی تک کہ وہ منتہی المتقدمین اور صاحبِ تصنیفاتِ کثیرہ ہے اور پھر ظہوری و نظیری اور ان کے نظائر سے لے کر شیخ محمد علی حزیں منتہی المتاخرین تک نہ کسی نے کوئی فرہنگ لکھی، نہ کسی نے کوئی قواعد فارسی کا رسالہ تصنیف کیا۔

اہلِ ہند نے تین تین چار چار سو برس سے شغلِ فرہنگ نویسی اختیار کیا۔ نہ زبان دان نہ سخنور، اشعارِ شعراء کو ماخذ ٹھہرا کر مطابق اپنے قیاس کے استنباط کرنے لگے۔ قیاس کم تر مطابق واقع، بیشتر غلط، مبلغ علم متفاوت، افہام مختلف، قیاس اور نقل اور تقلید پر مدار، بے اصل دعوے کی حقیقت پر اصرار۔"

(لطائفِ غیبی، ۱۸۶۴ء)

آزاد توت فیصلہ اور امورِ معقول میں تعقل کو دخل دینا بڑی جرأت اور تعریف کی بات سہی لیکن ظاہر ہے کہ جس طرح یہ نقطۂ نظر کہ جو اگلے کہتے تھے، سب درست ہے، صحیح نہیں،

اُسی طرح شیخ محمد اکرام کے لفظوں میں، کورانہ تقلید چھوڑ کر اندھادُھند مخالفت اختیار کرنے میں بھی کوئی مصلحت نہیں۔ ہر ایک مسئلے کا فیصلہ، اُس کے اپنے حسن و قبح سے ہوسکتا ہے"۔
غالب کے بقول :

۱۔ زردشتیوں میں سے کسی نے فرہنگِ لغاتِ فارسی نہیں لکھی۔
۲۔ ساسانِ پنجم نے کوئی مجموعہ فراہم نہیں کیا۔
۳۔ متاخرین میں آذر کیوان کی کوئی تحریر موجود نہیں، اور :
۴۔ رُودکی و فردوسی و عسجدی و دقیقی سے لے کر مولوی عبدالرحمٰن جامی نے، نیز :
۵۔ ظہوری و نظیری اور اُن کے نظائر سے لے کر شیخ محمد علی حزیں تک ـــ

نہ کسی نے کوئی فرہنگ لکھی، نہ کسی نے کوئی قواعد فارسی کا رسالہ تصنیف کیا" اس صورت میں کہ زردشتی عہد سے حزیں تک کسی پارسی الاصل فارسی داں نے از قسم لغت فارسی کچھ نہ لکھا، ہند کے فارسی فرہنگ نویس قدر افزائی اور داد کے مستحق قرار پاتے ہیں، اور ہند کے عام فارسی داں اصحاب کے لیے ان فرہنگوں سے استفادہ ناگزیر ہے۔ یہ لغات کم تعداد میں خاصی ہیں، ان کے مراتب تو ضرور ہوں گے لیکن اِس کُل سرمایۂ لغت سے یکسر "منکر" ہونا، زیادہ مستحسن صورت نہیں ہے اور اسے بے جا توغّل سمجھنا خلافِ احتیاط نہ ہوگا۔ غالب کہتے ہیں کہ ان سب فرہنگوں کے جامع کیوں کہ ہندی ہیں، کوئی اہلِ زبان نہیں ہے" اس لیے یہ بے وقعت ہیں، جو اہلِ زبان کہیں وہی صحیح ہے ـــ حقیقتاً اکرام صاحب کے بقول "یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے جس پر آج بھی اہل الرائے متفق نہیں"۔
(غالب نامہ، ایضاً، صفحہ ۱۶۹)

لیکن شیخ محمد اکرام ہی کے لفظوں میں یہ ماننا پڑتا ہے کہ عام اغلاط اور الفاظ کے معانی سے قطع نظر فنِ لغت میں مرزا نے جو اصول وضع کیے ہیں اور ان کے لحاظ سے "برہانِ قاطع" پر جو نکتہ چینی کی ہے، وہ بیشتر صحیح ہے۔ مثلاً مرزا کا یہ خیال کہ اگر لغت میں "مصدر" کے معنی دیے جائیں تو "مشتق" کے معنی دینے کی ضرورت نہیں رہتی، درست ہے اور اس اصول کو نظر انداز کر کے مصنف "برہان" نے الفاظ کا ذخیرہ بہت بڑھا دیا تھا۔ اسی طرح شعرا

نے الفاظ سے جو معانی، استعارے کے طور پر کسی خاص نظم میں مراد لیے تھے، انہیں بھی مصنف نے مستقل لغت کے طور پر درج کیا تھا[1]..." غرض صاحبِ "برہانِ قاطع" محمد حسین سے جنہیں وہ تحقیر کے انداز میں دکنی کے عرف سے بھی خطاب کرتے ہیں، غالب کو طرح طرح کی شکایتیں تھیں اور بجا تھیں:

"فنِ لغت میں ایک امر ہے کہ اس کو تصحیف کہتے ہیں یعنی لفظ کی صورت ایک ہو اور نقطوں میں فرق ..... صاحبانِ فرہنگ میں "برہانِ قاطع" والا تصحیف میں بہت مبتلا ہے .... کہتا ہے کہ "سدا" بہ سینِ سعفص لفظ فارسی ہے اور "صدا" بہ صاد تعریب ہے۔ جو لغات "تے" میں لکھے ہیں انہیں "طوئے" میں لکھتا ہے۔ حالانکہ جس طرح "عین" فارسی میں نہیں ہے، "طوئے" بھی نہیں ہے۔ مثلاً "تشت" لغت فارسی الاصل ہے، املا اس کی "طوئے" سے غلط ہے۔ "برہانِ قاطع" والا اس کو "تے" سے بھی لایا ہے اور "طوئے" سے بھی محققین جانتے ہیں کہ "صدا" بہ معنی آواز، لغت عربی الاصل ہے، نہ معرّب۔ اور "سدا" سین سے ہرگز فارسی میں آواز کو نہیں کہتے، ہاں اُردو کے محاورہ میں بہ معنی ہمیشہ کے مستعمل ہے، قصہ کوتاہ "غربال"، بہ معنی چھلنی کے لفظ فارسی الاصل صحیح اور فصیح ہے اور "غربال" اگر کسی ..... فرہنگ عربی میں ..... بمعنی چھلنی کے (ہے) نکلے تو .... یہ "برہانِ قاطع" والے کی خرافات میں سے ہے۔"

(بنام سیاح، ۲۷، فروری ۱۸۶۱ء)

"اور جو دکنی بوہرہ یعنی جامع "برہانِ قاطع" اَت، اِش، اُم، لکھتا ہے، غلط کرتا ہے ...."

(بنام سُرور، ۱۸۶۱ء)

"صاحب 'برہان قاطع' کا کیا ذکر کرتے ہو، وہ تو ہر لغت کو تین حرکتوں سے لکھتا ہے کہ زیر، زبر، پیش کا تفرقہ منظور نہیں رکھتا ہے۔ لکھتا ہے کہ یوں بھی آیا ہے، اور یوں بھی دیکھا ہے جس لغت کو کاف عربی سے لکھے گا، کاف

---

[1] غالب نامہ، آثارِ غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۶۸ و بہ بعد

فارسی سے بھی بیان کرے گا۔ جس لفظ کو طائے حطی سے لائے گا، تائے قرشت سے بھی ضرور لکھے گا۔ عرق "جھگڑا" کو "جگر" بولتا ہے۔ رائے ثقیلہ، ہائے مخلوطہ، تشدید، یہ تینوں ثقالتیں مٹا دیں۔۔۔

صاحب "برہان قاطع" اس لفظ کو فارسی بتاتا ہے اور زبان علمی اہلِ ہند میں بھی اس کو مشترک جانتا ہے۔ اپنے کو رسوا اور خلق کو گمراہ کرتا ہے۔"

(بنام تفتہ، ۱۴؍مئی ۱۸۶۵ء)

"دکنی تو یہ بھی نہیں جانتا کہ یائے اصلی کیا ہے اور یائے زائد کیا ہے۔۔۔"

(نامۂ غالب، ۱۸۶۵ء)

غرض طرح طرح کی شکایات اور بعض اصولی اعتراضات کے علاوہ غالب کو صاحب "برہان" کے بتائے ہوئے بعض معانی سے بھی جن کا مدار غالب کے نزدیک صاحب "برہان" کے قیاس پر تھا بنیادی اختلاف تھا اور اختلاف میں صاحب "برہان" کی کچھ ایسی خصوصیت نہیں وہ کسی بھی فرہنگ نویس کے قائل نہیں تھے۔ دیکھنا چاہیے کہ فرہنگ طرازوں اور فرہنگوں کے بارے میں غالب کی رائے اور فرہنگ طرازوں کے بارے میں غالب کے "عقائد" کیا تھے:

"اگرچہ 'قاطع برہان' میں جا بجا لکھتا آیا ہوں مگر اب ہندی کی چندی کر کے لکھتا ہوں کہ یہ عقیدہ میرا ہے کہ فرہنگ لکھنے والے جتنے گزرے ہیں سب ہندی نژاد ہیں۔ ہاں علمِ صرف و نحوِ عربی میں بہ قدر تحصیل مُسلّم اور اُستاد ہیں۔ علمِ صرف و نحو کی کتبِ درسی موجود ہیں جس نے چاہا ہے، اُس نے اُستاد سے ان کتب کو پڑھ لیا ہے۔ فارسی کی جو فرہنگیں حضرات نے لکھی ہیں، مطالب مندرجہ کس اصول پر منضبط کیے ہیں اور اس کا علم کس استاد سے حاصل کیا ہے؟ آخر مقاصد صرف و نحو عربی بھی تو صرف مطالعۂ کتب سے نہیں نکالے ہیں۔ پہلے تعلیم و تعلّم ہے پھر کتبِ قواعد کے جا بجا حوالے ہیں۔ قواعد فارسی کا رسالہ اہلِ زبان میں سے کس نے لکھا ہے اور ان ہوس پیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کس فاضلِ عجم سے پڑھا ہے؟

(نامۂ غالب، ۱۸۶۵ء)

ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوش گو اور معنی یاب ہیں لیکن یہ کون احمق کہے گا کہ یہ لوگ دعوائے زبان دانی کے باب ہیں۔ رہے فرہنگ لکھنے والے، خدا ان کے بیچ سے نکالے، اشعار قدما آگے دھر لیے اور اپنے قیاس کے مطابق چل دیے۔ وہ بھی، نہ کوئی ہم قدم نہ کوئی ہمراہ بلکہ سو بہ سو پراگندہ و تباہ۔ راہ نما ہو تو راہ بتائے، استاد ہو تو شعر کے معنی سمجھائے۔ نہ آپ شیرازی، نہ استاد اصفہانی .... میرا یہ قول خاص ہے، نہ عام ہے، مجموع اہل فرہنگ نگاروں کے محقق ہونے میں کلام ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ جامع برہان کا ماخذ فرہنگ رشیدی و جہاں گیری ہے۔ عبدالرشید کی کیا شخصی اور میاں انجو میں کیا بہری ہے؟ قطب شاہ جہانگیر کے عہد میں ہوتا اگر منشائے برتری ہے تو بے چارہ جعفر زٹل بھی فرخ سیری ہے۔" (نامۂ غالب، ۱۸۶۵ء) "یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں، وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے۔" (بنام تفتہ، ۱۸۶۳ء)

"جتنے فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں، یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانند پیاز ہیں۔ تو بہ تو اور لباس در لباس وہم در وہم اور قیاس در قیاس۔ پیاز کے چھلکے جس قدر اتارتے جاؤ، چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا، مغز نہ پاؤ گے۔ فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے چلے جاؤ گے، لباس ہی لباس دیکھو گے، شخص معدوم۔ فرہنگوں کی ورق گردانی کرتے رہو، ورق ہی ورق نظر آئیں گے، معنی موہوم ....." (نامۂ غالب، ۱۸۶۵ء)

"یہ فرہنگ لکھنے والے، نہ ان کے پاس ماخذ، نہ ان کے ہاتھ میں کوئی میزان۔ اشعار قدما میں لغات دیکھ دیکھ کر موافق محل و مقام، وہ بھی محض از روئے قیاس، معنی لکھتے گئے۔ تین سو برس میں یعنی خلیفۂ ثالث کے عہد سے محمود غزنوی کے وقت تک نقل در نقل ہونے میں کیا کیا تصحیف و تحریف واقع ہو گئی ہو گی۔ اس سے بڑھ کر چھ سات سو برس میں کیا صورت ہو گئی ہو گی۔ فرہنگ جہانگیری اور مثل اس کے اور فرہنگیں ...، ان میں خلط در

خبط و غلط در غلط کے سوا حسنِ تحقیق کہاں ؟......

(لطائفِ غیبی ، ۱۸۶۴ء)

اب دیکھیے کہ وہ کن اصحاب کی سند مانتے اور کن اصحاب کو مُسَلَّم الثبوت نہیں گردانتے ، نیز بعض معروف اور اپنے ہم وطن فارسی داں اصحاب کے بارے میں اُن کی رائے کیا تھی :

"غالب کہتا ہے ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمت کے سوا کوئی اُستاد مُسَلَّم الثبوت نہیں ہوا۔ خسرو، کیخسرو قلم رو سخن طراز(؟) ہے یا ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طرح سعدی شیرازی ہے۔ خیر فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے کلام اس کا پسندیدۂ جمہور ہے۔ آرزو، فقیر اور شیدا اور بہار وغیر ہم انھیں میں آگئے۔ ناصر علی اور غنیمت، ان کی فارسی کیا؟ منت اور مکین اور واقف اور قتیل، یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے۔ ان حضرات میں عالم علومِ عربیہ کے متخص ہیں؟ خیر ہوں، فاضل کہلائیں، کلام میں ان کے مزا کہاں؟ ایرانیوں کی سی ادا کہاں؟ فارسی کی قاعدہ دانی میں اگر کلام ہے، اس میں پیروئ قیاسی، ایک بلائے عام ہے۔ وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے بایں ہمہ وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر آجاتا ہے اپنے منہ کی کھاتا ہے۔ مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنائع لفظی میں دستگاہ اچھی تھی۔ اس شیوہ و روش کو خوب برت گئے، فارسی وہ کیا جانیں؟ قاضی محمد صادق اختر عالم ہوں گے، شاعری سے اُن کو کیا علاقہ؟ ہندی فارسی والوں نے کماں کو وہم میں منحصر کیا ہے...." (تحاطب بہ ، صاحب عالم ۱۸۶۴ء)

"اہلِ ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مُسَلَّم الثبوت نہیں، میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا، وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو تو ہم اُس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیوں مُسَلَّم الثبوت جانیں۔"

(بنام تفتہ ، ۱۴ مئی ۱۸۶۵ء)

"میاں انجو جامع" فرہنگ جہانگیری" "تیغ رشید راقم" فرہنگ رشیدی" "غلطای عجم میں سے نہیں۔ ہندان کا مولد، ماخذ ان کا اشعارِ قدما، ہادی ان کا قیاس، ٹیک چند اور سیالکوٹی مل، ان کے پیرو۔ سبحان اللہ ہندی بھی اور ہندو بھی۔ نورٌ علیٰ نور۔۔۔۔۔ فقیر، اشعارِ قدما، کا معتقد، ان لوگوں کے کلام کا عاشق، مگر جو لغات ان کے کلام میں ہیں، اس کے معنی تو اہلِ ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں۔ میں ان کے قیاس پر کیوں کر تکیہ کروں؟"

(بنام نواب کلب علی خاں، ۷ر اکتوبر ۱۸۶۶ء)

"سنہ ۸۰۰ یا سنہ ۹۰۰ ہجری میں ہوسناک لوگ فارسی کی فرہنگ لکھنے پر متوجہ ہوئے۔ نہ ایک نہ دو بلکہ ہزار دو ہزار فرہنگیں فراہم ہو گئیں۔ یہاں تک کہ قتیل نو مسلم لکھنوی، اور ملّا غیاث الدین ملائے مکتب دار رامپوری اور کوئی روشن علی جونپوری ..... اور کہاں تک کہوں، کون، کون .... جس کے جی میں آئی وہ متصدی تحریر قواعد انشا، ہو گیا۔ میں ان سب کو یا ان میں سے مختص فلاں و بہمان کو اپنا مطاع کیوں کر جانوں؟ اور کس دلیل سے ان کے حکم کو مانوں؟ ....."

(بنام مولوی ضیاء الدین، ۱۸۶۴ء)

"غیاث اللغات" ایک نام موقر و معزز، جیسے الفریہ، "خوامخواہ مرد آدمی، آپ جانتے بھی ہیں کہ یہ کون ہے؟ ایک مُعلّم فرومایہ، رامپور کا رہنے والا، فارسی سے ناآشنائے محض اور صرف و نحو میں ناتمام "انشاء خلیفہ" و "منشآتِ مادھو رام" کا پڑھنے والا۔ چنانچہ دیباچے میں اپنا ماخذ بھی اس نے خلیفہ شاہ محمد و مادھو رام، غنیمت و قتیل کے کلام کو لکھا ہے۔ یہ لوگ راہِ سخن کے غول ہیں، آدمی کے گمراہ کرنے والے۔ یہ فارسی کو کیا جانیں؟ ہاں، طبع موزوں رکھتے تھے، شعر کہتے تھے۔"

(بنام نواب انور الدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۲ء)

"سنو میاں! میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیٔ فارسی دانی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ

گھاگھس (دوغلا مرغا) اتو، عبدالواسع ہانسوی لفظ "نامراد" کو غلط کہتا ہے
اور یہ اتو کا پٹھا قتیل "صفوتکدہ" و "شفقکدہ" و "نشترکدہ" کو اور "ہمہ عالم"
و "ہمہ جا" کو غلط کہتا ہے۔"   (بنام تفتہ، ۲۷ اگست ۱۸۶۲ء)

غالب کا اعتراض اور استدلال یہ ہے کہ مجموعِ فرہنگ نویس ہندی نژاد ہیں، کوئی ان میں سے پارسی الاصل، یعنی اہلِ زبان نہیں، نہ ان فرہنگ نویسوں میں سے کسی کو، کسی فاضلِ عجم نے تحصیلِ علم کا موقع ملا۔ میں ان سب کو یا ان میں سے مختص فلاں وبہماں کو اپنا مطاع کیوں کر جانوں اور کس دلیل سے ان کے تحکم کو جانوں؟ ان میں سے کوئی بھی مسلّم الثبوت اور سند نہیں۔ ان فرہنگ نویسوں نے استنباطِ معنی کا مدار اپنے قیاس پر ٹھہرایا ہے جو نہ ہمیشہ لیکن اکثر و بیشتر غلط ہوتا ہے۔ اس معاملے میں وہ خصوصیت سے صاحب "برہان" کے قیاسِ سقیم و ضعیف سے زیادہ ہی شاکی اور مایوس ہیں اور اسی لیے وہ جابجا صاحب برہان کے متعینّہ اور مندرجہ معانی سے اختلافِ شدید ظاہر کرتے ہیں:

"فرہنگ لکھنے والوں نے اشعار قدما میں ترکیبیں دیکھیں، اپنا قیاس دوڑا کر اس کی حقیقت ٹھہرالی۔ کہیں ان کا قیاس غلط، کہیں صحیح۔ سو ان میں سے یہ دکنی ایسا کج فہم ہے کہ اس کا قیاس سو لغت میں شاید دس جگہ صحیح ہو ..."

(بنام میرزا تفتہ، مئی ۱۸۶۵ء)

"فرہنگ نویسوں کا قیاس معنیٔ فارسی میں نہ سراسر غلط ہے، البتہ کم تر صحیح اور بیش تر غلط ہے۔ خصوصاً دکنی تو عجب جانا نہ ہے، لغو ہے، پوچ ہے، پاگل ہے، دیوانہ ہے۔"   (نامۂ غالب، ۱۸۶۵ء)

"اس بزرگ یعنی صاحبِ "برہانِ قاطع" کو عقل سے بہرہ نہیں، صرف نقل پر مدار ہے۔ خدا جانے اس کو کوئی بہکایا کرتا ہے یا یہ آپ، قیاس کرتا ہے اور لطف یہ کہ قیاس اس کا کہیں صحیح نہیں ہوتا۔ عجب معوج الذہن آدمی ہے۔"
(قلمی تحریر[1] بر حاشیہ "برہانِ قاطع" نسخۂ غالب، ۱۸۵۹ء)

---

[1] بحوالہ: امتیاز علی عرشی، تحریک، دہلی، اپریل مئی ۱۹۶۱ء، صفحہ ۲۳

غرض کیا باعتبارِ فنِ "لغت" اور کیا بلحاظِ تعیینِ معنی، غالب کے نزدیک "برہانِ قاطع" بڑی کمزور کتاب تھی، اور کہ یہ کتابِ لغات، حوالے و استناد کی کتاب کے طور پر ہندوستان میں رائج و مقبول تھی، انھوں نے ہند کے عام فارسی خواں اصحاب اور بالخصوص اپنے تلامذہ کو گمراہی سے بچانے کے لیے "برہانِ قاطع" کی غلطیوں کو بے نقاب کیا، لیکن اس "عملِ جراحی" میں شاعر کی بے دردی نمایاں ہے :

"میں برہان، کا خاکہ اُڑا رہا ہوں۔ "چار شربت" (تالیفِ قتیل) اور "غیاث اللغات" کو حیض کا لتہ سمجھتا ہوں۔ ایسے گم نام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا۔ "برہانِ قاطع" کے اغلاط بہت نکالے ہیں۔ دس جزو کا ایک رسالہ لکھا ہے، اس کا نام "قاطع برہان" رکھا ہے ....."

(بنام تفتہ، ۲۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء)

غالب نے "نامۂ غالب" میں "ساطع برہان" کے مولف میرزا رحیم بیگ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ:

"تم کو معرضِ تحریر میں تحمّل و تأمل چاہیے، نہ سخن پروری و جانب داری میں توغّل چاہیے....."

لیکن اس کی راہ تو خود انھوں نے دکھائی "قاطع برہان" علمی اعتبار سے بڑی معرکے کی کتاب ہے۔ اس کا دائرۂ اثر کہیں زیادہ بڑھ جاتا اگر معرضِ تحریر میں مزید تحمل و تأمل سے کام لیا جاتا اور توغل سے یکسر بچا جا سکتا۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے صحیح لکھا ہے کہ حقیقتاً "میرزا غالب نے (قاطع برہان/درفشِ کاویانی وغیرہ) چند اجزا لکھ کر علم و تحقیق کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ "برہان قاطع" کی جو خرافات انھوں نے نقل کی ہیں، انھیں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کوئی صاحبِ بصیرت کیوں کر ان کی تائید کر سکتا ہے؟ مگر مصیبت یہ ہے کہ سارا معاملہ ایک طرح کا منطقی مصادرہ تھا۔ اعتراض ہندی لغت نویسوں پر تھا اور ہندی لغت نویسوں ہی کا کلام بطور دلیل کے پیش کیا گیا ہے۔"[۱]

---

[۱] غالب اور ابو الکلام، عتیق صدیقی، دہلی، ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۱۳-۱۱۴

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کے عام فارسی دانوں کے متعلق غالب کی سخت رائے (دنبۂ ۱۸۲۸ء) میں اُن کے خلاف کلکتہ میں جو ہنگامہ بپا کیا گیا تھا وہ "قاطع بُرہان" کی اشاعت پر زیادہ شدت و وسعت کے ساتھ دوبارہ ابل پڑا اور غالب کو تادمِ زیست اس سے نجات نہ ملی۔ "بُرہان قاطع" کے شائع ہوتے ہی جامد خیال مقلدوں کے لشکر غالب کے خلاف صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے کوئی یہ سوچنے کے لیے تیار نہ تھا کہ غالب نے کیا لکھا ہے یا اصولِ فارسی کے لحاظ سے اس کی حقیقی حیثیت کیا ہے سب محض اس وجہ سے جوش میں آگئے کہ غالب کو صاحبِ "برہانِ قاطع" کے خلاف زبان کشا ہونے کی جرأت کیوں کر ہوئی؟ اس سلسلے میں غریب، غالب نے چھوٹے پیمانے پر وہ تمام مصیبتیں اور اذیتیں برداشت کیں جو تقلید و جمود کے راستے سے الگ ہو کر چلنے والوں کو ہر عہد اور ہر دائرے میں ہمیشہ پیش آتی رہی ہیں[۱]......"

حالی کا بیان ہے کہ "قاطع بُرہان" کا شائع ہونا تھا کہ ہر کس و ناکس میرزا کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا۔ مخالفت کی وجہ ظاہر ہے۔ تقلید نہ صرف امورِ مذہبی میں، بلکہ ہر چیز، ہر کام، ہر علم اور ہر فن میں ایسی ضروری شے ہو گئی ہے کہ تحقیق کا خیال نہ خود کسی کے دل میں خطور کرتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ سلف کے خلاف کوئی بات زبان پر لائے۔ جو کتاب سو دو سو برس پہلے لکھی جا چکی ہے۔ وہ وحیِ منزل کی طرح واجب التسلیم سمجھی جاتی ہے۔ پس مرزا کے اعتراضات "بُرہانِ قاطع" پر کیسے ہی واجبی ہوتے ممکن نہ تھا کہ ان کی سختی کے ساتھ مخالفت نہ کی جاتی[۲]......"

"قاطع بُرہان" کی مخالفت میں جو آوازہ بلند ہُوا، خود غالب نے بھی "لطائفِ غیبی" میں اس کی توجیہہ کی ہے جو لطف سے خالی نہیں اور غالب کے مخصوص پُرزور اسلوب میں ہے!

"بات یہ ہے کہ فارسی دانانِ ہند محقق نہیں ہیں، مُقلّد ہیں۔ اکثر تو قتیلِ بے سرمایہ کے پجاری، اس کی تالیفات کو آنکھ کی پتلی بنائے ہوئے ہیں۔

---

[۱] غالب، طبع چہارم، لاہور، ۱۹۴۶ء، صفحہ ۴۲۶

[۲] یادگارِ غالب، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، صفحہ ۶۶

جو بلند پرواز ہیں، وہ "برہانِ قاطع" کو عرش المعرفت جانتے ہیں اور اس کے اقوال کو مانتے ہیں۔ پس جب کوئی مُحقّق، حق و باطل کا مُمیّز ہو اور دکنی کے اغلاط ظاہر کرے تو وہ حضرات، طیورِ آشیاں گم کردہ کیوں نہ بن جائیں؟ جب ان کا ماخذ تباہ ہو گیا تو وہ اب سند کس کو ٹھرائیں؟

جس میں دو صفاتِ ثبوتی جمع ہوں گی، یعنی حقیقتِ زبانِ فارسی سے آگہی اور انصاف کا ملکہ، مع ہٰذا یہ دو صفتیں سلبی بھی معاً موجود ہوں گی، یعنی مُردہ پرست نہ ہو گا اور حسد پیشہ نہ ہو گا، وہ تو غالب کی قدر جانے گا اور اِس مُحقّقِ مدقّق کے قول کو مانے گا اور ایسے لوگ دنیا میں کم ہوں گے۔ پس اس صُغریٰ و کُبریٰ کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرتِ غالب کے مُنافقین و منکرین ہزار در ہزار پیدا ہو جائیں گے۔ ہر چند اہلِ حق انہیں سمجھائیں گے، لیکن وہ انکار سے باز نہ آئیں گے۔ جہلِ مرکب کا علاج محال ہے۔"

غالب کا یہ بیان "قاطع برہان" کی اشاعت کے دو برس بعد کا ہے۔ اشاعتِ کتاب پر اہلِ ہند کی طرف سے جو ردِّ عمل ہُوا وہ اُن کے لیے قطعاً غیر متوقع نہیں تھا وہ زیادہ سے زیادہ اسی کی توقع رکھتے تھے۔ چنانچہ کتاب کی اشاعت سے کوئی تین برس پہلے جولائی ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں اُنھوں نے مجروح کو یہی لکھا تھا کہ :

"یاد رہے جو صاحب (میری کتاب "قاطع برہان") کو دیکھیں گے، وہ ہرگز نہ سمجھیں گے۔ صرف "برہانِ قاطع" کے نام پر جان دیں گے۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں گی وہ اس کو مانے گا۔ پہلے تو عالم ہو، دوسرے فنِ لُغت کو جانتا ہو۔ تیسرے، فارسی کا علم خوب ہو اور اس زبان سے اُس کو لگاؤ ہو۔ اساتذۂ سلف کا کلام بھی بہت کچھ دیکھا ہو اور کچھ یاد ہو۔ چوتھے مُنصف ہو، ہَٹ دھرم نہ ہو۔ پانچویں، طبعِ سلیم و ذہنِ مستقیم رکھتا ہو۔ مُعوّج الذہن اور کج فہم نہ ہو۔ نہ یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا....."

یہی ہوا یعنی محنت کی "داد" یہ ملی کہ "قاطع برہان" کے چھپتے ہی ایک تلخ بحث شروع ہوگئی۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ "فی الحقیقت مبحث ہی ایسا تھا کہ اس میں اختلافِ رائے کی گنجائش تھی اور پھر مرزا کا اختلاف فقط صاحبِ "برہانِ قاطع" سے نہ تھا۔ وہ کسی بھی ہندوستانی فرہنگ نویس کے قائل نہ تھے اور جو لوگ ان فرہنگ نویسوں کو اپنا قبلہ اور امام بنائے ہوئے تھے، اُن کی طرف سے مرزا کی مخالفت ایک امرِ لابد تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ ایک علمی بحث پست سطح پر جاری رکھی گئی۔ اس کی وجہ ایک حد تک مرزا کا طرزِ تحریر تھا۔ اُن کی کتاب "قاطع برہان" صاف اور موثر زبان میں لکھی گئی ہے لیکن طرزِ تحریر ضرورت سے زیادہ شوخ ہے اور صاحبِ بُرہان کا جا بجا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ اس سے "بُرہانِ قاطع" کے طرف دار ضرور آگ بگولہ ہوئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اگر "بُرہانِ قاطع" میں غلطیاں تھیں تو "قاطع برہان" بھی غلطیوں سے پاک نہ تھی[1]...." (غالب نامہ، صفحہ ١٧٥)

حالی کے بقول "بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مرزا نے جو ازراہِ شوخیٔ طبع کے صاحبِ برہان کا جا بہ جا خاکہ اڑایا ہے اور کہیں کہیں الفاظ نا ملائم بھی غیظ و غضب میں ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں، زیادہ تر اس وجہ سے مخالفت ہوئی، مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اگر مرزا صاحبِ برہان کی نسبت ایسے الفاظ نہ لکھتے تو بھی مخالفت ہوتی۔ کیونکہ ہندوستان کے پرانے تعلیم یافتہ جو آج کل ایک نہایت کس مپرسی حالت میں ہیں۔ اُن کے لیے کنجِ خمول و گمنامی سے نکلنے کا کوئی موقع اس کے سوا باقی نہیں رہا کہ کسی سربرآوردہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں اور لوگوں پر یہ ظاہر کریں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں[2]...."

شیخ محمد اکرام بجا لکھتے ہیں کہ "حالی نے سرسید کی مخالفت کی بھی یہی وجہ دی ہے

---

[1] "قاطع بُرہان" تردیدی بیان تھا۔ خود غالب کو بھی اعتراف ہے کہ یہ بہت احتیاط اور کاوش سے لکھی گئی تھی، لیکن اس تمام کوشش کے باوجود بھی وہ "آویزہ" و "افسوس" کے بارے میں دھوکہ کھا گئے اور اِنہی فارسی نویسانِ ہند کی نکتہ چینی پر اصلاح کی۔ اس سے اُن کو اندازہ ہونا چاہیے تھا کہ فرہنگ لکھنا کتنا مشکل کام ہے اور اس میں غلطیاں رہ جانی کتنا آسان ہے۔"

(سید اسد علی انوری فرید آبادی: قتیل اور غالب، دہلی، ١٩٣٩ء، صفحہ ٩٩)

[2] غالب نامہ، آثارِ غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ١٧٦

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طرزِ استدلال، کسی اعتراض کا جواب نہیں۔ اگر مرزا غالب اس علمی بحث میں ذاتیات کو نہ لے آتے اور بلاوجہ تمسخر و استہزا سے کام نہ لیتے تو مخالفین بھی اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیتے۔ علاوہ ازیں اگر بغرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے کہ پُرانے تعلیم یافتہ اپنی شہرت کے لیے مشہور آدمیوں کی مخالفت کرتے ہیں، تب بھی نا ملائم الفاظ کے استعمال میں جو عیب ہے، وہ کم نہیں ہو جاتا۔

حقیقت یہ ہے اور مرزا غالب کے سوانح نگار کو اس امر کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مباحثہ کرتے وقت، وہ اپنے ترکش کے سارے تیر استعمال کرتے تھے۔ اس سے پہلے جب اُن کے کلام پر قتیل کے مرتب کردہ اصولوں کی بنا پر اعتراض ہوئے تھے تو وہ اس کا آبائی شجرۂ نسب ڈھونڈ لائے تھے اور اب جو انہوں نے "بُرہانِ قاطع" کے مصنّف سے اختلاف کیا تو دلائل و براہین پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے قلم سے تیر اور نشتر کا کام لیا۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا غالب کی شوخ نگاری اور (مخالفین کی) فحش نگاری میں کوئی چیز مشترک نہیں اور "برہان" کے بعض مدّاحوں نے تہذیب و شائستگی کے تمام اصول نظر انداز کر دیے، لیکن یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ شوخی و تمسخر کی ابتدا، مرزا نے کی تھی[۱]۔۔۔"

"قاطع برہان" غالب کی زندگی میں پہلی بار ۲۱ مارچ ۱۸۶۲ء کو لکھنؤ سے شائع ہوئی اور دوسری بار دہلی سے "درفشِ کاویانی" کے اضافی "خطاب" کے ساتھ "بعد اضافہ مطالب دیگر" نومبر ۱۸۶۵ء میں چھپی اور مطبوعہ صورت میں غالب نے اسے رامپور سے واپس آکر ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو پہلی بار دیکھا اور شائع کیا۔

غالب صدی کے موقع پر یا اس کے قریب اس کی یہ دو اشاعتیں عمل میں آئیں:

- در: قاطع بُرہان و رسائل متعلقہ، صفحہ ۱-۱۷۴، قاضی عبدالودود، پٹنہ، ۱۹۶۷ء
- درفشِ کاویانی، ۲۹۵ صفحات، محمد باقر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء

۱۔ غالب نامہ: آثارِ غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۷۶ — ۱۷۷ نم

قطعۂ غالب

"در خصوص گفتگوی پارسی انشا کردہ است"

غالب کی کتاب "قاطع برہان" (۱۸۶۲ء) کے جواب میں مولوی آغا احمد علی متخلص بہ احمد کی ایک ضخیم کتاب "مؤید برہان" ٹائپ میں ۴۶۸ صفحات کو محیط، مطبع مظہر العجائب، محلّہ تال تلا واقع کلکتہ سے ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی۔

"مؤید برہان" غالب کی نظر سے ابھی گذری بھی نہیں تھی اور اس کے بارے میں کلکتے کے کسی دوست سے محض اطلاع ہی ملی تھی کہ غالب نے اکتیس[31] اشعار کا ایک فارسی قطعہ لکھ کر چھپوایا اور کلکتے روانہ کر دیا۔ ۱۶ر شعبان ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۴، دسمبر ۱۸۶۶ء کو اس امر کی اطلاع دیتے ہوئے اپنے شاگرد منشی حبیب اللہ ذکا، کو لکھتے ہیں :

"صاحب! میں بعین عنایتِ الٰہی، کثیر الاحباب ہوں۔ ایک دوست نے کلکتے سے مجھے اطلاع دی کہ مولوی احمد علی مدرس، مدرسۂ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے، نام اس کا "مؤید برہان"، اس رسالے میں دفع کیے ہیں تیرے وہ اعتراضات جو تو نے دکنی پر کیے ہیں اور تیری تحریر پر کچھ اعتراضات وارد کیے ہیں اور اہلِ مدرسہ اور شعرائے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم کی لکھی ہیں۔ بس بھائی! میں نے اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا اور کئی ورق، اس دوست کو، دو چار جلدیں "درفش کاویانی" علاوہ اوراقِ مذکورہ بھیج دیئے۔ اُسی زمانے میں تین چار ورق، خوب یاد ہے کہ "درفش" کی جلد میں رکھ کر تم کو بھیجے ہیں، یا تو مجھے غلط یاد ہے یا تم نے "درفش" کو کھول کر دیکھا نہیں، وہ اوراق مع "درفش" زینتِ طاقِ نسیاں ہیں۔ دو ورق اس لفافے میں اپنے نزدیک مکرر بھیجتا ہوں۔ تم بھی دیکھو اور

صاحبزادہ بھی دیکھے اور یہ جانے کہ فی الحال نظم فارسی یہی ہے اور بس ....."

[اردوئے معلی، طبع اول، دہلی مارچ ۱۸۶۹ء، صفحہ ۴۴]

اس سے پہلے ۴، دسمبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں بھی ذکار سے پوچھ چکے ہیں کہ:

"پہلے تو یہ کہو کہ "درفش کاویانی" اور وہ قطعہ جس کی پہلی بیت یہ ہے:

مولوی احمد علی، احمد تخلص نسخۂ

درخصوصِ گفتگوی پارسی انشا کردہ است

تم کو پہنچا ہے یا نہیں؟ اگر پہنچا تو مجھ کو رسید کیوں نہ لکھی۔ اگر یہ پارسل پہنچ گیا ہے تو رسید لکھو اور دیباچۂ ثانی جدید[1] کی داد دو اور اگر نہیں پہنچا تو مجھ کو اطلاع دو تاکہ ایک نسخہ اور بھیجوں۔"

[اردوئے معلی، طبع اول، صفحہ ۴۲]

گویا "قطعۂ غالب" پر مشتمل ورق ۴، دسمبر ۱۸۶۶ء سے پہلے چھپ گیا تھا۔

غالب کے خطوط میں "قطعۂ غالب" کا ذکر ان دو حوالوں کے علاوہ اور کہیں نظر سے نہیں گذرا، لیکن ایک اور ماخذ کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "قطعۂ غالب" کم از کم اگست ۱۸۶۶ء سے پہلے ضرور چھپ چکا تھا۔

یہ ادعا کچھ تفصیل چاہتا ہے۔ خواجہ غلام غوث بے خبر، غالب کے عزیز دوست تھے۔ انھوں نے مطبع مجتبائی، میرٹھ کے منشی ممتاز علی خاں صاحب کی فرمائش پر غالب کے رقعات کا مجموعہ "عودِ ہندی" مرتب کیا تھا۔ اس کی ترتیب سے فراغت پا کر انھوں نے غالب کو ایک خط لکھا جس میں "مؤید برہان" کا بھی ذکر ہے۔ یہ خط محفوظ ہے۔ بے خبر کے اس خط کی متعلقہ عبارت یہ ہے:

"جنابِ عالی، میں نے ایک عریضہ اس سے پہلے، آپ کو بھیجا ہے۔ اس میں یہ مطلب جواب طلب لکھا ہے کہ مولوی صاحب جہانگیر نگری نے جو رسالہ تصنیف کیا ہے، اس کا نام کیا ہے؟ اور وہ کہاں چھپا ہے، آج تک جواب نہیں۔ کیوں کر مجھے حیرت نہ ہو جب ترکِ جواب آپ کی عادت نہ ہو۔ جواب عنایت کیجیے، مجھے بلائے انتظار

---

[1] یہ "قاطع برہان" کے دیباچۂ ثانی جدید کی داد چاہی جا رہی ہے جو "درفش کاویانی" کے ساتھ شائع ہوا۔

سے نجات دیجیے۔ الحمد للہ کہ "عودِ ہندی" کی ترتیب تمام ہوئی۔ جلد بندھوا کر آج منشی ممتاز علی خاں صاحب کی خدمت میں روانہ کر دی ہے۔ اب چھپوانے میں دیر کریں یا جلدی، ان کو اختیار ہے......" [انشائے بے خبر، صفحہ ۱۱ و مابعد]

"قطعۂ غالب" مطبوعہ کی پیشانی کی عبارت یہ ہے۔

"قطعۂ درگذارش سپاس یادآوری بعالی خدمت جناب مولوی آغا احمد علی صاحب جہانگیر نگری"۔

اور پورے قطعے میں مولوی احمد علی جہانگیر نگری کے نسخے "مؤید برہان" کا نام کہیں نہیں آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مطبوعہ قطعے کا ورق غالب نے بے خبر کو بھیجا ہوگا، اس پر یہ قدرتی امر ہے کہ بے خبر کے دل میں مولوی صاحب کے رسالے کا نام جاننے کا تجسس پیدا ہوا، اور انھوں نے غالب سے پوچھا کہ اس رسالے کا نام کیا ہے۔ اور وہ کہاں چھپا ہے؟ اس استفسار میں رسالے کو دیکھنے اور پڑھنے کا اشتیاق پنہاں ہے۔ غالب کو یہ بات پسند نہ آئی ہوگی، اس لیے انھوں نے اس کے جواب سے صرفِ نظر کیا۔

بے خبر کے اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن ہے یہ ۱۸۶۶ء یا اس کے بعد ہی کا کیونکہ "مؤید برہان" ۱۸۶۶ء میں چھپی ہے۔ مگر ایک دوسرے ذریعے سے ۱۸۶۶ء سنہ عیسوی کے ساتھ ساتھ، بے خبر کے اس خط کے زمانۂ تحریر کا نسبتاً زیادہ متعین طور پر پتہ چل جاتا ہے۔ صاحب عالم مارہروی کے نام غالب کے ایک خط مرقومہ ۲۶ اگست ۱۸۶۶ء کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

"مولوی غلام غوث خاں، میر منشی نے .... میرا مجموعۂ نثر (عودِ ہندی) مرتب کر کے منشی ممتاز علی خاں [کو] بھیج دیا ہے۔ اب چھپوانے میں اُن کو اختیار ہے۔"

[علی گڑھ میگزین، غالب نمبر، ۴۹۔۱۹۴۸ء صفحہ ۹۷]

غالب کا ۲۶ اگست ۱۸۶۶ء کا یہ خط گویا، بے خبر کے محولہ بالا خط کے بعد کا ہے، چونکہ اسی میں بے خبر نے غالب کو اس امرِ خاص سے مطلع کیا تھا اور مطلع بھی کم و بیش انھی لفظوں میں کیا تھا۔

بے خبر کے خط کا یہ ٹکڑا "آج تک جواب نہیں" اس امر پر مظہر ہے کہ مولوی احمد علی جہانگیر نگری کے بارے میں استفسار کیے، گویا بہت دن ہو چکے۔ اس بنا پر میرا خیال یہ ہے کہ بے خبر کو "قطعۂ غالب" ۲۶ اگست ۱۸۶۶ء سے خاصا پہلے مل چکا تھا اور نظر بظاہر قطعے کا ورق، اس وقت تک چھپ

چکا ہوگا، تو ہی بے خبر کو پہنچا ہوگا۔

مختصر یہ کہ قطعۂ غالب کا اگست ۱۸۶۶ء سے قبل چھپنا طے پاتا ہے۔ اکتیس اشعار تو مجھے ہی یہ ایک ورق پر اوّل رُخ ہی آگئے۔ ورق کی تقطیع ½۱۲x۸ انچ ہے لیکن حومز کی پیمائش ½۱۱x۶ انچ ہے۔ خوش نویس بہت باذاق معلوم ہوتا ہے، اس نے ان اشعار کو تین کالموں میں سلیقے سے ترچھا لکھا ہے اور کالموں کو خوش وضعی سے ترتیب دیا ہے۔ بیلدار گوشے علاوہ ہیں۔ قطعہ کے عنوان کی عبارت یہ ہے:

"قطعۂ در گذارش سپاس یاد آوری بعالی خدمت جناب مولوی آغا احمد علی صاحب جہانگیر نگری"

ترقیمہ یہ ہے:

"از جانب آمرزش خواجہ جرم بیراہہ روی اسد اللہ خاں غالب دھلویئے"

اکمل المطابع

ڈاکٹر مختار الدین احمد کے بقول: "غالب نے یہ قطعہ علاحدہ ورق پر اس لیے چھپوایا تھا کہ احباب، تلامذہ اور دوسرے اہلِ علم میں آسانی سے تقسیم کرایا جاسکے۔"

[علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۶۹ء، صفحہ ۴۵]

غالب کا یہ قطعہ "کلیاتِ غالب" (فارسی) کی طباعت (۱۸۶۳ء) کے بعد لیکن "سبد چین" (اگست ۱۸۶۷ء) سے قبل موزوں ہوا، اس لیے قدرتی طور پر "کلیات" سے خارج لیکن "سبد چین" میں شامل ہے۔ غالب کی زندگی میں یہ قطعہ "ہنگامۂ دل آشوب" کے حصۂ اوّل (اپریل ۱۸۶۷ء) پر بھی شائع ہوا۔ اس قطعۂ غالب کا عنوان مالک رام کی مرتبہ "سبد چین" (دہلی ۱۹۳۸ء، صفحہ ۴۹-۵۱) میں 'قطعہ بست و ششم' ہے۔ یہ قطعہ، غالب کی آخری ادبی یادگار "باغِ دو در" (۱۸۶۶-۶۷ء) مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی، (لاہور، ۱۹۶۸ء، صفحہ ۱۹-۲۲) میں بھی موجود ہے۔ حالی نے "یادگارِ غالب" (۱۸۹۷ء) میں اس قطعے کے پندرہ شعر درج کیے ہیں (یادگارِ غالب، مطبع ریاضِ ہند، علی گڑھ صفحہ ۴۵-۴۶)۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد کا خیال ہے کہ:

"قطعۂ مذالب" مطبوعہ' غالب نے کثرت سے اطراف و جوانب میں بھیجا ہوگا لیکن اب یہ قند لباب ہے۔ ہندوستان کے کسی کتب خانے میں راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔ انڈیا آفس لائبریری میں یہ ورق موجود ہے اور غالباً مالک رام صاحب کے پاس بھی یہ قطعہ محفوظ ہے۔" [علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۶۹ء، صفحہ ۴۷]

رام پور سے اکبر علی خاں عرشی زادہ نے یہ اطلاع فراہم کی ہے کہ:

"قطعۂ غالب" کی ایک کاپی رامپور رضا لائبریری میں بھی موجود ہے جو غالب نے نواب رام پور کو بھیجی تھی اور غالباً نہیں بلکہ یقیناً یہ قطعہ مالک رام صاحب کے ذاتی ذخیرۂ غالبیات میں بھی محفوظ ہے۔" [بنام راقم الحروف: ۶ مئی ۱۹۶۹ء]

"قطعۂ غالب" (جداگانہ)، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی موجود ہے جس کا نمبر: ضمیمہ یونیورسٹی، ۲۶۵ ہے۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ:

"مرزا نے اکتیس شعر کا ایک فارسی قطعہ مولوی احمد علی کے نام لکھ کر بھیجا، جس میں ان کی کتاب (مؤید برہان) پر بڑے پُراثر طریقے میں نکتہ چینی کی ہے۔" [غالب نامہ، آثار غالب' طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۷۴]

مولانا غلام رسول مہر کا ارشاد ہے کہ:

"مؤید برہان" کے جواب میں غالب نے فارسی میں ایک قطعہ لکھا جس میں اگرچہ کل اکتیس شعر تھے لیکن "مؤید" جیسی دس کتابیں بھی اس کی تاثیر جہانگیر کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔"[1] [غالب' طبع دوم، لاہور ۱۹۴۱ء، صفحہ ۳۴۷]

لیکن اس "پُراثر طریقے میں نکتہ چینی" اور "مؤید برہان" کے اس جواب کی "تاثیر جہانگیر" کی وقعت کیا رہ جاتی ہے، جب یہ حقیقت علم میں آجائے کہ اس "جواب اور نکتہ چینی" کی تحریر و تعزیر

---

[1] سید قدرت نقوی نے مولانا مہر کی اسی بات کو اڑا لیا ہے:

'غالب کا یہ فارسی قطعہ اکتیس شعروں کا ہے مگر درحقیقت "مؤید برہان" جیسی کئی کتابیں بھی حسن تاثیر میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں ....' [ہنگامۂ دل آشوب' انجمن ترقی اردو' کراچی' ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۲]

کے وقت تک غالب نے "مؤید برہان" کو سرے سے دیکھا تک بھی نہیں تھا[1] اور محض کلکتے کے ایک دوست کی اطلاع پر کہ "قاطع بُرہان" کے جواب میں ایک کتاب لکھی گئی ہے، انھوں نے قطعہ لکھ کر اسے شائع بھی کر دیا۔

"——ایک دوست نے کلکتے سے مجھے اطلاع دی کہ مولوی احمد علی مدرس مدرسۂ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے نام اس کا "مؤید برہان" اس رسالے میں دفع کیے ہیں۔ تیرے وہ اعتراضات جو تو نے دکنی پر کیے ہیں اور تیری تحریر پر کچھ اعتراضات وارد کیے ہیں اور اہلِ مدرسہ اور شعرائے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم کی لکھی ہیں۔ بس بھائی! میں نے اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا اور کئی ورق ...... اس دوست کو...... بھیج دیئے......" [بنام حبیب اللہ ذکا، ۲۴ دسمبر ۱۸۶۶ء]

کتاب دیکھی تک نہیں لیکن اس کی تغلیط میں رواں ہیں اور صاحبِ کتاب کی تنقیص میں لکھتے ہیں کہ مولوی احمد علی متخلص بہ احمد نے ارض کیچ و مکران کو جو "ہندوسند" میں ہے اور ایران سے جُدا ہے، بلاتکلف اقلیمِ ایران میں شامل جانا ہے اور یہاں کی اقوام کو خلط ملط کر دیا ہے اور سمرقند و بخارا کے ترکوں پر ایک ہندو زادے قتیل کو ترجیح دی ہے:

مولوی احمد علی ، احمد تخلص نسخہ
در خصوصِ گفتگوی پارس انشا کردہ است
کیچ و مکران را کہ در سند است و از ایران جُدا
شاملِ اقلیم ایران بے محابا کردہ است
قومِ برہُج را با ایرانی نژادان دادہ خلط
ترکِ ترکانِ سمرقند و بخارا کردہ است
در جہان توام بود روی دی پشتِ قتیل
پیشوای خویش ہندو زادہ را کردہ است

---

[1] اغلب یہ ہے کہ "مؤید برہان" غالب کے پاس مارچ ۱۸۶۷ء میں پہنچی؛ دیکھیے حبیب اللہ ذکا، کے نام غالب کا خط مرقومہ ۱۴ مارچ ۱۸۶۷ء [اُردوئے معلّٰی، طبع اوّل ۱۸۶۹ء، صفحہ ۴۰]

ہندیان را در زبان دانی مسلّم داشتہ
تا چہ اندر خاطر والای او جا کردہ است

کتاب خود دیکھی تک نہیں ہے لیکن اس کے مندرجات اور طرزِ استدلال پر معترض اور مؤلف کتاب مولوی آغا احمد علی سے ناانصافی اور بد کلامی کے شاکی ہیں کہ انھوں نے میری خوبیِ گفتار سے دانستہ صرفِ نظر کیا ہے اور مجھے بُرا بھلا کہا ہے۔ وہ ہندی نژاد قتیل، جامع برہان (محمد حسین) اور صاحبِ بہارِ عجم (ٹیک چند) کے عاشقِ زار ہیں، مجھ سے کیوں بیزار ہیں:

با قتیل و جامعِ برہان و لالہ ٹیک چند
لابہ و سوگیری و لطف و مدارا کردہ است
داوری گاہے بنا فرمود، در وے ہر سہ را
منصف و صدر امین و صدرِ اعلیٰ کردہ است
گر چنین با ہندیان دارد تولا در سخن
من ہم از ہندم چرا از من تبرّا کردہ است
کردہ است از خوبیِ گفتارِ من قطعِ نظر
ظلم زین قطعِ نظر بر چشمِ بینا کردہ است
میلِ او با ہر کسے از ہند و حیفش خاصِ من
حیف و میلے با دو عالم شور و غوغا کردہ است
مطلب از بد گفتنِ من چیست؟ گوئی نیک مرد
مزدِ این کار از حق آمرزش تمنا کردہ است
در چنین نبود، چنان باشد کہ در عرضِ کمال
تا بر آرد نام، این ہنگامہ برپا کردہ است

بار بار کہنا پڑتا ہے کہ کتاب، غالب کی نظر سے گزری تک نہیں ہے لیکن "تبصرہ" حاضر ہے! مؤلف کتاب مولوی آغا احمد علی، احمد کی کم علمی پر ماتم کرتے ہیں، اُن کو جانبداری اور بدنیتی کا مستلزم قرار دیتے ہیں اور اُن کی روشِ تحریر کا مضحکہ اڑاتے ہیں کہ مولوی احمد علی نے "برہانِ قاطع"

کی تائید کی ہے لیکن برہان و دلائل کا فقدان ہے۔ صاحب برہان کے طرز انشا کی کمزوری کو جانتے نہیں یا دانستہ اُسے چھپایا ہے۔ میری توہین اور اپنی تحسین کر کے مجھے بھی اپنے ساتھ عالم میں رسوا کیا ہے۔ مولوی احمد علی کی کتاب کو بے لاگ ہو کر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ معائب سے پُر، لغو و حشو سے عبارت ہے، بھرے بے دلیل دعوے اور ملول و دلگیر کر دینے والی طوالت۔ معنی سے قطع نظر الفاظ کو دیکھیے تو ظاہر ہے کہ شراب تو ہے نہیں مگر شیشہ و ساغر مہیا کر دیے ہیں۔

وہی بات، کہ کتاب ہی ابھی مطالعے کے لیے انہیں میسر نہیں آئی تھی[1]، کتاب کی تقریظیں اور تاریخیں دیکھنے کی بات تو بعد کی تھی لیکن فرماتے ہیں کہ کتاب کے قطعات تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجھے خود بھی بُرا کہا ہے اور اس کے لیے اپنے دوستوں کو بھی اُبھارا ہے گویا اس "کارِ خیر" میں تنہا نہیں ہیں، ایک جمعیت کے ساتھ حملہ آور ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انتہائے جوش و غضب میں دل کھول اٹھا ہے، اسی لیے یہ بیہودہ روش روا رکھی ہے۔ غصے کی آگ، اوّل صاحب قہر کو جلاتی ہے، یہی باعث ہے کہ مولوی احمد علی کے دل میں شرارے بھرے ہوئے ہیں، ورنہ رشک و حسد کے بجز اور کوئی بات، بُرا بھلا کہنے کی نہیں:

یافتم از دیدنِ تاریخہای آن کتاب
خود بدم گفت و باجابِ خود ایما کردہ است
غازیان ہمراہ خویش آوردہ از بہرِ جہاد
تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ است
جوش زد از غایتِ قہر و غضب خون در دلش
تا زبانش را بدین گُستُرہ گویا کردہ است
آتشِ خشمے کہ سوزد صاحبِ خود را نخست
در دلش ہمچوں شررِ در سنگ ماوا کردہ است
چوں نہ باشد باعثِ تشنیع جز رشک و حسد
باد غالب خستہ تر، گر خستہ پروا کردہ است

---

[1] کتاب "مؤید برہان" غالب کے پاس مارچ ۱۸۶۷ء میں پہنچی جبکہ "قطعۂ غالب" اس کتاب کے دیکھنے سے کم از کم چھ سات مہینے پہلے اگست ۱۸۶۶ء میں یا اس سے بھی پہلے کسی وقت موزوں ہوا ہے۔

کتاب "مؤیدِ برہان" کے بارے میں محض اطلاع ملی ہے کہ اس میں مولوی احمد علی نے صاحب بُرہان پر کیے گئے غالب کے اعتراضات "دفع" کیے ہیں اور کچھ اعتراضات غالب پر "وارد" بھی کیے ہیں۔ بس اس اطلاع کی بنیاد ہی پر رقم طراز ہیں کہ مجھ سے جامع "قاطع بُرہان" کا انتقام لیا گیا ہے۔

اس موقع پر ایک بات ضرور ہوئی کہ غالب نے اپنی درشت گفتاری اور زشت گوئی کا اقرار کیا ہے، لیکن یہ اعتراف برملا نہیں، حسن گفتار کے پردے میں اور امرِ لابد کے طور پر ہے یعنی کچھ اس انداز میں کہ مَیں تو سپاہی زادہ تھا، میری گفتار کچھ درشت ہونی ہی تھی، لیکن افسوس کہ خاص اس معاملے میں میری تقلید کی گئی! زشت گوئی سے کام لیا ہے، اس کے معترف ہیں، بایں ہمہ بذلہ سنجی کی داد چاہتے ہیں! یہ طبع شوخ کی ادا بھی ہے اور اس کا اقتضا بھی:

انتقامِ جامع "بُرہانِ قاطع" می کشد
آنچہ ما کردیم بادی، خواجہ با ما کردہ است
من سپاہی زادہ ام، گفتارِ من باید درشت
وای بروے گر بہ تقلیدِ من اینہا کردہ است
زشت گفتم، لیک دادِ بذلہ سنجی دادہ ام
شوخیِ طبعے کہ دارم این تقاضا کردہ است

ان اشعار کے حوالے سے شیخ محمد اکرام کہتے ہیں کہ "جو شوخ فقرے، خود غالب نے صاحب برہان کی نسبت لکھے تھے، ان کی بڑے لطف سے توضیح کی گئی ہے[1]"۔

"مؤیدِ برہان" کے مصنف آغا احمد علی احمد[2] کمپنی کے مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں فارسی کے مدرس تھے۔ ان کے اجداد اصفہانی الاصل تھے لیکن ایک زمانے سے نقلِ مکان کر کے ہندوستان چلے آئے تھے۔ خود ان کا مولد ڈھاکہ (جہانگیر نگر) تھا، اسی لیے جہانگیر نگری کہلاتے تھے[3]۔ آغا احمد علی،

---

[1] غالب نامہ: آثارِ غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۲۰۷ و مابعد

[2] مولوی احمد علی نے سنہ ۱۲۸۰ف میں انتقال کیا (تاریخ لطیف، مصنفہ مہدی علی خان، تحویلدار کتب خانہ، ص ۱۵) یہ سال فصلی سنہ ۱۲۹۰ ہجری اور سنہ ۱۸۷۳ عیسوی کے مطابق ہوگا۔ (تشریح السنین قلمی صفحہ ۱۷۹، فن ہیئت اُردو نمبر ا)۔
[امتیاز علی عرشی، مکاتیب غالب طبع اوّل ۱۹۳۷ء حاشیہ متن، صفحہ ۷۲]

[3] مالک رام، ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی، صفحہ ۲۲۱

ایرانی النسل ہونے کے دعویدار تھے۔ غالبؔ اس دعوے کو نہیں مانتے۔ لکھتے ہیں کہ :

ہندیان را در زباندانی مسلّم داشتہ
تا چہ اندر خاطرِ والایِ او جا کردہ است
خوش برآمد باہمہ ہندوستان زایان چہ خوش!
تکیہ آرے بر ولادت گاہِ آبا کردہ است
ہر کہ بینی بازبانِ مولدِ خود آشناست
سازِ نطقِ موطنِ اجداد بے جا کردہ است
خواجہ را از اصفہانی بودنِ آبا چہ سود؟
خالقش در کشورِ بنگالہ پیدا کردہ است

اکرام صاحب نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ "مرزا غالب کا یہ دعویٰ تو کسی طرح قابلِ قبول نہیں کہ ایرانی النسل ہونے کے باوجود آغا احمد علی کو اہلِ زبان نہ سمجھا جائے لیکن مرزا غالب، باوجودیکہ نہ ان کے آبا، ایران سے آئے، نہ وہ خود ایران میں پیدا ہوئے، اہلِ زبان گنے جائیں[1]۔"

"فارسی میں مبدا، فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد وضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جواہر۔ اہلِ پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں، ایک تو یہ کہ ان کا مولد ایران اور میرا مولد ہندوستان۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے سو دو سو، چار سو، آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں . . . ."

[نامۂ غالب بنام تفتہ : ۲۷، اگست ۱۸۶۲ء]

"میں اگر اتنی دیر بعد پیدا ہوا ہوں تو یہ میرے لیے فخر و عزت کا مقام ہے کیونکہ اس طرح مجھے مبدا فیض سے اتنی مدت زیادہ استفادہ کرنے کا موقع ملا اور میری استعداد و قابلیت بھی اسی نسبت سے زیادہ ہے :

---

[1] غالب نامہ، آثارِ غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۷۵

باخذ فیض ز میدار فزودنم از اسلاف
کہ بودہ ام قدرے دیر تر بداں درگاہ
نزولِ من بہ جہاں بعدِ یک ہزار و دویست
ظہورِ خسرو و سعدی بہ ششش صد و پنجاہ

[ذکرِ غالب، مالک رام، طبع چہارم، ۱۹۶۴ء، صفحہ ۲۹۵]

"میدا رفیاض کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے، ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی لایا ہوں۔ مطابق اہلِ پارس کی منطق کے بھی فرہ ایزدی لایا ہوں ....."

[نامۂ غالب، بنام مفتی سید محمد عباس: ۱۶ اگست ۱۸۶۲ء]

"بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی اور اکابرِ پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو[۲] برس[۱] رہا اور میں نے اُس سے حقائق و دقائقِ زبانِ پارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اس امرِ خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے ....."

[نامۂ غالب، بنام نواب کلب علی خاں: ۷ اکتوبر ۱۸۶۶ء]

---

[۱] "مجھے اس میں شک ہے کہ .... کوئی پارسی اکبر آباد آیا اور میرزا صاحب اس کے شاگرد ہوئے اور وہ دو[۲] برس میں انھیں فارسی گُنا کر چلا گیا۔ بلکہ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفوں کو خاموش کرنے کے لیے میرزا صاحب نے یہ (قصّہ) دل سے گھڑ لیا تھا جیسا کہ حالی نے خود میرزا غالب کی زبانی "یادگارِ غالب" میں اس کا ذکر کیا ہے ...."
[مولانا امتیاز علی عرشی، حواشی مکاتیبِ غالب، طبع دوم ۱۹۴۳ء، صفحہ ۳۳]
عرشی صاحب کی رائے سے کُلّی اتفاق نہ بھی کیا جائے تو اتنا بہر نوع یقینی ہے کہ یہ امر اختلافی ضرور ہے۔

"فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے۔ للہ الحمد وللہ الشکر۔"
[نامۂ غالب' بنام تفتہ: ۲۷، اگست ۱۸۶۲ء]

"شاید لوگ یہ کہیں کہ خود ہندوستانی ہو کر اور ہندوستانیوں کو مُسلم نہ جاننا اور خود زباندانی کا دعویٰ کرنا بے معنی ہے۔ سو، میں اقرار کرتا ہوں کہ میرا دادا توران (ماوراالنہر) سے آیا تھا اور میرا باپ دلّی میں پیدا ہوا اور میں آگرے میں۔ حاشا کہ میں خود کو اہلِ زبان سمجھتا ہوں۔ میں بلاشبہ زبان دان ہوں اور میری زباندانی اوّلاً خداداد سلامتیِ طبع کی بدولت ہے جو غلطی کو قبول نہیں کرتی اور بغیر سچائی کے تسلی نہیں پاتی۔ دوسرے اس وجہ سے کہ میری طبیعت فارسی زبان سے فطرتاً مناسب واقع ہوئی ہے، تیسرے ہرمزد کے فیضِ صحبت سے جو مجھ کو دو برس تک برابر حاصل رہا۔"
[درفشِ کاویانی، طبع اوّل، صفحہ ۱۳۱، ترجمہ حالی از یادگارِ غالب]

"اگر مجھ سے کوئی کہے کہ "غالب تیرا مولد ہندوستان ہے" میری طرف سے جواب یہ ہے کہ بندہ ہندی مولد و پارسی زبان ہے:

ہر چہ از دستگہ پارس بہ یغما بردند
تا بنالم ہم ازان جملہ زبانم دادند

زبان دانیِ فارسی میری ازلی دستگاہ ہے اور یہ عطیۂ خاص من جانب اللہ ہے۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے۔ مشق کا کمال میں نے اُستاد سے حاصل کیا ہے۔"

[نامۂ غالب، بنام میرزا رحیم بیگ میرٹھی: ۱۸۶۵ء]

شیخ محمد اکرام ہی کے بقول "اسے بھلا سوائے غالب کے معتقدین کے کوئی کیسے مانتا کہ باوجودیکہ نہ اُن کے آبا ایران سے آئے، نہ وہ خود ایران میں پیدا ہوئے، انھیں اہلِ زبان گنا اور مانا جائے، اور واقعہ یہ ہے کہ مرزا نے ہندی نژاد فارسی نویسوں پر جو اعتراض کئے ہیں، اگر کوئی اہلِ زبان کرتا تو لوگ اتنے برافروختہ نہ ہوتے۔ لیکن چونکہ مرزا خود ہندی نژاد اور ترکی النسل تھے، ان

کا دعویٰ برتری کوئی نہیں مانتا تھا۔" (غالب نامہ، آثارِ غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۷۶)

"قطعۂ غالب" مباحثۂ برہان کے سلسلے کی پہلی منظوم چیز تھی۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ اس پر "قاطع برہان" کے نتیجے میں چھڑی ہوئی ادبی جنگ نے نثر کے بجائے نظم کی شکل اختیار کرلی اور غالب ہی کی زمین میں موافق و مخالف (مولانا غلام رسول مہر کی شماربندی کے مطابق چار سو تیرہ شعر کہے گئے۔[1] اور اس نظم نے بترتیب ذیل تین رسالوں کی صورت اختیار کی۔

۱۔ ہنگامۂ دل آشوب (سولہ صفحات) : در مطبع منشی سنت پرشاد واقع آرہ ضلع شاہ آباد، بہار، ۵، ذی الحج ۱۲۸۳ھ، ۱۱ اپریل ۱۸۶۷ء

۲۔ تیغ تیز تر (سولہ صفحات) : در مطبع غلام نبی خان، مطبع نبوی، ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۷ء

۳۔ ہنگامۂ دل آشوب (حصہ دوم) : ۶۴ صفحات : در مطبع منشی سنت پرشاد، واقع آرہ، ضلع شاہ آباد، بہار، ۲۵، جمادی الاول ۱۲۸۴ھ / ۲۴ ستمبر ۱۸۶۷ء

مالک رام کے بقول "اس شعری مناقشے کی دلچسپ بات یہ ہے کہ منشی محمد امیر لکھنوی کے قطعے کے علاوہ جو اردو میں ہے، باقی تمام قطعات فارسی میں اور اسی زمین میں لکھے گئے : انشا کردہ است، تقاضا کردہ است" (ذکرِ غالب' طبع چہارم، ۲۲۴) "ہنگامۂ دل آشوب" کے دوسرے حصے میں غالب کی حمایت میں دو نثری مضامین، ایک اردو (سخن دہلوی) اور ایک فارسی (باقر آردی) بھی شامل ہیں:

اضافہ :

اس حصۂ کتاب کی تسوید کے بعد ایک حوالہ نظر سے گزرا، جس سے اس امر کی توثیق ہوتی ہے کہ یہ قطعہ اگست ۱۸۶۶ء سے پہلے چھپ چکا تھا اور غالب نے اس کی چھپی ہوئی دس کاپیاں ۳۱ جولائی ۱۸۶۶ء کو نواب کلب علی خاں کو بھیجی تھیں جو دارالانشا، رامپور میں محفوظ ہیں۔ رجوع کیجیے :

۱۔ مکاتیبِ غالب' امتیاز علی عرشی، طبع اول ۱۹۳۷ء، متن صفحہ ۷۵

۲۔ مکاتیبِ غالب' امتیاز علی عرشی، طبع دوم ۱۹۴۳ء، متن ۵۴-۵۵

---

[1] غالب' طبع چہارم، لاہور ۱۹۴۶ء، صفحہ ۴۴۳

چھٹا باب

تصانیفِ غالب : (قضیۂ برہان) : اُردو

۱۔ لطائفِ غیبی : دہلی، ۱۸۶۴ء
۲۔ سوالاتِ عبدالکریم : دہلی، ۱۸۶۴ء
۳۔ نامۂ غالب : دہلی، ۱۸۶۵ء
۴۔ تیغِ تیز : دہلی، ۱۸۶۷ء

لطائفِ غیبی :

○ طبع اوّل : اکمل المطابع، دہلی، بست و نہم ربیع الثانی ۱۲۸۱ھ / یکم اکتوبر ۱۸۶۴ء
بنام : میاں داد خاں سیاح، المخاطب بہ سیف الحق
باہتمام : میر فخر الدین
ضخامت : ۴۴ صفحات سائز : ۱۸ × ۲۲/۸

لطائفِ غیبی، "محرق قاطع برہان" (۱۸۶۴ء) مولفہ منشی سید سعادت علی کے رد میں لکھی گئی۔ طبعِ[1] اوّل کے سرورق کی عبارت یہ ہے :

این نسخہ کہ ہست رشک ارژنگ سرچنگ بود برائی خرچنگ
منت ایزد را کہ نتیجہ فکر محقق مدقق میانداد خاں سیاح المخاطب بہ سیف الحق یعنی
این نسخہ شگرف مسمی بہ
لطائفِ غیبی
بجواب محرق قاطع برہان بصحت تمام و سعی مالا کلام نخستین بار
باہتمام میر فخر الدین در اکمل المطابع دہلی طراز انطباع گرفت

کتاب سرورق کی پشت صفحہ ۲ سے شروع ہو کر اکیس سطری مسطر پر صفحہ ۴۱ پر ختم ہو گئی ہے۔ صفحہ ۲ کے قریب نصف اوّل پر لوح کے نقوش ہیں، اس لیے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے سرعنوان کے بعد اس صفحے پر گیارہ سطریں آئی ہیں۔ صفحہ ۴۲، ۴۳، ۴۴ پر پانچ قطعات ہیں۔ پہلے دو قطعات جوا ہر سنگھ جوہر کے ہیں، تیسرا مرزا یوسف علی خاں عزیز کا، چوتھا مرزا شمشاد علی بیگ خاں رضوان کا اور آخری قطعہ بہاری لال مشتاق کا ہے جنہوں نے "لطائفِ غیبی" کی کتابت کی ہے۔ ان قطعات سے

---

[1] طبع اوّل کا ایک نسخہ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں موجود ہے دیکھیے : (۶۴۳۷ ۸۹۱/ غ د)

سالِ اشاعت ۱۲۸۱ ہجری اور ۱۸۶۴ عیسوی برآمد ہوتا ہے۔

کتاب کے صفحہ ۴۴ پر دو کالمی "صحیح نامہ لطائفِ غیبی" ہے جس سے کتابت کی چالیس غلطیوں کی صحت ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کتاب کے صفحہ ۴۳ کے آخر میں "تمت" کے جلی عنوان کے تحت یہ عبارت ملتی ہے:

"الحمد للہ والمنت کہ ایں صحیفہ سماوی یعنی لطائفِ غیبی بشیریں کاری کارپردازان اکمل المطابع بتاریخ بست نہم ربیع الثانی ۱۲۸۱ ہجری طبع شد"۔

دیباچے کے علاوہ کتاب بیس لطیفوں پر مشتمل ہے اور اس پر جیساکہ سرورق کی عبارت سے ظاہر ہے بطور مصنف میاں داد خاں سیاح المخاطب بہ سیف الحق کا نام درج ہے لیکن مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اسے اُن کتابوں کے تحت شمار کیا ہے جو مرزا غالب کی لکھی ہوئی ہیں[۱]، بعض دوسرے غالب شناس بھی اس امر پر متفق ہیں کہ یہ غالب کی تصنیف ہے:

"میرے نزدیک یہ رسالہ یا تو شروع سے آخر تک غالب کی تصنیف ہے یا سیاح کی عبارت میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ اسے غالب ہی کی تصنیف سمجھنا چاہیے۔ عبارت کی روانی اور تعریضات کی شوخی میں غالب کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ سیاح کی نگارش کا ڈھنگ اور تھا جیساکہ ان کی "سیرِ سیاح" سے جو غالباً ۱۸۷۲ء میں چھپی تھی، ظاہر ہے۔" [مولانا غلام رسول مہر، غالب، طبع چہارم ۱۹۴۶ء، صفحہ ۴۳۱]

○

"پہلا بحث طلب مسئلہ یہ ہے کہ "لطائفِ غیبی" کا مصنف کون تھا؟ کتاب پر میانداد خاں سیاح کا نام درج ہے ..... لیکن ..... "لطائفِ غیبی" خود میرزا نے لکھی تھی سیاح کو اس کی ترتیب کا بھی علم نہ تھا، یہاں تک کہ کتاب چھپ کر شائع ہو گئی اور میرزا غالب نے اس کے نسخے سیاح کے پاس بھیجے ....."

[مولانا غلام رسول مہر، اُردوئے معلّٰی، دہلی، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۱ء، صفحہ ۴۶-۴۷]

○

---

[۱] مکاتیبِ غالب، طبع دوم، ۱۹۴۳ء، دیباچہ، صفحہ ۴۵

"لطائفِ غیبی" ۱۸۶۴ء میں لکھی گئی، اس کی زبان، اس کی روانی وسلاست اور اس کے طنز و استہزاء میں مرزا غالب کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ اس لیے اس کو پڑھ کر کوئی صاحبِ ذوق، اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یا تو یہ کتاب مرزا نے خود لکھ کر میاں داد خاں سیاح کے نام سے شائع کرائی ہوگی یا اس کی اصلاح و ترمیم میں مرزا کا اس قدر دخل ہے کہ عبارتوں کی عبارتیں، ان کی اپنی لکھی ہوئی ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ اس علمی جہاد کی "جنگی خدمات" کے صلے میں مرزا غالب نے میاں داد خاں سیاح کو "سیف الحق" کا خطاب بھی عنایت فرمایا ہے۔۔۔"

(مولانا عبدالمجید سالک، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، ص ۱۲۳ و ما بعد)

اس مقدمے کے اثبات میں متعدد "داخلی و خارجی قرائن" پیش کرنے کے بعد مولانا سالک نے بالآخر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

"میاں داد خاں سیاح، اپنے گھر بیٹھے رہے۔ مرزا نے خود ہی یہ رسالہ لکھا، خود ہی اکمل المطابع والوں کو اس کی طباعت پر آمادہ کیا، خود ہی اس کی اشاعت اور ارسال کا بندوبست کیا۔ اپنے قریبی شاگردوں سے، اس پر قطعاتِ تاریخ لکھوائے اور نام سیاح کا کر دیا۔۔۔" (مولانا عبدالمجید سالک، ایضاً صفحہ ۱۳۰)

○

"لطائفِ غیبی: اس کتاب کے سرورق پر اس کو منشی میاں داد خاں سیاح المخاطب بہ سیف الحق کا نتیجۂ فکر بتلایا گیا ہے مگر اس کو مرزا کی فکر کا نتیجہ سمجھنا چاہیے کیونکہ اس کی تیاری میں مرزا کا زبردست ہاتھ ضرور رہا ہے۔۔۔"

(مہیش پرشاد، علی گڑھ میگزین، ایضاً ص ۱۳۲)

○

"لطائفِ غیبی" جس کا سالِ انطباع ۱۲۸۱ھ ہے میاں داد خاں، سیاح کی طرف منسوب ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کا لفظ لفظ، غالب کے قلم سے نکلا ہے۔ طرزِ تحریر کی شہادت سے قطع نظر، اس میں کچھ ایسی باتیں

ہیں جو غالب کے سوا اور کوئی نہیں لکھ سکتا تھا۔"

[قاضی عبدالودود، آثارِ غالب، در : علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۳۲]

○

"لطائفِ غیبی، میاں الہ داد خاں[1] کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ ۴۴ صفحے کا رسالہ ہے۔ کتاب کے باہر میاں الہ داد خاں[2] سیاح کا نام بطور مصنف کے لکھا ہوا ہے لیکن فی الواقع یہ غالب کی تصنیف ہے اور شروع ہی سے سب کو معلوم تھا کہ یہ کتاب مرزا نے خود لکھی ہے۔ مولانا حالی[3]، غالب کی اُردو نثر کے متعلق لکھتے ہیں :

"مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں، چند تقریظیں اور دیباچے ہیں اور تین مختلف رسالے ہیں جو "برہان قاطع" کے طرف داروں کے جواب میں لکھے ہیں : لطائفِ غیبی، تیغِ تیز اور نامۂ غالب"

[شیخ محمد اکرام، غالب نامہ : آثار غالب، طبع چہارم، بمبئی، ص ۱۷۲]

○

"لطائفِ غیبی : یہ کتاب ۱۸۶۵ء[4] میں سید سعادت علی کی "محرق قاطع برہان" کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس پر مصنف کا نام میاں داد خاں سیاح لکھا ہے مگر یہ مغالطہ ہے اصل میں یہ کتاب، غالب کی اپنی تصنیف ہے ...."

[مالک رام، ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی، ۱۹۶۴ء، صفحہ ۲۲۹]

○

---

۱ و ۲ یہ سہوِ قلم ہے۔ سیاح کا صحیح نام "میاں داد خاں" ہے، "میاں الہ داد خاں" نہیں۔

۳ مولانا حالی سے بھی پہلے آزاد "لطائفِ غیبی" کو "آبِ حیات" (۱۸۸۰ء) میں غالب کی طبع زاد بتا چکے ہیں، آزاد کے لفظ یہ ہیں :

"لطائفِ غیبی : اس رسالے میں منشی سعادت علی کی طرف روئے سخن ہے۔ اگرچہ اس کے دیباچے میں سیف الحق کا نام لکھا ہے، مگر انداز عبارت' اور عبارت کے چٹکلے صاف کہتے ہیں کہ مرزا ہیں ...."

۴ یہ صحیح نہیں کہ یہ کتاب ۱۸۶۵ء میں چھپی، کتاب' قطعات تاریخ (ص ۴۲، ۴۳) کے مطابق ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء میں چھپی۔ "تمت" (صفحہ ۴۳) سے سال کے علاوہ قطعی تاریخ اشاعت بھی معلوم ہو جاتی ہے یعنی "بست و نہم ربیع الثانی ۱۲۸۱ ہجری" جو مطابق ہے یکم اکتوبر ۱۸۶۴ء کے۔

"لطائفِ غیبی"، مرزا غالب کی تصنیف ہے اور سیاح کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ بفرضِ محال اگر کچھ ہے بھی تو بس اتنا ہی کہ وہ زیادہ سے زیادہ، اس کے جامع کی حیثیت رکھتے ہیں، جیسا کہ "درفش کاویانی" کے آخر میں سیاح کی تاریخ کا عنوان بھی "جامع لطائفِ غیبی" ہے۔...." [مالک رام، ایضاً، ص ۲۲۳]

○

ایران کے دانشور ڈاکٹر محمد معین بھی "لطائفِ غیبی" کو غالب ہی کی تصنیف مانتے ہیں[۱]۔

حالی نے "یادگارِ غالب" (۱۸۹۷ء) میں "لطائفِ غیبی" کا منجملہ تصانیفِ غالب شمار و اظہار کیا ہے، جس کی طرف شیخ محمد اکرام نے اشارہ کیا ہے[۲]۔ مالک رام نے کہا ہے کہ "مولانا حالی نے "لطائفِ غیبی" پر میاں داد خاں سیاح کا نام مصنّف کی حیثیت سے چھپا دیکھنے کے باوجود اسے کیوں غالب کی تصنیف قرار دیا؟ اس کا جواب اس کے سوائے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ انہیں معلوم تھا کہ یہ مرزا کی تصنیف ہے[۳]۔" حالی سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے بھی "آبِ حیات" (۱۸۸۰ء) میں "لطائفِ غیبی" کو غالب کی تصنیف قرار دیا ہے۔

آزاد اور حالی کے علاوہ ایک اور معاصر شہادت بھی اس امر کی ملتی ہے کہ یہ کتاب غالب ہی کی زائدہ فکر ہے۔ مولانا عبدالمجید سالک نے، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء میں "رسالہ لطائفِ غیبی" اور مرزا غالب" کے عنوان سے ایک مضمون میں متعدد "داخلی و خارجی قرائن" سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "یہ رسالہ میرزا غالب نے خود لکھا اور نام سیاح کا کر دیا"۔ مولانا سالک نے بتایا ہے کہ "لطائفِ غیبی" کا جو نسخہ اُن کے پیشِ نظر رہا ہے، اس پر یہ سب اُمور طالب، کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ طالب، نیر رخشاں کے بیٹے تھے اور "لطائفِ غیبی" کا یہ نسخہ انہیں زمانۂ طالب علمی میں نواب علاء الدین احمد خاں علائی نے دیا تھا۔ مولانا سالک کے لفظ یہ ہیں:

"لطائفِ غیبی" ۴۴ صفحے کا رسالہ ہے۔ ۱۸۶۴ء میں اسے اکمل المطابع دہلی نے چھاپا۔ جو نسخہ اس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔ یہ نواب سعید الدین احمد خاں

---

[۱] مقدمہ: برہانِ قاطع، جلد اوّل، تہران ۱۹۶۳ء، صفحہ صد و چہاردہ

[۲] غالب نامہ: آثارِ غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۷۲

[۳] ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی، ۱۹۶۴ء، صفحہ ۲۳۳

طالب، ابن نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر کا نسخہ ہے جو زمانہ طلبِ علم میں ان
کے پاس رہا اور نواب علاء الدین احمد خاں علائی نے انھیں دیا تھا۔ اس نسخے
پر یہ سب اُمور طالب کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں . . . .''

[عبدالمجید سالک، علی گڑھ میگزین، ایضاً، ص ۱۳۰]

''یہ سب اُمور'' سے مُراد اگر وہ ''تمام داخلی و خارجی قرائن'' ہیں جنھیں مولانا سالک نے مضمون میں پیش کیا ہے تو، پھر اسے ایک مزید معتمد علیہ، مفصل معاصر شہادت ماننا چاہیے چونکہ نواب طالب غالب کے شاگرد بھی رہے ہیں اور حلقۂ غالب کی بہت سی اہم شخصیتوں کے قریب تر بھی۔

''قاطع برہان'' (۱۸۶۲ء) کے رد میں سب سے پہلی کتاب جو منظرِ عام پر آئی، منشی سیّد سعادت علی کی ''محرق قاطع برہان''[۱] (۱۸۶۳ء) تھی۔ اس کے جواب میں اول اول ''دافع ہذیان''[۲] (۱۸۶۴ء) لکھی گئی۔ ''محرق'' اور ''دافع'' کے بارے میں غالب کا تاثر لطف سے خالی نہ ہوگا۔ میوا ضلع سیتاپور کے تعلقہ دار مولوی نعمان احمد کے نام ۱۹، اکتوبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں غالب لکھتے ہیں:

''ایک ''دافع ہذیان'' مصنف اس کے مولوی نجف علی، مجمع البحرین علم فارسی و عربی، سببِ تالیف یہ کہ ایک شخص عامی فضول نے اپنی شہرت کے واسطے ''قاطع برہان'' کے مطالب کے رد میں ایک کتاب لکھی ''محرق قاطع برہان'' اس کا نام رکھا۔ عبارت مہمل، مقاصد پوچ۔ مولوی نجف علی نے منصفانہ، اس کے رد میں ایک رسالہ لکھا، موسوم بہ ''دافع ہذیان'' فارسی قدیم کے طرز پر . . . .''

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

''ایک مولوی نجف علی صاحب ہیں، باوجود فضیلتِ علمِ عربی، فارسی دانی میں اُن کا نظیر نہیں۔ وہ جو ایک شخص مجہول الحال تے اہل دہلی میں سے میرے کلام کی تردید میں کتاب تصنیف کی ہے، مسمی بہ ''محرق قاطع برہان'' انھوں نے

---

[۱] محرق قاطع برہان: ½۹ × ½۶'' سائز، صفحات ۹۶، مطبوعہ: در مطبع احمدی، واقع شاہدرہ، دلہائی، باہتمام: امو جان، ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء

[۲] دافع ہذیان: صفحات ۲۸، مطبوعہ: اکمل المطابع، دہلی، ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء

اس کی توہین اور مسوّد کی تفضیح میں دو جزو کا ایک نسخہ مختصر لکھا ہے (دافع ہذیان)۔

[بنام بے خبر، اگست ۱۸۶۴ء]

"دافع ہذیان" کے مصنف مولوی نجف علی سے، غالب کا بیان ہے کہ ان کی شناسائی تک نہ تھی۔ حق، بجانب غالب سمجھتے ہوئے، فقط اتفاقِ رائے اور اتحادِ معنوی کے اقتضا سے منصفانہ انہوں نے مرزا غالب کی حمایت کی۔ غالب نے حبیب اللہ ذکا کو "سوالاتِ عبدالکریم" اور "لطائفِ غیبی" کے منجملہ "دافع ہذیان" کا نسخہ ہدیۃً بھیجا تھا۔ (دیکھیے خط بنام ذکا، مورخہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۴ء)۔ ذکا نے ان رسائل کے مطالعے کے بعد غالب کے توسط سے مولوی نجف علی کو بھی خط لکھا۔ غالب، جواباً ذکا کو لکھتے ہیں:

"ہاں صاحب، خط دریوزہ کے ساتھ، ایک خط مولوی نجف علی کے نام مع اس حکم کے کہ میں اس کو مولوی صاحب کے پاس پہنچاؤں، میں نے پایا۔ حال یہ ہے کہ مولوی صاحب سے میری ملاقات نہیں، صرف اتحادِ معنوی کے اقتضا سے انہوں نے "دافع ہذیان" لکھ کر فنِ سخن میں مجھ کو مدد دی ہے۔ منشی گوبند سنگھ دہلوی اُن کے ایک شاگرد اور میرے آشنا ہیں۔ ان کو وہ خط بجنسہٖ بھیج دیا، یقین ہے کہ وہ مولوی نجف علی صاحب کو بھیج دیں گے۔ انہیں کے اظہار سے دریافت ہوا کہ مولوی صاحب مرشد آباد، بنگالے میں ہیں، نواب ناظم نے ان کو نوکر رکھ لیا ہے۔"

[خطوطِ غالب (۲)، مہر، لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۷۰۶]

"دافع ہذیان" فارسی میں ہے۔ اُردو میں "سوالاتِ عبدالکریم" بھی قائم کیے جا چکے تھے۔ لیکن غالب، ابھی مطمئن نہیں تھے اور اُردو میں کسی ایسی کتاب کے لکھنے اور لکھوانے کی فکر اور دھن میں تھے جس سے کما حقہٗ، "محرق" کا خاکہ اڑ سکے اور جس میں شیخ محمد اکرام کے لفظوں میں "محرق کی غلطیاں اور جامع محرق کی کوتاہیاں پورے طور پر ظاہر ہوں، چنانچہ انہوں نے میر غلام حسنین قدر بلگرامی پر ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ عام طور پر ان کے خط، قدر کے نام رسمی ہوتے تھے اور "بندہ پرور" "سید صاحب"، "مشفق میرے" اور اسی طرح کے دوسرے رسمی القاب سے شروع ہوتے تھے۔ اب انہوں نے میر صاحب کو ایک بڑا دوستانہ خط لکھا اور اپنی ادبی

جنگ میں مدد چاہی، خط کا آغاز تھا "قرۃ العین میر غلام حسنین سلکم اللہ تعالیٰ[1]".... یہ کم وبیش پورا خط دیدنی ہے۔ پُر تملق القاب کے بعد قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں :

"تمہارا خط پہنچا، دل خوش ہوا۔ مولوی نجف علی صاحب کی کیا تعریف کرتے ہو، تم کچھ لکھو تو جانوں! واللہ، اگر کبھی مولوی صاحب میرے گھر آئے ہوں یا میں نے، ان کو دیکھا ہو، چہ جائے اختلاط و ارتباط۔ صرف بہ رعایت جانب حق، چند کلمات، انہوں نے لکھے ہیں۔

تم، میرے یار ہو اور میری خدمت گذاری کے حقوق ہیں، تم پر۔ مجھ کو مدد دو اور اپنی قوتِ علمی صرف کرو۔ "محرق قاطع برہان" میرے پاس موجود ہے، مجھ سے منگواؤ۔ میں ہر موقع پر خطا اور ذلت (لغزش) مولف کا اشارہ کر دوں گا۔ تم ہر فقرے کو بغور دیکھو اور بے ربطی الفاظ اور لغویتِ معنی کو میزانِ نظر میں تو لو۔ عامی نہیں ہو، عالم ہو۔ آخر مولوی نجف علی صاحب نے بھی تو اپنی قوتِ عاقلہ سے بے اعانتِ غیر "محرق" کے جامع کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ تمہارے پاس، دو نسخے ایک "دافع ہذیان" اور ایک "سوالاتِ عبدالکریم" مع استفسار و افتاء دستخطی علماء دہلی موجود ہیں اور اب اس کتاب کے ساتھ میرے اشارات سود مند پہنچیں گے۔ تم کو معارضہ بہت آسان ہوگا۔ مدعی کا کلام دراصل لغو، پھر تمہارے پاس سرمایۂ علمی موجود، اور یہ تین نسخے معقول، اس پر مزید علیہ، اس پر "محرق" کا خاکر اڑ جائے گا۔

میرے پاس، اس خط کے پہنچتے ہی جواب لکھیے اور اجازت بھیجئے کہ میں نسخہ مطبوعہ، نامطبوعہ "محرق" بسبیلِ ڈاک بھیج دوں۔ مگر جس دن سے کہ کتاب پہنچ جائے، اسی دن سے آپ، اُردو زبان میں رسالہ لکھنا شروع کیجئے اور بعد اختتام مجھے اطلاع دیجئے، پھر میں جیسا لکھوں، ویسا عمل میں لائیے۔ غالب' اثنا عشری حیدری[2]...."

[خطوط غالب (۲)، مہر، لاہور ۱۹۶۹ء، صفحہ ۴۰۷ و بہ بعد]

---

[1] غالب نامہ، آثار غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۷۱

[2] مکتوب الیہ میر غلام حسنین قدر، زیدی سید تھے۔ "اثنا عشری حیدری" کے اعلان کی غایت؟ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن اس تمام تر ترغیب کے باوجود، اس کی نوبت نہ آئی کہ قدر بلگرامی، غالب کی طرف سے اُردو زبان میں رسالہ لکھتے۔ آخرِ کار "محرق" کے جامع کی دھجیاں اڑانے کے لیے خود انھیں کمربستہ ہونا پڑا اور "اپنے دوستِ روحانی" کے نام پر جسے انھوں نے "منجملہ رجال الغیب" ٹھہرایا اور بتایا ہے نیرِ رخشاں اور ثاقب سے مددلی اور علائی سے استمداد طلب کی اور "گزارشِ مدعا" سے پہلے یوں آغازِ کلام کیا:

"میری جان! . . . ثاقب نے کہا کہ بھائی تم سے شاکی ہیں۔ اب ضرور آپڑا کہ گزارشِ مدعا سے پہلے تمھارے رفعِ ملال میں کلام کروں۔ بھائی! تم میرے فرزند بلکہ بہ از فرزند ہو۔ اگر میرا اصلی بیٹا، اس دید و دانست و تحریر و تقریر کا ہوتا تو میں اس کو اپنا یارِ وفادار اور ذریعۂ افتخار جانتا۔ تمھارا کونسا خط آیا کہ اس کا جواب یہاں سے نہ لکھا گیا؟ میرے پاس جو مقاصد ضروری فراہم تھے، وہ میں نے اس نظر سے نہ لکھے کہ اب، تم آتے ہو، زبانی گفت و شنید ہو جائے گی . . . ."

"گزارشِ مدعا" سے پہلے رفعِ ملال اور حصولِ مطالب کی غرض سے اس تملق آمیز کلام کے بعد جو "مقاصدِ ضروری" بالمشافہ گفتگو کے لیے فراہم کر رکھے تھے، انھیں اس طرح گوش گزار کیا ہے:

". . . . یہ رسالہ موسوم بہ "محرق قاطع برہان" جو ثاقب نے تم کو بھیجا ہے، میرے کہنے سے بھیجا ہے اور اس ارسال سے مدعا یہ ہے کہ اس کے معائنے کے وقت اس کتاب کی بے ربطیٔ عبارت پر اور میری اپنی قرابت اور نسبت ہائے عدیدہ پر پر نظر نہ کرو، بیگانہ وار دیکھو اور از روئے انصاف حکم ہو، بے حیف و میل۔ اس نے جو مجھے گالیاں دی ہیں، اس پر غصہ نہ کرو۔ غلطیاں عبارت کی، شدتِ اطناب مُمِل کی صورت، سوال دیگر، جواب دیگر۔ ان باتوں کو مطمحِ نظر کرو، بلکہ اگر فرصت مساعدت کرے، تو ان مراتب کو الگ الگ کاغذ پر لکھو اور بعد اتمام، میرے پاس بھیج دو۔ میرا ایک دوستِ روحانی کہ وہ منجملہ رجال الغیب ہے، ان ہفوات کا

(بقیہ حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ)

"استحصال و انگیخت" ہے، ورنہ اس سے پہلے یا اس کے بعد غالب نے قدر بلگرامی کے نام اپنے کسی خط میں، اپنے نام کے ساتھ "اثنا عشری حیدری" کے ایزاد کی ضرورت نہیں سمجھی۔

خاک اڑا رہا ہے۔ نیر رخشاں نے اس کو مدد دی ہے، تم بھی بھائی مدد دو.....
ارسالِ جواب کی تاکید کے سوا اور کیا لکھوں....."

غالب کا یہ خط ۱۸ مئی ۱۸۶۴ء کا ہے۔ علائی کے نام غالب کے ایک دوسرے خط مرقومہ ۳۰ مئی ۱۸۶۴ء سے پتہ چلتا ہے کہ علائی "محرق" پر لکھتے تو بعد کو، وہ اس منافیِ طبع تحریر کو دیکھنے ہی کے روادار نہ ہوئے، عُذر یہ کیا کہ طبیعت اسے دیکھنے سے گریزاں اور نفور ہے :

"تپ محرق" (محرق قاطع !) کے دیکھنے سے انکار کیوں کرتے ہو؟ اگر منافیِ طبع تحریر کو بسبب انزجار نہ دیکھا کرتے تو فریقین کی کتب مبسوطہ کہاں سے موجود ہوتیں؟ ......"

مختصر یہ کہ غالب نے طرح طرح سے اپنے عزیزوں اور مداحوں کو "محرق قاطع برہان" کا خاکہ اُڑانے پر اُبھارا، لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر انھوں نے خود "لطائفِ غیبی" تصنیف کی اور اسے اپنے ایک شاگرد میاں داد خاں سیّاح سے منسوب کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ خود بھی "محرق" کی غلطیاں جمع کر رہے تھے، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں نے بھی یہ کام اپنے ذمے لیا تھا اور میرزا چاہتے تھے کہ نواب علاء الدین احمد خاں علائی بھی جتنی مدد دے سکیں ضرور دیں، مقصود یہ تھا کہ مختلف اربابِ نظر اپنے اپنے اندازے کے مطابق جو جو غلطیاں بروئے کار لائیں گے، انہیں جمع کر کے جوابی یا انتقادی کتاب یا رسالہ مرتب کر لینا سہل ہوگا۔ اگرچہ میرزا نے محولہ بالا مکتوب میں ایک "دوستِ روحانی" کا ذکر کیا ہے، جسے وہ منجملہ رجال الغیب کہتے ہیں، لیکن وہ خود میرزا غالب تھے، نہ کہ میاں داد خاں سیّاح، جو، ان حالات سے بھی غالباً بے خبر تھے[1]"

سیّاح، ان حالات سے تو بے خبر غالباً نہ رہے ہوں گے اور عجب نہیں کہ فرطِ محبت میں انھوں نے "محرق" کا رد لکھنے کے عزم سے غالب کو مطلع کیا ہو اور کچھ مسالہ جمع کر کے بھیج بھی دیا ہو۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ حاضر باش احباب کی استمداد کے مقابلے میں، دلی سے دور دراز کے ایک مداحِ دلی و غیبی کی توجہ، غیر متوقع اور اس لیے غالب کے لیے زیادہ قابلِ لحاظ

---

[1] مولانا غلام رسول مہر، اُردوئے معلّیٰ، دہلی، فروری ۱۹۶۱ء، صفحہ ۴۹

رہی ہوگی "لطائفِ غیبی" کی اشاعت کے کم و بیش سال بھر بعد کے ایک خط مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء میں، غالب نے "ساطع برہان" (۱۸۶۵ء) کا تذکرہ کرتے ہوئے جو غالب کی "قاطع برہان" کے استرداد میں چھپی تھی، سیاح کو لکھا ہے :

"ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں جن کو "لطائفِ غیبی" میں رد کر چکے ہو، بہر حال، اس کے جواب کی فکر نہ کرنا ...."

گویا "لطائفِ غیبی" کی ترتیب میں سیاح کا کچھ ہاتھ رہا ضرور ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خود غالب "محرق" کی غلطیاں جمع کر رہے تھے، نیر رخشاں نے بھی یہ کام اپنے ذمے لیا تھا، علائی سے بھی انھوں نے مدد چاہی تھی، قدر بلگرامی کو بھی اس کے لیے اُبھارنا چاہا تھا، سیاح نے بھی حسبِ توفیق، اس کارِ خیر میں ہاتھ بٹایا اور حصہ لیا ہوگا۔ مختلف اربابِ نظر، اپنے اپنے اندازے کے مطابق جو جو غلطیاں بروئے کار لائے غالب نے باضافہ مطالب دیگر، انھیں حلیہ عبارت سے آراستہ و پیراستہ کیا اور یوں "لطائفِ غیبی" عالمِ وجود میں آئی۔

یہ کتاب، اس رنگ و آہنگ میں ہے جو غالب سے خاص اور تنہا ان کی ایجاد و ابداع ہے جس کا پہچاننا اور جاننا کسی غیر معمولی تربیتِ نظر کا محتاج نہیں اور جس کی خود خوشبو، کتاب پر کسی دوسرے کا نام ڈال دینے سے دب نہیں گئی یا جذب نہیں ہوگئی۔ سیاح کا محض نام ہی نام ہے، ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ "یکے از جامعین" کی سی ہے۔ "نامۂ غالب" (۱۸۶۵ء) میں مرزا رحیم بیگ کو لکھتے ہیں :

"مجھے جو چاہو سو کہو، اوروں سے تم کیوں لڑتے ہو؟ کہیں جامع "لطائفِ غیبی" کو بُرا کہتے ہو، کہیں نگارندۂ "دافع ہذیان" سے جھگڑتے ہو...."

جامع لطائفِ غیبی، اور نگارندۂ دافع ہذیان کے مشارٌ الیہ سیاح اور مولوی نجف علی ہیں گویا "دافع" کو تو مولوی نجف علی کی "نگارش" بتایا ہے لیکن سیاح کو خود غالب نے "لطائف" کا محض "جامع" ٹھہرایا ہے۔ "درفشِ کاویانی" (۱۸۶۵ء) کے آخر میں سیاح کا جو قطعۂ تاریخِ طباعت درج ہے اُس کے عنوان میں بھی "جامع لطائفِ غیبی" آیا ہے (طبع اول، صفحہ ۱۵۳)۔ اس قطعۂ تاریخ کا

لہ ساطع برہان: ۱۸۴ صفحات، مصنف: میرزا رحیم بیگ، مطبوعہ: ہاشمی پریس، میرٹھ، ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء

تیسرا مصرعہ یہ ہے "یوں کیا سیاح نے اظہار سن عیسوی" قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ "سن عیسوی" کے تشدید نون سے ان کی علمی صلاحیت کا پتا چل سکتا ہے۔[۱]"

اب کسی قدر تفصیل کے ساتھ، وہ قرائن و شواہد اور داخلی و خارجی دلائل پیش کیے جاتے ہیں جن کی بنا پر، ہر چند کہ یہ کتاب، میاں داد خاں سیاح المخاطب بہ سیف الحق کے نام سے چھپی، لیکن اسے بالیقین غالب کا نتیجۂ فکر ماننا چاہیے۔ آخر میں وہ مصلحتیں زیرِ غور لائی جائیں گی جو اس کتاب کو غالب کے اپنے نام سے شائع نہ کرنے میں مانع ہوئیں۔

(۱)

غالب، میاں داد خاں سیاح کے نام ایک خط مرقومہ ۱۲ فروری ۱۸۶۷ء میں لکھتے ہیں:

"یہ جو میں نے تم کو "سیف الحق" خطاب دیا ہے، اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو، تم میرے بازو ہو۔ میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔ "لطائفِ غیبی" نے اعدا کی دھجیاں اڑا دیں ...."

مالک رام کے لفظوں میں "اس خط میں دراصل اشارہ ہے خود "لطائفِ غیبی" کی طرف، جسے میرزا اس سے پہلے شائع کر چکے تھے۔ اس کتاب کے آغاز ہی میں یہ عبارت ہے:

"سیاحِ بحر و بر، ہیچداں، بے ہنر، سیف الحق، میاں داد خاں حق شناسوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے۔"

اگر کتاب، خود سیاح کی لکھی ہوتی تو وہ دیباچے میں سیف الحق کیسے لکھتے جب کہ غالب نے یہ خطاب، انھیں بعد کو دیا تھا۔ فی الحقیقت غالب نے کتاب لکھ کر، ان سے منسوب کی اور پھر گویا انھیں اطلاع دیتے ہوئے یہ لکھا کہ میں نے تمھیں سیف الحق خطاب دیا ہے۔ میرزا کے خط کے اس اقتباس سے بھی ہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ کلام تو میرا ہو گا، لیکن وہ تمہارے ہاتھ سے نکلا اور شائع کیا جائے گا، یعنی میں اپنی تحریر اپنے نام سے شائع نہیں کروں گا۔ میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہے گی ...." (ذکرِ غالب، طبع چہارم، ص ۲۲۹ و بعد)

---

[۱] آثارِ غالب، در، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹-۱۹۴۸ء، صفحہ ۳۳

۱۲ فروری ۱۸۶۷ء ہی کے خط میں سیاح کو لکھتے ہیں :

"ایک نئی بات سنو۔ محمد میرزا خاں میرے بھتیجی بھائی کا نواسہ ہے۔ اس نے ایک اخبار نکالا ہے مسمی بہ "اشرف الاخبار" اس کا ایک لفافہ تم کو بھیجتا ہوں۔ اس کو پڑھ کر معلوم کر لوگے کہ تمہارا ایک اعتراض قتیل کے کلام پر چھاپا گیا ہے۔ اس ارسال و اعلام سے صرف اطلاع منظور ہے۔۔۔۔"

یعنی غالب نے خود ہی کلامِ قتیل پر اعتراض وارد کیا، اور اسے سیاح کے نام سے "اشرف الاخبار" میں شائع کر دیا، اور سیاح کو اس سرگرمی کے بعد اس کی صرف اطلاع دے دینا کافی سمجھا گیا۔ اس اعتراض کا کسی گوشے سے جواب دیا گیا اور یہ "اکمل الاخبار" میں چھپا تو جواب الجواب چھپوانا پڑا، ۲۹ اپریل ۱۸۶۷ء کے خط میں غالب نے سیاح کو باخبر کیا کہ :

"اعتراض کے جواب ایک مولوی نے لکھے ہیں۔ اس ہفتے کے "اکمل الاخبار" میں دیکھ لو جو تم سے کلام کرے، اسی انداز سے تم بھی کلام کرو۔۔۔۔"

گویا، سیاح کو یہ ہدایت کی گئی کہ اگر اس امرِ خاص میں کوئی تم سے کلام کرے تو اس سے تم اس طرزِ بحث کی روشنی میں گفتگو کرو جو جواب الجواب میں اختیار کیا گیا ہے۔۔۔۔ یہ بھی "میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے" چلتی رہنے والی بات ہوئی۔۔۔۔ قاضی عبدالودود نے ٹھیک کہا ہے کہ :

"ان کے نام کے ایک خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "اشرف الاخبار" میں قتیل پر اعتراض، ان کی طرف سے چھاپ دیا گیا تھا اور یہ کافی سمجھا گیا تھا کہ اشاعت کے بعد، انہیں اطلاع دی جائے۔ سیاح کو اس میں مضائقہ نہ ہوا تو لطائف کو اپنی طرف منسوب کرانے میں کیا تامل ہوتا۔"

[آثارِ غالب در : علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، ص ۳۲]

اسی پس منظر میں شیخ محمد اکرام نے یہ لکھا ہے کہ غالب نے "نہ صرف" لطائفِ غیبی" خود لکھ کر سیاح کے نام سے چھپوائی، بلکہ کبھی کبھی وہ سیاح کے نام سے اعتراضات، اخباروں میں چھپواتے تھے اور سیاح کو اس کی اطلاع، اعتراض چھپ جانے کے بعد ہوتی تھی![1]"

---

[1] غالب نامہ : آثارِ غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۶۲

(۲)

"ہاں صاحب! تیس جلد "لطائف غیبی" کی دو پارسلوں میں آگے بھیجی ہیں۔۔۔۔ فی الحال ایک جلد اور اپنی طرف سے بھیجی ہے۔ رسید جلد لکھو۔۔۔۔"

(بنام سیاح، ۳۰ دسمبر ۱۸۶۴ء)

"سعادت و اقبال نشان، سیف الحق منشی میاں داد خاں سیاح کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ خط میں آپ نے بہت سے مطالب لکھے مگر تیس کتابوں کے دو پارسلوں کی رسید نہیں لکھی۔ یہ ایک پارسل، جو بعد دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے، اس میں وہی "لطائف غیبی" ہے جس کو میں نے اپنے مطالعے میں رکھ کر صحیح کیا ہے اس کے بھیجنے سے یہ مدعا ہے کہ تم ان تیس رسالوں کو اس کے مطابق صحیح کر لو اور اگر (میرا صحیح کردہ نسخہ) چھوٹے صاحب (میر غلام بابا خاں) نے رکھ لیا ہے تو ان سے مستعار لے کر اپنی سب کتابیں صحیح کر لو اور وہ نسخہ، ان کی نذر کر دو۔۔۔۔" (مرقومہ ۳ جنوری ۱۸۶۵ء)

مولانا عبد المجید سالک نے اس پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ "مصنف کو اس کی کتاب درست کر کے دینے کے کیا معنی؟[1]" مولانا غلام رسول مہر کہتے ہیں کہ "کتاب کی تصحیح مصنف کا کام ہے نہ کہ قاری کا۔ اگر "لطائف غیبی" سیاح کی تصنیف تھی تو میرزا کو یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی کہ "میرا درست کردہ نسخہ سامنے رکھ کر باقی نسخوں کی تصحیح کر لو"[2]۔۔۔۔" مالک رام لکھتے ہیں "اس سے عیاں ہے کہ کتاب میرزا نے لکھی تھی اور اب وہ اس کی غلطیاں درست کر کے سیاح کو بھیج رہے ہیں۔ اگر یہ تصنیف خود سیاح کی تھی، تو جو نسخے سیاح کو بھیجے گئے تھے، وہ انہیں آپ درست کر سکتے تھے، غالب یا کسی اور شخص کو انہیں اغلاط بتانے کی ضرورت جبھی پیش آسکتی تھی کہ یہ کتاب، کسی اور کی لکھی ہوتی[3]۔۔۔۔"

---

[1] علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۱۲۹

[2] اردوئے معلی، دہلی، غالب نمبر ۱۹۶۱ء، صفحہ ۴۸

[3] ذکر غالب، طبع چہارم، دہلی، ۱۹۶۴ء، صفحہ ۲۳۱

(۳)

"لطائفِ غیبی" میں "لطائف" سے پہلے ایک مختصر سی تمہیدی عبارت ہے اس کا آخری ٹکڑا یہ ہے:

"کیا منشی جی نے یہ قیاس کیا ہے کہ تمام ہندوستان میں کوئی عالم، کوئی عاقل، کوئی مصنّف نہیں ہے؟ اللہ اللہ! ہندوستان مجمع فضل و کمال ہے منشی جی کے حمق کا پردہ کھل جائے گا، بلکہ مولانا غالب کا ایک ایک شاگرد منشی جی کا خاکہ اڑائے گا۔ مجھ کو تو حمیت اور رعایتِ حق، اس تحریر کی باعث ہوئی، تا آنکہ میں نے بیس لطائف جمع کیے اور اس نگارش کا "لطائفِ غیبی" نام رکھا:

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت، بگو، میگویم

قاضی عبدالودود کا کہنا ہے کہ "دیباچے میں جو حافظ کا (یہ) شعر "در پسِ آئینہ" الخ مرقوم ہے، وہ (یہ) بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ سیّاح کا صرف نام ہی نام ہے، اصل مصنّف غالب ہیں[1]۔" مولانا مہر نے بھی اس شعر سے یہی استدلال کیا ہے، لکھتے ہیں کہ "خواجہ حافظ کا جو شعر تمہید کے آخر میں لکھا ہے، اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیف الحق سیّاح محض ایک پردے کا کام دے رہے تھے، ترانہ ریزیاں دراصل مرزا غالب کی تھیں...[2]" مالک رام کے نزدیک "لطائفِ غیبی" کی تمہیدی عبارت کے خاتمے سے "ظاہر ہے کہ سیّاح تو "در پسِ آئینہ طوطی صفت" بیٹھے ہیں۔ "استادِ ازل" (غالب) جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ دہرا رہے ہیں[3]۔" بلکہ مالک رام نے اس سے بھی کچھ آگے بڑھ کر یہ تک لکھ دیا ہے کہ:

"میرے خیال میں تو کتاب کا نام "لطائفِ غیبی"، بجائے خود غمّازی

---

[1] آثارِ غالب، در: علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹-۱۹۴۸ء، صفحہ ۳۲

[2] اُردوئے معلّیٰ، دہلی، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۱ء، صفحہ ۵۹

[3] ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی، ۱۹۶۴ء، صفحہ ۲۳۲

کر رہا ہے کہ:

کوئی معشوق ہے، اس پردۂ زنگاری میں!

④

لطیفہ (۸) کی یہ عبارت بھی قابلِ توجہ ہے:

"صاحبو! خان غالب یہاں کیا کرے، مگر یہ کہ تم سے داد چاہے؟"

قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ "یہ غالب خود داد خواہی کر رہے ہیں[1]۔" اسی لطیفے کی یہ عبارت بھی دیکھیے:

"یارب! میرے کن اعمال کی مکافات ہے جو مجھ کو ایسے عجیب المخلوقات سے پالا پڑا ہے۔ مقدماتِ علمی میں منشی جی کا دخل بعینہٖ ایسا ہے جیسا مسموعات میں بندر کا شطرنج کھیلنا اور مشاہدات میں بندریا کا ناچنا...."

یہ غالب ہی ہیں جن کا پالا منشی جی ایسے "پریشاں بیانوں" سے پڑا، جن کی "تحمیق میں غالب کو کلماتِ سخت[2]" لکھنا پڑے۔

⑤

لطیفہ (۱۵) میں غالب کے اُستاد "ملا عبدالصمد ہرمزد" کے بارے میں بعض نئی باتیں یا تفصیلات ملتی ہیں:

"(محرق قاطع برہان" کے) صفحہ ۵۹ میں منشی جی، ایسا کچھ لکھتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ ہرمزد، جس کو حضرت غالب اپنا استاد بتاتے ہیں، وہ وجودِ خارجی نہیں رکھتا تھا.... ہاں سچ ہے، وہ ایسا وجودِ خارجی نہیں رکھتا تھا کہ ناصبی کے ساتھ مترادف بالمعنی ہو۔ ساسانِ پنجم کی اولاد میں سے، رہنے والا یزد کا'

---

[1] آثارِ غالب، ایضاً، صفحہ ۳۲

[2] "اغلب ہے کہ حضرتِ غالب مغلوب الغضب ہیں۔ دکنی کے ایسے ہی پریشان بیانوں پر غصہ آگیا ہے، تب اس کی تحمیق میں کلماتِ سخت کہے ہیں...." (در لطیفہ ۸)

ایک امیر زادۂ جلیل القدر جس نے پچاس برس علمائے عرب و بغداد سے علوم عربیہ حاصل کیے اور طریقہ زردشتیہ چھوڑ کر دائرۂ اسلام میں آیا اور پھر ہندوستان میں تشریف لایا اور حضرت غالب سے ملا اور دو برس ان کا مہمان رہا، اس کو منشی جی کس دلیل سے جھوٹ کہتے ہیں؟"

قاضی عبد الودود کہتے ہیں کہ عبد الصمد سے متعلق یہ کچھ نئی باتیں، "ایسی باتیں میں جو غالب کے سوا اور کوئی نہیں لکھ سکتا تھا[1]..."

(۷)

"محرق قاطع برہان" میں منشی سعادت علی، سیاق عبارت کو نہ سمجھ پانے کے سبب یا کسی اور غلط فہمی کے باعث، یہ لکھ گئے تھے کہ غالب، فردوسی کو مُسلّم الثبوت نہیں مانتے۔ اس عقب میں "لطائفِ غیبی" کا ایک بیان ملاحظہ ہو:

"یہ جو منشی جی اچھلتے کودتے ہیں کہ غالب، فردوسی کو مُسلّم الثبوت نہیں جانتا اور اس کے کلام کو نہیں مانتا۔ اہلِ علم و ہوش سمجھ لیں گے کہ "مصرع فردوسی مفید معنی حصر نیست" عبارت ہرگز فردوسی کے انکار کے معنی نہیں دیتی.....
ایک راوی ثقہ، ناقل تھا کہ کسی شخص نے نجم الدولہ بہادر سے پوچھا کہ کیا تم فردوسی کے کلام کے منکر ہو؟ نواب صاحب نے ہنس کر کہا کہ میرے نزدیک فنِ سخن میں فردوسی کا کلام ایسا ہے، جیسا اُمورِ دینی میں آیت و حدیث کا، جو فارسی شعر کہے یا نثر لکھے اور فردوسی کو سند نہ جانے، اس کا حال و مآل بعینہٖ وہ ہے جو منکرِ آیت و حدیث کا حال و مآل ہو....." (در: لطیفہ ۲)

مولانا عبد المجید سالک کہتے ہیں "بھلا، میاں داد خاں سیاح کو اس "نقلِ روایت" کے تکلّف کی کیا ضرورت تھی! یہ ندرت مرزا غالب ہی کی ایجاد ہے کہ اپنی رائے فردوسی کے متعلق ظاہر کرتے میں ایک "راوی ثقہ" کا سہارا لیا[2]...."

---

[1] آثارِ غالب، در: علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۲۲

[2] علی گڑھ میگزین، غالب نمبر، ۱۹۴۹ء، صفحہ ۱۲۶

(۸)

"لطائف غیبی" میں دوسرے لطیفے کے ضمن میں بیان ہوا ہے کہ :

"مزا ایک اور ہے کہ منشی جی بذاتِ خود سنی ہیں اور حقیقی بھائی ان کے، شیعی سنی ہیں۔ محرم میں بھس اڑاتے پھرتے ہیں، حاضریاں کھاتے پھرتے ہیں۔ اصحابِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو برا کرتے ہیں اور منشی جی کے ساتھ، ایک گھر میں رہتے ہیں ان پر منشی جی کو کبھی غصہ نہ آیا...."

سیاح، باشندہ دکن، منشی جی، دہلی کے رہنے والے، منشی جی کی یہ خانگی تفصیلات کہ ان کے حقیقی بھائی شیعی سنی ہیں۔ وہ محرم میں بھس اڑاتے پھرتے ہیں اور حاضریاں کھاتے پھرنے کے عادی ہیں، اصحابِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو برا کہا کرتے ہیں اور منشی جی کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں اور وہ منشی جی کو اس قدر عزیز ہیں کہ ان پر منشی جی کو "کبھی" غصہ تک نہیں آیا، سیاح سے بعید تھیں۔ حقیقت یہی ہے کہ "لطائفِ غیبی" بقلمِ غالب، دلی میں تصنیف ہوئی، جو منشی جی کا بھی مامن و مسکن تھا۔

(۹)

"تیس جلدیں 'لطائفِ غیبی' کی دو پارسلوں میں آگے بھیجی ہیں، جس کی قیمت دس روپے مجھ کو پہنچے۔ فی الحال ایک جلد اور، اپنی طرف سے بھیجی ہے۔ رسید جلد لکھو...."

(بنام سیاح، مرقومہ ۴، دسمبر ۱۸۶۴ء)

"صاحب! میں نے اپنے صرفِ زر سے "لطائفِ غیبی" کی جلدیں نہیں چھپوائیں، مالک مطبع نے اپنی بکری کو چھاپیں۔ بیس میں نے مول لیں، تیس تم کو دلوا دیں، بیس بھائی ضیاء الدین نے لیں، دس مصطفےٰ خاں صاحب نے لیں، باقی کا حال مجھے معلوم نہیں...."

(بنام سیاح، مرقومہ ۳، جنوری ۱۸۶۵ء)

"صاحب! یہ تم نے پانچ روپے کے ٹکٹ کیوں بھیجے؟ میں نہ کتاب فروش، نہ دلاّل۔ یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی اور تم نے بُرا کیا۔ حضرت، سولہ جلدیں "لطائفِ غیبی" ..... کا پارسل ارسال کیا..... "لطائف" کی رسید تم نے بھیج دی۔"

(بنام سیاح، مرقومہ ۲۱، فروری ۱۸۶۶ء)

"اب تو کوئی خط تمہارا نوٹ اور ہنڈی اور ٹکٹ سے خالی نہیں ہوتا۔ بھلا یہ تو فرمائیے کہ یہ ڈھائی روپے کس بابت کے اور کس جنس کی قیمت کے ہیں؟ اگلے پانچ روپے پر میں بے مزہ ہوا تھا، یہ ڈھائی اور طرّہ ہوئے....."

(بنام سیاح، مرقومہ ۲۳، اپریل ۱۸۶۶ء)

"..... تم نے "لطائفِ غیبی" کی پندرہ جلدیں سات روپے آٹھ آنے دام بھیج کر منگوائیں ....." (بنام سیاح، مرقومہ ۱۲ فروری ۱۸۶۷ء)

ان اقتباسات کے بین السطور، یہ پڑھنا کچھ مشکل نہیں کہ "لطائفِ غیبی" خود غالب نے لکھی، اس کی طباعت کے لیے دلّی میں مطبع کے کارپردازوں کو آمادہ و تیار کیا اور خود، اس کتاب کی اشاعت و ترسیل کا انتظام کیا اور یہ کہ سیاح، قیمت بھیج بھیج کر "لطائفِ غیبی" کے نسخے اپنے حلقۂ احباب وغیرہ میں تقسیم کرنے کے لیے منگواتے رہے۔ کتاب کی قیمت آٹھ آنے مقرر کی گئی تھی لیکن سیاح کو ابتداً غالباً اس وجہ سے کہ کتاب پر ان کا نام بطور مصنّف درج کیا گیا تھا، بیس نسخے رعایتی شرح پر دس روپے میں فراہم کیے گئے۔ بعد کو انھوں نے بھی فی نسخہ آٹھ آنے کے حساب سے دام بھیج کر "لطائفِ غیبی" کی جلدیں خریدیں۔

یہاں اس امر کی طرف اشارہ کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ "لطائفِ غیبی" دلّی میں "اکمل المطابع" سے شائع ہوئی۔ اس مطبع کے مہتمم میر فخرالدین اور اس ادارے کے دیگر متعلقین و منصرمین حکیم غلام رضا خاں، حکیم غلام نبی خاں وغیرہ سے غالب کے عزت و محبت کے مراسم تھے۔ غالب اس ادارے کے اخبار "اکمل الاخبار" کی قلمی سرپرستی میں مستعد رہے[1]، اس کے خریدار

---

[1] دیکھیے: میاں داد خاں سیاح کے نام غالب کے خطوط مرقومہ ۱۵، اپریل ۱۸۶۷ء و ۲۵، اگست ۱۸۶۰ء۔ نیز: اکمل الاخبار، دہلی، اکتوبر ۔

فراہم کرنے کی فکر کی اور طرح طرح سے اس کے ادارۂ تحریر کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ۷ جون ۱۸۶۸ء کے خط میں اپنے ایک شاگرد بہاری لال مشتاق کو جو" اکمل الاخبار" اور" اکمل المطابع" سے وابستہ تھے، لکھتے ہیں:

"برخوردار بہاری لال!۔۔۔۔۔ اس نونہال باغ دولت یعنی حکیم غلام رضا خاں کے دوام صحبت کو، اپنے طالع کی یاوری سمجھو۔ یہ دانش مند ستودہ خوے امیر، نامور ہونے والا اور مراتبِ اعلیٰ کو پہنچنے والا ہے۔ اس کی ترقی کے ضمن میں تمہاری بھی ترقی ہونے والی ہے۔۔۔۔۔ میاں! سچ تو یہ ہے کہ اکمل المطابع، اجمل المطابع بھی ہے۔ حکیم غلام نبی خاں منجملہ خوبانِ روزگار ہیں، نکوخوے اور نیکو کردار ہیں۔ میر فخرالدین آزاد منش اور سعادت مند نوجوان ہیں، کم گفتار اور مرجع و مرجان ہیں۔ تم چاروں شخص پیکرِ صدق و صفا و مہر و ولا کے چار عنصر ہو۔ جہاں آفرین، تم چاروں صاحبوں کو خوشنود و دل شاد اور اکمل المطابع کو بارونق اور آباد رکھے۔"[۱]

"اکمل المطابع" کے مالک حکیم غلام رضا خاں کو غالب بہت عزیز رکھتے تھے اُن کی صفات و خصوصیات کے حد درجہ مدّاح تھے، ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں رامپور سے لکھتے ہیں:

"نور دیدہ و سرورِ دل و راحتِ جان، اقبال نشان، حکیم غلام رضا خان کو غالبِ نیم جان کی دعا پہنچے۔۔۔۔۔ مفصل حالات عند الملاقات زبانی کہوں گا۔ سنو صاحب! میں فقیر آزاد کیش ہوں، دنیا دار نہیں، مکار نہیں، خوشامد میرا شعار نہیں، جس میں جو صفات دیکھتا ہوں، وہ بیان کرتا ہوں۔ نواب صاحب تو گھر بیٹھے سو روپے مہینہ دیتے ہیں۔ تم مجھ کو کیا دیتے ہو، جو تمہارے باب میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر بہ مثل، میرا کوئی صلبی بیٹا، ایسا ہوتا جیسے تم ہو تو میں اس کو اپنا فخر و شرف جانتا۔ علم و عقل، خلق و صدق، سواد و حلم کے جامع، تورع و زہد و تقویٰ کے حاوی۔ علمِ اخلاق میں حکمائے روحانی نے سعادت کے جو دارج لکھے ہیں، وہ سب تم میں پائے جاتے ہیں۔ پروردگار تم کو عمرِ طبعی عطا کرے

---

[۱] دیکھیے: میاں داد خاں سیاح کے نام غالب کا خط مورخہ ۲۲، مارچ ۱۸۶۶ء

اور دولت و اقبال، شمار سے زیادہ دے! ..."

غرض، اس تعلقِ خاطر کی وجہ سے غالب کا نام اور احوال "اکمل الاخبار" میں ہمیشہ تفصیل تفصیل اور تکریم سے درج ہوتا رہا۔ چنانچہ "قاطع برہان" کے قضیے میں بھی اس اخبار نے غالب کی حمایت میں بڑی سرگرمی دکھائی[1] اور ان کے موقف کو بڑی شد و مد سے پیش کیا۔ اسی طرح "اکمل المطابع" بھی پیش پیش رہا۔

"مصنف "برہانِ قاطع" (مولوی محمد حسین برہان) کے معتقدوں نے جب کہ ان کے حق میں بہت کچھ لکھا تو مرزا غالب تو زندہ تھے، وہ بذاتِ خود، اور ان کے طرفدار، کیوں کر کچھ نہ لکھتے۔ چنانچہ مخالفین کے جواب میں کتابیں ضبطِ تحریر میں آئیں[2]۔" ایک آدھ استثنیٰ کے علاوہ اس سلسلے کی سب کتابیں "اکمل المطابع" ہی سے شائع ہوئیں۔ غالب کی کتابوں میں "درفشِ کاویانی" (۱۸۶۵ء)، "سوالاتِ عبدالکریم" (۱۸۶۵ء)، "قطعۂ غالب" (۱۸۶۶ء) اور "تیغ تیز" (۱۸۶۷ء) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ "مثنوی ابرِ گہربار" (۱۸۶۴ء) کی جداگانہ کتابی صورت میں اشاعت "اکمل المطابع" سے حکیم غلام رضا خاں کے ایما ہی پر عمل میں آئی نیز "اُردوئے معلیٰ" (۱۸۶۹ء) کی طباعتِ اوّل کا فخر بھی "اکمل المطابع" ہی کو حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ "ازراہِ فرطِ محبت" غالب نے اس یادگار، تالیفِ لطیف کا حقِ طباعت، حکیم غلام رضا خاں کو بخش دیا تھا، یہ کتاب (طبع اوّل) اس "اعلان" پر ختم ہوتی ہے:

> "بیکرِ بے روح و رواں، فقیر اسد اللہ خاں غالب تخلص، ہیچدان کہتا ہے اور لکھ دیتا ہے کہ یہ جو "اردوئے معلیٰ" تصنیفِ فقیر، مطبع اکمل المطابع، دہلی میں چھاپا ہوا، سو میں نے ازراہ فرطِ محبت، اپنا حقِ تالیف، نورچشم، اقبال نشان حکیم رضا خاں کو بخش دیا ہے، اور اس حق کو، خاص ان کا حق کیا، اب اور کوئی صاحب، اگر مالک اکمل المطابع، حکیم رضا خاں کے بے اطلاع "اردوئے معلیٰ" کے چھاپنے کا قصد کریں گے تو مواخذہ سے محفوظ نہ رہیں گے، اور فوراً

---

[1] امداد صابری، تاریخِ صحافت اردو، جلد دوم، طبع اوّل، دہلی، صفحہ ۲۲۰

[2] مہیش پرشاد، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹ء، ۱۹ء، صفحہ ۱۱۲

حسب منشار قانون بستم ۱۸۴۷ء سزا پائیں گے....

[اُردوئے معلیٰ، طبع اول، ۱۸۶۹ء، صفحہ ۴۶۴]

"لطائفِ غیبی" بھی حکیم رضا خاں کے مطبع "اکمل المطابع" سے میر فخرالدین کے زیر اہتمام چھپی..... اس مطبع اور اصحابِ مطبع سے خاص، غالب کے تعلقات بہ معرفت ثابت و روشن ہیں، اور "لطائفِ غیبی" کے "مُبَیّنہ" "مصنف" میاں داد خاں سیاح، کا اس مطبع یا مطبع والوں سے کوئی راست تعلق اور تعارف ثابت نہیں۔

(۱۰)

"لطائفِ غیبی" کے آخر میں غالب کے چار عزیز شاگردوں: جوہر[1]، عزیز[2]، رضوان[3] اور مشاق[4] کے قطعاتِ تاریخ ہیں اور یہ بہت شوق اور شغف سے لکھے گئے ہیں۔ مولانا سالک نے خوب نکتہ پیدا کیا ہے کہ "یہ چاروں مرزا غالب کے خاص شاگرد اور نیاز مند تھے، سیاح سے ان کا کوئی علاقہ نہ تھا، اِلّا بتوسطِ غالب...." (علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۱۲۹ و مابعد)، اس لیے بھی یہ ماننا چاہیے کہ یہ کتاب دراصل، غالب ہی کی لکھی ہوئی ہے نہ یہ کہ سیاح کی۔

---

[1] جوہر: منشی جواہر سنگھ جوہر، تحصیل دار بلب گڑھ، جوہر کے والد رائے چھج مل کے غالب سے دیرینہ دوستانہ مراسم تھے چنانچہ جس زمانے میں وہ کلکتہ گئے ہیں رائے چھج مل ہی کو اپنے معاملات کی دیکھ بھال سونپ گئے تھے (تلامذۂ غالب، ص ۷۸)۔

[2] عزیز: مرزا یوسف علی خاں عزیز، بے کاری کے ایام میں غالب نے ان کا کچھ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور اپنے دوستوں سے بھی کہہ کر، ان کی ملازمت کی کوشش کرتے رہے، مرثیہ گوئی اور سوز خوانی میں اچھی دستگاہ تھی اسی واسطے سے غالب انہیں قلعۂ معلیٰ میں لے گئے۔ خلعت چار پارچہ، گوشوارہ، خطاب عطا ہوئے اور ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ خطاب: "سراج الشعرا، سراج الذاکرین" متوفی: ۱۸۷۲ء (تلامذۂ غالب، صفحہ ۲۳۷)

[3] رضوان: مرزا شمشاد علی بیگ خاں رضوان، وکیل، ڈپٹی مجسٹریٹ، مصنف، شاعر، متوفی: ۱۸۷۶ء (تلامذۂ غالب، صفحہ ۱۲۲)

[4] مشاق: منشی بہاری لال، خوش نویس، مدیر، منشی، ۷۲، ۷۳ برس کی عمر تھی جب ۱۹۰۸ء میں انتقال کیا۔ (تلامذۂ غالب، صفحہ ۲۵۹)

یہاں مجھے ان میں سے آخری قطعۂ تاریخ از بہاری لال مشتاق کا خصوصیت سے ذکر کرنا ہے جنہوں نے "لطائفِ غیبی" کی کتابت بھی کی ہے۔ اگر کتاب لیتھو پر چھپے تو مصنف کے بعد کاتب ہی مسودے کی قرار واقعی حقیقتِ حال سے پوری طرح واقف ہوتا ہے، اس نکتے اور صداقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے بہاری لال کا قطعہ ملاحظہ کیجئے:

قطعۂ تاریخ از خاکسار بہاری لال کاتب الحروف عفی عنہ،

میاں سیاح ہو تم کو مبارک — ہوئی جو آپ سے تقریرِ غیبی
جواب اچھا دیا محرق کا تم نے — غضب سوجھی تمہیں تدبیرِ غیبی
بدی غالب کی یزداں کو نہ بھائی — عدو کو دی ہے یوں تعزیرِ غیبی
ہوا جب ختم چھپ کر یہ رسالہ — کہ جس کی ہر کشش ہے تیرِ غیبی
ہوئی جب فکرِ سالِ عیسوی کی — نظر آئی مجھے تحریرِ غیبی

سرِ حاسد اڑا کر دیکھ مشتاق
کہ سالِ طبع ہے "شمشیرِ غیبی"

سیاح کی "تقریر" اور "تدبیر" وغیرہ کو "غیبی" بتانا اور رسالے کے کاتب کا، جس کے پیشِ نظر رسالے کا قلمی مسودہ رہا ہے، اس رسالے کی ہر "کشش" کو "تیرِ غیبی" ٹھہرانا، گہری معنویت کا حامل ہے، بحیثیتِ مجموعی بھی اس قطعے کی ردیف "غیبی" معنی خیز اور قابلِ غور ہے!

میاں داد خاں سیاح، عمر میں بہاری لال سے دس پندرہ برس بڑے تھے "میاں سیاح" کا طرزِ تخاطب، جو چھوٹوں سے سزاوار ہے بہاری لال کے، سیاح سے عدمِ تعارف پر دلالت کرتا ہے، ظاہر ہے وہ سیاح سے واقف ہی نہ تھے، وہ تو "لطائفِ غیبی" کا قطعۂ تاریخ لکھ رہے تھے۔ جس کا مسودہ انہیں کتابت کی غرض سے، غالب سے ملا اور جو غالب ہی کے سوادِ تحریر میں رہا ہوگا ——

(۱۱)

"لطائفِ غیبی" کا آغاز، ان سطور سے ہوتا ہے:

"سیاحِ بحر و بر، ہیچمدان بے ہنر سیف الحق، میاں داد خاں، حق شناسوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ میں رہنے والا اورنگ آباد دکن کا ہوں۔ میں نے بعد تحصیلِ علومِ رسمیہ، سیاحت اختیار کرکے، بنگالہ، دکن، پنجاب، وسط ہند میں سرتاسر پھرا ہوں بلکہ سندھ و کابل و کشمیر و قندھار بھی دیکھ آیا ہوں۔"

مولانا غلام رسول مہر کہتے ہیں کہ "سیاح کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ سندھ و کابل و کشمیر و قندھار بھی دیکھ چکے تھے۔ اپنی کتاب "سیرِ سیاح" میں جو سات سال بعد مرتب ہوئی، سیاح نے لکھا تھا کہ کشمیر نہیں دیکھا، کابل و قندھار بھی، وہ یقیناً نہیں گئے۔ یہ بھی، اس امر کی دلیل ہے کہ کتاب "لطائفِ غیبی" سیاح کی نہ تھی، مرزا غالب کی تھی، جن کی معلومات سیاح کے متعلق سرسری تھیں یا یہ سمجھ لیجئے کہ میرزا نے سیاحت کی اہمیت بڑھانے کے لیے شاعرانہ مبالغے سے کام لیا۔" [اُردوئے معلّیٰ، دہلی غالب نمبر، فروری ۱۹۶۱ء، صفحہ ۵۹]

(۱۲)

مالک رام لکھتے ہیں کہ "سب سے بڑی داخلی شہادت، "لطائفِ غیبی" کا اسلوبِ بیان و طرزِ تحریر ہے۔ سیاح کی اپنی لکھی ہوئی کتاب "سیرِ سیاح" موجود ہے جو ۱۸۷۲ء (۱۲۸۸ھ) میں چھپی تھی۔ اس میں انھوں نے لکھنؤ اور کانپور کے دو مشاعروں اور بعض اور مقامات کا حال لکھا ہے۔ ساری کتاب میں صرف پانچ چھ صفحے نثر کے ہیں، لیکن اس کا بھی یہ حال کہ شروع سے آخر تک مسجّع اور مقفّیٰ فقرے ہیں اور تصنع اور آورد سے کوئی سطر خالی نہیں۔ اس کی نثر کو "لطائفِ غیبی" سے کیا نسبت، جس میں بے ساختگی اور آمد کا یہ عالم ہے کہ نگاہ کہیں رکتی ہی نہیں، اور اس پر ظرافت اور بذلہ سنجی، فقرے فقرے سے عیاں، جو غالب کی تحریر کا طرۂ امتیاز ہے۔" [ذکرِ غالب، طبع چہارم، ص ۲۳۲]

مولانا غلام رسول مہر نے بھی اسلوب کے حوالے سے "لطائفِ غیبی" کے مصنف کو پانے کی راہ سُجھائی ہے: "ایک قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ "لطائف" کا اسلوبِ تحریر، سیاح کے اسلوب سے بالکل مختلف ہے۔ سیاح کے خطوط تو ہمارے سامنے نہیں، لیکن ان

کی کتاب "سیرِ سیاح" کے نام سے منشی نولکشور نے ۱۸۷۲ء میں شائع کی تھی۔ یہ سیاح کی سیاحتِ ہند کا ایک مرقع ہے جس میں کچھ" کم ساٹھ صفحے۔ دو شاعروں میں مختلف شعرا کے حالات، بہ صورتِ نثر مرتب کئے ہیں۔ یہ نثر "لطائف" سے کم و بیش سات سال بعد کی ہے۔ اس وجہ سے اس میں زیادہ پختگی، زیادہ روانی اور زیادہ حُسن موجود ہونا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس وہ پرانے رنگ کی نثر ہے جس میں دو دو تین تین فقروں میں قافیہ بندی کا التزام کیا جاتا تھا۔ میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ منشی نولکشور کی مہمان نوازی کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

"سیرچشمی، سبحان اللہ! منش بزرگ، واہ، واہ، حوصلے کی تنومندی، ہمت کی بلندی، بات بات میں، انضباطِ لوازم و احتیاط مراسم کی پابندی ملاقات میں۔ رات دن تکلف کے نئے ٹھاٹ دکھاتے، سو سو طرح سے میرے دل کو بہلاتے۔ ہر روز، روزِ عید، ہر شب، شبِ برات۔ صبح و شام، اکابرِ شہر کی ملاقات تواضع کوشی کا شیفتہ کیا، مدارات جوشی کا فریفتہ۔ اگر حضرت نوحؑ کی عمر پاؤں، شکرِ مہمان نوازی ادا نہ کرسکوں ..... یہ داستان، حد سے متجاوز ہے کر قلم دو زبان، ایک جملے کے ادا میں عاجز ہے۔ نہ ہاتھ میں طاقت، تحریر کی۔ نہ زبان میں طاقت، تحریر کی۔"

بس چھ سات صفحے، اسی قسم کی عبارت سے مزین ہیں۔ "لطائفِ غیبی" کا اسلوب، اس، سے بالکل مختلف ہے، اور اس کا ایک بھی صفحہ ایسا نہیں، جسے مذکورہ بالا عبارت کے محرر کی قلم کاری کا نتیجہ قرار دیا جاسکے ...."

[اُردوئے معلّیٰ، دہلی، غالب نمبر فروری ۱۹۶۱ء، صفحہ ۴۹ وبعد]

مولانا عبدالمجید سالک بھی اسی امر کی جانب بڑی وضاحت سے اشارہ کرچکے ہیں، ان کا بیان ہے کہ: میاں داد خاں سیاح نے "سیرِ سیاح" کے نام سے جو کتاب لکھی تھی، اس میں اُن کا اندازِ تحریر "لطائفِ غیبی" سے بالکل جداگانہ نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ "لطائف" کی بحثوں میں فارسی دانی کے جن کمالات کا اظہار ہوا ہے، وہ اس دور میں مرزا غالب کے سوا

کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ میاں داد خاں سیاح، ہندوستانی نژاد تھے اور وہ بھی دکنی۔ انہیں فارسی میں استاد رخور کہاں تھا کہ تحقیقِ الفاظِ ایرانی میں مرزا غالب سے لگا کھاتے بلکہ ان کی اغلاط تک کا اعتراف بھی کرتے۔ حقیقت میں مرزا نے خود ہی یہ رسالہ لکھا ہے اور تعریض و تشنیع کی بندوق، اپنے شاگرد کے کندھے پر رکھ کر محمد حسین دکنی اور منشی سعادت پر چلائی ہے ، ورنہ یہ سلاست، اور یہ شوخی، یہ پختگی اور یہ ہمہ گیر معلومات، سیاح کو کہاں نصیب.....“ [علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۱۹۴۹ء صفحہ ۱۲۸]

(۱۴)

اوّل "لطائفِ غیبی" سے کچھ اقتباس درج کیے جاتے ہیں:

”اللہ اللہ! غالب نام آور نامدار، کوئی شہر ایسا نہ دیکھا جس میں ان کے دو چار شاگرد، دس بیس معتقد نہ دیکھے ہوں..... معزز اور مکرم، والا رتبہ، عالیشان، عالی خاندان، انگریزی رئیس زادوں میں محسوب، بادشاہ دہلی کے حضور سے مخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ یعنی تخلص اسد اللہ خاں بہادر.....“ (تمہید: لطائفِ غیبی)

”ایک شخص عالی خاندان، نامور، باوجود صفت امارت صاحبِ کمال، یگانہ روزگار، اہلِ ہندوستان کا مطاع، مسائلِ منطق فارسی کا مفتی، بایں ہمہ مرنج و نجان، گوشہ نشین، آزاد و وارستہ، فروتنی اس کا شیوہ، مروّت اس کا پیشہ، طرزِ بیان میں ایک عالم اس کا معتقد، حسنِ خلق میں ایک جہان، اس کا مداح، بادشاہ کا مصاحب، حکام کا معزز متوسل، ان صفات کا جامع.. .....یعنی اسد اللہ خاں غالب...“ (ور، لطیفہ ۲)

”منشی جی، نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں بہادر کا آدھا نام لکھتے ہیں؛ یعنی مرزا اسد اللہ غالب..... ہائے..... جس شخص کا بادشاہی دفتر میں اسد اللہ خاں نام لکھا گیا ہو اور نواب گورنر جنرل بہادر کے محکمہ محتشمہ سے

"خاں صاحب بسیار مہربان دوستان مرزا اسد اللہ خاں" لکھا جاتا ہو...."

(در : لطیفہ ۱)

"لطائفِ غیبی" کے ان اقتباسات کے بعد، اب "نامۂ غالب" (۱۸۶۵ء) بنام میرزا رحیم بیگ میرٹھی کا ایک جملہ دیکھیے :

"احسان مند ہوں آپ کا کہ آپ نے منشی سعادت علی کی طرح آدھا نام میرا، نہ لکھا...."

اسی طرح "تیغِ تیز" (۱۸۶۷ء) سے غالب کی عبارت کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو :

"..... غالب اگر عالم نہیں، شاعر نہیں، آخر شرافت و امارت میں ایک پایہ رکھتا ہے، صاحبِ عز و شان ہے، عالی خاندان ہے۔ اُمرائے ہند، روسائے ہند، راجگانِ ہند، سب اس کو جانتے ہیں رئیس زادگانِ سرکار انگریزی میں گنا جاتا ہے۔ بادشاہ کی سرکار سے نجم الدولہ کا خطاب ہے، گورمنٹ کے دفتر میں "خان صاحب بسیار مہربان دوستاں" القاب ہے، جس کو گورمنٹ "خان صاحب" لکھتی ہے....."

"لطائفِ غیبی"، "نامۂ غالب" اور "تیغِ تیز" کی ان عبارتوں کے تقابلی مطالعے سے کیا باعتبارِ اتحادِ معنی اور کیا بلحاظِ اشتراکِ الفاظ و تراکیب، بدیہی طور پر ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ ایک ہی شخص کے قلم اور فکر کا نتیجہ ہیں۔

(۱۴)

حبیب اللہ ذکا، کے نام ۲۸، نومبر ۱۸۶۴ء کے ایک خط میں غالب لکھتے ہیں کہ :

"دانا ہو اور منصف ہو۔ "محرق" کو دیکھ کر جانو گے کہ مولف اس کا احمق ہے اور جب وہ احمق "دافع ہذیان" "سوالاتِ عبدالکریم" اور "لطائفِ غیبی" کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا اور "محرق" کو دھو نہ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے...."

اب "لطائفِ غیبی" کی دو عبارتیں ملاحظہ ہوں :

"اگر آدمی ہوتا تو حضرتِ غالب کی تحریر دیکھ کر، اس بحث کے جواب کا عزم نہ کرتا، مگر چوں کہ بے حیا ہے، تقریر سے باز نہیں رہا ہے ..... اور بیہودہ بکا ہے .....۔"
(در: لطیفہ ۹)

"میں ڈرتا ہوں کہ منشی جی ..... اس "لطائف" کو دیکھ کر کہیں اپنے کو ہلاک نہ کریں، اس بزرگ نے فرمایا کہ میاں دادخاں یہ کام غیرت والوں کا ہے، منشی جی کی طرف یہ احتمال بے جا ہے ...۔"
(در: لطیفہ ۱۸)

کیا یہ عبارتیں، ایک ہی قلم، ایک ہی "بزرگ" کی نہیں ہیں؟ اور وہ بزرگ بالیقین غالب ہیں!

(۱۵)

"قاطع بُرہان" کے جواب یا رد میں منشی سیّد سعادت علی نے "محرقِ قاطع برہان" کے نام سے ایک کتاب لکھی، غالب نے اپنے نجی خطوں میں صاحبِ کتاب کو شخصِ گم نام، مجہول الحال، عامی و فضول بتایا ہے اور اس مجہول الحال شخص کے شہرت کمانے کی طمع کو غایتِ تصنیف ٹھہرایا ہے:

"ایک شخص مجہول الحال نے اہلِ دہلی میں سے، میرے کلام کی تردید میں کتاب تصنیف کی ہے، مُسمّیٰ بہ "محرقِ قاطع برہان"
[بنام: بے خبر، اگست ۱۸۶۴ء]

"ایک شخص عامی فضول نے اپنی شہرت کے واسطے "قاطع برہان" کے مطالب کے رد میں ایک کتاب لکھی، "محرقِ قاطع برہان" اس کا نام رکھا۔ عبارت مہمل، مقاصد پوچ .....۔"
[بنام: مولوی نعمان احمد، ۱۹، اکتوبر ۱۸۶۶ء]

"جو اغلاط فارسی دانانِ ہند کے ذہن میں راسخ ہو گئے تھے، ان کو دفع کیا ہے تو کیا برائی کی ہے، بات یہ ہے کہ اوچھی پونجی والے گم نام اپنی شہرت کے لیے مجھ سے لڑتے ہیں ..... اپنے نامور بنانے کو، ناحق احمق بگڑتے ہیں ...۔"

[بنام: غلام بابا خاں، ۱۷، دسمبر ۱۸۶۵ء]

"لطائفِ غیبی" میں بھی "محرقِ قاطع بُرہان" کی غایتِ تصنیف یہی قرار دی گئی ہے:

"قاطع بُرہان" کے جواب لکھنے سے منشی جی کی مُراد یہ تھی کہ کنجِ خمول سے

ہا ہر آئیں اور ایک صاحب نام و نشان کے مقابل ہو کر خود بھی نام پائیں ...؟

(در، لطیفہ ، ۱)

یہ توارد نہیں ، دراصل ایک ہی ذہن اور فکر کی گونج ہے !

(۱۶)

"لطائف غیبی" میں دوسرے لطیفے کا آغاز ، ان کلمات سے ہوتا ہے :

"اے صاحبانِ فہم و انصاف ، عبارت "محرق قاطع برہان" کو دیکھا چاہیے۔
خلط مبحث ، اطناب مملّ ، سوٗ ترکیب ، تباہی روزمرہ ، غلطیِ فہم ، اس سے
مجھے کچھ کام نہیں۔ بھلا عامیانِ مُعَوَّج الذہن کی نثر اور کیسی ہوگی ...؟"

اب "تیغ تیز" کی تمہید سے غالب کی ایک عبارت ملاحظہ ہو :

"اسد اللہ خاں غالب کہتا ہے کہ میں نے ... "برہان قاطع" کی عبارت کی
سستی اور بیان کی غلطی اور "اطناب مملّ" کی نکوہش میں ایک رسالہ لکھا
..... ایک مردِ بے مغز "معوج الذہن"، نہ فارسی دان ، نہ عربی خواں ، نے
میری نگارش کی تردید میں ایک کتاب بنائی اور چھپوائی ....."

"اطناب مملّ" اور "معوج الذہن" کی تراکیب اس میں بھی موجود ہیں۔ "اطناب مملّ"
علائی کے نام ۱۸ رمئی ۱۸۶۴ء کے ایک نامۂ غالب میں بھی ہے :

"غلطیاں عبارت کی ، شدت "اطناب مملّ" کی صورت ، سوال دیگر ، جواب
دیگر۔ ان باتوں کو مطمح نظر کرو۔"

اور "اطناب مملّ" اس قطعے میں بھی موجود ہے جو غالب نے "موید برہان" (۱۸۶۶ء) کے
مصنف مولوی احمد علی احمد کو لکھ کر بھیجا تھا[۱] :

---

[۱] مشمولہ : (الف) سبد چین ، مالک رام ، دہلی ۱۹۳۸ء ، صفحہ ۴۹ - ۵۱

(ب) "غالب" مولانا غلام رسول مہر ، لاہور ، طبع چہارم ، ۱۹۴۶ء ، ص ۴۴۵ - ۴۴۷

(ج) باغِ دودر ، وزیر الحسن عابدی ، لاہور ، طبع دوم ، ۱۹۶۸ء ، ص ۱۹ - ۲۲

(د) قطعات رباعیات الخ غالب ، مولانا غلام رسول مہر ، لاہور ۱۹۶۹ء ، ص ۱۱۵ - ۱۱۸

لغو و خشو و ادعای محقق و "اطناب مل"
مار و موش و سوسمار و گربہ یکجا کردہ است

اور "ذہن" کے ساتھ "معوج" کا لاحقہ شمس العلماء مولوی ضیاء الدین کے نام غالب کے ایک خط میں بھی آیا ہے[1] اور جولائی ۱۸۵۹ء کے ایک خط بنام مجروح میں بھی "معوج الذہن" کی ترکیب نظر سے گزری ہے۔ جملہ یہ ہے:

"طبع سلیم و ذہن مستقیم رکھتا ہو۔ معوج الذہن" اور کج فہم نہ ہو...."

اسی طرح حبیب اللہ ذکا کے نام ۱۵ فروری ۱۸۶۷ء کے ایک خط میں اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"معوج الذہن نہیں ہوں، غلط فہم نہیں ہوں..."

عزیز صفی پوری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ذہن تمہارا معوج ہے، اکثر کجی کی طرف جاتا ہے[2]..."

"برہان قاطع" (محمد حسین دکنی) کا جو مطبوعہ نسخہ غالب کے پیش نظر رہا تھا، اس کے حاشیے پر، غالب کی ایک خود نوشتہ عبارت میں بھی "معوج الذہن" کی ترکیب آئی ہے[3]۔ لکھتے ہیں:

"اس بزرگ یعنی صاحب "برہان قاطع" کو عقل سے بہرہ نہیں، صرف نقل پر مدار ہے۔ خدا جانے اس کو کوئی بہکا دیا کرتا ہے یا یہ آپ، قیاس کرتا ہے اور لطف یہ کہ قیاس اس کا کہیں صحیح نہیں ہوتا۔ عجب معوج الذہن آدمی ہے..."

غالب نے اپنی نظم و نثر میں عربی اور بالخصوص فارسی ترکیبیں خاصی بے دریغ صرف کی ہیں، جو اکثر صورتوں میں واقعتاً گنجینۂ معنی کا طلسم ہیں۔ ان میں ایسی ترکیبوں کی بھی کمی نہیں جو خود غالب کی تراشیدہ ہیں۔ غالب کے سرمایۂ علمی میں جو ہمہ جہتی، تہہ داری اور معنوی وسعت کی انفرادی اور امتیازی خوبیاں نظر آتی ہیں، ان میں بڑا حصہ، ان مرکبات

---

[1] اُردوئے معلّیٰ، مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، لاہور، ۱۹۷۰ء، صفحہ ۱۱۲۷

[2] اُردوئے معلّیٰ، ایضاً، صفحہ ۱۰۹۱

[3] بحوالہ امتیاز علی عرشی، تحریک، دہلی، اپریل مئی ۱۹۶۱ء، صفحہ ۲۳

کا بھی ہے ۔ مرکبات میں، جیسا کہ "اشاریۂ کلامِ غالب" (دہلی، ۱۹۷۰ء) کے مرتبین نے بھی۔ اس کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کی بڑی گنجائش ہوتی ہے کہ پیچیدہ اور وسیع مفاہیم کو سادگی و شائستگی اور کفایتِ لفظی کے ساتھ ادا کر دیا جائے۔ اس طرح لکھنے والا براہ راست اندازِ بیان سے بچ جاتا ہے اور تحریر میں اکتا دینے والی سادگی پیدا نہیں ہونے پاتی۔

ان مرکبات کے وسیلے اور بعض خاص مرکبات کی طرف رُجحان سے صاحبِ تحریر کا کشف اور اس کی پہچان بھی ممکن ہے، لیکن یہاں اس بحث کو پھیلانے کی گنجائش نہیں ہے۔ "اطنابِ مملّ" (ملول و دلگیر کو دینے والی طوالت) اور "معوج الذہن" (ذہن و فہم کی کجی اور ٹیڑھاپن) کے مرکبات، غالب سے خاص ہیں۔ ان نگارشات میں، جن کا انتساب غالب سے اختلافی نہیں ہے، اس کا استعمال، یعنی "اُردوئے معلیٰ"، "سبد چین"، "باغِ دو در" اور "تیغِ تیز" میں ان نادر ترکیبات کی موجودگی اور ان ہی خاص مرکبات کا "لطائفِ غیبی" میں پایا جانا، اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ "لطائفِ غیبی" بھی، اسی ذہن اور قلم کی تخلیق ہے، جو "اردوئے معلیٰ"، "سبد چین"، "باغ دو در" اور "تیغِ تیز" میں کارفرما رہا ہے۔

حاصلِ بحث یہ کہ "لطائفِ غیبی" غالب ہی کی تصنیف ہے، اب اختصار کے ساتھ، اُن اسباب اور وجوہ کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے پیشِ نظر غالب نے کتاب کو اپنے نام سے پیش کرنے کے مقابلے میں اسے اپنے ایک شاگرد کے نام پر شائع کرنے کا راستہ اختیار کیا۔

"مرزا غالب نے خود یہ رسالہ لکھا اور نام سیاح کا کر دیا۔ وجہ یہی کہ وہ خود منشی سعادت علی کے مقابلے پر آنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ لہٰذا ایک شاگرد کو آگے کر دیا اور محمد حسین دکنی کے حامی کو ایک دکنی ہی سے جواب دلوایا ...."

[مولانا عبدالمجید سالک، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۱۳۰]

مرزا غالب نے نواب علاء الدین احمد خاں علائی کو ۱۸ مئی ۱۸۶۴ء کے اپنے ایک خط میں، منشی سعادت علی کی کتاب "محرقِ قاطعِ برہان" کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کے آغاز میں عرفی کا یہ مشہور شعر بھی درج ہے:

با من از جہاں معارض شدہ نا منفعلے ‌‌‌‌ ‌‌‌ کہ گوش ہجو کنم ایں بودش مدحِ عظیم

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ "اس سے مذکورہ بالا وجہ کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے کہ (غالب "محرق" کے مصنف کو لائقِ خطاب نہیں سمجھتے تھے) اور یہ شعر خود "لطائف" میں بھی آیا ہے[۱]..."

حبیب اللہ ذکا کے نام غالب کے ایک خط مرقومہ ۲۸، نومبر ۱۸۶۴ء کے اس ٹکڑے کو بھی مذکورہ بالا وجہ کی تصدیق مزید سمجھنا چاہیے "محرق قاطع برہان" کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "میں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا؟ مگر ہاں، سخن فہم دوستوں کو غصہ آگیا۔ ایک صاحب نے فارسی عبارت میں اس کے عیوب ظاہر کیے۔ دو طالب علموں نے اُردو میں دو رسالے جدا جدا لکھے...."

یہ دو رسالے: "سوالاتِ عبدالکریم" اور "لطائفِ غیبی" ہیں، جنہیں دو طالب علموں کے نام سے خود غالب نے لکھا۔ "سوالاتِ عبدالکریم" کے خاتمے کی یہ عبارت بھی غالب کے اسی "کبرِ نفس" پر روشنی ڈالتی ہے:

> "نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالب، امیر نامدار اور مع ہذا حلیم اور بردبار ہیں..... میں نے ایک دن نواب صاحب محتشم الیہ سے پوچھا کہ آپ نے منشی سعادت علی صاحب کی بدزبانی کا جواب کیوں نہ دیا۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر راہ چلتے سڑک پر گدھا تم کو لات مار بیٹھے[۲] تو کیا تم بسبیلِ تلافی سڑک

---

۱ اُردوئے معلّیٰ، دہلی، فروری ۱۹۶۱ء، صفحہ ۵۳

۲ حالی نے "یادگارِ غالب" (۱۸۹۷ء) میں "لات مارنے" والے اس لطیفے کو سہواً مولوی امین الدین کی کتاب "قاطع القاطع" (۱۸۶۶ء) سے التباس کیا ہے۔ اپنی کتاب "تیغ تیز" (۱۸۶۷ء) کی تمہید میں غالب نے اس کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "میاں امین الدین..... نے ایک "قاطع القاطع" چھپوایا...... وہ مغلظ گالیاں دی ہیں جو کنجڑے بھٹیارے استعمال کرتے رہتے ہیں..... اگر میری طرف سے ازالہ حیثیت کی نالش دائر ہو جاتی تو میاں پر کیسی بنتی، مگر میرے کبرِ نفس نے ازالہ حیثیت کے لفظ کو گوارا نہ کیا..... میرا کیا بگڑا، مولوی نے اپنا پاجی پن ظاہر کیا۔ میں نے معلم امین بے دین کو شیطان کے حوالے کیا..." لیکن بعد میں وہ اس خیال پر نہ رہے اور ۲، دسمبر ۱۸۶۷ء کو انہوں نے مولوی امین الدین پر ازالہ حیثیت عرفی کی نالش دائر کر دی لیکن بوجوہ ۲۳، مارچ ۱۸۶۸ء کو خود راضی نامہ داخل کر کے مقدمہ واپس لے لیا۔ اس مقدمہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے: احوالِ غالب۔ مختار الدین احمد، علی گڑھ ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۳۹–۱۷۱

پر ٹھہر جاؤ گے اور گدھے کو لات مارو گے ؟ میں نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ حضرت نے ارشاد کیا کہ پھر میں منشی کی خرافات کا جواب کیا دوں۔ اس امر کے اظہار سے میری عرض یہ ہے کہ حضرتِ غالب تمہارے مقابلے کو ننگ و عار سمجھ کر سکوت کر گئے......"

قاضی عبدالودود نے اس رسالے کو سیاح کے نام سے منسوب کرنے کی، ایک سے زیادہ وجوہ کا تعین کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "لطائفِ غیبی" کو اپنے نام سے نہ شائع کرانے میں کئی مصلحتیں تھیں :

۱۔ اوّل تو یہ کہ "لطائف"....، "محرق" کے رد میں ہے اور اس کے مصنف کو غالب، لائقِ خطاب نہ سمجھتے تھے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ سیاح، دہلی کے لیے اجنبی تھے۔ ان کی طرف سے مصنفِ "محرق" کو گالیاں دینے میں آسانی تھی۔

۳۔ تیسری یہ کہ اس صورت میں، خودستائی کے زیادہ سے زیادہ مواقع مل سکتے تھے...."

[آثارِ غالب، در : علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۳۲]

مولانا غلام رسول مہر نے بھی ان حکمتوں اور مصلحتوں کا احاطہ کیا ہے جن کے باعث 'غالب کو "لطائفِ غیبی" کے ساتھ اپنا انتساب گوارا نہ ہوا۔ لکھتے ہیں کہ "سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "لطائفِ غیبی" پر اپنا نام کیوں نہ دیا ؟ مطالب یا اسلوبِ تحریر کے لحاظ سے یہ معمولی کتاب نہ تھی، لیکن مرزا کو اس کے ساتھ انتساب کس لیے گوارا نہ ہوا ؟ اس سلسلے میں.... قیاس آرائی کے سوا چارہ نہیں۔ چنانچہ اب تک قیاس کی بنا پر مختلف وجوہ پیش کیے گئے ہیں، مثلاً :

۱۔ غالب، "محرق" کے مصنف کو لائقِ خطاب نہیں سمجھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے جو رسالہ رد میں لکھا، اسے اپنے ایک شاگرد کے نام سے شائع کر دیا۔

۲۔ میاں داد خاں سیاح، اہلِ دہلی کے لیے سراسر اجنبی تھے اور ان کی زبان سے منشی سعادت علی کے خلاف جو کچھ کہا جا سکتا تھا، وہ میرزا غالب خود کہنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

۳. یہ بھی کہا گیا ہے کہ کتاب کو کسی اور سے منسوب کرکے، اپنے متعلق ستائش کے لیے زیادہ سے زیادہ، گنجائش نکالی جا سکتی تھی ....۔"

ان قیاسی اور امکانی وجوہ اور ممکنات کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا غلام رسول مہر نے فرمایا ہے کہ "میرے نزدیک، تیسری وجہ تو چنداں قابلِ التفات نہیں۔ کیونکہ کتاب، کوئی بھی لکھتا میرزا غالب کی ستائش میں ویسے کلمات ضرور استعمال کرتا، جیسے "لطائفِ غیبی" میں موجود ہیں۔ البتہ پہلی دو وجہیں خاصی معقول معلوم ہوتی ہیں تاہم میرے نزدیک ان کی حیثیت ثانوی ہے"۔

(اُردوئے معلّٰی، دہلی، غالب نمبر فروری ۱۹۶۱ء، صفحہ ۵۳ و ۵۴)

"لطائفِ غیبی" کو اپنے نام سے شائع نہ کرنے کی ایک نفسیاتی وجہ مرزا غالب کا حد سے بڑھا ہوا "پندار" اور "کبرِ نفس" بھی ہے، جس کی طرف ابھی غالب شناسوں نے توجہ نہیں دی۔ اس کی تفصیل کچھ تمہید چاہتی ہے۔ غالب نے کئی برس کے غور و فکر کے بعد "قاطع برہان" مرتب و شائع کی تھی اور ایک ایسے عالم میں اس کی ترتیب و طباعت پر محنت کی تھی جب وہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے ناخوشگوار احساسات اور اثراتِ مابعد کا شکار تھے لیکن اس حال میں بھی علمی خدمت پر کمربستہ رہنے کا انعام انہیں یہ ملا کہ "قاطع برہان" کی اشاعت کے بعد، علانیہ آواز، تائیدی نہیں، تردیدی تھی۔ خود غالب لکھتے ہیں کہ "قاطع برہان"، کا لکھنا کیا تھا، گویا باسی کڑھی میں اُبال آیا، لکھنا کیا تھا کہ سہام ملامت کا ہدف ہوا[۱]....۔"

اور "معتقدانِ "برہانِ قاطع" برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے[۲]....۔"

اس تردیدی آواز کو غالب نے اپنے خلاف، ایک جنگ کا آغاز سمجھا۔ انھوں نے جھنجھلاہٹ اور کبرِ نفس، میں "برہان" کی "طرفداری" کو ایک طرف حمق و جہل قرار دیا اور دوسری طرف اس "طرفداری" میں انھیں اپنی علمی فضیلت کی توہین اور شخصی عظمت کی تحقیر نظر آئی۔ منشی سید سعادت علی کی "محرق قاطع برہان" پہلی تردیدی کتاب تھی۔ اس کے بارے میں "تیغِ تیز" (۱۸۶۷ء) کی تمہید میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[۱] بنام، مفتی سید محمد عباس، ۹ اگست ۱۸۶۲ء

[۲] بنام: نواب انور الدولہ شفق، ۱۱ اگست ۱۸۶۲ء

"اسد اللہ خاں غالب کہتا ہے کہ میں نے خاص نظر بہ اعلانِ حق "برہانِ قاطع" کی سستی اور بیان کی غلطی اور اطناب مل کی نکوہش میں ایک رسالہ لکھا اور اس کا نام "قاطع برہان" اور "درفش کاویانی" رکھا۔ جب بعد انطباع وہ رسالہ مشتہر ہوا تو پہلے پہل اس مثل ہندی کے مطابق "بیل نہ کودا، کودی گون"۔ ایک مرد بے مغز معوج الذہن، نہ فارسی دان، نہ عربی خواں، نے میری نگارش کی تردید میں ایک کتاب بنائی اور چھپوائی "محرق قاطع" اس کا نام رکھا اور اس کو مشتہر کیا...."

کتاب کے مشتہر ہونے پر غلام غوث بے خبر کو اطلاع دیتے ہوئے اگست ۱۸۶۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"ایک شخص مجہول الحال تے اہلِ دہلی میں سے، میرے کلام کی تردید میں کتاب تصنیف کی ہے، مسمّیٰ بہ "محرق قاطع برہان"۔"

حبیب اللہ ذکا، کے نام ایک خط مرقومہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۴ء میں "محرق قاطع برہان" کے مؤلف منشی سید سعادت علی صاحب کے بارے میں فرماتے ہیں کہ :

"دانا اور منصف ہو۔ "محرق" کو دیکھ کر جانو گے کہ مولف اس کا احمق ہے اور (یہ) احمق...... معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے۔"

مہیوا، سیتا پور کے مولوی نعمان احمد کے نام ۱۹، اکتوبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں صاحب کتاب، غایت کتاب اور بجائے خود کتاب کے بارے میں لکھا :

"ایک شخص عامی فضول نے اپنی شہرت کے واسطے "قاطع برہان" کے مطالب کے رد میں ایک کتاب لکھی "محرق قاطع برہان" اس کا نام رکھا۔ عبارت مہمل، مقاصد پوچ ....."

"نامہ غالب" (۱۸۶۵ء) میں لکھتے ہیں کہ :

"منشی سعادت علی نہ ناظم ہے، نہ نثار ہے۔ بموجب اس مصرع کے "مقتضائے طبیعتش ایں است، ناچار ہے۔"

اور "لطائفِ غیبی" میں تو منشی سید سعادت علی کو وہ سناؤنیاں سنائی ہیں کہ الامان والحفیظ! لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں منشی صاحب نے "محرقِ قاطع برہان" میں علمی سطح پر، غالب کی بعض ایسی لغزشوں اور فرو گزاشتوں پر گرفت کی تھی، جن کا کوئی جواب خود غالب سے بن نہیں آیا۔

غالب، ہمیشہ ایک خاص نوع کی خود توقیری یا انانیتِ بے جا کا شکار رہے۔ اس احتیاطِ عظمت کے وہم اور "کبرِ نفس" کے مرض میں مبتلا ہونے کے باعث، بالراست، اپنی علمی فروگزاشتوں کو تسلیم کر لینا، اور وہ بھی ایک "مجہول الحال منشی، عامی فضول" کی نشاندہی پر، ان کے لیے ناقابلِ برداشت اور اس لیے ان کے بس سے یکسر باہر تھا...... اس کی راہ، انہوں نے یہ نکالی کہ اپنے ایک دور دراز کے شاگرد رشید میاں داد خاں سیاح کو "سیف الحق" کا خطاب دے کر، سامنے کر دیا اور اس چلمن سے خود کلام کیا:

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت، بگو میگویم

اور اس طرح، در زبان و حدیثِ دیگراں، حُسنِ بیاں کے پردے میں اپنی غلطیوں کے اقبال کی پناہ گاہ تراشی اور ڈھونڈی۔ ملاحظہ کیجیے، لطیفہ، ۵ کے ضمن میں اعترافِ سہو بھی ہے، تو کس سطح پر اور کس ادا و انداز کے ساتھ:

> خاں صاحب لکھتے ہیں "حاشا کہ آویزہ و گوشوارہ یکی تواند بود" اس ادعا کو کون غلط کہہ سکتا ہے۔ واقعی "آویزہ" و "گوشوارہ" ایک چیز نہیں، یہاں تک تو ٹھیک، مگر آگے نجم الدولہ بہادر (نے جو لکھا) .... قصد اچھا، بیان قصد کے خلاف ہے۔ چاہیے تھا کہ "آویزہ" کی تخصیص مٹاتے اور اس کی تعمیم میں کلام کرتے، نہ کہ، "گوشوارہ" کے معنی اصل چھوڑ کر، گوشوارہ اصطلاحی کا ذکر کیا اور "آویزہ" کے معرف، اس نہج پر ہوئے کہ دیکھنے والا گمان کرے کہ شاید، "آویزہ" زیورِ گوش ہے بالتخصیص۔
>
> خدا کی قدرت ایسا صاحبِ کمال، عدیم المثال، ایک سہل تقریر میں دو

مغالطے کھائے۔ ہاں، انسان جایز الخطا ہے۔ خصوصاً ستر برس کا آدمی۔ فقیر، سیاح تو یہ کہتا ہے کہ حضرت غالب کے حسن تحریر پر ان کے ہم نشینوں میں سے کسی کی نظر لگی چلو اچھا ہوا کہ ایسے ہمہ دان عدیم النظیر سے بسبب سہو وغفلت کے ہزار بات میں دو باتیں ایسی بھی ہوئیں کہ جس سے منشی جی کا دل خوش ہوا اور یقین ہے کہ میاں محمد حسین دکنی کی بھی روح خوش ہوئی ہوگی۔

دوسرا مغالطہ جو اس محقق اکمل کو واقع ہوا ہے وہ یہ ہے "اسف" کی مشتقات کو "افسوس" کی مشتقات میں سے لکھا ہے۔ یہ سہوِ طبیعت ہے، قصورِ فہم نہیں ہے۔ اکابر امت کو مسائلِ فقہ اور مناظرۂ فنِ کلام میں ایسے سہو واقع ہوئے ہیں۔ علامہ تفتازانی کو سید جرجانی سے مقولۂ علم میں تا دیر سکوت رہا ہے اور صاحبِ متنِ کیدانی کو ایسا ناہموار مغالطہ پیش آیا ہے کہ اس نے اشارہ سبابہ فی التحیات کو باآنکہ مسنون ہے محرمات صلوۃ میں لکھا ہے۔ نہ اس سکوت سے علامہ تفتازانی کی تحمیق لازم آتی ہے، نہ اس بیان سے صاحبِ متنِ کیدانی کی تکفیر ہو سکتی ہے۔ شعرا کے اشعار میں اور بلغا کے عبارات میں بشرطِ تفحص و غور بہت ایسے سہو و خلا پائے جائیں گے۔"

اس کے بعد سعدی اور جامی کے دو شعر پیش کیے ہیں کہ "ان دونوں شعروں میں ہای اصلی و ہای مختفی کا قافیہ" اور حافظ کا ایک شعر درج کیا ہے کہ "اس شعر میں روی متحرک قافیہ نصیبِ اعدا"۔ اکابر کے سہو و خلل کی یہ نظیریں درج کرنے کے بعد یہ استعذار پیش کیا گیا ہے کہ:

"یہ جو مولانا غالب کو دو سہو واقع ہوئے ہیں، اسی قبیل سے ہیں اور یہ ماہرینِ فن کے نزدیک سہوِ طبیعت ہے..... یہ بات جوازِ الزام و اعتراض کی حجت نہیں ہو سکتی۔ معہذا غالب کا بیان ہے کہ جامع "برہانِ قاطع" نے "افسوس" بروزنِ "مینوش" اور "فسوس" بروزنِ "عروس" کو لغتِ واحد سمجھا ہے اور یہ خطا ہے۔ "افسوس" بمعنی دریغ و حسرت جداگانہ لغت اور "فسوس" بمعنی استہزا جداگانہ لغت ہے اور یہ جو نواب صاحب "افسوس" کو لغتِ عربی لکھ گئے ہیں،

سہوِ طبیعت ہے۔ عربی، نہ سہی فارسی سہی، لیکن دکنی کا بدستور حمق ثابت رہا کہ اس نے "افسوس" و "فسوس" کا تفرقہ ملحوظ نہ رکھا.....۔"

ظاہر ہے اگر اپنے نام سے وہ یہ کتاب لکھتے تو اپنی صریح غلطی کو مغالطے اور سہو کا رنگ دینے اور اکابر کے سہو کے نظائر پیش کر کے، اپنے "سہو" کا تاثر ہلکا کرنے کی کیا گنجائش ہو سکتی تھی؟ غرض یہ تاویلات، یہ زورِ بیان اور بحیثیتِ مجموعی یہ مدافعت اور اندازِ وکالت اسی امر کا متقاضی تھا اور اسی صورت میں ممکن تھا کہ کتاب ان کے نام سے نہ چھپے، اور انھوں نے یہی کیا۔

منشی سید سعادت علی نے "محرقِ قاطع برہان" میں "افسوس" والی جس صریح غلطی[1] کی نشاندہی کی ہے، نواب علاء الدین احمد خاں علائی نے اس کی تائید میں غالب کو متوجہ کیا تھا، ۳۰ مئی ۱۸۶۴ء کے ایک خط میں غالب جواباً علائی کو صرف یہ لکھ پائے کر:

"افسوس" کو میں نے عربی جانا، عربی نہیں، اب مانا۔ یہ ایک سہوِ طبیعت تھا۔ میرا اعتراض تو خلطِ مبحث پر ہے۔ "افسوس" و "فسوس" ایک کیوں ہو جائے؟....."

لیکن اس سادہ و سیدھے انداز میں برملا اعتراف، اُن کی "اُفتادِ مزاج" اُن کے "تبحرِ علمی" اور "کبرِ نفس" کے منافی، اس لیے اُن کے بس اور حوصلے سے باہر تھا، نتیجتاً انھیں ایک آڑ اور مدافعت کی ضرورت تھی جس کے سہارے اور پسِ پردہ وہ اقبالِ خطا کریں لیکن لفاظی و لسانی کے ساتھ۔ چنانچہ "اپنے نطق کی تلوار" سیاح کے ہاتھ اور نام سے چلائی۔

"نامۂ غالب" (۱۸۶۵ء) بنام میرزا رحیم بیگ میں لکھتے ہیں:

"آویزہ" و "افسوس" کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا ہے کہ مجھے اس کا اقرار اور میرا دوست میاں داد خاں شرمسار ہے۔ جو کچھ اس مصنف نے اس باب میں لکھا، وہ قولِ فیصل اور کافی ہے۔ مانیں یا نہ مانیں، ناظرین کو اختیار ہے..... مجھے اور میرے دوست سیف الحق کو دو سہو طبعی پر استعذار ہوا

---

[1] "یادگارِ غالب" (۱۸۹۷ء) میں حالی کو بُرہان کے مباحثے کے سلسلے میں غالب کی پُرزور مدافعت کے باوجود اعتراف کرنا پڑا ہے کہ میرزا غالب نے: "لفظ افسوس، کے متعلق ایک بڑی فاحش غلطی کی ہے کہ اس کو لفظ عربی الاصل ماخوذ از "اسف" قرار دیا ہے.....۔"

خواہانِ بوہرہ دکنی کو اغلاطِ متواتر کے جواز پر اصرار .....؟

یعنی ایک تو اپنی صریح غلطی کو سہو کہنے پر اصرار ہے، سہو سہی، اس کا خود صرف "اقرار" ہے اس پر "شرمسار ہے میرا دوست میاں داد خاں!" اللہ اللہ! کیا "کبرِ نفس" ہے!!

"نامہ غالب" میں میرزا رحیم بیگ کو لکھتے ہیں:

"ستر برس کی عمر، کانوں سے بہرا، جمعیت کم، تفرقہ زیاد اور پھر خودداری اور کبرِ نفسی اور استغنا خداداد۔ بے ہودہ بکنے میں اوقات کیوں صرف کروں؟ پاسخ نگاری کیوں لفظ بہ لفظ و حرف بہ حرف کروں؟ آپ کو اپنی نمود اور شہرت منظور ہے۔ خوردہ گیری و عیب جوئی سے مجھ کو نفرت ہے اور حیا آتی ہے زیادہ گوئی سے....."

اور "تیغ تیز" کی تمہید میں میرزا رحیم بیگ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

"فقیر نے صرف ایک خط مرزا جی کو لکھ بھیجا۔ زیادہ اس طرف التفات کو تضیعِ اوقات جانا۔"

غرض یہ کہ کتاب کو اپنے نام کے بجائے کسی دوسرے نام سے شائع کرنے کی ایک وجہ میرے نزدیک غالب کا یہ حد سے بڑھا ہوا "پندار" بھی ہے جسے گو انہوں نے "کبرِ نفس" کا نام دیا ہے لیکن سوچیے تو یہ صورت "احساسِ کمتری" سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے تعلیٰ اور دوسروں کی تحقیر، تحمیق اور تذلیل، اسی احساس کا نتیجہ ہیں۔ اپنی علو نسبی اور علمی دستگاہ کے بجز ان کے پاس کوئی سامانِ تفاخر نہ تھا۔ "قاطع برہان" کے علمی مباحث میں ان سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں، یہ کس سے نہیں ہوتیں، ان کا کشادہ دلی سے اعتراف، اصل بڑائی ہے، لیکن غالب اپنے "کبرِ نفس" میں اس کا حوصلہ نہیں کر سکتے تھے، اپنی زبان سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کسی "عامی" کے مقابلے میں کر اُن کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے انہوں نے بالواسطہ طریقہ اختیار کیا اور بہ زبانِ دیگراں، حسنِ بیان کے پردے میں اپنی غلطیوں کے اعتراف و اقبال کی پناہ گاہ تراشی۔

مولانا عبدالمجید سالک بجا لکھتے ہیں کہ "مرزا غالب کے رقعات سے جا بجا اس امر

کا سراغ ملتا ہے کہ وہ اپنی خاندانی ریاست و وجاہت کے اعلان میں بہت اہتمام کرتے تھے اور جو لوگ رئیسوں کے زمرے سے کسی قدر کم درجہ رکھتے تھے، وہ مرزا کی نگاہوں میں بہت کم جچتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کر اس وقت معاشرے کی کیفیت یہی تھی۔ دوسرے مرزا کے پاس کوئی دنیاوی سامانِ تفاخر موجود نہ تھا، اِلّا اپنی ذاتی قابلیت اور خاندانی بزرگی۔ ناداری، عمر بھران کے شریکِ حال رہی۔ جذباتی آدمی پر اس حالت کا نفسیاتی اثر یہی ہونا چاہیے تھا کہ وہ اپنی عزّت و حرمت کی حفاظت میں "احساسِ کمتری" کا ثبوت دیتے چنانچہ، اُن کی زندگی کے متعدد واقعات میں اس کا پتہ چلتا ہے۔"

[علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۱۲۴]

"لطائفِ غیبی" کی تمہیدی سطور میں "تقابل" کی صورت ملاحظہ ہو:

"قاطع برہان" کا مولف ایک شخص ہے معزز اور مکرم والا رتبہ، عالیشان عالی خاندان، انگریزی رئیس زادوں میں محسوب، بادشاہِ دہلی کے حضور سے مخاطب بہ نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ یعنی غالب تخلص، اسداللہ خان بہادر......"

اور:

"محرق قاطع برہان" کا جامع کوئی شخص ہے رعایائے دہلی میں سے کہ کبھی کسی زمانے میں کسی محکمۂ انگریزی کا سررشتہ دار ہو گیا تھا اور اب خانہ نشین ہے، مرسوم بہ منشی سعادت علی۔"

معاشرتی حیثیت و مراتب کے تقابل کے بعد علمیت اور شہرت کی کیفیت یہ کہ:

"منشی سعادت علی، نہ نثر سے واقف، نہ نظم سے آگاہ، نہ عقل کا سرمایہ، نہ علم کی دستگاہ، کسی بستی میں، کسی گاؤں میں، کسی گھاٹ پر، کسی باٹ پر، اس بزرگ کا کام کسی نے نہیں سنا۔" اور:

"اللہ اللہ! غالب نام آور نامدار، کوئی شہر ایسا نہ دیکھا، جس میں ان کے دو چار شاگرد، دس بیس معتقد نہ دیکھے ہوں۔ ایک عالم ان کی فارسی دانی اور شیوہ بیانی کا معترف نظم و نثر میں ظہوری و نظیری و عرفی کے برابر،

نثر میں نثارانِ سابق و حال سے بہتر ....."

آگے چل کر "قاطع برہان" اور "محرق قاطع برہان" کی عبارتوں کے براہِ راست تقابل میں فرماتے ہیں:

"اہلِ نظر قاطع و محرق کو جب باہم دیکھیں گے تو قاطع کی عبارتیں موتی کی لڑیاں نظر آئیں گی اور محرق کی نثریں ماش کی بڑیاں نظر آئیں گی....."

اسی طرح "لطائف" میں ایک اور موقع پر تقابل کی صورت پیدا کرلی ہے:

"ہے ہے، جس کو شورامہ و شورابہ میں تمیز نہ ہو، وہ متصدی فنِ تحریر ہو اور تحریر بھی مقابلے اس کے، کہ جو آج انشاد اور انشا کے مجموع فنون میں ایک آیت ہے آیاتِ الٰہی میں سے، یعنی نواب معلی القاب نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ سلمہ اللہ العلی العظیم....." [در لطیفہ ۱۴]

ایک لطیفے کا تو آغاز ہی اس شعر سے ہوتا ہے:

اے منشی خیرہ سر، سخن ساز نہ ہو
عصفور ہے تو، مقابل باز نہ ہو

مولانا غلام رسول مہر نے "لطائفِ غیبی" میں اس "تقابل کے بارے میں بالکل درست فرمایا ہے کہ میرزا غالب نے:

"اپنی خاندانی بڑائی اور ناموری نیز منشی سعادت علی کی گمنامی کا ذکر جس انداز میں کیا ہے، وہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ علم و فضل، ناموری یا رفعت، خاندان سے مخصوص نہیں۔ جن بزرگوں نے "من قال" کے بجائے "ما قال" پر زور دیا ہے وہ اس بارے میں حقیقت سے بدرجہا بہتر واقف تھے، لیکن میرزا کے زمانے میں ان چیزوں کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ نیز مرزا نیرنگِ روزگار کے بیسیوں عبرت افزا تماشے دیکھ چکنے کے باوجود خاندانی برتری کے اس طلسم سے نجات نہ پا سکے جو دراصل دورِ جاگیرداری کا گراں ترین سرمایہ تھا، اور میرزا کو یہ سرمایہ وراثت میں ملا تھا، اگرچہ جاگیر نہیں ملی تھی...."

[اردوئے معلیٰ، دہلی، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۱ء، ص ۵۸]

مولانا غلام رسول مہر کے بقول :

"کتاب، دوسرے کے نام سے شائع کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس میں نہ تو مباحث کا انداز علمی تھا، نہ "محرق" کے ایک ایک اعتراض کا جواب دیا گیا تھا۔ اور نہ کتاب کا اسلوبِ تحریر علمی تھا..... (اس) میں سرسری طور پر "محرق" کے خلاف چند اعتراضات کیے گئے تھے۔ چوں کہ انھیں لطائف کی حیثیت دے دی گئی تھی، اس وجہ سے اسلوبِ تحریر میں مستقل علمی ثقاہت قائم نہ رہی اور میرزا غالب، خاص طور پر اس مرحلے پر ایسی تحریر، اپنے سے منسوب کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے....."

..... کوئی علمی تحریر، مرتب نہ کر پانے کی وجہ یہ..... ہے کہ میرزا غالب ۱۸۶۲ء میں اورام و بثور کا شکار ہو گئے تھے اور اس بیماری نے تین سال تک انھیں سخت پریشان و بدحال رکھا۔ اسی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے نواب کلب علی خاں (والیِ رامپور کو) لکھا تھا:[1]

جنابِ قبلۂ حاجات! اس بلاکش نے

بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس

یہ زمانہ ایسا تھا کہ نہ تو وہ اطمینان سے بیٹھ سکتے تھے اور نہ کچھ لکھ سکتے تھے۔ اس دور کے مکاتیب میں متواتر، اس شدید مرض کی شکایتیں کی جاتی رہیں۔ ان کی تحریر میں جہاں تلخی کی شدت محسوس ہوتی ہے، وہ دراصل، ان رنج افزا عوارض ہی کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ، ان کے عقیدت مندوں کی کمی نہ تھی، بلکہ خاصی کثرت تھی، تاہم فکر و نظر کے اعتبار سے یقیناً وہ یگانہ و تنہا تھے..... کوئی فرد ایسا نہ تھا جو ان کا نقطۂ نگاہ، ٹھیک ٹھیک سمجھ سکتا، پھر انھیں کے انداز میں، اسے واضح کر سکتا۔ اس لیے انھیں ہر جسمانی زحمت کے باوجود سب کچھ خود کرنا پڑا، اور جو بھی وہ لکھ گئے ہیں، اپنے دائرۂ بحث و نظر میں اس کی امتیازی حیثیت سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا....."

(اُردوئے معلیٰ، دہلی، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۱ء، صفحہ ۵۴-۵۶)

---

[1] مرقومہ ۱۱، اگست ۱۸۶۵ء، مشمولہ: مکاتیبِ غالب، عرشی، طبع دوم، ۱۹۴۳ء، صفحہ ۳۰ و بہ بعد

"لطائفِ غیبی" غالب کی زندگی میں صرف ایک بار شائع ہوئی اور پھر پہلی طباعت (۱۸۶۴ء) کے ایک سو سال بعد تک، اس کی اشاعتِ ثانی کی نوبت نہیں آئی۔

★ در: قاطع برہان و رسائلِ متعلقہ، صفحہ ۱۹۱-۲۴۲، قاضی عبدالودود، پٹنہ، ۱۹۶۷ء

★ در: مجموعۂ نثرِ غالب اُردو، صفحہ ۵۹-۱۲۳، خلیل الرحمٰن داؤدی، لاہور، ۱۹۶۷ء

★ در: افاداتِ غالب، صفحہ ۱-۱۱۴، سیّد وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۹ء

سوالاتِ عبدالکریم:

○ طبع اوّل: اکمل المطابع، دہلی، ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء

ضخامت: ۸ صفحات　　　　سائز: ۱۸×۲۲/۸

غالب کی "قاطع برہان" (۱۸۶۲ء) کا شائع ہونا تھا کہ غالب کے بقول معتقدان "برہان قاطع" برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے[۱]۔ پہلی جوابی کتاب منشی سیّد سعادت علی کی "محرق قاطع برہان" (۱۸۶۳ء) تھی۔ غالب کے بقول "اس کے رد میں مجمع البحرین علم فارسی و عربی، مولوی نجف علی نے منصفانہ ایک رسالہ لکھا موسوم بہ "دافع ہذیان" فارسی قدیم کے طرز پر[۲]" اور خود غالب نے دو رسالے تصنیف کیے، ایک "لطائفِ غیبی" جسے سیاح کے نام سے شائع کرایا، اور دوسرا "سوالاتِ عبدالکریم" جسے "عبدالکریم" نامی ایک مفروضہ طالب علم

---

[۱] بنام: انوار الدولہ شفق، ۱۱، اگست ۱۸۶۲ء

[۲] بنام: مولوی نعمان احمد، ۱۹، اکتوبر ۱۸۶۶ء۔ لیکن اس سے پہلے غلام غوث بے خبر کے نام ایک خط میں غالب یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ "ایک مولوی نجف علی صاحب ہیں، باوجود فضیلت علم عربی، فارسی دانی میں ان کا نظیر نہیں.... انھوں نے "محرق قاطع برہان" کی توہین اور مسوّد کی تفضیح میں دو جزو کا ایک نسخہ مختصر (دافع ہذیان) لکھا ہے۔" (اگست ۱۸۶۴ء) .... ظاہر ہے اگر یہ رسالہ "محرق" کی "توہین" اور صاحب محرق کی "تفضیح" کی نیت سے لکھا گیا تھا تو پھر اسے "منصفانہ" کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟

کی طرف سے شائع کیا گیا، اس کے آخر میں، بفتوائے علمائے شہر ایک "محضر" بھی شامل ہے۔
خواجہ غلام غوث بے خبر کے بارے میں کہیں غالب نے یہ سن لیا تھا کہ وہ "قاطع برہان" (غالب) کی تردید میں کوئی رسالہ لکھ رہے ہیں، انہیں منجملہ اور اطلاعات کے لکھتے ہیں کہ:

"ایک طالب علم مسمّی بہ عبدالکریم نے سعادت علی مولف "محرق قاطع" سے سوالات کیے ہیں اور ایک محضر اس نے بفتوائے علمائے شہر مرتب کیا ہے۔ ایک میرے دوست نے بصرفِ زر اس کو چھپوایا ہے۔۔۔۔"

"سوالاتِ عبدالکریم" صرف آٹھ صفحات کا رسالہ ہے اور اس پر مطبع کا اندراج نہیں لیکن قیاس غالب ہے کہ اس کی اشاعت اکمل المطابع، دہلی ہی سے عمل میں آئی ہوگی جس کے کارپردازوں سے غالب کے گہرے دوستانہ مراسم تھے اور جو اس بحث کے سلسلے کی چیزوں کی اشاعت میں سرگرم عمل رہے۔ مالک رام نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ رسالہ مطبع اکمل المطابع، دہلی ہی میں شائع ہوا۔[۱] خلیل الرحمٰن داؤدی نے مالک رام کے حوالے سے[۲] اور فاضل لکھنوی نے آزادانہ اسی رائے[۳] کا اظہار کیا ہے۔ مالک رام نے اپنی کتاب "ذکرِ غالب" کی اشاعت ۱۹۶۴ء میں بھی یہی کہا ہے کہ:

"یہ آٹھ صفحے کا مختصر سا رسالہ بھی غالباً اکمل المطابع دہلی سے ۱۲۸۱ھ میں چھپا تھا۔"
[ذکرِ غالب، دہلی، ۱۹۶۴ء، حاشیہ، صفحہ ۱۲۹]

مولانا غلام رسول مہر بہت پہلے اپنی تالیف لطیف "غالب" میں یہ بتا چکے ہیں کہ "لطائفِ غیبی" اور "سوالاتِ عبدالکریم" "یہ دونوں رسالے اکمل المطابع میں چھپے تھے۔"
[غالب، طبع چہارم، لاہور، ۱۹۴۶ء، صفحہ ۴۳۳]

مولانا غلام رسول مہر نے "دافع ہذیان" (نجف علی) اور "لطائفِ غیبی" کی طرح "سوالاتِ عبدالکریم" کو بھی ۱۸۶۴ء کی تصنیف بتایا ہے[۴]۔ غالب کے بعض ایسے خطوں

۱۔ آج کل، دہلی، فروری ۱۹۵۳ء

۲۔ مجموعہ نثرِ غالب اُردو، لاہور، ۱۹۶۷ء، صفحہ ۱۲۸

۳۔ اُردوئے معلیٰ، لاہور، صدی ایڈیشن، صفحہ ۱۱۳۴

۴۔ خطوطِ غالب، لاہور، ۱۹۶۹ء، جلد ۲، صفحہ ۷۴۷

میں بھی جن کا زمانۂ کتابت ۱۸۶۴ء ہے "سوالاتِ عبدالکریم" کا ذکر آیا ہے۔ ایک خط موسومہ حبیب اللہ ذکا، میں غالب لکھتے ہیں :

"دانا اور منصف ہو۔ "محرق" کو دیکھ کر جانو گے کہ مولف اس کا احمق ہے اور جب وہ احمق، "دافع ہذیان" و "سوالاتِ عبدالکریم" اور "لطائفِ غیبی" کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا اور "محرق" کو دھو نہ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے۔ "دافع ہذیان"، "سوالات"، "لطائفِ غیبی" تینوں نسخے ایک پارسل میں اس خط کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں ....."

یہ خط ۲۸ نومبر ۱۸۶۴ء کا ہے۔ گویا "محرق قاطع برہان" کی طرح، "دافع ہذیان" اور "لطائفِ غیبی" کے بشمول رسالہ "سوالات عبدالکریم" بھی ۱۸۶۴ء میں چھپ گیا تھا۔ یہاں ضمناً مذکورہ بالا تینوں رسالوں کے بارے میں غالب کا ایک جُملہ ملاحظہ ہو :

"حضرت! تین دوستوں نے مولف "محرق" پر، جس کا نام "صاحب تپ محرق" رکھا گیا ہے، جوتی پیزار کی ہے....." [بنام مولوی عبدالرزاق شاکر]

قاضی عبدالودود نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ان رسائل کے "لہجے کی نسبت اس سے کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں[۱]"۔

"سوالاتِ عبدالکریم" میں "محرق قاطع برہان" کے ابتدائی پچاس صفحات پر سولہ سوال قائم کیے گئے ہیں۔ یہ سوالات منشی سید سعادت علی صاحب کی فارسی عبارات و تراکیب سے متعلق ہیں۔ "سوالات" پیش کرنے سے پہلے ایک پنج سطری تمہید ہے جو، ان کلمات پر تمام ہوتی ہے :

"ہر سوال کا جواب جداگانہ بہ عبارتِ سلیس، عام فہم لکھیے گا اور یہ سوالات "محرق" مطبوعہ کے پچاس صفحہ سے متعلق ہیں۔ اس نسخۂ بے نظیر کے چھیالیس صفحے اور باقی ہیں، جب ان سوالوں کے جواب پا چکوں گا تو سوالات باقی پیش کروں گا ....."

مہیش پرشاد نے لکھا ہے کہ "جہاں تک مجھے علم ہے صاحبِ سوالات کو جواب نہیں ملے اور نہ باقی سوالات کی نوبت آئی[1]" اور یہ صحیح ہے۔ "محرقِ قاطع" کے آخری ۴۶ صفحات "مشقِ ناز" سے محفوظ رہے اور ان پر سوالات قائم کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ قائم کردہ سوالات منشی سید سعادت علی کی فارسی عبارات و تراکیب سے متعلق ہیں۔

"سوالاتِ عبدالکریم" کی ابتدائی تین سطور یہ ہیں:

"اضعف بندگان رب کریم عاصی عبدالکریم، منشی سعادت علی صاحب کی خدمتِ بابرکت میں عرض کرتا ہے کہ میں "محرقِ قاطع برہان" کو دیکھ کر آپ کی فارسی دانی بلکہ ہمہ دانی کا معتقد ہوا۔ مگر اپنے فہم کے قصور سے بعض ترکیبوں کو نہیں سمجھا۔"

لیکن "سوالات" کا انداز اور لہجہ تا آخر یہی رہتا تو بھی غنیمت ہوتا، یہ آغاز ہے اور اس کے بین السطور استہزا کو محسوس کیا جا سکتا ہے اب "سوالات" کے خاتمے کی عبارت ملاحظہ ہو، اس میں منشی سید سعادت علی سے اس طرح خطاب کیا گیا ہے:

"آپ کا دستور یہ ہے کہ جب فقدانِ مادہ علمی کی جہت سے حریف کو جواب نہیں دے سکتے، تو غصے میں اندھے بن کر گالیاں دینے لگتے ہو۔ نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالب، امیر نامدار اور مع ہذا حلیم اور بردبار ہیں، تمہاری ناسزا باتیں سُن کر چپ ہو رہے..... تمہارے مقابلے کو ننگ و عار سمجھ کر سکوت کر گئے۔ میں دلّی کا روڑا ہوں، آپ ہتھ زور تو میں کوڑا ہوں۔ اگر آپ پھکڑ لڑنے کا قصد کیجئے گا تو میں خم ٹھوک کر موجود ہو جاؤں گا، ایک کہو گے دو سناؤں گا۔ زنہار میرے سوالوں کا جواب جیسا طریقہ شرفا کا ہے دیجئے گا اور بدزبانی ژاژخائی نہ کیجیے گا....."

دیکھیے کہ، کس آغاز کا کیا انجام ہے! "سوالات" میں کم و بیش ہر جگہ گل افشانیٔ گفتار کا یہی عالم ہے، یعنی کہیں علی الاعلان اور کہیں بین السطور، اندازِ نگارش اور لہجہ استہزائی ہے۔

---

[1] علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۱۳۳

صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان "سوالات" کی بنیاد علمی خیراندیشی پر نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد محض یہ ہے کہ جس طرح بھی بن آئے صاحبِ "محرق" کا خاکہ اڑایا جائے اور جس حد تک ہو سکے انہیں تضحیک کا نشانہ بنایا جائے۔

"سوالاتِ عبدالکریم" کا آخری صفحہ (۸) "بفتوائے علمائے شہر" ایک دو کالمی محضر پر مبنی ہے جس کی صورت یہ ہے:

استفتاء از جانب سایل

سوال پہلا	سوال دوسرا
قواعد مقررہ فارسی کے مطابق صیغہ امر کے بعد مجرد الف افادہ معنی فاعلیت کرتا ہے اور اسم جامد کے آگے الف نون مفید معنی جمع ہے۔ الف نون سے معنی فاعل کے لینے کا قصد کرنا فاش غلطی سے ہے، یا نہیں؟	رواں و دواں و افتاں و خیزاں یعنی صیغہ ہائے امر کے آگے الف نون جو آتا ہے، وہ حالیہ کہلاتا ہے۔ الف نون حالیہ کے وجود کا منکر مسلمات جمہور کا منکر ہے یا نہیں؟
جواب:	جواب:
★ محمد سعادت علی، ملازم گورنمنٹ اسکول، دہلی۔	★ محمد سعادت علی، ملازم گورنمنٹ اسکول، دہلی۔
★ خدا بخش، مدرس نورمل اسکول	★ خدا بخش، مدرس نورمل اسکول
★ محمد نصیرالدین، متعلق نورمل اسکول، دہلی	★ محمد نصیرالدین، متعلق نورمل اسکول، دہلی
★ محمد لطیف حسین، مدرس مدرسہ سرکاری	★ محمد لطیف حسین، مدرس مدرسہ سرکاری
★ محمد فضل اللہ، اور:	★ محمد فضل اللہ، اور:
★ نجف علی	★ نجف علی

فارسی میں الف و نون تین قسم کا ہے، اگر لفظ جامد کے آگے آئے تو یا زائد ہے یا جمع کا اور صیغہ ہائے امر کے بعد حالیہ ہے، عموماً، فقط

داد کا طالب، غالب

ہر دو سوالات کے تحت، سب جواب کالم وار اثبات میں ہیں، لیکن یہاں انہیں حذف کیا جارہا ہے غالب کا جواب ایک سطر میں ہے اور یہ دونوں کالموں پر محیط ہے اسے پیش کر دیا گیا ہے۔

غالب کے ایک طویل خط بنام مولوی ضیاء الدین خاں ضیا دہلوی سے یہ ثابت ہے کہ اس "استفسار" کا اہتمام خود غالب نے کیا تھا اور وہ مولوی ضیاء الدین کو بھی اس بحث میں موید و ہم نوا بنانے کی فکر میں تھے جن کی رائے غالباً مختلف تھی۔ غالب کے خط کا ایک جملہ اس پر مظہر ہے لکھتے ہیں:

"بہر حال یہی لکھ دو کہ بعض لوگ اس الف نون کو فاعل کا الف نون بناتے ہیں اور بعض الف نون حالیہ کہتے ہیں، قصہ مختصر، کاغذ استفسار مع دستخط حضرات یا بے دستخط کل میرے پاس بھیج دیجیے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "تھوڑی سی تقریر، اگرچہ خارج از بحث ہے، لیکن اس واسطے وہ تقریر، تحریر میں لاتا ہوں کہ پھر مجھے کچھ لکھنا نہ پڑے" اس کے بعد اول اپنا موقف بیان کیا ہے کہ "ہم افادہ معنی فاعلیت لینے والوں کے قیاس کو نہیں مانتے، الف نون حالیہ کہنے والوں کی ہم نے مطابقت رائے کی ہے۔" پھر اس موقف پر دلائل دیئے ہیں اور نظائر لائے ہیں، حاصلِ کلام اور:

"خلاصہ یہ ہے کہ الف نون فاعل، نہ فارسی بحث میں تھا، نہ فارسی آمیختہ بہ عربی میں ہے۔ قیاس کو میں مانتا نہیں۔ الف نون، جہاں اسمائے جامد کے آگے ہے، جمع کا ہے اور جہاں صیغہ ہائے امر کے آگے ہے، حالیہ۔ والسلام بالوف الاحترام..... رقعہ بعد پڑھنے کے یا نقل لینے کے، استفسار کے کاغذ کے ساتھ مجھ کو واپس مل جائے....."

لیکن بظاہر مولوی ضیاء الدین خاں، اس امر پر متفق نہ ہوئے اور انہوں نے "کاغذ استفسار بے دستخط" غالب کو واپس بھیج دیا، اس لیے کہ مطبوعہ محضر پر ان کے تائیدی یا تردیدی کلمات اور دستخط ثبت نہیں ہیں۔

"سوالاتِ عبدالکریم" آٹھ صفحے کا مختصر سا رسالہ ہے اور منشی سید سعادت علی کی ۹۶ صفحات کی کتاب "محرق قاطع برہان" کے جواب میں ایک تحریرِ سرسری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اس کے مباحث کی شان عالمانہ نہیں ہے، یہ طالب علمانہ بھی نہیں ہے اور سوالات کا لہجہ بھی ناملائم ہے۔ ظاہر ہے، غالب "برہان" کی بحثا بحثی کے دوران میں اسے اپنے نام سے شائع ہونے کا خطرہ مول نہیں لکھ سکتے تھے، عام حالات میں بھی ان کا "کبرِ نفس" شاید اس "تحریرِ سرسری" کو اپنے نام سے منسوب و مشتہر کرنے کی اجازت نہ دیتا، یہ کوئی ایسی تحریر بھی نہیں تھی کہ اسے وہ اپنے کسی "واقعی" شاگرد کے نام سے ہی شائع کرتے چنانچہ انہوں نے اس نگارش کو "سوالات" کی رعایت سے ایک "طالب علم" کے فرضی نام سے چھپوا دیا..... گو حقیقتاً یہ غالب ہی کی تصنیف ہے۔

"سوالاتِ عبدالکریم" کے مندرجات اور اس کی روشِ تحریر کا غالب کی ایسی نگارشات سے جن کا الحاق و انتساب، غالب سے، اختلافی نہیں ہے، تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ایسی شہادتیں ہاتھ آتی ہیں، جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ "سوالاتِ عبدالکریم" کے پس پشت غالب ہی کا ذہن اور قلم کارفرما رہا ہے..... یہاں ایسی چھ سات سندیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱)

اوّل، "لطائفِ غیبی" سے چار مختصر جملے دیکھیے:

- "ہم نے منشی جی کی فارسی کو چندی ٹھہرایا، عقلاً سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم نے ان کو کیا بنایا؟" (در لطیفہ، ۸)
- "منشی جی کی چندی زبان کی تقریر بہ پیرائیہ تحریر لائق دیکھنے کے ہے۔" (در لطیفہ، ۹)
- "منشی جی کی چندی فارسی کا حظ اٹھائیں۔" (در لطیفہ، ۸)
- "یہ چندی فارسی کا لغت ہے یا سعدی فارسی کا!" (در لطیفہ، ۱۶)

اب "سوالاتِ عبدالکریم" سے اسی طرز اور مضمون کا ایک جملہ ملاحظہ ہو:

"فرہنگ نویسوں نے فارسی کو سات قسم پر منقسم کیا ہے۔ ان اقسام سبعہ میں سے ساتویں فارسی سعدی ہے۔ منشی سعادت علی نے آٹھویں فارسی نکالی ہے، اس کا نام چعدی ہے . . . . ." (در سوال چودھواں)

(۲)

"لطائفِ غیبی" کے دو جملے ملاحظہ ہوں :

"یہ عبارت مجذوب کی بڑ یا پاگل کا غل ہے۔" (در لطیفہ، ۱۳)

"(منشی جی) کا کلام مجذوب کی سی بڑ ہے۔" (در لطیفہ، ۹)

اسی رائے کی بازگشت "سوالات عبدالکریم" میں بھی سنی جا سکتی ہے :

"یہ عبارتِ فارسی ہے یا مجذوب کی بڑ ہے ؟" (در سوال دوسرا)

(۳)

"لطائفِ غیبی" کی عبارت یہ ہے :

"بعینہٖ، یہ وہ بات ہے کہ ایک دابے نے کسی آدمی کو لات ماری اور وہ آدمی غصے میں آ کر اس دابے کے لات مارے۔" (در لطیفہ، ۱۷)

اور اب "سوالاتِ عبدالکریم" کا ایک مقام دیکھیے :

"اگر راہ چلتے سڑک پر گدھا تم کو لات مار بیٹھے، تو کیا تم بھی بہ سبیلِ تلافی، سڑک پر ٹھہر جاؤ گے اور گدھے کو لات مارو گے ؟"

(در خاتمہ سوالات)

(۴)

"لطائفِ غیبی" کی ایک عبارت ملاحظہ ہو :

"ایک دن میرا ایک دوست ظریف الطبع، "محرق قاطع برہان" کو دیکھ رہا تھا اور میں بھی حاضر تھا۔ صفحہ ۴۳ سطر ۱۶ میں لکھا دیکھا کہ "مردم عوام تم گفتن آغازید" ہم دونوں متعجب ہوئے کہ جمع کی خبر کا استعمال مفرد کے ساتھ

کیوں کر درست ہوگا۔ "آغازید" کی جگہ "آغازیدند" چاہیے تھا۔ نون دال کہاں گیا؟ اگر منشی جی کو بھوک لگی تھی، دال کھا جاتے، نون کیا ہوا؟ اس دوست نے کہا "نون" عربی میں مچھلی کو کہتے ہیں، بھلا یہ کیوں کر ہو سکتا تھا کہ منشی جی ایسی غذائے لذیذ چھوڑ دیتے اور ابالی دال پر قناعت کرتے! پھر صفحہ ۵۰ کی ۶ اور ۷ سطر میں یہ فقرہ نظر آیا کہ "لاحول ولا قوۃ، من ایں قدر قلم چرا سود" حیرت ہوئی کہ "سودن" پیسنا اور "فرسودن" گھسنا، اطفالِ دبستان "آمدنامہ" میں یوں ہی پڑھتے ہیں۔ "سودن" صندل اور سرمہ اور غالیہ اور لخلخہ وغیرہ کے واسطے موضوع ہے۔ قلم کے واسطے "فرسودن" ہے، نہ "سودن"۔ خامہ فرسائی لکھتے ہیں، نہ خامہ سائی۔ اس دوست نے کہا کہ منشی جی نے خفا ہو کر قلم کو سرمے کی مانند پیس ڈالا ہوگا۔ میں نے کہا کہ من کی خبر "سود" بھلا، اس کی تو کوئی وجہ اور تاویل کرو۔ "سودم" کی جگہ "سود" کے کیا معنی؟ اس ظریف نے کہا کہ "سودم" میں "دم" کی صورت پائی جاتی ہے اور منشی جی بے دم ہیں۔ "من" جو حرف متکلم کا ہے، یہ دم کے ساتھ آتا تو خدانخواستہ منشی جی دام دار بن جاتے؟ پھر میں نے اس طالب علم ظریف الطبع سے کہا ....." (در لطیفہ ۱۸)

ب اسی وضع و انداز کی ایک عبارت "سوالاتِ عبدالکریم" سے دیکھیے:

"جس مجمع میں یہ صفحہ دیکھا جاتا تھا، ایک شخص ظریف حاضر تھا۔ اس نے سب کو ڈانٹا اور کہا تم لوگ نادان ہو، جناب منشی صاحب نے "می ستایند" کی جگہ "می سرایند" لکھا ہے۔ ہم سب نے کہا کہ یہ امر سند طلب ہے۔ "سرودن" کے دو معنی ہیں: گانا اور کہنا، "تعریف کرنا" کس طرح مسلّم ہو سکتا ہے؟ اس ظریف نے کہا کہ سنو! ہندی میں تعریف کرنے کو "سراہنا" کہتے ہیں۔ منشی جی نے از روئے تفریس "می سرایند" لکھا ہے۔ ہم نے کہا اگر یوں تھا تو "می سراہند" چاہیے تھا، نہ "می سرایند"۔ ظریف نے کہا کہ منشی جی پیرو ہیں دکنی کے جس نے "برہانِ قاطع" میں "ارژنگ" کو "ارتنگ" اور "ارجنگ" اور "ارژنگ" اور "ارنگ"

اور "ارغنگ" لکھا ہے۔ منشی جی نے بھی "می سرایند" کو "می سرایند" لکھ دیا تو کیا غضب کیا؟ منشی صاحب! تمہارے سر کی قسم، اس مجمع میں بہ نسبت آپ کے فارسی عبارت کے، وہ لطائفِ ذوق انگیز درمیان آئے ہیں کہ سب اہلِ محفل، ہنسی کے مارے مرے جاتے تھے۔۔۔۔" (در سوال پندرھواں)

⑤

"لطائفِ غیبی" میں دوسرے لطیفے کے ضمن میں بیان ہوا ہے کہ:

"مرزا ایک اور ہے کہ منشی جی بذاتِ خود سُنّی ہیں اور حقیقی بھائی ان کے شیعی سنی ہیں۔ محرم میں بھس اڑاتے پھرتے ہیں۔ حاضریاں کھاتے پھرتے ہیں۔ اصحابِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو بُرا کہتے ہیں اور منشی جی کے ساتھ، ایک گھر میں رہتے ہیں۔ ان پر منشی جی کو کبھی غصہ نہ آیا۔ خلفائے راشدین کی مذمت سے منع نہ فرمایا۔ اس باب میں کوئی عذر لائیں۔ اس کی وجہ بیان فرمائیں۔ بدیہی تو یہی ہے کہ منشی جی کو دکنی کا پاس اپنے بزرگانِ دین سے زیادہ ہے، ظاہر اس سے باطنی استفادہ ہے۔۔۔۔"

اب "سوالاتِ عبدالکریم" کے آخری یعنی سولھویں سوال کے آغاز کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

"آپ سُنّی ہیں اور اہلِ سنت وجماعت خلفائے راشدین کو اپنا پیر ومرشد اور ان کی تعظیم وتفضیل کو اپنے سر واجب اور سبِ صحابہ کو گناہ، بلکہ کفر جانتے ہیں۔ آپ کے حقیقی بھائی نے مذہب رفض اختیار کیا، محرم میں حاضریاں کھاتے اور تعزیہ خانوں میں بھس اڑاتے پھرتے ہیں، تم ان سے کبھی خفا نہ ہوئے؟ مقامِ حیرت ہے کہ جامع "قاطع برہان" کی مذمت پر تو وہ استیلائے غیظ وغضب ہو اور لعن وطعنِ صحابہ سن کر کان پر جوں نہ پھرے اور تیوری پر بل نہ پڑے۔۔۔۔ باوجود اس تسنن اور تقدس اور تورّع ... کو حاصل ہے، حمیتِ دین کی رگ، جنبش میں کیوں نہ آئی؟ ... خشمگین نہ ہونے

کی وجہ لکھیے.....

(۶)

"لطائفِ غیبی" میں دوسرے لطیفے کے تحت ایک موقع پیدا کرکے غالب کے حالات یعنی فضائل و کمالات، مزاج و اطوار اور معاشرے میں ان کے مقام و مراتب بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ:

"ایسے شخص کی نسبت ناسزا کہنا، منافی شانِ علم و ادب، بلکہ خلافِ آئینِ آدمیت ہے..... مابہ النزاع یہ ہے کہ حضرت غالب نے برہانِ قاطع کی اغلاط پر اعتراضات لکھے ہیں۔ کہیں کہیں از راہِ شوخیِ طبع ظریفانہ، بہ طریق بذلہ رقم سنج ہوئے ہیں۔ منشی جی نے حضرت غالب کی شان میں سفیہانہ وہ کلمات ناسزا لکھے ہیں کہ ایسے کلمات کوئی شریف النفس، بہ نسبت کسی آدمی کے، نہ لکھے گا۔ محمد حسین دکنی کے انتقام لینے کا بہانہ مسموع و مقبول نہیں۔ وہ دکنی، منشی جی کا کون تھا جو ان کو اس کی مذمت سن کر، ایسا غصہ آگیا کہ چہرہ گرمی سے لال ہو گیا۔ بدن سے پسینہ بہنے لگا۔ منہ میں جھاگ آگئے، آنکھیں بند کر لیں گالیاں بکنے لگے....."

"سوالاتِ عبدالکریم" میں بھی یہی مضمون کم و بیش اسی پیرائے میں بیان ہوا ہے۔ ملاحظہ کیجیے سوال پندرہواں:

"محمد حسین دکنی جامع "برہانِ قاطع" پیرِ طریقت نہ تھا، شیخِ وقت نہ تھا، مفتی نہ تھا، مجتہد نہ تھا، عالم نہ تھا۔ رعایائے دکن میں سے ایک شخص، متوسط الحال ہوگا، غایت مافی الباب یہ، کہ پڑھا لکھا ہوگا۔ اس کی بہ نسبت جو حضرت غالب مدظلہ العالی نے کچھ کلمات ظرافت آمیز لکھے، آپ نے اس کے عوض میں حضرت کو وہ کچھ لکھا، کہ اشراف، کسی ادنیٰ آدمی کو بھی ایسی باتیں، نہ کہے گا، نہ لکھے گا، کوئی نہ لکھے گا، بس صاف گالیاں ہیں۔ یہ، آپ کا معتقد، آپ سے بہ کمالِ عجز و انکسار پوچھتا ہے کہ ایک دکنی دنی کے واسطے آپ کو اتنا

غصہ کیوں آگیا کہ آپ نے مناظرے کو جھگڑ بنا دیا اور فحش بکنے لگا اور بھوگ دینے لگے، اس سوال کا جواب شافی لکھیے۔"

"لطائفِ غیبی" میں دوسرے لطیفے ہی کی یہ سطریں بھی پیشِ نظر ہیں :

"خالصاً للہ یہ بتاؤ کہ یہ مناظرہ ہے یا جھگڑا؟ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہیجڑا تالیاں بجا کر گالیاں دیتا ہے، یا ایک سڑی کو کسی نے چھیڑ دیا ہے، وہ فحش بک رہا ہے۔"

غرض مولانا غلام رسول مہر کے بقول "سوالاتِ عبدالکریم" اور "لطائفِ غیبی" کے بعض مطالب میں ایسا اشتراک ہے کہ یہ دونوں چیزیں، صرف ایک فرد کے قلم سے ہو سکتی ہیں۔[۱] اگر "لطائفِ غیبی" کے بارے میں یہ طے ہے کہ وہ غالب کی تصنیف ہے تو پھر "سوالاتِ عبدالکریم" کو بھی منجملہ تصانیفِ غالب، ماننے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیے۔ "نامۂ غالب" (۱۸۶۵ء) بنام مرزا رحیم بیگ میرٹھی میں بھی، جس کا غالب سے انتساب اختلافی نہیں ہے، اسی نوع کا نکتہ ملتا ہے، اور اسی وضع کے الفاظ میں :

"برہانِ قاطع" والے کی محبت سے دل بے قرار ہے، فرطِ غیظ و غضب سے بدن رعشہ دار، دکنی کی عبارت کی خامی، اس کی رائے کی کجی، اس کے قیاس کی غلطی .... سچ جانتے ہو، مگر یہ میں نہیں جانتا کہ اتنی محنت کرنی اور اس کے رفعِ تخطیہ کے واسطے توجیہاتِ باردہ ڈھونڈنی، کس واسطے؟ ایسا، اس کو کیا مانتے ہو؟ .... کہ "برہانِ قاطع" والے کی محبت سے دل بے قرار ہے، فرطِ غیظ و غضب سے بدن رعشہ دار ہے۔"

"پنج آہنگ" کے ایک خط بنام محمد آغا حسین ناخدائے شیرازی میں بھی غالب نے اسی نوع کی باتیں کم و بیش اسی انداز میں بیان کی ہیں :

"دانش مندانِ ہند میں یہ کتاب (قاطع برہان) بے حد نامعقول ہے۔ (میرا دعویٰ غیر مسلم اور میری گفتار ناپسندیدہ قرار دی گئی ہے)۔ اس کتاب کو دیکھ

---

[۱] اردوئے معلیٰ، دہلی، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۱ء، صفحہ ۵۰

کر "دانش مندانِ ہند" میں سے ایک خیرہ سر)، بے ہنر، فارسی سے نا واقف، عربی سے نابلد شخص، غصے سے پاگل ہو گیا اور ایک کتاب لکھ ماری جس میں سارا زورِ قلم، صاحب برہان قاطع کو جو دکن کا ایک معمولی آدمی ہے، ہمہ داں قرار دینے اور غالب کو گالیاں دینے پر صرف ہوا ہے..... اندازِ تحریر ایسا ہے جیسے ہندو ہولی میں ڈھول پیٹ کر ناچ رہے ہوں یا ہیجڑے تالیاں بجا بجا کر ہاتھ اٹھا کر کوس رہے ہوں۔"

(ترجمہ، پنج آہنگ، محمد عمر مہاجر، کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۱۸۴ و بہ بعد)

اس سے، اس امر کی تائیدِ مزید ہوتی ہے کہ "لطائفِ غیبی" کی طرح "سوالاتِ عبدالکریم" بھی غالب ہی کی طبع وقار کا نتیجہ ہے۔

(۷)

مالک رام نے "اپنے مقالے "سوالاتِ عبدالکریم" (مطبوعہ رسالہ آجکل، دہلی، فروری، ۱۹۵۳ء) میں "سوالات" کی نگارش میں "غالب کی شگفتہ اور مزاحیہ طرزِ تحریر" کی نشاندہی کی ہے اور "آپ" کہتے کہتے "تم" کہنے کے انداز کو جو "سوالات" میں ہے، غالب کی خاص روش بتایا ہے اور کہا ہے کہ یہ چیز اس رسالے کی تحریر کے "مرزا کے قلم سے ہونے کا ثبوت ہے....."

(بحوالہ: افاداتِ غالب، سید وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۹ء، دیباچہ، صفحہ ۱۰)

غرض ان قرائن و شواہد کی بنا پر "سوالاتِ عبدالکریم" کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ غالب ہی کی تصنیف ہے۔ ایک زمانے میں مولانا غلام رسول مہر کو اس بارے میں اعتمادِ کلی نہیں تھا:

"سوالاتِ عبدالکریم"..... رسالہ..... غالب ہی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔" (غالب، طبع چہارم، لاہور، ۱۹۴۶ء، صفحہ ۴۴۳)

لیکن اب انہیں "سوالاتِ عبدالکریم" کو غالب کی تصنیف ماننے میں کوئی تکلف یا تذبذب نہیں رہا، لکھتے ہیں کہ:

"سوالاتِ عبدالکریم" اور "لطائفِ غیبی" کے بعض مطالب میں ایسا اشتراک ہے کہ یہ دونوں چیزیں، صرف ایک فرد کے قلم سے ہو سکتی ہیں۔" (صفحہ ۵۰) "قرائن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ "سوالاتِ عبدالکریم" کی طرح "لطائفِ غیبی" بھی خود مرزا غالب نے لکھی تھی ...." (اردوئے معلیٰ، دہلی، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۱ء صفحہ ۵۲)

گویا اس منطق کے مطابق "لطائفِ غیبی" کی طرح "سوالات عبدالکریم" بھی غالب ہی کی تصنیف ہوئی۔ قاضی عبدالودود کی بھی یہی رائے ہے:

"غالب نے دو رسالے دوسروں کے نام سے "محرق" کی تردید و تضحیک میں لکھے، رسالہ عبدالکریم اور لطائف ...."

(آثارِ غالب، در: علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء صفحہ ۴۷)

مولانا عبدالمجید سالک نے بھی "لطائفِ غیبی" سے بحث کرتے ہوئے ضمناً یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ:

"لطائفِ غیبی" کے علاوہ "سوالاتِ عبدالکریم" بھی مرزا نے خود ہی لکھا تھا، کیوں کہ اس کا انداز بھی یہی ہے"

(علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۱۲۹)

"سوالاتِ عبدالکریم" پر مالک رام کے مقالے (آج کل، دہلی فروری ۱۹۵۳ء) کا ذکر اُوپر آچکا۔ "ذکرِ غالب" طبع دوم (۱۹۵۰ء) میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"یہ آٹھ صفحے کا مختصر رسالہ بھی میرزا کی تراوشِ قلم کا ممنونِ احسان ہے جسے انھوں نے عبدالکریم کے نام سے شائع کیا۔" (صفحہ ۱۵۴)

اور اب "ذکرِ غالب" کی اشاعت چہارم میں "سوالاتِ عبدالکریم" کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ:

"میرے خیال میں یہ رسالہ بھی غالب کا لکھا ہوا ہے، یا کم از کم، اس کی تصنیف میں اُن کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔"

(ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی، ۱۹۶۴ء، حاشیہ صفحہ ۲۱۹)

ایران کے دانشور ڈکٹر محمد معین "سوالاتِ عبدالکریم" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"احتمال قوی میرود کہ تالیف خود غالب باشد[1]..."

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ رسالہ سرتاسر غالب ہی کی تراوشِ قلم کا ممنونِ احسان ہے۔

منظورالحسن برکاتی کا ایک مضمون "رسالہ سوالات عبدالکریم کا مصنف"، آج کل، دہلی، غالب نمبر، شمارہ فروری ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا ہے۔ برکاتی صاحب کے نزدیک اس رسالے کو غالب کی تصنیف ٹھہرانا صحیح نہیں — عابد رضا بیدار نے اس مضمون کو "اہم" قرار دیتے ہوئے ایک موقع پر لکھا ہے کہ:

"مضمون نگار نے جو خود ٹونک سے تعلق رکھتے ہیں، تفصیلات فراہم کر کے دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے مصنف عبدالکریم عبدالصمد کی مانند وجودِ خیالی کے بجائے واقعہ تھے، جو ٹونک سے تعلق رکھتے تھے اور جو مضمون نگار کے استاد حبیب اللہ قضائی کے نانا تھے....."

(غالب اسٹڈیز (۶)، دہلی، ۱۹۷۰ء، صفحہ ۱۰۲)

منظورالحسن برکاتی نے اس رسالے کو ٹونک کے مولوی عبدالکریم کی تالیف قرار دیا ہے جو ان کے بیان کے مطابق ۱۳۰۷ھ (۹۰-۱۸۸۹ء) تک حیات تھے اور مولوی نجف علی خاں مولف "دافع ہذیان" کے حلقے کے لوگوں میں سے تھے۔ سید وزیرالحسن صاحب عابدی نے برکاتی صاحب کے دلائل کی یہ شمار بندی کی ہے:

۱۔ ایک یہی کہ مولوی عبدالکریم، مولوی نجف علی مولف "دافع ہذیان" کے حلقے کے آدمی تھے دونوں کے درمیان گہرے روابط تھے۔

۲۔ کتاب "فتوح اسلام" کی تصنیف میں جو شاہنامے کی طرز پر منظوم تاریخ ہے، دوسرے علماء اور شعراء کے ساتھ مولوی نجف علی خاں بھی ہیں۔

۳۔ مولوی عبدالکریم بڑے پائے کے عالم تھے اور انہیں محمد علی خاں نواب ٹونک نے محقق العلماء خطاب دیا تھا۔

---

[1] مقدمہ برہانِ قاطع، جلد اول، تہران ۱۹۶۳ء، صفحہ صد و چہاردہ

۴۔ مولوی عبدالکریم "بڑے شوخ طبع تھے اور ظریفانہ مزاج رکھتے تھے۔"

۵۔ رسالہ "سوالات" کا طرزِ تحریر مولوی عبدالکریم کے طرزِ تحریر سے ملتا ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی ایک تصنیف "فتوح الشام" کا آغاز اس طرح کیا ہے:

"ایں فقیر اضعف بندگان قدیر عبدالکریم غفر اللہ لہ"

پھر اپنی ایک دوسری تصنیف "نجم منیر نظم منار" کو یوں شروع کیا ہے:

"فقیر ضعیف العباد عبدالکریم ابن احمد خاں متوطن ٹونک غفر اللہ لہ"

(افاداتِ غالب، لاہور، ۱۹۶۹ء، دیباچہ، صفحہ ۱۱)

سیّد وزیر الحسن عابدی نے "افاداتِ غالب" کے دیباچے میں برکاتی صاحب کے موقف پر جو محاکمہ کیا ہے وہ فیصلہ کن ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "برکاتی صاحب نے اس رسالے کی تصنیف کے وقت مولوی عبدالکریم کی عمر قیاساً ۲۷ سال بتائی ہے۔ "سوالاتِ عبدالکریم" میں مصنف نے جو یہ کہا ہے:

"میں دلّی کا روڑا ہوں، آپ ہمہ زور ہیں تو میں کوڑا ہوں۔ اگر بھکڑ لڑنے کا قصد کیجئے تو خم ٹھوک کر موجود ہو جاؤں گا۔"

اس کی توجیہہ یہ کی ہے کہ مولوی صاحب نے یہ بات مخالف کو مرعوب کرنے کے لیے لکھی ہوگی۔ برکاتی صاحب نے ٹونک کے مولوی عبدالکریم کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں، اس سے ایک نہایت ثقہ اور ذمہ دار اور ایک مشہور ریاست کے ایک ممتاز جانے پہچانے شخص کی تصویر سامنے آتی ہے جو ریاست کا باشندہ ہی نہیں بلکہ سرکاری عہدہ دار تھا اور اس ریاست کا عہدہ دار، جس کے مسند نشین اسلامی علوم و اخلاق کی ترویج میں خاص انہماک رکھتے تھے اور مولوی صاحب کو اتنی اہمیت دیتے تھے کہ بعد میں انھیں محقق العلماء کا خطاب دیا۔ ایسی صورت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ مولوی صاحب نے ایسی بے بنیاد بات کیسے لکھی اور چھپوائی ہو جس کی تردید منشی سعادت علی اور ان کے حامی زور و شور سے کر سکتے تھے اور جو ریاست کے ایک ذمہ دار کے لیے سخت ندامت و فضیحت کا سبب بن سکتی تھی۔ کوئی گمنام اور غیر ذمہ دار شخص ایسا دعویٰ کرتا تو کوئی بات نہ تھی، لیکن جیسا کہ برکاتی صاحب نے واضح

کیا ہے، مولوی عبدالکریم ریاست ٹونک کی ایک ممتاز علمی شخصیت تھے، جنہیں دلّی کے معززین بھی جانتے تھے۔ مثلاً حکیم امام الدین خاں دہلوی جن کا نام خود برکاتی صاحب نے بھی لکھا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نواب وزیرالدولہ محمد علی خاں مسند نشین ٹونک کی ثقاہت جسے اہلِ تاریخ جانتے ہیں، ایک وابستہ ریاست کی طرف سے ایسی غلط بیانی کو جو ریاست کی بھی بدنامی کا سبب ہو، ہرگز برداشت نہ کرسکتی تھی۔

(مزید کر) چند فارسی الفاظ اور فارسی محاوروں کی بحث میں مخالف کو یہ کہہ کر کہ میں دلّی کا روڑا ہوں، مرعوب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، شیراز و اصفہان سے نسبت قائم کی جاتی تو ایک بات بھی تھی۔ البتہ اُردو زبان کے روزمرہ اور محاورے کا مسئلہ ہوتا تو یہ دعویٰ ضرور مخالف کو مرعوب کرسکتا تھا۔ تمام قرائن بتا رہے ہیں کہ ان الفاظ کا لکھنے والا واقعی دلّی کا رہنے والا ہے اور اسے اس بات پر اطمینان ہے کہ اس کے دعوے کی تردید نہیں کی جاسکتی .....'' (افاداتِ غالب، ایضاً صفحہ ۱۲ و بہ بعد)

رسالہ ''سوالات عبدالکریم'' کے بارے میں برکاتی صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ اس ''رسالے کا انداز خالص مولویانہ اور مناظرانہ ہے اور غالب کا طرزِ فکر اور اُفتادِ طبع یہ ہرگز نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے دفاع میں ادبی میدان چھوڑ کر مذہبی فتووں اور محضروں کی پناہ لیتے پھریں۔ رندانہ طبیعت رکھنے والے لوگ یہ راہ اختیار نہیں کرتے ....'' برکاتی صاحب کے اس استدلال کے جواب میں عابدی صاحب نے بہت اچھی بات کہی ہے کہ ''استفسار اور محضر کا انداز ''سوالات'' ہی میں نہیں، ''تیغ تیز'' میں بھی ہے اور بہت نمایاں ہے اور یہ کتاب ''متفق علیہ طور پر غالب کی اپنی تصنیف ہے[۱]''

حاصل کلام یہ کہ ''سوالاتِ عبدالکریم'' غالب دہلوی ہی کی تصنیف ہے، اور اسمِ سائل ''عبدالکریم'' وجودِ موہوم سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

''سوالاتِ عبدالکریم'' کی غالب کی زندگی میں صرف ایک ہی اشاعت عمل میں آئی۔ ۱۹۵۲ء میں قاضی عبدالودود صاحب نے اسے سہ ماہی مجلہ معاصر، پٹنہ، حصہ ۲ میں

۱؎ افاداتِ غالب: سیّد وزیرالحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۲

شائع کیا اور پھر "غالب صدی" کے قریب اس کی یہ تین اشاعتیں سامنے آئیں :

در : قاطع برہان و رسائلِ متعلقہ، صفحہ ۱۷۵ - ۱۹۰، قاضی عبدالودود، پٹنہ، ۱۹۶۷ء

در : مجموعۂ نثرِ غالب اُردو، صفحہ ۱۲۵-۱۴۶، خلیل الرحمٰن داؤدی. لاہور، ۱۹۶۷ء

در : افاداتِ غالب، صفحہ ۱ - ۳۱، سید وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۹ء

نامۂ غالب :

○ طبع اوّل : مطبع محمدی، محمد مرزا خاں، دہلی، ماقبل ۱۳ اگست ۱۸۶۵ء
باہتمام : عبدالرزاق بیگ　　　ضخامت : ۱۶ صفحات

در : اودھ اخبار، لکھنؤ ۱۰ اکتوبر و ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء

در : عودِ ہندی، مطبع مجتبائی، میرٹھ، ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء، صفحہ ۱۴۱-۱۵۵

"قاطع برہان" (غالب) کی تردید میں، منشی سید سعادت علی کی "محرق قاطع برہان" (۱۸۶۳ء) کے بعد جو دوسری کتاب سامنے آئی وہ میرزا رحیم بیگ کی "ساطع برہان" تھی۔ ۱۸۴ صفحات کی یہ کتاب، فارسی زبان میں ہے اور ہاشمی پریس میرٹھ سے ۱۲۸۲ھ ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئی۔ "تیغ تیز" (۱۸۶۷ء) کے آغاز میں غالب لکھتے ہیں کہ "محرق قاطع برہان" (منشی سعادت علی) کے بعد :

> "پھر ایک مرزا رحیم بیگ میرٹھ کے رہنے والے بروئے کار آئے اور ایک تحریر مسمّیٰ بہ "ساطع برہان" نکال لائے۔ مطالب مندرجہ لغو، بیشتر "محرق قاطع" کے مضامین منقول ـــ فقیر نے صرف ایک خط مرزا جی کو لکھ بھیجا۔ زیادہ اس طرف التفات کو تضیعِ اوقات جانا...."[1]

غالب نے میرزا رحیم بیگ کے نام اپنا یہ اُردو خط خود[2] اپنے صَرف سے تین سو کی تعداد میں

---

[1] بحوالہ : مہیش پرشاد، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر، ۱۹۴۹ء، صفحہ ۱۳۱-۱۳۲

[2] محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" (۱۸۸۱ء) میں "نامۂ غالب" کو سہواً غالب کی "تصنیفاتِ فارسی" کے تحت شمار کیا ہے۔

"نامۂ غالب" کے نام سے رسالے کی صورت میں چھپوایا اور یہ جلدیں دوستوں کو دور و نزدیک بانٹ دیں۔ غالب کے ایک خط بنام سیاح سے یہ سب امور سامنے آتے ہیں :

"نامۂ غالب، صاحبِ مطبع نے اپنی بکری کے واسطے نہیں چھاپی جو میں مول لے کر بھیج دوں اور تم سے اس کی قیمت مانگ لوں۔ میں نے آپ تین سو جلد چھپائی، دوستوں کو دور و نزدیک بانٹ دی۔ آج یک شنبہ ہے، پارسل روانہ نہ ہوگا جتنے یہ نسخے اب میرے پاس باقی ہیں، کل تمہیں بھیج دوں گا....."

(مرقومہ ۱۷ ستمبر ۱۸۶۵ء)

"کل" یعنی ۱۸ ستمبر ۱۸۶۵ء کو "بقیہ سب" نسخے سیاح کو بھیجے گئے یا نہیں، خطوں سے اس امر پر کوئی روشنی نہیں پڑتی لیکن سیاح کے نام ہی کوئی پانچ ماہ بعد کے ایک خط مرقومہ ۲۱ فروری ۱۸۶۶ء سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ غالب نے انہیں بیس "نامہ غالب" کا پارسل بھیجا لیکن فروری ۱۸۶۶ء کے ابتدائی تین ہفتوں تک انہیں یہ پارسل نہیں ملا تھا جس کے باعث سیاح کو تشویش تھی۔

غالب کے دستیاب خطوں میں "نامۂ غالب" کا حوالہ سب سے پہلے نواب کلب علی خاں کے نام ایک خط مرقومہ ۱۳ اگست ۱۸۶۵ء میں آیا ہے، جس میں داغ دہلوی کے بدست "نامۂ غالب" کے پانچ نسخے نذر گزارنے کا امر مذکور ہے گویا ۱۳ اگست ۱۸۶۵ء تک "نامۂ غالب" کی اشاعت عمل میں آچکی تھی۔ غالب کے لفظ یہ ہیں :

"ایک عبارت کا ایک جزو بطریقِ خط ایک انصاف دشمن کو لکھ کر چھپوا دیا ہے۔ پارسل اس کا (برخوردار) نواب مرزا (خاں داغ) کو ارسال کیا ہے۔ پانچ رسالے وہ میری طرف سے نذر گزرانیں گے۔ حضرت قبولِ نذر کو میرا اعزاز و شرف جانیں گے۔"

(۱۳ ماہ اگست سنہ ۱۸۶۵ء)

جیسا کہ عرشی صاحب نے بھی فرمایا ہے "ایک عبارت کا ایک جزو بطریق خط" سے "نامۂ غالب" مراد ہے[۱]، اور "انصاف دشمن" ہوئے میرزا رحیم بیگ مولف "ساطع برہان"..... میرزا رحیم بیگ

---

[۱] مکاتیب غالب، طبع دوم، ۱۹۴۳ء، حواشی صفحہ ۲۲

کے بارے میں غالب کا رویہ اور لہجہ مستقل تحقیر اور تذلیل کا رہا۔ میاں داد خاں سیاح نے "ساطع برہان" کے بارے میں غالب سے کچھ استفسار کیا ہوگا، ۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں غالب، جواباً سیاح کو لکھتے ہیں :

"وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے، وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملّائے مکتبدار کا خبط ہے۔ رحیم بیگ، اس کا نام۔ میرٹھ کا رہنے والا کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے ....."

تحقیر کے ساتھ ساتھ غالب کے انداز میں شقاوت اور سنگدلی بھی در آئی ہے، ۱۷ ستمبر ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں سیاح کو ہی لکھتے ہیں :

"بندہ پرور! سچ کہتے ہو، رحیم بیگ کا وطن اصلی سردھنہ اور فی الحال میرٹھ میں مقیم اور معلّمی، اس کا پیشہ ہے اور آٹھ دس برس سے اندھا نظم و نثر میں مولوی امام بخش صہبائی کا شاگرد اور فارسی شعر کہتا ہے ....."

اواخر ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں جو رامپور سے لکھا گیا ہے، مولوی عبدالرزاق شاکر کو ارشاد ہوتا ہے کہ :

"نامہ غالب" کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی، میرٹھ کا رہنے والا ہے، دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب، پڑھ نہیں سکتا۔ سن لیتا ہے، عبارت، لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے۔ بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہل دہلی کہتے ہیں، مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے، اپنا اعتبار بڑھانے کو، اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وائے اس ہیچ و پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمّذ موجب عزّ و وقار ہو ....."

صہبائی پر تبرّا بھیجنے کی ایک نازک نفسیاتی وجہ بھی ہے۔ "لطائفِ غیبی" میں غالب نے اپنے لیے "محقّقِ اکمل" کا تخاطب روا رکھا تھا، میرزا رحیم بیگ نے "ساطع برہان" میں صہبائی سے اپنے تلمّذ کا اظہار کیا اور انہیں "امام المحققین" سے خطاب کیا، یہ بات غالب

کو کھل گئی، اسے وہ اپنا استحقاق سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس "انصاف دشمن" سے "نامۂ غالب" میں پوچھتے ہیں کہ :

"یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو امام المحققین خطاب دیا ہے، کیسے محققین نے آپ (صہبائی) کو امام مان لیا ہے ؟"

پھر یہ حکم لگاتے ہیں کہ :

"جب تک نہ اجماع، محققین کا ہوگا، یہ خطاب، بہ اجماعِ اہلِ عقل ناجائز و ناروا ہوگا۔۔۔۔"

تمثیل سے بات کو اور کھولتے ہیں :

"وہ فرماں روائے عہد، شہنشاہ کہلائے گا، کئی بادشاہ جس کے فرماں پذیر ہو جائیں گے۔"

اس کے بعد استہزا :

"ایک سید نے اپنے لڑکے کا نام میر شہنشاہ رکھ لیا۔ یہ میر شہنشاہ صاحب کیوں کر شاہجہان و جہانگیر ہو جائیں گے ؟"

اور پھر ترکش کا آخری تیر تحقیر و تضحیک یا طنز :

"اگر حضرت بفتحۂ قاف ثانی، بصیغۂ تثنیہ "امام المحققین" کہتے تو ایک امام آپ ہوتے اور نرائن داس تنبولی دوسرا ہوتا۔"

حقیقت یہ ہے اور جیسا کہ شیخ محمد اکرام صاحب نے بھی لکھا ہے "مرزا غالب کے سوانح نگار کو اس امر کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مباحثہ کرتے وقت وہ اپنے ترکش کے سارے تیر استعمال کرتے تھے۔"[1]

میرزا رحیم بیگ کی کتاب "ساطع برہان" قریب پونے دو سو صفحات پر مشتمل ہے، میرزا رحیم بیگ نے لکھا تھا کہ "دو چار باتوں کا جواب نہ لکھا جائے، جواب لکھیں تو کمل کتاب کا۔۔۔" "نامۂ غالب" میں جواباً ارشاد ہوا کہ :

---

[1] غالب نامہ : آثارِ غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۷۷

"ستّر برس کی عمر، کانوں سے بہرا، جمعیت کا تفرقہ زیاد اور پھر خود داری اور کبر نفسی اور استغنا خدا داد، بے ہودہ بکنے میں اوقات صرف کیوں کروں؟ پاسخ نگاری کیوں لفظ بہ لفظ و حرف بہ حرف کروں؟ آپ کو اپنی نمود اور شہرت منظور ہے۔ خوردہ گیری و عیب جوئی سے مجھ کو نفرت ہے اور حیا آتی ہے زیادہ گوئی سے.....؟"

یہاں ایک دلچسپ نکتے کی طرف توجہ دلانا بھی بے محل نہ ہو گا۔ غالب کی طرف سے مولوی نجف علی نے "دافع ہذیان" لکھی اور "لطائفِ غیبی" کا مصنف میاں داد خاں سیّاح کو ظاہر کیا گیا۔ "ساطع برہان" کے مولف میرزا رحیم بیگ نے ان دونوں کو مقابل کا آدمی نہیں سمجھا اور "ساطع" کے خاتمے میں صاف صاف لکھا ہے کہ یہ لوگ جواب نہ لکھیں یا کوئی دوسرا بیچ میں نہ آئے کیوں کہ "برہان"، "رحیم" اور "میرزا" ہم عدد (۲۵۸) ہیں اور دراصل ذات و صفات میں بھی ہم پایہ ہیں، کسی دوسرے کی بھلا کیا رسائی ہے کہ وہ ان کے مقابل ہو، ایسا کرنا گویا لومڑی کی طرح، دو شیروں کی جنگ میں اپنی جانِ نازنین کو معرضِ ہلاکت میں ڈالنا ہو گا.... چنانچہ غالب نے اپنے نام سے اپنے قلم کو جنبش دی لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا، لگ بھگ پونے دو سو صفحات کی تصنیف کے جواب میں غالب نے مصنف کو ایک جزو کا صرف ایک خط بعنوان "نامۂ غالب":

"لکھا بھیجا اور زیادہ، اس طرف التفات کو تضیع اوقات جانا۔"

(تمہید: تیغ تیز)

"نامۂ غالب" کا القاب یہ[1] ہے:

"بخدمت مشفقی مکرمی مرزا رحیم بیگ صاحب نور اللہ قلبہٗ بالاسرار و عینہٗ بالانوار"

اس پس منظر میں کہ میرزا رحیم بیگ ایک طویل عرصے سے بینائی سے محروم ہو چکے تھے، ان کلماتِ القاب میں مخفی نیش زنی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بصارت سے محروم ہونے

---

[1] "نامۂ غالب" طبع اوّل کے صفحۂ اوّل کے عکس کے لیے دیکھیے: ماہِ نو کراچی فروری ۱۹۶۵ء، مابین ص ۲۰، ۲۱

کے باعث ظاہر ہے میرزا رحیم بیگ نے غالب کی "قاطع برہان" خود نہ دیکھی ہوگی، قاری کوئی اور رہا ہوگا۔" نامۂ غالب" میں اس کی جانب بھی اشارہ ہے اور ناگوار انداز میں ہے میرزا رحیم بیگ سے پوچھتے ہیں کہ :

"آپ کے محکمۂ عالیہ کا سر رشتہ دار دیانت دار ہے یا نہیں؟ سخن فہم و ہوشیار ہے یا نہیں؟ میں تو گمان کرتا ہوں کہ امین نہ ہو، دلیل سن لیجئے اگر یقین نہ ہو: صیحہ بہ معنی آوازِ اسپ زنہار نیست" اس کے ماقبل اور بھی عبارت ہے سنانے والے نے نہ پڑھی ہو، کتنا بعید ہے....."

"نامۂ غالب" کے آغاز میں غالب نے لکھا ہے کہ :

"مجھ کو تحریر میں حذف زواید منظور ہے۔عزم مقابلہ نہیں، مقصد مجادلہ نہیں، سرتاسر دوستانہ حکایت ہے..... مع ہٰذا اظہارِ دردِ دل مراد ہے، کوئی بات جواب طلب نہیں۔"

لیکن "نامۂ غالب" کی روشِ تحریر کو باعتبارِ مجموعی "دوستانہ" نہیں کہا جا سکتا، اظہارِ دردِ دل اس میں واقعی ضرور ہوا ہے اور بڑے موثر اور بلیغ لفظوں میں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ایک عرصے تک تو غالب کو "پنشن، خلعت اور دربار کے غم نے پریشان رکھا اور جب ان الجھنوں سے (کسی قدر) نجات ملی تو "قاطع برہان" کی اشاعت سے جو ہنگامہ بپا ہوا، اس کی تلخی اور اذیت برسوں تک سوہانِ روح بنی رہی لیکن غالب کی اس زمانے کی پریشانیاں انہی قضیوں تک محدود نہ تھیں۔ وہ اس زمانے میں فسادِ خون کے مرض میں مبتلا تھے جس نے ان کی حالت اور بھی قابلِ رحم بنادی تھی[1]....."

"نامۂ غالب" میں انہوں نے "اظہارِ دردِ دل" کے طور پر "اپنی حالت" ان لفظوں میں بیان کی ہے :

"نہ مجھ کو مناظرے کا دماغ، نہ ہجوم امراضِ جسمانی و آلامِ روحانی سے فراغ، آگے جو ہمت نہیں ہاری تھی اور غیب سے توقع مددگاری تھی تو اپنا یہ شعر

---

[1] شیخ محمد اکرام، غالب نامہ: آثارِ غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۷۷

اُردو، میرے وردِ زبان اور اس ہنجار سے میں زمزمہ سنجِ فغاں رہتا تھا :

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

اب جو اصلاحِ حال و حصولِ مطالب سے دل مایوس ہے، تو طبیعت اسی غزل کی اس بیت کے ترنم سے مانوس ہے :

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

کوئی یہ نہ سمجھے کہ بڑا رونا رزق کا ہے۔ جب معاش مقرر ہو تو پھر غم کیا ہے ؟ نہ صاحب، یہ باتیں جانوروں کی ہیں کہ کچھ کھا لیا، پانی پی لیا اور چین سے سو رہے۔ آدمی عموماً اور صاحبانِ ننگ و ناموس خصوصاً، باوجود فراغ معاش ایسی جان گداز بلاؤں میں مبتلا ہیں کہ کوئی کیا کہے[1]۔ یہ حال تو یا صاحبِ واقعہ جانے یا خدا جانے! دوسرے سے یہ کار افتادہ کیوں کہے اور بغیر کہے دوسرا کیا جانے؟ اگر مردہ دل نہ ہوتا تو دو باتیں کہتا، زیادہ نہیں۔ وہ بھی نہ از روئے بحث و تکرار، نہ بہ اندازِ استفسار۔ اظہار سے مقصود، نفسِ اظہار.....“

”نامۂ غالب“ ان کلمات پر ختم ہوتا ہے :

”میں اب قطع کلام کرتا ہوں اور آپ کو بہ کمال تعظیم سلام کرتا ہوں ..... مجھ کو جس قدر تم نے لکھا ہے، یا کوئی اور لکھ رہا ہے، اگرچہ وہ سب لغو اور جھوٹ ہے، معقول اور راست نہیں، لیکن واللہ مجھ کو عرصہ محشر میں اس کی باز خواست نہیں :

---

[1] ۱۸۵۷ء کے انقلاب کو ”اب کئی سال ہو چکے تھے۔ دہلی جہاں تک تبدیلِ حالات کے ساتھ ممکن تھا، اپنی حالت پر آ رہی تھی۔ بظاہر تو غالب کو اس وقت ہر طرح مطمئن ہونا چاہیے تھا۔ رامپور سے سو روپیہ ماہوار ملتا تھا، پنشن جاری تھی، دربار اور خلعت بھی بحال ہو چکے تھے، لیکن ”قاطع برہان“ کی اشاعت سے انھوں نے جو مخالفتِ عام مول لی، اُس نے یہ زمانہ ان کے لیے بہت تلخ کر دیا.....“
(شیخ محمد اکرام غالب نامہ : آثارِ غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ۱۲۷)

زمین عشق، بہ کونین صلح کل کردیم
تو خصم باش، و زما دوستی تماشا کن

(میں نے عشق کی برکت سے دو جہاں میں صلح کرلی ہے، تم دشمن بن کر میری محبتوں کا عالم دیکھو۔[1])

اس طرح جب غالب کا دل "اصلاحِ حال وحصولِ مطالب سے مایوس" ہوا تو انھوں نے صلح کا علم بلند کر دیا۔ بایں ہمہ یہ مجادلہ اس اعلان پر ختم نہیں ہوگیا؛ تائید و تردید میں قلمی جنگ کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔

"نامۂ غالب" کی اپنی ایک الگ اہمیت ہے، یہ غالب کا پہلا خط ہے جس کی کتابی صورت میں اشاعت روبہ عمل آئی۔ اس لیے اس کی حیثیت غالب کی ایک مستقل اور جداگانہ تصنیف کی سی ہوگئی ہے۔ اس رسالے کا اخیر ورق ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ رسالہ سولہ صفحوں میں ختم ہوا ہے۔ صفحہ ۱۶ کے نیچے مسطر کے باہر چھاپے خانے والوں کی طرف سے یہ عبارت خلاصے کی چھپی[2] ہے:

"الحمدللہ کہ نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالب کا خط موسومہ مرزا رحیم بیگ صاحب کا مطبع محمدی محمد مرزا خاں میں بیچ کمپ دہلی اندرون کوچہ چیلہ گنذر فیض حد چھاؤنی کے اہتمام عبدالرزاق بیگ سے چھپا، سنہ ۱۸۶۵ء۔"
(امتیاز علی عرشی، مکاتیب غالب طبع دوم، دیباچہ، صفحہ ۴۲)

خلیل الرحمٰن داؤدی نے ٹھیک کہا ہے کہ "یہ غالب کے دیگر خطوط کی طرح ایسی "تحریر سرسری" نہیں ہے جسے "قلم سنبھال کر اور دل لگا کر" نہ لکھا گیا ہو، بلکہ اس کی تصنیف پر تو مرزا غالب نے اچھی خاصی توجہ فرمائی تھی اور اسے اشاعت کے لیے کتابی صورت میں قلم بند فرمایا تھا۔"[3]

"نامۂ غالب" غالب کی زندگی میں (طبع اوّل جداگانہ کے بعد) اودھ اخبار، لکھنؤ کی دو اشاعتوں ۱۰، اکتوبر ۱۸۶۵ء اور ۱۷، اکتوبر ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا اور "عودِ ہندی" (اکتوبر ۱۸۶۸ء)

---

[1] فاضل لکھنوی، عودِ ہندی، لاہور، ۱۹۶۷ء، صفحہ ۳۷۹

[2] صفحہ ۱۶ کے عکس کے لیے رک: ماہ نو، کراچی فروری ۱۹۶۵ء، ص ۲۰ و ۲۱ کے مابین۔

[3] مجموعہ نثرِ غالب اردو، لاہور، ۱۹۶۷ء، صفحہ ۱۴۹

میں بھی شامل کیا گیا۔ اس کے بعد یہ "عودِ ہندی" کے ہر ایڈیشن میں شامل رہا ہے
"عودِ ہندی" یا "خطوطِ غالب" پر مشتمل، مابعد مرتبہ مجموعوں سے الگ، یہ صحتِ متن کے زیادہ اہتمام کے ساتھ رسالہ "ہندوستانی" الہ آباد، بابت سال ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا یا پھر غالب صدی کے قریب مندرجہ ذیل دو مجموعوں میں شامل ہوا:

★ در: قاطع برہان و رسائلِ متعلقہ، صفحہ ۲۴۳-۲۶۰، قاضی عبدالودود، پٹنہ، ۱۹۶۷ء
★ در: مجموعہ نثرِ غالب اُردو، صفحہ ۱۴۷-۱۷۳، خلیل الرحمٰن داؤدی، لاہور، ۱۹۶۷ء

تیغِ تیز:

○ طبع اوّل : اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۷ء
ضخامت : ۳۲ + ۱ صفحات

"قاطع برہان" (غالب) کے رد میں مولوی آغا احمد علی احمد کی کتاب "موید برہان" کلکتے سے ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ ۴۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ:

"قاطع برہان" کے خلاف اور "برہان" کے حق میں سب سے مفصل کتاب (موید برہان) آغا احمد علی نے لکھی جو مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں مدرس تھے اور ایشیاٹک سوسائٹی کی مطبوعات کی تصحیح کیا کرتے تھے۔" (غالب نامہ، صفحہ ۲۷۳)

مالک رام کی رائے ہے کہ:

"موید برہان' اس سلسلے کی سب سے مبسوط اور وقیع کتاب ہے۔"
(ذکرِ غالب، حاشیہ صفحہ ۲۲۱)

غالب، کثیر الاحباب شخص تھے۔ ایک دوست نے انہیں کلکتے سے "موید برہان" کی اشاعت اور مختصراً اس کے مطالب سے مطلع کیا۔ غالب نے "اتنے علم پر" ہی، اس کا انتظار کیے بغیر کہ اصل کتاب بھی آجائے اور دیکھی جائے، ایک قطعہ اکتیس اشعار کا فارسی میں کہہ،

اکمل المطابع سے چھپوا، کلکتے روانہ کر دیا[1]۔ اس قطعے میں تخاطب بلکہ تعریض "موید" کے مولف احمد علی احمد سے ہے!

۲۴، دسمبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط موسومہ حبیب اللہ ذکا سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک "موید برہان" ان کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ ۱۴، مارچ ۱۸۶۷ء کے ایک خط سے اس امر کی اطلاع ملتی ہے کہ انھیں "موید برہان" کا نسخہ مل گیا ہے۔ انہوں نے کتاب کو دیکھ چکنے کے بعد بھی اسے "خرافات" ہی مانا۔ اور حبیب اللہ ذکا کو اس کا جواب لکھنے کے لیے کہا اور خود اس کا "خاکہ" بنا کر بھیجنے کی پیش کش کی:

"موید برہان میرے پاس بھی آگئی ہے اور میں اس کی خرافات کا حال بقید شمارِ صفحہ و سطر لکھ رہا ہوں۔ وہ تمہارے پاس بھیجوں گا۔ شرط مودت، بشرط آنکہ جاتی نہ رہی ہو اور باقی ہو، یہ ہے کہ میں ہوں یا نہ ہوں، تم اس کا جواب لکھو۔ میرے بھیجے ہوئے اقوال جہاں جہاں مناسب جانو درج کر دو۔ میں اب قریب مرگ ہوں۔ غذا بالکل مفقود اور امراض مستولی۔ بہتر برس کی عمر۔ انا للہ و انا الیہ راجعون....." (۱۴، مارچ ۱۸۶۷ء)

چار روز بعد ۱۸، مارچ ۱۸۶۷ء ہی کے خط میں پھر یہ تجویز دہرائی ہے اور منشی حبیب اللہ ذکا سے آمادگی چاہی ہے:

"بندہ نواز! میں نے لکھا کہ "موید برہان" میرے پاس آگئی ہے اور میں اس کے اعتراض کے جواب، بہ نشانِ صفحہ و سطر، ایک تختہ کاغذ پر لکھ رہا ہوں بعد اتمام نگارش تمہارے پاس اس مراد سے بھیجوں گا کہ تم از راہِ عنایت "موید" کا جواب لکھو۔ میری نگارش جو پسند آئے اس کو بھی جابجا درج کر دو تم نے اس درخواست کا جواب، ہاں، نا، کچھ نہ لکھا۔ اب عنایت فرما کر جواب لکھیے....."

---

[1] دیکھیے، مکتوب غالب، بنام ذکا، مرقومہ ۲۴، دسمبر ۱۸۶۶ء

اس موضوع پر پھر اور کچھ نہیں ملتا۔ قریب بہ یقین ہے کہ حبیب اللہ ذکا، اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ بہ حالتِ خستہ و خراب، بیمار و نزار، غالب کو خود ہی "موید برہان" کا جواب لکھنا پڑا اور غالباً وہی تنقیحات جو اولاً غالب نے ذکا کی رہنمائی اور استمداد کے لیے قلمبند کی تھیں، "تیغ تیز" کی بنیاد بنیں۔

"تیغ تیز" کے نام سے غالب کی یہ مختصر سی جوابی کتاب ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی اور اُردو میں لکھی گئی۔ اس میں سترہ فصلیں ہیں۔ شروع میں تمہید ہے جسے دیباچہ کہہ لیجیے۔ اس میں انھوں نے "قاطع برہان" کی غایتِ اشاعت پر روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلے کے لکھے گئے موافق مخالف سب رسالوں پر مختصراً اظہار رائے کیا ہے اور اپنے تئیں کل "کام" کا جائزہ لیا ہے:

"اللہ جل شانہ، اپنے بندوں کو ورزشِ امورِ خیر کی توفیق دے۔ اچھا ہے وہ بندہ جس کو ظلم کی خو نہ ہو اور ظلم کی انواع ہیں، از آں جملہ ایک سخن پروری ہے کہ اس کو بے ایمانی کہا چاہیے، یعنی کتمان حق اور اعلان باطل پہ اصرار۔

اسد اللہ خاں غالب کہتا ہے کہ میں نے خاص نظر بہ اعلانِ حق "برہانِ قاطع" کی عبارت کی سستی اور بیان کی غلطی اور اطناب مل کی نکوہش میں ایک رسالہ لکھا اور اس کا نام "قاطع برہان" اور "درفش کاویانی" رکھا۔ جب بعدِ انطباع وہ رسالہ مشتہر ہوا تو پہلے پہل اس مثلِ ہندی کے مطابق "بیل نہ کود! کودی گون" ایک مردِ بے مغز، معوج الذہن، نہ فارسی داں نہ عربی خواں، نے میری نگارش کی تردید میں ایک کتاب بنائی اور چھپوائی۔ "محرق قاطع" اس کا نام رکھا اور اس کو مشتہر کیا۔ میرے ایک یار نے اس کتاب کے جواب میں کچھ لطائف جمع کیے اور "لطائفِ غیبی" اس کا نام رکھا۔[1] وہ نسخہ بھی مشتہر ہوا۔ پھر ایک مرزا رحیم بیگ میرٹھ کے رہنے والے بروئے کار آئے اور ایک تحریر مسمّی بہ "ساطع برہان" نکال لائے۔ مطالب مندرجہ لغو، بیشتر "محرق قاطع" کے مضامین منقول۔ فقیر نے صرف ایک خط مرزا جی کو لکھ بھیجا۔[2] زیادہ اس طرف التفات کو تضیع اوقات جانا۔

---

[1] اصلاً "لطائف غیبی" غالب ہی کی نگارش ہے۔
[2] مراد "نامۂ غالب" مطبوعہ ۱۸۶۵ء

ثالثاً میاں امین الدین کہ اب پٹیالے میں ملقب بہ مدرّس ہیں، انھوں نے ایک "قاطع القاطع" چھپوایا۔ استعدادِ علمی میں سے بعدِ صرف مقاصدِ نحو و صرف، فارسیت کی اسی قدر رعایت منظور رکھی کہ حقیر کے بعض فقروں کی ترکیبیں، اپنی عبارت کے قالب میں ڈھالیں۔ باقی سوائے عربی قشری اور فارسیِ مسروقہ کے وہ مغلظ گالیاں دی ہیں، جو کنجڑے بھٹیارے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ کمال یہ کہ ان کا منطق ہندی اور حضرت کی عبارت فارسی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی جلاہے ان دنوں میں علم تحصیل کرکے مہذب ہوگئے ہیں۔ عمامہ باندھے ہوئے پڑے پھرتے ہیں۔ فحش نہیں بولتے، خلاف اپنی قوم کے۔ "صاحب و قبلہ" ان کا روزمرہ ہے۔ یارب میاں امین الدین کس بُری قوم کے اور کس پاجی گروہ کے ہیں کہ مولوی کہلاتے، مدرّس بنے، مگر الفاظ مستعملۂ قوم نہ چھوڑے۔ اگر میری طرف سے ازالہ حیثیت کی نالش دائر ہو جاتی تو میاں پر کیسی بنتی، مگر میرے کبرِ نفس نے ازالہ حیثیت کے لفظ کو گوارا نہ کیا۔[۱]

ان کی تحریر، ان کے پاجی پن پر سجل ہے بہ مہرِ ذرہ تا آفتاب۔

رابعاً مدرّس احمد علی صاحب، عربیت میں امین الدین سے بڑھ کر، فارسیت میں برابر، فحش و ناسزا گوئی میں کمتر، جتنے الفاظ توہین و تذلیل کے ہیں، وہ چن چن کر میرے واسطے صرف کیے اور یہ نہ سمجھا کہ غالب اگر عالم نہیں، شاعر نہیں، آخر شرافت و امارت میں ایک پایہ رکھتا ہے۔ صاحبِ عز و شان ہے، عالی خاندان ہے۔ امرائے ہند، روسائے ہند، راجگانِ ہند، سب اس کو جانتے ہیں۔ رئیس زادگانِ سرکارِ انگریزی میں گنا جاتا ہے۔ بادشاہ کی سرکار سے نجم الدولہ خطاب ہے۔ گورمنٹ کے دفتر میں "خاں صاحب بسیار مہربان دوستان" القاب ہے۔ جس کو گورمنٹ "خان صاحب" لکھتی ہے، اس کو سٹری اور کتا اور گدھا کیوں کر لکھوں۔ فی الحقیقت یہ تذلیل بفحوائے عزتُ الغلام اہانۃُ المولیٰ گورمنٹ بہادر کی توہین اور

---

[۱] بعدۂ غالب اس خیال پر قائم نہ رہے اور ۲، دسمبر ۱۸۶۷ء کو انھوں نے مولوی امین الدین پر ازالہ حیثیتِ عرفی کی نالش دائر کر دی لیکن بوجوہ مقدمے کو کمزور دیکھتے ہوئے ۲۳، مارچ ۱۸۶۸ء کو خود راضی نامہ داخل کرکے مقدمہ واپس لے لیا۔ اس مقدمے کی تفصیل کے لیے دیکھیے: احوالِ غالب۔ مختار الدین احمد، علی گڑھ، ۱۹۵۳ء صفحہ ۱۳۹ - ۱۴۱

شریفِ ہند کی مخالفت ہے۔ میرا کیا بگڑا، مولوی نے اپنا پاجی پن ظاہر کیا۔ میں نے معلم ابن بے دین کو شیطان کے حوالے کیا اور احمد علی کے الفاظ مذموم سے قطع نظر کر کے مطالب علمی کا جواب اپنے ذمے لیا.....“

اس ”نگارش“ کا نام غالب نے ”تیغِ تیز“ رکھا اور اس تمہیدی عبارت کے بعد سے آغاز فصول کیا۔ صرف اس جائزے سے بھی جو بقلم غالب ہے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک علمی بحث کس درجہ پست سطح پر روا رکھی گئی، اس میں غالب کے دل آزار طرزِ نگارش کا بھی دخل ہے جس کا اظہار بجائے خود منقولہ بالا بیان سے بھی ہو رہا ہے۔

”تیغِ تیز“ کی پہلی فصل کا آغاز ایک ”نظم“ سے ہوا ہے جس سے بجائے خود ”تیغِ تیز“ کی غایتِ تالیف اور غالب کی اس سے توقعات کا پتہ چلتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ”تیغِ تیز“ مغزِ عدو کے پرخچے اڑا دے گی اور دشمنِ اوّل وہ صاحب ”برہانِ قاطع“ کو خیال کرتے تھے:

بر آنم بہ نیروی این تیغِ تیز | کہ مغزِ عدو را کنم ریز ریز
عدو آن کہ ”برہانِ قاطع“ نوشت | بگفتارِ سست و بہنجارِ زشت

خود اس سے اندازہ کر لیجیے کہ ”تیغِ تیز“ کا لہجہ اور روش و شیوہ کیا رہا ہوگا۔ نظم کا آخری شعر یہ ہے:

زہے نامہ کز فرِّ اقبالِ او | یکے تیغِ تیز آمادہ سالِ او

”یکے تیغِ تیز“ سے اس رسالے کا سالِ تالیف ۱۸۶۷ء حاصل ہوتا ہے۔ یہ کتابچہ ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے آخر میں ”غلط نامہ“ کا ایک صفحہ بڑھایا گیا ہے جسے صفحہ ۳۳ کہہ لیجیے گو اس پر صفحے کا شمار درج نہیں ہے۔

”تیغِ تیز“ کی سترہ فصلیں ہیں۔ پہلی سولہ فصلوں میں ”مؤید برہان“ پر نقد و جرح ہے۔ آغا احمد علی پر اعتراض ہیں اور ہر اعتراض پر غالب، حضراتِ کثیر البرکات، صاحبانِ انصاف سے داد خواہ ہوئے ہیں۔ صاحبِ برہان بھی برابر موردِ عتاب رہے ہیں لیکن آخری فصل بطورِ خاص ”برہانِ قاطع“ پر اعتراضاتِ مزید کے لیے وقف کی گئی ہے۔

نظم کے بعد پہلی فصل کا پہلا جملہ یہ ہے:

"نادرستیِ عبارت امرِ وجدانی ہے۔ ۔ ۔ ۔ فی الحال وہ عیوب جامع برہان کے لکھتا ہوں کہ جو بدیہی ہیں اور حسنِ لبصران کا مدرک ہو سکتا ہے۔"

در پھر صاحبِ برہان سے انہیں فنِ لغت کے اعتبار سے جو شکایتیں ہیں، انہیں بیان کیا ہے:

"سکون و حرکت و تخفیف و زیادتی کا ہمدگر بدل جانا محض برائے ضرورتِ وزنِ شعر ہے۔ نثر میں اسی طرح لکھنا اور اس کو بجائے خود ایک لغتِ مستقل جاننا حماقت ہے اور یہ سب سے زیادہ جامع برہانِ قاطع کا ڈھنگ ہے۔"
(فصل، ۱۲)

"(جامع برہان نے) سینکڑوں لغت پہلے تے سے لکھے ہیں اور پھر طوئے سے۔ پہلے حائے حطی سے لکھے ہیں اور پھر ہائے ہوز سے، جو الفاظ واو معدولہ سے ہیں اور جو بے واو ہیں، دونوں کو ایک کر دیا۔" (فصل، ۱)

کچھ شکایتیں انہیں خاص صاحبِ برہان سے ہیں اور کچھ سارے ہی ہندی فرہنگ نویسوں سے:

"یہ تو میں بھی نہیں کہتا کہ جامع برہان مجموعِ لغات کے معنی غلط لکھتا ہے۔ البتہ چوں کہ اور کتب سے نقل کرتا ہے، پھر معنی غلط کیوں کر ہوں گے۔ مگر یہاں ایک امر ہے خاص، اور ایک امرِ عام ہے۔ امرِ خاص عبارت ہے عامیانہ ترکیب، ٹکسال باہر سے۔ اس میں مختص ہے مولفِ برہان۔ امرِ عام، غلطی قیاس کی، کہ اس میں سب فرہنگ نویس مبتلا ہیں۔ خصوصاً جامع برہان کا قیاس تو ایسا بھونڈا اور دور از صواب ہے کہ اس کے حامی ہر چند توجیہات بارہ ڈھونڈ لاتے ہیں مگر اس کی قباحت کو مٹا نہیں سکتے۔" (فصل، ۹)

"میاں انجو (جامع فرہنگِ جہانگیری) وغیرہ تصحیفات میں بال بال گرفتار ہیں اور ہر ایک کا اپنے اپنے قیاس پر مدار ہے۔ کوئی احمق ہی ہوگا کہ مجموعِ قیاس، بای، بے شمار کو حق جانے گا۔۔۔۔" (فصل، ۱۲)

"اگر غالب، "جامع غیاث اللغات" کو آدمی جانتا ہو تو وہ خود آدمی نہیں ..... جو میاں انجو کو نہ مانے گا، وہ میاں جی غیاث الدین کو کیا جانے گا۔"

(فصل ۱۰)

"مولوی "موید" ..... رد کرتا ہے میرے قول کو اور سند لاتا ہے آرزو کے کلام کو۔ راقم ان اوراق کا، آرزو کا ایسا معتقد کب ہے کہ اس کے ہر قول کو معتبر جانے۔"

(فصل ۷)

"برہان" والا اندھا ہے اور "فرہنگِ جہانگیری" اس کی عصا ہے۔"

(فصل ۱)

"یہ ایک حماقت ہے دکنی کی ....." (فصل ۱۳)

"دکنی صاحب بکتے ہیں ....." (فصل ۱۷)

"دکنی" کا مشارٌ الیہ صاحبِ برہان محمد حسین ہیں جو دکن میں رہے لیکن جن کا تبریز سے تعلق تھا۔ غالب ان کے لیے، برابر تحقیر کے انداز میں ضمیر "دکنی" کی لاتے ہیں۔ "موید برہان" میں اس پر سرزنش کی گئی۔ غالب کو بالیقین معلوم نہیں کہ صاحب برہان کا مولد کیا تھا بایں ہمہ انہیں دکنی کہنے پر مصر ہیں:

"مولوی احمد علی صاحب "موید برہان" کے دوسرے صفحے میں تاکید کرتے ہیں کہ زنہار محمد حسین کو دکنی نہ کہو، وہ تبریزی ہے۔ آخر ظہوری و نظیری بھی ایران سے آکر دکن اور ہند میں رہے۔ یہ دکنی وہ ہندی کیوں نہ کہلائے۔ واہ رے قیاس مع الفارق! ان دونوں میں سے ایک کا مولد ترشیز، ایک کا مولد نشاپور۔ بطریقِ سیر و سیاحتِ ہند میں آئے۔ ان کو دکنی اور ہندی کون کہہ سکتا ہے۔ محمد حسین بے چارے کا دادا پر دادا تبریز سے آیا ہوگا۔ یہ دکن میں یا ہند کے کسی اور شہر میں پیدا ہوا ہوگا ....." (فصل ۲)

اب مولوی احمد علی سے، غالب کے اندازِ تخاطب کو بھی دیکھیے:

"مولوی احمق ہے یا نہیں؟ اگر عقل رکھتا ہوتا تو "اسد" کے مقابلے پر

یہ شعر نہ لکھتا.....“ (فصل ، ۱۲)

”مولوی احمد علی جہانگیری نگری عالم ہیں، مگران معنوں میں کہ صرف و نحو کے دو چار رسالے پڑھ لیے ہیں اور فاعل مفعول سے لگا لگار کھا ہے. باقی فہم، تمیز، انصاف، حیا، ان چاروں صفتوں کا پتا نہیں۔ مدرسی کا ہاتھ آنا بحسب اتفاق ہے، نہ از روئے استحقاق۔“ (فصل ، ۱۰)

”میاں مولوی کی فارسی دانی اور سخن رانی کی ٹھیک نکل گئی....“ (فصل ،۶)

مولوی احمد علی سے غالب کو ایک بڑی لطیف شکایت یہ پیدا ہوئی کہ وہ عبارت اور نقشِ مضمون دونوں کے سرقے کے جرم دار ہوئے ہیں۔ سرقۂ فقرہ بے تبدلِ لفظ کی ایک مثال دے کر لکھتے ہیں :

”اب سرقۂ مضمون بہ تغیرِ الفاظ سنیے : فقیر نے ”درفش کاویانی“ کے ۱۲ صفحہ میں عبارت لکھی ہے : ”آرے دبیران پارس را قاعدہ چنان بود کہ بر سرِ دالِ ابجد نقطہ نہادندے۔ چوں دریں اندیشہ وجودِ دالِ بی نقطہ از میان میرفت و ہمہ دال منقوطہ می ماند، اکابرِ عرب قاعدۂ قرار دادند و تفرقۂ دال وذال را برآں قاعدہ اساس نہادند۔“

منصفین ملاحظہ کریں کہ مولویِ عربی خوانِ فارسی مدان ”موید“ کے ۲۴ صفحے میں یہ عبارت یوں لکھتا ہے : ”بہ خاطرِ قاصر چنیں میرسد کہ چوں در زمانِ قدیم و عہدِ باستان بر زبرِ دال نقطہ می نہادہ اند۔ متاخرین کہ ازیں قاعدہ آگاہ نیستند آن را خیال ذالِ منقوطہ کردہ اند.....“

فرہنگِ پیشین میں کوئی مجھ کو یہ مطلب دکھا دے تو میں گنہگار، ورنہ مولوی انتحالی گیرا۔ یہ راز مجھ سے شست ہرمزدتم مولانا و اولنا حضرت مولوی عبدالصمد علیہ الرحمہ نے کہا ہے۔ دوسرا کوئی اس کو نہیں جانتا تھا۔ ایسی نئی بات کو چرانا اور اپنا قول بتانا، چوری اور سرزوری، خیرہ رائی اور بے حیائی ہے یا نہیں....“ (فصل ،۶)

"مویدِ برہان" کے مولف مولوی احمد علی صاحب کو صرف "مولوی" لکھنا، احمق، بے عقل بتانا، فہم وتمیز، انصاف اور حیا کی صفات سے خالی ٹھہرانا، ان کی فارسی دانی اور سخن رانی کا مضحکہ اڑانا، سرقے کا مجرم گردانا، اٹھائی گیرا، چور، سرزور اور خیرہ سر قرار دینا اور پھر رزقِ روزی پر ہاتھ ڈالنا کہ "مدرسی کا ہاتھ آنا بحسب اتفاق ہے، نہ از روئے استحقاق۔" یعنی انہیں مدرسۂ عالیہ کلکتہ کی مدرسی سے فارغ خطی مل جائے اور یہ اس پر ہے کہ "تیغ تیز" کی تمہید کے مطابق ابھی صرف "مطالب علمی کا جواب اپنے ذمے لیا ہے...." اور یہ نہیں کہ تمہید دور جا پڑی ہو آٹھویں فصل تک یہ یاد بھی ہے۔ آٹھویں فصل کے آخر میں لکھتے ہیں:

"صفحہ ۷۰ میں مولوی مجھ کو ابوجہل ہندی اور دکنی کو دانائے تبریز لکھا ہے ہر چند اس کو میں ابولہب جہانگیر نگری لکھ سکتا ہوں لیکن چوں کہ نگارش میں شرط کی ہے کہ مطالب کا جواب دوں گا، فحش وناسزا کا پاسخ نگار نہ ہوں گا اس واسطے (اس سے قطع نظر) کیا جاتا ہے۔"

"تیغ تیز" کی سترہ فصلوں کے باوجود غالب کا جی ابھی بھرا نہیں تھا لیکن صحت وہمت مانع آئی۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

"اگرچہ ابھی پرسشیں بہت باقی ہیں، لیکن بڑھاپا اور امراض اور ضعفِ مفرط نہیں لکھنے دیتا۔ صبح سے شام تک پلنگ پر پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے مسودہ کیا اور احباب کو دے دیا، انہوں نے صاف کر لیا۔ اب میری تحریر تو تمام ہوئی۔ احباب صاف کر لیں تو مطبع میں حوالہ کروں...." (فصل ۱۷)

آخر میں مولوی احمد علی سے مخاطب ہیں کہ یہ جو کچھ بسبیلِ سوالات لکھا ہے۔ مولوی صاحب اس کا جدا جدا جواب دیں اور اس کے بعد کتاب کو جس اعترافِ حقیقت پر ختم کیا ہے، اس میں اس مجادلے میں پڑنے والے سب ہی موافق مخالف اصحاب کے لیے درسِ عبرت پوشیدہ ہے، لکھتے ہیں:

"سنو صاحب! نفسانیت کا بُرا ہو، اکابرِ امت میں باہم کیا کیا ناخوش ناشائستہ کلام درمیان آئے ہیں۔ حکیم شفائی صفاہانی نے مولانا عرفی شیرازی کی

کیا کیا مذمتیں کی ہیں ..... اور یقین ہے کہ عرفی و شفائی کے زمانے میں اسی قدر تقدیم و تاخیر ہو جتنی برہان و غالب کے عہد میں ہے۔ علمائے ماوراء النہر اور علمائے مشہد میں ایسے مکاتبات کی آمد و رفت درمیان رہی ہے کہ فریقین کی توہین و تفرین سے مملو ہے بلکہ خود شاہِ ایران اور سلاطینِ روم کے درمیان وہ نامے جاری ہوئے ہیں جن میں سراسر مغلظ گالیاں مرقوم ہیں۔ غرض اس اظہار سے یہ ہے کہ جہاں عمائدِ اہلِ اسلام و سلاطینِ اہلِ اسلام کی وہ باہم ناسزا تحریریں صفحۂ روزگار پر یادگار رہیں گی، وہاں تمہاری ہماری بھی بدکہاؔ صفحۂ دہر پر نمودار رہے گی۔ نہیں نہیں ؟ صرف اللہ کا نام رہ جائے گا اور کچھ نہیں۔"

مختصر یہ کہ "تیغ تیز" سترہ فصلوں میں تمام ہوتی ہے۔ غالب کے بیشتر ایرادات میں وزن ہے لیکن یہ جس عبارت و روش سے رقم ہوئے ہیں، ان کی قباحت اپنی جگہ ہے۔ "برہان" کے پورے مباحثے میں مالک رام صاحب کے لفظوں میں "جس طرح شرم و حیا اور تہذیب و شرافت کی مٹی پلید ہوئی، وہ ہماری ادبی تاریخ کا بہت ہی افسوسناک باب ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر "البادی اظلم" کے اصول سے دیکھا جائے تو اس کے لیے بہت حد تک مرزا غالب خود ذمہ دار تھے۔ انھوں نے اپنی "درشت گفتاری" کی جو توجیہہ[1] کی ہے وہ بہت بودی ہے۔ کوئی لاکھ "سپاہی زادہ" ہوا کرے، اسے ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کا مذاق یا تمسخر اڑائے یا اسے سخت سست کہے۔ خاص کر جب بحث کا موضوع بھی علمی اور تحقیقی ہو۔ بے شک مرزا غالب نے اپنی تحریر میں شوخ طبعی اور بذلہ سنجی کے جوہر دکھائے ہیں، لیکن علمی مسئلوں کی تحقیق میں شوخی اور ظرافت نہیں، متانت اور سنجیدگی درکار ہے۔ اسی لیے مفتی میر محمد عباس نے انھیں ٹوکا تھا کہ آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ اس کا ایک نتیجہ نکل سکتا تھا کہ مخالف بھی ترکی بہ ترکی جواب دے، یا پھر ان سے نیچی سطح پر آکر گالیاں دینے لگے۔ ہوا بھی یہی، چوں کہ وہ ظرافت کے اہل نہیں تھے پھکڑ پر اتر آئے ...." (ذکر غالب، صفحہ ۲۰۲)

"تیغ تیز" کے متن کے بعد "اللہ اکبر" کے زیرِ عنوان ایک ادبی استفسار ہے۔ اس کے آغاز

---

[1] یہ "توجیہہ" "قطعہ غالب" میں پیش کی گئی ہے۔

کی عبارت بقلمِ غالب یہ لکھتے ہیں : "صاحبانِ قوتِ ناطقہ و قوتِ عاقلہ سے کہ وہ مقربانِ بارگاہِ مبدءِ فیاض ہیں، غالب کی یہ استدعا ہے کہ جب یہ تحریر کہ گویا استفسار ہے، نظر سے گزرے تو احد اللغتین میں سے جو لغت صحیح ہو، اس کی صحت اور لغتِ غلط کی غلطی لکھ کر خاتمۂ عبارت پر اپنا نام لکھ دیں۔ یہ عبارت چھاپی جائے گی۔ اس واسطے ضرور ہے کہ فتوے میں توضیح ہو۔"
سولہ سوالات کیے گئے ہیں۔ اس میں ہر سوال کے آخر میں "مع" (مصنف کا اختصار) درج ہے۔ گویا ہر سوال خود غالب کی طرف سے ہے۔ اور ہر جواب کے بعد "محمد الدعو بہ مصطفیٰ" مرقوم ہے۔ یہ غالب کے شاگرد نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ ہیں۔ ان جوابات کے موید تین اصحاب ہیں جن کے کلمات اور اسمار بالترتیب یہ ہیں :

* سب جواب مجیب کے صحیح ہیں : الطاف حسین پانی پتی عفی اللہ تعالیٰ عنہ
* سب جواب دونوں مجیبوں کے باصواب ہیں : محمد سعادت علی مدرس، گورمنٹ سکول دہلی
* ہر شانزدگانہ سوال کے جواب میں، میں بھی نواب محمد مصطفیٰ خاں صاحب کا ہم زبان و ہم داستاں ہوں : الراقم الآثم محمد الملقب بہ ضیاء الدین عفی عنہ

مجیب یعنی شیفتہ اور موید ین میں دو : حالی اور ضیاء الدین خاں نیّر، غالب کے شاگرد ہیں، محمد سعادت علی معروف آدمی نہیں ہیں "سوالاتِ عبدالکریم" کے آخر میں جو استفسار ہے، اس کا جواب دینے والوں میں بھی یہ ہیں۔ قاضی عبدالودود نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ :

"غالب کو یہ نہ سوجھا کہ جب میں کلُ ہندوستانی فارسی دانوں کو خواہ وہ شاعر ہوں یا فرہنگ نگار نامعتبر قرار دے چکا ہوں تو ہندوستانیوں سے فتویٰ لینے کے کیا معنی ؟ اور نہ یہ بات ان کے ذہن میں آئی کہ جو اصحاب خود میری فارسی دانی کے قائل نہیں وہ میرے معتقدین و تلامذہ کو کیا خاطر میں لا سکتے ہیں ....." (آثارِ غالب، در علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، ص ۳۵)

قاضی عبدالودود[۱] اور سید وزیر الحسن عابدی[۲] نے اس "استفسار" پہ سوال بہ سوال دادِ تحقیق

---

[۱] آثارِ غالب در : علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۳۵-۴۴

[۲] افاداتِ غالب، لاہور، ۱۹۶۹ء، دیباچہ صفحہ ۲۹-۳۶

دی ہے جو اہمیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد) کے پاس "تیغِ تیز" اور اس سلسلے کی دوسری کتابوں کا بہت نادر مسالہ اور ذخیرہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کی اشاعت کے لیے کوشاں بھی رہے ہیں، پھر نہ معلوم کیا بجوگ پڑا..... امتیاز علی عرشی کے نام ایک خط مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر صاحب نے یہ نوید دی ہے کہ وہ "تیغِ تیز" کو شائع کرنے والے ہیں:

"جیسا کہ معلوم ہے، تیغِ تیز آغا احمد علی کی کتاب "موید البرہان" کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس لیے مجھے "موید" کی تلاش ہوئی۔ بہت تلاش کے بعد "موید" کا وہ نسخہ ہاتھ آیا جس کے حاشیے پر غالب نے جابجا یادداشتیں لکھ لی تھیں (جو اکثر اُردو میں ہیں) اور انہیں یادداشتوں کو بعد میں "تیغِ تیز" کی شکل میں ڈھال دیا۔ کئی برس ہوئے، میں نے ان یادداشتوں کو بعینہٖ نقل کر لیا تھا۔ اب سنتا ہوں کہ وہ کتاب (جو ایک دوست کے توسط سے مجھے مستعار ملی تھی) سرکاری کتب خانے سے کوئی صاحب لے اڑے۔ اس کی جگہ "تعزیراتِ ہند" کا ایک نسخہ کتب خانے میں داخل فرمادیا! تیغِ تیز کو میں شائع کرنے والا ہوں (اور بطور اس کے ضمیمے کی یہ یادداشتیں بھی)، کاغذ کے نہ ملنے کے باعث اشاعت ملتوی ہے۔ یہ کل ۱۲۰ یادداشتیں ہیں....."

(نقوش، لاہور خطوط نمبر، ۱۹۶۸ء، جلد ۲، صفحہ ۲۳)

۱۴ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے خط میں، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولانا امتیاز علی عرشی ہی کو لکھتے ہیں:

"ارادہ ہے کہ غالب کی تیغِ تیز کو شائع کروں۔ نقل اس کی مرتب ہو چکی۔ یہ ارادہ قاضی عبدالودود صاحب کو لکھا تھا۔ انہوں نے بڑے اصرار سے لکھا کہ "لطائفِ غیبی" اور "سوالاتِ عبدالکریم" کو بھی اس میں شامل کر دو۔ میں نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا، اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں دوسروں کے نام سے چھپی ہیں۔ البتہ "لطائف" اور "سوالات" اگر ایک مجلد میں شائع ہوں تو بے جا نہیں۔ یہ لکھ کر ان سے طالب ہوا کہ "سوالات" کا نسخہ ان کے پاس، یا پٹنے میں کہیں

اور ہو تو بھیجیں۔ انھوں نے رامپور اور لاہور تک گھوڑے دوڑا دیے۔ خیر، اب ایک نقل سوالات کی منشی مہیش پرشاد صاحب سے مل گئی۔ "لطائف" کی نقل میں نے خود کرلی ہے، مقابلہ بھی ہو گیا ہے۔ اب رہا مقدمہ، سو یہ مقدمہ پیچیدہ ہے..... میں نے جو ان چیزوں کے شائع کرنے کا قصد (کیا) ہے، سو محض اس لیے کہ غالب کی اُردو انشاپردازی کی (خطوط سے الگ) ایک صنف پیش ہو جائے اور ان کے مناظرے کا ڈھنگ سامنے آجائے، اس لیے کہ انشاپردازی کے کمال کے علاوہ غالب کے کمال کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔ اب اگر مقدمہ، جیسا کہ آپ چاہتے ہیں، لکھا جائے تو اس کتاب کے پڑھنے والوں کا ذہن ادھر منتقل ہو جائے گا۔ اسی شش و پنج میں، میں نے ابھی تک کچھ لکھا نہیں۔ میری رائے زیادہ اس طرف جھکتی ہے کہ یہ چیزیں مختصر دیباچوں کے ساتھ شائع کی جائیں۔ رہی اصل بحث کہ غالب نے جو اعتراض "برہان" پر کیے، ان کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ایک علاحدہ تالیف کا مضمون ہے اس کام کو کوئی اور صاحب کردیں تو بہت اچھا....." (نقوش، لاہور، خطوط نمبر ۱۹۶۸ء، جلد ۳، صفحہ ۲۷)

"تیغِ تیز" غالب کے اخیر زمانے کی یادگار ہے اور اس بحث کے سلسلے کی غالب کے قلم سے یہ آخری چیز ہے۔ یہ رسالہ ان کی زندگی میں ایک ہی بار چھپا۔ "غالب صدی" پر یا اس کے قریب قریب "تیغِ تیز" کی مندرجہ ذیل تین اشاعتیں عمل میں آئیں:

* در: قاطع برہان و رسائلِ متعلقہ، صفحہ ۲۶۱-۲۹۵، قاضی عبدالودود، پٹنہ، ۱۹۶۷ء
* در: مجموعۂ نثرِ غالب اُردو، صفحہ ۱۷۵-۲۱۷، خلیل الرحمٰن داؤدی، لاہور، ۱۹۶۷ء
* در: افاداتِ غالب، ۴۰-۱۷، صفحات، سیّد وزیرالحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۹ء

☆

ساتواں باب

اِنتخابات و مُتفرّقاتِ غالب :

اُردو / فارسی : نظم و نثر

۱- (ا) گُلِ رعنا، بخطِ غالب، نسخۂ لاہور ۱۸۲۸ء

(ب) گُلِ رعنا، مطبوعہ لاہور ۷۰ - ۱۹۶۹ء

(ج) گُلِ رعنا، مرتّبہ: مالک رام، دہلی ۱۹۷۰ء

(د) گُلِ رعنا، مرتّبہ: سید قدرت نقوی، کراچی ۱۹۷۵ء

۲- (ا) باغِ دودر، مرتّبہ: سید وزیر الحسن عابدی

(ب) سبدِ باغِ دودر، متعارفہ: مولانا امتیاز علی خاں عرشی

۳- متفرقاتِ غالب، مسعود حسن رضوی ادیب

۴- آثارِ غالب/ مآثرِ غالب، قاضی عبدالودود

۵- نامہائے فارسی غالب، اکبر علی ترمذی

۶- انتخابِ غالب، مولانا امتیاز علی خاں عرشی

۷- انتخابِ غالب، محمد عبدالرزاق

۸- فرہنگِ غالب، مولانا امتیاز علی خاں عرشی

"گلِ رعنا" بخطِ غالب

ایک نادر مخطوطہ، مکتوبہ ۱۸۲۸ء

"گلِ رعنا" غالب کے فارسی اور اُردو کلام پہلا انتخاب ہے جسے غالب نے اپنے کلکتہ کے دوران قیام[1] میں اپنے ایک دوست مولوی سراج الدین احمد[2] کی فرمائش پر، جو اس زمانے میں کلکتہ میں مقیم تھے، مُرتّب کیا۔

کلکتے کا سفرِ دور دراز غالب نے خوشی سے اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ اس زمانے میں اپنی خاندانی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں بے حد پریشان خاطر اور مُضطرب تھے اور مطالب دشوار در پیش تھے، ایسے میں مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش کو پُورا کرنا، باہم گہرے مخلصانہ روابط پر دلالت کرتا ہے۔

مولوی سراج الدین احمد سے وقتی مودّت کا تعلق نہیں تھا، یہ رشتۂ موانست غالب کو عمر بھر عزیز رہا۔ اخیر عمر کے ایک خط موسومہ غلام غوث بیخبر میں بھی غالب نے مولوی سراج الدین احمد کے اخلاص کو حاصلِ حیات ٹھہراتے ہوئے اُن کے حُسنِ سیرت کو حسرت سے یاد کیا ہے:

"ستر برس کی عمر ہے۔ بے مبالغہ کہتا ہوں ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں زمرۂ خواص میں سے، عوام کا شمار نہیں۔ دو مخلص

۱؎ دیکھیے ایک قیمتی مضمون: غالب کا کلکتہ: پروفیسر حمید احمد خاں، ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۵۰ء، صفحہ ۲۴ - ۲۷

۲؎ مولوی سراج الدین احمد کے حالات کے رجوع کیجیے:

ا) آثارِ غالب، قاضی عبدالودود، صفحہ ۵۷ و بہ بعد، در علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۴۹ - ۱۹۴۸ء

ب) بزمِ غالب، عبدالرؤف عروج، ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ۱۹۶۹ء ص ۱۹۱ - ۱۹۲

صادق الولادیکھے۔ ایک، مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ، دوسرا
منشی غلام غوث سلمہٗ اللہ تعالیٰ، لیکن وہ مرحوم حسنِ صورت نہیں
رکھتا تھا اور خلوص اخلاص اُس کا خاص میرے ساتھ تھا[۱]۔"

بہر نوع کلامِ غالب کا یہ مجموعہ موسوم بہ "گلِ رعنا" ترتیب پانے کے سوا سو سال سے بھی زیادہ گوشۂ گمنامی میں رہا اور منصّۂ شہود پر نہ آسکا۔ اس مجموعے کے آغاز اور خاتمے کی فارسی نثری تحریریں اگر پنج آہنگ[۲] (۱۸۴۹ء) اور پھر کلیاتِ نثرِ غالب[۳] (۱۸۶۸ء) میں شامل نہ ہوجاتیں تو اہلِ علم شاید اس مجموعے سے یکسر بے خبر ہی رہتے۔ ۱۸۹۷ء میں حالی نے اپنی کتاب "یادگارِ غالب" میں "دیوانِ ریختہ" کے تحت گفتگو کا آغاز "گلِ رعنا" سے کیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں مولانا حسرت موہانی نے غالب کا اُردو دیوان اپنی شرح کے ساتھ شائع کیا تو اس کے ضمیمے کے طور پر "گلِ رعنا" سے کچھ ایسے اشعار درج کیے جو مطبوعہ اُردو دیوان میں موجود نہیں تھے۔ حسرت موہانی کے لفظ یہ ہیں، مرزا غالب نے:

"اپنے دیوانِ اردو و فارسی کا خود انتخاب کر کے اس کا نام
"گلِ رعنا" رکھا تھا۔ راقم کے پاس اس کا ایک نسخہ
موجود ہے۔ چنانچہ یہ اشعار ضمیمہ اسی سے نقل کیے گئے
ہیں[۴]۔"

مولانا غلام رسول مہر نے اپنی معروف کتاب "غالب" میں کیفیتِ تصانیف کے تحت "گلِ رعنا" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ مجموعہ کبھی شائع نہیں ہوا۔ مولانا حسرت موہانی فرماتے ہیں کہ اس کا صرف ایک حصہ ان کے

۱؎ اردوئے معلیٰ، طبع اول: اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۹ء، صفحہ ۲۸۸

۲؎ پنج آہنگ، طبع اوّل: مطبع سلطانی، قلعہ دہلی ۱۳ رمضان ۱۲۶۵ھ / ۲ اگست ۱۸۴۹ء

۳؎ کلیاتِ نثرِ غالب فارسی، طبع اول: مطبع نولکشور، لکھنؤ، جنوری ۱۸۶۸ء

۴؎ ضمیمہ دیوانِ غالب مع شرح حسرت موہانی، ۱۹۰۶ء، ص ۱۶۱

پاس ہے[۱] مالک رام[۲] اور مولانا امتیاز علی عرشی[۳] نے بھی ایک موقع پر نسخۂ حسرت کو ناقص بتایا ہے لیکن یہ ناتمام، ناقص حصّہ بھی مولانا حسرت موہانی کی وفات (۱۹۵۱) کے بعد، یہ تک نہیں معلوم کہ کہاں گیا اور یہ کہ اب موجود بھی ہے یا تلف ہو چکا ہے۔ اغلب ہے کہ ان کے کتب خانے کے ساتھ ضائع ہو گیا[۴] اس طرح غالب دوست ایک بار پھر اس کتاب اور اس کے مندرجات سے محروم ہو گئے۔

حسنِ اتفاق سے ۱۹۵۷ء میں مالک رام کو "گل رعنا" کا ایک مکمل قلمی نسخہ دستیاب

۱۔ غالب، طبع چہارم، عالمگیر الیکٹرک پریس۔ لاہور، ۱۹۴۶ء ص ۳۸۳

غالب، طبع سوم، ۱۹۴۴ء (ص ۳۸۲) اور طبع دوم ۱۹۴۱ء (ص ۳۸۹) میں مولانا غلام رسول مہر نے لکھا تھا کہ:

"میں جس حد تک معلوم کر سکا ہوں یہ مجموعہ (گل رعنا) کبھی شائع نہیں ہوا۔ سُنا ہے کہ اس کا ایک نسخہ مولانا حسرت موہانی کے پاس ہے"

غالب، طبع اوّل، ۱۹۳۶ء (ص ۲۹۴) میں مولانا غلام رسول مہر نے یہ لکھا تھا کہ:

"میں جس حد تک معلوم کر سکا ہوں یہ مجموعہ (گل رعنا) کبھی شائع نہیں ہوا، اور نہ اس کا کہیں سے پتہ مل سکا ہے"

۲۔ مالک رام، نگار، لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۶۴

۳۔ (الف) امتیاز علی عرشی، دیباچہ، دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، ۱۹۵۸ء، ص ۲۰

(ب) امتیاز علی عرشی، دیباچہ، انتخاب غالب، ۱۹۴۲ء، ص ک

۴۔ حسرت موہانی کے قیمتی ذخیرۂ کتب کا ذکر کرتے ہوئے بابائے اُردو نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ:

"حسرت موہانی کی وفات ہر اعتبار سے صدمۂ عظیم ہے لیکن ایک بات کا مجھے بہت زیادہ افسوس ہے، ان کے کتب خانے میں اُردو کا بہت اچھا اور بیش بہا ذخیرہ ہے۔ بہت سے مخطوطات، پرانے تذکرے، قدیم اساتذہ کا کلام، پرانے اخبار اور رسالے اور بہت سی ایسی (باقی اگلے صفحہ پر)

دستیاب ہوا جس کے حصۂ فارسی کے بارے میں ایک تعارفی مضمون ۱۹۶۰ء کے وسط میں شائع ہوا[1]۔ اس کے کوئی آٹھ برس بعد "گلِ رعنا" کے حصۂ اردو کے تعارف میں مالک رام کا قیمتی مضمون چھپا[2]۔ اس سے پہلے مولانا امتیاز علی عرشی نے اپنے مرتبہ دیوانِ غالب اردو (۱۹۵۸ء) میں مالک رام کے اس مخطوطے سے استفادہ کیا اور اس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا کہ :

> "گلِ رعنا" کے اس مخطوطے میں سالِ انتخاب ناقص رہ گیا ہے، تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ قیامِ کلکتہ کا کارنامہ ہے جو ۴ شعبان ۱۲۴۳ھ (۱۹- فروری ۱۸۲۸ء) سے شروع ہو کر ربیع الاول ۱۲۴۵ھ (ستمبر ۱۸۲۹ء) میں ختم ہوا تھا[3]۔"

خوبیٔ قسمت ۱۹۶۹ء میں عین ان دنوں جب غالب کے صد سالہ جشن کا زور شور تھا، راقم الحروف کو "گلِ رعنا" کے ایک اہم تر اور نادر و نایاب مخطوطے کا سراغ ملا ۔ یہ

(حاشیہ گزشتہ صفحے سے آگے) .... مطبوعات ہیں جو اب نایاب ہیں اور جو انھوں نے بڑی احتیاط اور محنت سے جمع کی تھیں، میں نے بارہا اس طرف توجہ دلائی اور کہا کہ اس ذخیرے کو کسی ایسی جگہ محفوظ کر دیجیے کہ تلف ہونے سے بچ جائے ..... اب اُن کے انتقال کے بعد نہ معلوم اس کا کیا حشر ہوگا۔ ہماری بیشمار عزیز چیزیں، خاص کتب خانے تباہ و برباد ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں اُن کو تلف ہونے سے بچانا ہمارا بہت بڑا فرض ہے ۔"

(چند ہم عصر، مطبوعہ ۱۹۵۹ء، ص ۳۶۳)

[1] مالک رام، نگار، لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۱۲، یہ مضمون افکار، کراچی غالب نمبر فروری مارچ ۱۹۶۹ء میں بھی انتخاب ہوا (ص ۱۶۹-۱۶۸)

[2] نذرِ ذاکر، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۳۹۷-- ۴۲۰ : مقالہ: "گلِ رعنا" — غالب کا گم شدہ انتخاب ۔"

[3] دیباچہ دیوانِ غالب اردو، نسخۂ عرشی، ۱۹۵۸ء، ص ۲۱ نیز ص ۸۱-۸۲

سارے کا سارا غالب کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ فروری ۱۹۶۹ء میں اس مخطوطے کا تعارف راقم الحروف نے اپنی کتاب "اشاریۂ غالب" میں شامل کیا اور اس مخطوطے کے چار متفرق صفحات کے عکس بھی شائع کیے۔[1] اس کے بعد یہ تعارفی سطور اور تصاویر "نقوش" کے غالب نمبر حصہ دوم میں شائع ہوئیں۔[2]

"گلِ رعنا" کا یہ پورا مخطوطہ بخطِ غالب ہے اور اس اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ میں نے اس مخطوطے کی دریافت کی اطلاع منجملہ اور غالب دوستوں کے اکبر علی خان عرشی زادہ (رامپور) کو دی عرشی زادہ کی ایک نگارش "مخطوطہ گلِ رعنا بخطِ غالب: غالبیات میں ایک اور بیش بہا دریافت" کے عنوان سے ہماری زبان، علی گڑھ شمارہ یکم ستمبر ۱۹۷۰ء (صفحہ ۳ تا ۶) میں شائع ہوئی۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ "گلِ رعنا" کے نسخوں میں سے وہ:

"نسخہ بھی جو اب تک کے معلوم نسخوں میں سب سے زیادہ اہم، زیادہ قابلِ قدر اور زیادہ لائقِ اعتبار ہے دریافت ہو گیا ہے اس اطلاع کے لیے میں اپنے کرم فرما دوست جناب سید معین الرحمٰن کا شکرگزار ہوں۔ موصوف نے یہ بھی کرم فرمایا کہ مجھے ازرہِ لطف نو دریافت مخطوطۂ "گلِ رعنا" کے عکس ارسال کیے۔ اِن عکسوں کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ نو دریافت "گلِ رعنا" وہی اصل نسخہ ہے جو پہلے پہل غالب نے اپنے قلم سے نقل کیا تھا۔ غالب کی تصانیف کے معلومہ مخطوطوں میں ۱۲۳۱ھ کے مکتوبہ دیوانِ اُردو کے بعد یہ دوسرا مخطوطہ ہے جسے تمام و کمال بخطِ غالب ہونے کا شرف حاصل ہے اب فارسی و اُردو کے تقریباً نو سو اشعار اور چند فارسی نثروں کی

[1] اشاریۂ غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، فروری ۱۹۶۹ء ص ۳۹۹ - ۴۰۸

[2] نسخۂ گلِ رعنا (بخطِ غالب)، نقوش، لاہور، غالب نمبر، حصہ دوم اکتوبر ۱۹۶۹ء ص ۳۲۷ - ۳۳۳

تصحیح ہو سکے گی اور بعض اہم اختلافات کا ذکر ہو گا۔"[1]

غالبیات میں "گلِ رعنا" کی بڑی اہمیت ہے۔ نو دریافت دیوانِ غالب بخطِ غالب کے بعد یہ واحد مجموعہ ہے جو پورے کا پورا غالب کا خود نوشتہ ہے اس سے غالب کے اندازِ نگارش اور روشِ املا کے ضمن میں بہت سی باتیں نظر کے سامنے آتی ہیں اور اس کی بنیاد پر غالب کی روشِ تحریر اور املا کے بارے میں بعض نتیجے استنباط کیے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں کہ:

> "گزشتہ سال (۱۹۶۹ء) میں لاہور میں "گلِ رعنا" کا ..... ایک ایسا نسخہ ملا تھا جس کو غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا تسلیم کیا گیا ہے ..... اس مخطوطے کو صرف خط کی پہچان کی بنا پر غالب کا لکھا ہوا مانا گیا ہے۔ سید معین الرحمٰن کے تعارف کے ساتھ اس کے چار صفحوں کے جو عکس "نقوش" غالب نمبر حصہ دوم میں شائع ہوئے ہیں، اُن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خط اور اندازِ کتابت بالکل غالب کے نو دریافت نسخے ..... کے مطابق ہے۔"[2]
>
> (ہماری زبان، علی گڑھ، ۱۵۔ نومبر ۱۹۷۰ء)

بلاشبہ "گلِ رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے اور نو دریافت نسخۂ دیوانِ غالب کا خط اور اندازِ کتابت بڑی حد تک ایک ہی ہے اور جہاں تہاں کچھ فرق ہے بھی تو اُسے اِن دونوں خطی نسخوں کے لکھے جانے کے درمیان جو زمانی فصل ہے اُس کا قدرتی نتیجہ خیال کرنا چاہیے۔

نو دریافت دیوانِ غالب بخطِ غالب کو زیادہ تر ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء اور بعض صورتوں میں ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء کا لکھا ہوا مانا گیا ہے۔ "گلِ رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے کے لکھنے کا کام غالب نے بالیقین ۱۸۲۸ء میں مکمل کیا۔ بارہ برس تو ایک خاصی

---

[1] ہماری زبان، علی گڑھ، یکم ستمبر ۱۹۷۰ء، ص۵

[2] بحوالۂ: نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، ص۵۶۵

مدت ہوتی ہے، اوائل عمر کے سات برس بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ عمر اور وقت کے ساتھ ساتھ طرزِ تحریر اور روشِ املا میں خفیف فرق پڑ جانا یا پیدا ہو جانا۔ کچھ تعجب خیز نہیں لیکن غالب قبل از وقت پختہ ہو جانے والی فطرت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ روشِ تحریر بھی اُن کی جو بننا تھی کم عمری ہی میں بن گئی اور یہ اتنی متعین تھی کہ اس میں عمر یا وقت کے ساتھ کسی انقلابی یا بنیادی تبدیلی کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی چنانچہ نو دریافت دیوان اور "گلِ رعنا" کے اُن خطی نسخوں کا، جو اُن کے شباب کی یادگار ہیں اُن کی اخیر عمر کی قلمی تحریروں سے، جس کی ایک بہت بڑی تعداد کے روشن عکس "مرقعِ غالب" (از: پرتھوی چندر) میں موجود ہیں، موازنہ کیا جائے تو کوئی ایسی بڑی تبدیلی نظر نہیں آتی کہ خط کا مجموعی تأثر ہی بدلا نظر آئے۔

"گلِ رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے کا اندازِ خط اور املا، غالب کا اپنا معروف اور جانا پہچانا ہے۔ اس میں اور غالب کے قلم سے اس سے پہلے اور بعد کی تحریروں میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ یہ نستعلیق کے شفیعا خط کا اچھا نمونہ ہے اور باہتمام قلم سنبھال کر لکھا گیا ہے، اس لیے غالب کے خط سے ذرا بھی آشنا، عام شخص تک بلا تامل کہہ سکتا ہے کہ یہ غالب ہی کا خط ہے اور "گلِ رعنا" کا یہ نسخہ غالب کا خود نوشتہ ہے۔

اکبر علی خاں عرشی زادہ کو راقم الحروف نے "گلِ رعنا" کے چار صفحات کے عکس بھیجے تو انھوں نے یہ عکس مولانا امتیاز علی عرشی کے ملاحظے میں پیش کیے، موصوف نے بھی تصدیق فرمائی کہ :

"بلا شبہ، یہ غالب کا خط ہے[۱]"

اوائل مئی ۱۹۶۹ء میں مخطوطہ "گلِ رعنا" کے آخری صفحے کا ایک عکس میں نے مالک رام کی خدمت میں بھی ارسال کیا تھا، ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۹ء کے مرقومہ اپنے ایک خط میں جو آبادہ دہلی سے لکھتے ہیں :

"آپ بھی کہیں گے کہ ۲۔ مئی کے خط کا جواب ۱۷۔ اکتوبر کو دے رہا

---

[۱] ہماری زبان، علی گڑھ، یکم ستمبر ۱۹۷۰ء، ص ۵

ہوں، لیکن باور فرمائیے، یہ تاخیر اختیاری نہیں تھی، جن ایام میں آپ کا خط ملا ہے، میں بہت بیمار اور یہاں سے باہر جانے کی فکر میں تھا۔ میں ۱۲-کو یہاں سے روس اور یورپ کے لیے روانہ ہوا.... جو عکس آپ نے روانہ کیا تھا وہ غالب ہی کے ہاتھ کی تحریر کا تھا، اس میں کوئی شبہ نہیں۔ خود میرے پاس "گلِ رعنا" کا ایک نسخہ ہے، لیکن کسی کاتب کا لکھا ہوا۔"

○

"گلِ رعنا" کا یہ زیرِ بحث، اہم اور بے بہا نسخہ جس کی دریافت اور نشاندہی کی عزت راقم الحروف کو حاصل ہوئی، جناب خواجہ محمد حسن[1] کی ملکیت ہے، جنہیں کوئی نصف صدی سے اس نسخے کے تملک کا شرف حاصل ہے اور یہ تبرک انھیں اپنے نانا خواجہ احمد اللہ مرحوم[2] سے ورثے میں ملا۔

---

[1] خواجہ محمد حسن بڑی خوبیوں کے بزرگ ہیں، وہ ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے وقت امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آئے اور مصروف کاروباری زندگی بسر کرنے کے بعد ایک طرح سے ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں، لیکن اس پیرانہ سالی کے باوجود توانائی اور قوتِ عمل کے اعتبار سے اُن کی زندگی آج کل کے نوجوانوں سے زیادہ بھرپور ہے۔ خواجہ صاحب کے تین صاحبزادے ہیں اور ماشاء اللہ تینوں عملی زندگی میں بڑے کامیاب ہیں۔ سب سے بڑے تجمل حسین مرچنٹ، ایئر فورس میں ونگ کمانڈر ہیں، منجھلے خالد حسن، بہت اچھے آرٹسٹ ہیں اور مستقلاً لندن میں بس گئے ہیں، چھوٹے حسن طارق مرحوم، پاکستان کے مشہور فلم ڈائرکٹر رہے ہیں۔

[2] خواجہ احمد اللہ مرحوم امرتسر میں کشمیری شالوں کے بہت بڑے سوداگر تھے اور اپنے اس کاروبار کے سلسلے میں اُن کا اکثر دلّی آنا جانا رہتا تھا۔ اُنھوں نے ۸۵ اور ۹۰ برس کے درمیان عمر پائی اور ۱۹۱۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔

"گلِ رعنا" کا یہ قلمی نسخہ بخطِ غالب ہے اور یہ خصوصیت، بجائے خود اس نسخے کو دیگر معلوم نسخوں پر امتیاز بخشتی ہے۔ اس مخطوطے کی ایک دوسری وجۂ امتیاز اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس سے پہلی بار، اس انتخاب کی تاریخ ترتیب معلوم ہوتی ہے جو دیگر ماخذ میں ناقص رہ گئی ہے۔

"گلِ رعنا" کے قلمی نسخے، بخطِ غالب میں، غالب نے دیباچے کے آخر میں غرہ ربیع الاول ۱۲۴۴ھ کی تاریخ درج کی ہے جو "عیسوی شب و روز و ماہ سال" کے مطابق منگل ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ء ہوتی ہے۔ اس طرح "گلِ رعنا" کی تاریخ تالیف پہلی بار سامنے آرہی ہے اور یہ اطلاع ادبِ غالب میں قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا غلام رسول مہر فرماتے ہیں:

> "یہ امر بطور خاص توجہ طلب ہے کہ "اشاریۂ غالب" (از سید معین الرحمٰن) میں اُس نسخہ گلِ رعنا کے چار صفحوں کا عکس چھاپا گیا ہے جو خود میرزا غالب کے قلم کا لکھا ہوا ہے اور اس سے پہلی مرتبہ "گلِ رعنا" کی ترتیب کی قطعی اور مُستند تاریخ منظرِ عام پر آئی یعنی غرہ ربیع الاول ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ء۔ دیکھیے: ضمیمہ اشاریۂ غالب صفحہ ۳۹۹ تا ۴۰۸ [1]

> "غالب، ۲۱۔ فروری ۱۸۲۸ء (۴۔ شعبان ۱۲۴۳ھ) کو (پنشن کی تقسیم کے قضیے کے سلسلے میں) کلکتے پہنچے۔ یہاں پہنچ کر اُنھوں نے ۲۸۔ اپریل ۱۸۲۸ء کو اپنی درخواست گورنر جنرل باجلاس کونسل کی خدمت میں پیش کی تو انھیں دفتر کی طرف سے حکم موصول ہوا کہ: "یہ پہلے دلّی میں انگریز ریذیڈنٹ کے سامنے پیش ہونا چاہیے۔ اس کی رپورٹ پر یہاں مناسب کارروائی کی

---

[1] (i) سہ ماہی اُردو ادب، علی گڑھ، شمارہ ۳، ۱۹۷۰ء، ص ۱۰۶

(ii) نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، ص ۲۱۳

جائے گی۔" میرزا غالب کے لیے یہ ناممکن تھا کہ واپس دلی آتے اور پھر دوبارہ ہفت خواں طے کر کے کلکتے پہنچتے۔ اس لیے وہ خود تو کلکتے ہی میں رہے اور دلی ریذیڈنسی میں مقدمے کی پیروی کے لیے خط کے ذریعے سے لالہ ہیرالال کو اپنا وکیل مقرر کر دیا۔ ان دنوں دلی میں سر ایڈورڈ کولبروک ریذیڈنٹ تھے۔ کولبروک صاحب نے ۲۴۔ فروری ۱۸۲۹ء کو ان کے حق میں رپورٹ صدر کو بھیج دی جس میں اُن کے دعوے کی تائید تھی۔ دلی سے ابتدائی رپورٹ کے حاصل کرنے ہی میں دس مہینے کا طویل زمانہ گزر گیا اور میرزا یہ سارا عرصہ بیکار کلکتے میں بیٹھے رہے۔"[۱]

اس "بیکاری" لیکن بے کلی کے زمانے میں غالب نے ستمبر ۱۸۲۸ء میں "گلِ رعنا" ترتیب دی۔ یہ تاریخ "گلِ رعنا" کے دیباچے کی ہے۔ خاتمے پر کوئی تاریخ ثبت نہیں۔ یہ انتخاب بہت ضخیم نہیں ہے۔ اس لیے اگر ستمبر ۱۸۲۸ء کو آغازِ کار کی تاریخ فرض کر لیا جائے تو بھی اس انتخاب کی ترتیب اور نقل کا کام ۱۸۲۸ء ہی میں انجام پا گیا ہوگا۔ کیونکہ غالب اس عرصے میں "بیکار" تھے اور پھر ایک صادق الولا دوست، مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش تھی۔ بنا بریں تعمیلِ ارشاد میں تاخیر روا نہ رکھی گئی ہوگی۔ لیکن اس قیاس آرائی کی گنجائش اسی صورت میں ہے کہ ستمبر ۱۸۲۸ء کو کارِ نقل کے آغاز کی تاریخ پر اصرار کیا جائے، ورنہ زیادہ قرینِ قیاس حقیقت یہی ہے کہ "گلِ رعنا" کی تحریر و ترتیب کے بعد دیباچہ لکھا گیا، جیسا کہ تصنیف و ترتیب کے کام سے متعلق اصحاب کا قدرتی طور پر ہمیشہ سے بالعموم شیوہ رہا ہے۔ غالب نے دیباچے میں اس مجموعے کا جس انداز اور جن کلمات سے تعارف کرایا ہے، اس سے یہی ظاہر بھی ہوتا ہے۔

"گلِ رعنا" کا یہ بیاض نما مخطوطہ (ایک ورق کے بقدر ناقص الاول) ۸۸ صفحات

---

[۱] مالک رام، ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی ۱۹۶۴ء ص ۶۹-۷۰

پر مشتمل ہے۔ اصل مخطوطے کا سائز ساتِ انچ طول میں اور چار انچ عرض میں ہے کسی صفحے پر کوئی جدول نہیں۔ کنارے سے کچھ ہی اندر کی طرف عبارت شروع ہو جاتی ہے کتاب کا مسطر دیباچے اور خاتمے کی فارسی نثری تحریروں میں بالعموم چودہ سطری ہے۔ انتخاب کلام کی روشِ تحریر زیادہ تر دائیں سے بائیں سیدھی اور صاف ہے اور سترہ سطری مسطر پر ہے۔ لیکن یہ روشِ تحریر بعض صورتوں میں ترچھی مربع نما بھی ہے اور کہیں کہیں دو کالمی بھی۔ اِس صورت میں مسطر کا لحاظ ممکن نہ تھا لیکن یوں بھی مسطر کی پابندی سختی سے کی ہی نہیں گئی ہے۔

اکثر ہلکے آسمانی یا بادامی رنگ کا بدیسی کاغذ، غالب کے زیرِ استعمال رہا ہے۔ اس مخطوطے کا کاغذ بھی ہلکا بادامی ہے، ممکن ہے یہ کبھی سفید رہا ہو لیکن اب کہنگی کے آثار ظاہر ہیں اور رنگ بادامی یا اصلاً ہی تھا، یا اب ہو گیا ہے۔ مخطوطے کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے، اوراق کے کنارے مڑ گئے ہیں، بعض صورتوں میں جھڑ بھی گئے ہیں، روشنائی سیاہ استعمال کی گئی ہے۔

اس مخطوطے کے ابتدائی پانچ صفحات میں غالب کا فارسی نثر میں دیباچہ آیا ہے، دیباچے کے اس قلمی متن کی قرأت "پنج آہنگ" (۱۸۴۹ء) اور "کلیاتِ نثرِ غالب" (۱۸۶۸ء) میں شامل "دیباچۂ "گلِ رعنا" کے مطبوعہ متن سے خاصی مختلف ہے۔ اس قلمی دیباچے میں عبارت کے بعض ٹکڑے مطبوعہ سے زیادہ ہیں اور اہمیت کے حامل ہیں۔

غالب نے اس انتخاب کو دو دَروں، دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصّہ "اَشعارِ اُردو" کے انتخاب پر مشتمل ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ میں نے چونکہ ریختہ میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ اس لیے اسی سے آغازِ کتاب کیا، دوسرے حصّے کا نام بہ زبانِ اداشناسان "گلِ رعنا" رکھا گیا۔

زیرِ نظر مخطوطے میں دیباچے کے ابتدائی پانچ صفحات کے بعد صفحہ ۶ سے "یا اسد اللہ الغالب" کا عنوان دے کر اُردو اشعار کا انتخاب ہے۔ پہلی غزل

غالب کی وہی معروف غزل ہے جس سے اُن کے متداول اُردو دیوان کا آغاز ہوتا ہے :

نقش، فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

صفحہ ۱ سے شروع ہو کر صفحہ ۳۴ پہ اُردو اشعار کا یہ انتخاب " مدت ہوئی ہے یار کو مہمان کیے ہوئے" والی مرصّع غزل پر تمام ہوتا ہے ۔ صفحہ ۳۴ ہی پر انتخاب غزلیاتِ اُردو کے فوراً بعد فارسی نثر میں یہ پانچ سطریں ہیں :

" سلسلہ جنبانی وردوم این رنگین چمن موسوم بہ گلِ رعنا در عرض مذاقِ زبانِ پارسی کہ صہبائے حریف افگن است و بادۂ مرد آزما۔ از آنجا کہ ہنوز این گہرہائے شاہوار را بہ رشتۂ نمط حروفِ تہجّی نکشیدہ ام و این اوراقِ پراگندہ را شیرازۂ جمعیت تدوین نبستہ فرو ہیدہ فرہنگان تجردی پیشہ وسنجیدہ آہنگانِ موزونی اندیشہ خردہ بر بے ربطی تحریر نگیرند و عذر تنک سرمایگان فطرت و بے دماغانِ عالم فرصت بپذیرند "

یہ نثر دراصل اس رنگین چمن موسوم بہ " گلِ رعنا " کے وردوم کی " گریز" ہے ۔ ان تمہیدی سطور کے فوراً بعد اگلے صفحے (۳۵) سے فارسی اشعار کا انتخاب شروع ہو جاتا ہے جس کا آغاز " قصیدہ در مدح اسٹرلنگ سے ہوا ہے ۔ اس تمہیدی عبارت سے ایک بڑی اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ " گل رعنا " کی ترتیب و تدوین کے زمانے (ستمبر ۱۸۲۸ء) تک غالب کے فارسی کلام کی حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب یعنی ردیف وار تقسیم عمل میں نہیں آئی تھی ۔

" گلِ رعنا " کے زیرِ نظر مخطوطے کے حصۂ فارسی میں قصیدہ، قطعات اور مثنوی کے اشعار کے علاوہ ستائیس متفرق غزلوں سے اشعار منتخب کیے گئے ہیں ۔ غزلیں بلا قید و ترتیبِ ردیف جمع کر دی گئی ہیں، مثلاً پہلی غزل ردیف " ن " سے، دوسری ردیف " الف " اور آخری غزل ردیف " ر " سے لی گئی ہے ۔ مولانا مرتضیٰ حسین

فاضل لکھنوی کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ:

"گلِ رعنا" میں پہلی مرتبہ فارسی کلام، مرتّب شکل میں ظہور پذیر ہوا۔[۱]
مولانا امتیاز علی نے "گلِ رعنا" کے نسخۂ مالک رام کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے حصۂ فارسی میں تو صرف منتخب غزلیں درج کی گئی تھیں لیکن ریختہ میں سے دو چار غزلیں لے کر باقی میں سے اچھے اچھے شعر چن لیے تھے۔[۲]"

لیکن "گلِ رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے، بخطِ غالب سے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی[۳] اس کے حصۂ فارسی میں صرف غزلیں ہی نہیں، قصیدے اور مثنوی کی اصناف سے بھی شعر منتخب کیے گئے ہیں۔ نیز "منتخب غزلیں" زیادہ تر پوری کی پوری ہی نقل ہوئی ہیں۔ اور "ریختہ میں سے دو چار غزلیں نہیں" بلکہ ایک سَو سے بھی زیادہ غزلیں لی گئی ہیں۔

فارسی اشعار کا انتخاب صفحہ ۳۵ سے شروع ہو کر ۶۹ پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد "خاتمۂ گلِ رعنا" کی دو نثری تحریریں ہیں جو صفحہ ۸۳ کی ابتدائی تین سطروں پر تمام ہوتی ہیں۔ دوسری اور آخری عرضداشت وہ ہے جو اُنھوں نے اودھ کے نائب السلطنت معتمد الدّولہ سید محمد خان بہادر عرف آغا میر کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لکھی تھی۔

غالب، پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتے جاتے ہوئے لکھنؤ میں کئی ماہ ٹھہرے اس عرضداشت کے شروع میں وہ کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں مہربانوں کی توجہ سے میرا ذکر رفتہ رفتہ سید آغا میر کی بزم میں پہنچا جو معتمد الدولہ کے خطاب سے مشرف تھے "از انجاب ایمایِ کششے رفت" ملاقات کا انتظام ہوا۔ اس وقت، غالب

---

[۱] کلیاتِ فارسی غالب، جلد اوّل، لاہور، ۱۹۶۷ء، پیش گفت، ص۱

[۲] دیباچہ دیوانِ غالب اُردو، نسخۂ عرشی، ۱۹۵۸ء، ص ۲۰

[۳] "گلِ رعنا" کا نسخۂ مالک رام شائع ہو چکا ہے (علمی مجلس، دلّی، ۱۹۷۰ء) اس سے بھی عرشی صاحب کے اس بیان کی توثیق نہیں ہوتی۔

کہتے ہیں کہ قصیدہ نہ کہا جا سکا[1] اور صنعتِ تعطیل میں ایک مختصر فارسی نثر لکھ لی :

"طبع از فکرِ قصیدہ تشنگی کرد و سینہ براین آرزو تنگی۔ جنونِ شوقم بہ
بیداریِ نثر انداخت و سوادِ عبارتے ہم در صنعتِ تعطیل روشن ساخت"

"اگرچہ وقت اقتضای دیدن آن جاہ مند نکرد و آن ہوس از سینہ بدر رفت"

اور یہ ملاقات اس وجہ سے نہ ہو پائی کہ غالب نے ملاقات کی جو شرطیں پیش کی تھیں[2] وہ منظور نہ ہوئیں ۔ بہر نوع "گلِ رعنا" کا زیرِ نظر مخطوطہ صفحہ ۸۳ پر بخطِ غالب' آغا میر کے نام صنعتِ تعطیل میں فارسی نثر ان چار سطروں پر تمام ہوتا ہے۔

"خاتمۂ گلِ رعنا" کے فوراً بعد صفحہ ۸۳ ہی کی خالی جگہ سے شکستہ خفی قلم میں "ولہ" "کا عنوان دے کر" مثنوی بادِ مخالف" یا "آشتی نامہ" شروع ہو جاتی ہے۔ "گلِ رعنا" میں منقول اس کی روایت، مثنوی کی مروجہ روایت سے مختلف ہے۔ صفحہ ۸۳ پر اس مثنوی کے بہ ترتیبِ ذیل یہ پندرہ شعر آئے ہیں :

ولہ[3]

اے تماشائیانِ بزمِ سخن	۱	دے مسیحا دمانِ نادرفن
اے گران مایگانِ عالمِ حرف	۲	خوش نشینانِ ایں بساطِ شگرف
اے سخن را طرازِ جان دادہ	۳	صفحہ را سازِ گلستان دادہ[4]
عطر بر مغزِ گیتی افشانان	۴	پہلوانانِ پہلوی دانان[5]

---

[1] غالب نے گو یہ کہا ہے کہ انھوں نے آغا میر کی مدح میں قصیدہ نہیں لکھا، صرف صنعتِ تعطیل میں نثر لکھی لی تھی، لیکن "نامہائے فارسی غالب" (مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء) کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ممدوح کی شان میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کی بعض ابیات میں آغا میر کا نام بھی آیا تھا۔

[2] ان شرائط کے لیے دیکھیے : ذکرِ غالب، مالک رام، طبع چہارم، دہلی ۱۹۶۴ء، ص ۹۷

[3] دیوانِ فارسی، غالب (۱۸۴۵ء) عنوان: پنجمین مثنوی موسوم بہ "بادِ مخالف"

[4] دیوانِ فارسی، ایضاً باعتبارِ ترتیب آٹھواں شعر

[5] دیوانِ فارسی ایضاً نواں شعر

اے گرامی قنانِ ریختہ گو ۵ ملغزِ دریا کشانِ عربدہ جو[1]
اے سخن پرورانِ کلکتہ ۶ وے بلند اخترانِ کلکتہ[2]
ہر یکے صدرِ بزم بادہ گے ۷ شمعِ خلوت سرای کامہ گے[3]
ہر یکے پیشِ تازِ قافلہٴ ۸ ہر یکے کدخدای مرحلہٴ[4]
اے بہ شغلِ وکالت آمادہ ۹ دادِ غمخواریِ جہان دادہ[5]
اے تشکرفانِ عالمِ انصاف ۱۰ بہ سفارت رسیدہ از اطراف[6]
اے رئیسانِ این سوادِ عظیم ۱۱ وے فراہم شدہ ز ہفت اقلیم
ہمچو من آرمیدہٴ این شہر ۱۲ بہرِ کارے رسیدہ در این شہر
اسد اللہ خان ہیچمدان ۱۳ جادہ پیمائے وادیِ حرمان[7]
گرچہ ناخواندہ میہمانِ شماست ۱۴ بے سخن ریزہ چینِ خوانِ شماست[8]
بہ تظلم رسیدہ است این جا ۱۵ بہ امید آرمیدہ است این جا[9]

"دیوانِ غالب فارسی" (۱۸۴۵ء) میں اس مثنوی کے اشعار کی قرأت اور ترتیب "گلِ رعنا" کے آخر میں منقول اس مثنوی سے مختلف ہے۔ دیوان میں اس

---

[1] دیوانِ فارسی، دسواں شعر

[2] دیوانِ فارسی ایضاً: تیسرا شعر، نیز مصرعۂ ثانی: "وی زبان آورانِ کلکتہ"
"متفرقاتِ غالب" (طبع دوم، کتاب نگر، لکھنؤ ۱۹۶۹ء) میں مصرعۂ ثانی کی روایت: "وی بلند افسرانِ کلکتہ"

[3] "دیوانِ فارسی غالب" (۱۸۴۵ء) میں باعتبارِ ترتیب چوتھا شعر [4] دیوانِ فارسی ایضاً: پانچواں شعر

[5] دیوانِ فارسی، ایضاً: چھٹا شعر [6] دیوانِ فارسی ایضاً: ساتواں شعر

[7] دیوانِ فارسی، ایضاً: شعر کی شکل یہ ہے:

اسد اللہ بخت برگشتہ
در خم و پیچ غم سر گشتہ

[8] "متفرقاتِ غالب" (طبع دوم، ۱۹۶۹ء) میں باعتبارِ ترتیب سولہواں شعر

[9] "متفرقاتِ غالب"، ایضاً: چودھواں شعر

مثنوی کا نظرِ ثانی شدہ متن شامل ہے۔ اس نظرِ ثانی میں اشعار کی ترتیب بدل گئی ہے، بعض مؤخر شعر، مقدّم اور بعض مقدّم شعر مؤخر ہو گئے ہیں۔ بعض اشعار میں ترمیم عمل میں آئی ہے اور کچھ اشعار حذف بھی کر دیے گئے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں مسعود حسن رضوی ادیب نے "متفرقاتِ غالب" کے نام سے اپنے ذاتی کتب خانے کی ایک قلمی بیاض سے غالبیات کے سلسلے کا کچھ نیا مواد، ترتیب و توضیح کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس میں یہ مثنوی بھی موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ مثنوی غالب کے کلیاتِ نظم میں" بادِ مخالف" کے نام سے شامل ہے مگر اس میں کہیں کہیں لفظی ترمیم کر دی گئی ہے۔ کہیں کوئی شعر، کہیں کئی شعر گھٹا یا بڑھا دیے گئے ہیں اور کہیں شعروں کی ترتیب بدل گئی ہے۔ ... اس بیاض میں اس کی وہی شکل ہے جس میں وہ کلکتے والوں کے سامنے پیش کی گئی تھی [1]"

"متفرقاتِ غالب" میں شامل" بادِ مخالف کا متن " گلِ رعنا" کے آخر میں منقول اس مثنوی کی قرأت اور ترتیب سے تمام کا تمام تو نہیں، لیکن بڑی حد تک ملتا ہے۔ مثنوی مذکور کی وہ روایت بھی معمولی فرق سے قطع نظر، ان اشعار کی قرأت اور ترتیب سے کم و بیش مطابقت رکھتی ہے جسے حکیم حبیب الرحمٰن خاں مرحوم (ڈھاکا) کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ، غالب کے ایک فارسی مجموعے سے نقل کر کے قاضی عبدالودود نے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن میلینی" جلد ۱، بابت ۱۹۴۸ء میں شائع کیا تھا۔

اس مثنوی کا ایک متن سید اکبر علی ترمذی کی مرتبہ "نا چھائے فارسی غالب [2]" میں بھی شائع ہوا ہے جو کچھ اختلاف کے ساتھ وہی ہے جو غالب کے "دیوانِ فارسی" میں ہے۔ راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ" گلِ رعنا" کے زیرِ نظر مخطوطے کے آخر میں "بادِ مخالف" کی جو شکل ضبطِ تحریر میں آئی ہے، دراصل یہ، اُس صورت میں ہے،

---

[1] متفرقاتِ غالب، طبع دوم، ۱۹۶۹ء، ص ۲۴

[2] نا چھائے فارسی غالب، مرتبہ: سید اکبر علی ترمذی، غالب اکیڈمی، دہلی، ۱۹۶۹ء

جس صورت میں یہ اوّل اوّل سخنورانِ کلکتہ کے سامنے پیش کی گئی تھی۔

غالبیات میں "گلِ رعنا" کی بڑی اہمیت ہے، نودریافت دیوانِ غالب بخطِ غالب (۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء) کے بعد یہ واحد مجموعہ ہے جو پورے کا پورا غالب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس سے غالب کے اندازِ نگارش اور طرزِ املا کے بارے میں بہت سی باتیں نظر کے سامنے آتی ہیں۔ غالب کے اُردو اور فارسی کلام کی تاریخی ترتیب اور فنی ارتقا کے منازل و مراحل کے تعین میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔

"گلِ رعنا" کا یہ مخطوطہ نودریافت دیوان (۱۸۱۶ء) نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) اور نسخۂ شیرانی (۱۸۲۹ء) کے بعد اشعارِ غالب کا قدیم ترین متن پیش کرتا ہے۔ یہ اب سے قریب ڈیڑھ سو برس پہلے کا لکھا ہوا ہے اور خود غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس لیے اختلافِ نسخ ظاہر کرنے کے لیے بھی اس کی بڑی بنیادی اہمیت ہے۔

"گلِ رعنا" (غرۂ ربیع الاوّل ۱۲۴۴/ ۱۱ستمبر ۱۸۲۸ء) میں کچھ ایسا اُردو کلام بھی شامل ہے جو "نسخۂ شیرانی" (۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء) میں موجود نہیں۔ یہ گویا ۱۲۴۲ھ اور ربیع الاول ۱۲۴۴ ہجری کی درمیانی مدت میں لکھا گیا ہے۔ غالب کے فارسی کلام کی پہلی تاریخی حدبندی کرنے میں بھی "گلِ رعنا" کو بڑی بنیادی حیثیت اور اہمیت حاصل ہے۔

اب، اُن تیرہ فارسی رباعیوں کے علاوہ جو نودریافت دیوانِ غالب (۱۸۱۶ء) میں شامل ہیں اور اُس فارسی قصیدے کو چھوڑ کر جو "نسخۂ حمیدیہ" (۱۸۲۱ء) میں "فاتحۃ الکتاب" کے طور پر شامل ہے[2]، غالب کے فارسی کلام کی پہلی تاریخی حدبندی "گلِ رعنا" ہی کی نثروں کی تصحیح بھی ہوتی ہے اور بعض اہم اختلافات کا پہلی بار علم ہوتا ہے۔

o

---

[1] "متفرقاتِ غالب" طبع دوم، ۱۹۶۹ء، ص۲۳

[2] نامہائے فارسی غالب، مرتبہ: سید اکبر علی ترمذی، غالب اکیڈمی، دہلی ۱۹۶۹ء

"گُلِ رعنا"

مطبوعہ لاہور (عابدی) کی حقیقت

"گلِ رعنا" غالب کے اُردو اور فارسی کلام کا اوّلین انتخاب ہے جسے خود غالب نے ستمبر ۱۸۲۸ء میں بمقام کلکتہ، اپنے ایک عزیز دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ "گلِ رعنا" کو غالب کی زندگی میں روزِ اشاعت نصیب نہیں ہوا، اُن کی وفات کے بعد بھی اسے اشاعت کا منہ دیکھنے میں سو برس لگ گئے۔ غالب صدی کے قریب یہ انتخاب، بہ تفصیلِ ذیل، سید وزیر الحسن عابدی کی "توجہات" سے منظرِ عام پر آیا:

تصحیح و تحقیق : سید وزیر الحسن عابدی

ناشر : ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، دانش گاہِ پنجاب، لاہور

زمانۂ طباعت: دسمبر ۱۹۶۹ء تا دسمبر ۱۹۷۰ء

ضخامت : ۳۵۶ صفحات، سائز ۲۰×۲۶/۸

یہ کتاب خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے، کتابیاتی جزئیات کی تفصیل یہ ہے:

۱- پیش لفظ، از ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، ستارۂ پاکستان صفحہ ۳

۲- مقدمہ، از مرتب: سید وزیر الحسن عابدی (۶۶ صفحات) ۱۵-۸۱

۳- متن "گلِ رعنا" از غالب: (۱۲۸ صفحات)

i - دیباچہ "گلِ رعنا" از غالب ۱-۸

ii - انتخابِ کلامِ اردو ۱۱-۶۵

iii - تمہید انتخابِ کلامِ فارسی ۶۷

iv - انتخابِ کلامِ فارسی ۶۹-۱۱۸

v - خاتمہ "گلِ رعنا" از: غالب ۱۱۹-۱۲۸

کتاب کے آخری نو صفحات (۲۶۸ - ۲۷۶) "غلط نامہ" پر مبنی ہیں۔ اس میں (صفحہ ۲۶۸- ۲۷۲) مقدمے، متن اور تعلیقات کی ایک سو سے خاصی زیادہ اغلاط کی تصحیح کی گئی ہے۔ "تصحیح مزید" (صفحہ ۲۷۳ - ۲۷۶) کے تحت مقدمے، متن اور تعلیقات کی مزید ایک سو سے زیادہ غلطیاں درست کی گئی ہیں "توضیح" (صفحہ ۲۷۶) کے زیرِ عنوان کتاب کے مرتب سید وزیر الحسن عابدی نے بتایا ہے کہ "گلِ رعنا" کے اصل متن کے اُردو اشعار میں راہ پا جانے والی غلطیاں ان کے علاوہ ہیں جن کی نشان دہی غلط نامے میں نہیں کی گئی اور جنہیں عام قاری کے ذوقِ سلیم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کتاب پر تاریخِ طباعت دسمبر ۱۹۶۹ء درج ہے لیکن اصلاً کتاب ۱۹۷۰ء میں شائع ہو کر اہلِ ذوق کے ہاتھوں میں آئی۔ اس درمیانی وقفے میں "غلط نامہ" ترتیب پاتا رہا۔

"بوئے گل" کے ایک ذیلی عنوان کے تحت سید وزیر الحسن عابدی، مقدمے میں لکھتے ہیں:

> "۱۹۵۲ء میں راقم کو.... غالب کے دست نوشتہ نسخے کے مالک، محبِ مکرم جناب خواجہ محمد حسین صاحب کی عنایت سے "گلِ رعنا" کی چند سطریں خوشبو سونگھنی نصیب ہوئی اور پھر پیہم آرزو اور کئی دفعہ کی سعی و کوشش کے باوجود پورے سولہ برس بعد خواجہ صاحب موصوف کے دولت کدے پر دسمبر ۱۹۶۸ء کی ایک مبارک شب میں اس گراں بہا مخطوطے کو جی بھر کر دیکھنے اور غور سے پڑھنے کا موقع ملا جس میں محترم خواجہ صاحب کی

کی عنایت و نوازش شامل، لیکن دستر خوانی (گفتگو[1]) اور مہمان نوازی
حائل رہی" (مقدمہ صفحہ ۱۷)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ فاضل مرتب سید وزیر الحسن عابدی کا یہ "مقدمہ" صریحاً مبالغہ آمیز اور مغالطہ انگیز ہے۔

مجھے غالب کے دست نوشتہ نسخۂ "گلِ رعنا" کی زیارت کا متعدد بار موقع ملا ہے[2]
اس نادر نسخے سے استفادہ کرنے اور غالب کے دوستوں سے اس کا تعارف کرانے کی عزت اور سعادت بھی اوّل اوّل راقم الحروف ہی کو حاصل ہوئی۔ مجھے خواجہ صاحب کی خدمت میں نیاز حاصل ہے۔ موصوف کا نام خواجہ محمد حسن[3] ہے، نہ کہ خواجہ محمد حسین؛ عابدی صاحب نے خواجہ صاحب کو اپنا "محبِّ مکرم" بتایا ہے لیکن وہ ان کے صحیح نام تک سے ناآشنا ہیں۔

خواجہ محمد حسن صاحب کے مملوکہ نسخۂ "گلِ رعنا" کے متن سے عابدی صاحب کی آشنائی اور اس کے مشمولات و مندرجات تک اُن کی رسائی دراصل ایک بے بنیاد افسانے سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتی، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سید وزیر الحسن عابدی کے مرتبہ متن کی کوئی محکم بنیاد نہیں ہے۔ یہ اُن کے دعوے کے برعکس نسخۂ خواجہ محمد حسن پر مبنی نہیں ہے، اس لیے "گلِ رعنا" کے اس متن کو نوشتۂ غالب سمجھ کر اس سے استفادہ کرنا گمراہی کا باعث ہو سکتا ہے۔

۱۹۵۲ء میں غالب کے اس دست نوشت نسخے کی چند لمحے "خوشبو سونگھنے"

---

[1] اس وقت "گلِ رعنا" (عابدی صاحب) کا جو نسخہ میرے سامنے ہے، اُس میں یہاں بین السطور لفظ "گفتگو" خود عابدی صاحب نے اپنے قلم سے بڑھایا ہے۔

[2] (الف) اشاریۂ غالب، لاہور، فروری ۱۹۶۹ء، ص ۳۹۹-۴۸۰

(ب) نسخۂ "گلِ رعنا" (بخطِ غالب)، نقوش، لاہور، غالب نمبر ۲، اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۲۷-۲۳۳

[3] خواجہ صاحب کے حالات کے لیے: اشاریۂ غالب، ایضاً، ص ۴۰۰

والی بات کچھ تفصیل چاہتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ بات ۱۹۵۲ء کی نہیں بلکہ جیسا کہ خواجہ صاحب نے مجھ سے فرمایا غالباً ۱۹۵۶ء کی ہے۔ خواجہ محمد حسن صاحب کو پور طرح اندازہ نہیں تھا کہ "گلِ رعنا" کا یہ نسخہ غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے یا نہیں انھوں نے اپنے ایک عزیز کے توسط سے عابدی صاحب کو "گلِ رعنا" کا یہ نسخہ دکھا ان کی رائے چاہی۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ عابدی صاحب نے اس نسخے کو ذ ذرا ہاتھ میں لیا۔ آنکھ کے قریب لے گئے اور پھر اسے میز پر ایسی بے نیازی سے ڈا دیا کہ مجھے ان کا مخطوطے کو اس طرح پٹکنا پھینک دینے کے عمل سے قریب تر معلوم ہ اور پھر مجھ سے کچھ یوں گویا ہوئے :

> "جی نہیں ! یہ قطعاً نوشتۂ غالب نہیں ہے، غالب کی تحریر کو
> تو میں ایک فرسنگ سے بھی پہچان لوں اور اُڑ کر اُس تک
> پہنچوں "

خواجہ محمد حسن صاحب، ایک ماہرِ غالبیات کی اس "تشخیص" سے اس قدر شکستہ ہوئے کہ پھر کبھی اس بارے میں اہلِ علم سے رجوع نہیں کیا اور یوں بھی اس مدت میں وہ کاروباری مصروفیات میں ایسے اُلجھے رہے کہ برسوں اُنھیں مخطوطے کا خیال تک نہیں آیا۔

دوسری طرف خود سید وزیر الحسن عابدی صاحب نے مجھ سے زبانی گفتگو میں اعتراف کیا کہ اس نفسیاتی طریقِ عمل سے انھوں نے اس نسخے کو بے دام حاصل کرنے کی فکر کی تھی۔ بر بنائے تجاہل، مالکِ مخطوطہ کا اتہ پتہ بھی نہ لیا۔ خیال تھا کہ یہ صاحب پھر میرے پاس آئیں گے اور کسی اگلی ملاقات میں اونے پونے، میں اس مخطوطے کا اُن سے سودا کر لوں گا۔ اس واقعے کے کچھ ہی عرصے کے بعد سُنا گیا کہ دلی میں جناب مالک رام کو "گلِ رعنا" کا کوئی قلمی نسخہ ملا ہے، میں نے سمجھ لیا کہ یہ وہی نسخہ ہوگا جو مجھے دکھایا گیا تھا ع

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اب کفِ افسوس ملنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ ناچار صبر کرکے بیٹھ رہا۔ اسی لیے مالکِ مخطوطہ کی تلاش یا اُن سے ملاقات کی نہ کوشش کی نہ کوئی سبیل ہی نکل تا آنکہ:

"خواجہ صاحب موصوف کے دولت کدے پر دسمبر ۱۹۶۸ء کی ایک مبارک شب میں اس گراں بہا مخطوطے کو جی بھر کر دیکھنے اور غور سے پڑھنے کا موقع ملا جس میں محترم خواجہ صاحب کی عنایت و نوازش شامل لیکن دسترخوانی گفتگو اور مہمان نوازی حائل رہی"۔

(سید وزیر الحسن عابدی، مقدمہ، ص ۱۷)

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس ملاقات میں انھوں نے لمبی چوڑی تمہید باندھی، کچھ دبے کچھ کھلے لفظوں میں غالب سے اپنے عشق کا ذکر کیا اور ضمناً نسخۂ "گل رعنا" کو دیکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے نسخہ نکلوایا۔ عابدی صاحب نے دست بستہ کھڑے ہو کر اسے مجھ سے لیا، چوما، آنکھوں سے لگایا، سر پہ رکھا اور میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اس نسخے کو قوم کے گراں بہا ترین تہذیبی سرمائے سے تعبیر کرتے ہوئے اس قیمتی موتی کے امین ہونے کی بنا پر مجھے معاشرے کا فردِ کبیر ٹھہرایا اور دیر تک بلا تکان تملق اور مبالغے کی اس طرح پیہم گفتگو کرتے رہے کہ مجھے کچھ عرض کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ میں نے انھیں بتایا اور یاد دلانا چاہا کہ وہ اس نسخے کو پہلے سرسری طور پر دیکھ کر رد کر چکے ہیں لیکن انھوں نے اس سے انکار کر دیا اور یہ بھی تسلیم نہیں کیا کہ اس سے پہلے کبھی اُن سے ملاقات بھی ہوئی ہے۔

بہر حال اس شب عابدی صاحب ڈیڑھ دو گھنٹے کے قریب میرے پاس بیٹھے اور اصل مخطوطے کی ایک نقل جو میں نے ایک زمانے میں اپنے ہاتھ سے تیار کی تھی، امانتاً رات بھر کے لیے لے گئے اور واقعی اگلے روز علی الصبح انھوں نے میری دست نوشتہ نقل مجھے لوٹا دی۔ میرے استفسار پر خواجہ محمد حسن صاحب نے جو کچھ فرمایا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل مخطوطے سے جو نقل اُنھوں نے اپنے ہاتھ سے تیار کی ہے اس پر خود انھیں بھروسہ نہیں تھا، اس لیے کہ غالب کا سوادِ تحریر اُن کے

لیے مانوس نہیں۔ پھر کسی مخطوطے کو پڑھنا یوں بھی ایک خاص طرح کی تربیت چاہتا ہے جس کا اُنھیں کوئی دعویٰ نہیں، پھر اپنی غیر معمولی لیکن غیر علمی کاروباری مصروفیات کے باعث غالبیات یا بحیثیتِ مجموعی مطالعۂ ادب وغیرہ کی بھی انھیں کبھی باقاعدہ فرصت میسر نہیں آئی۔

مختصر یہ کہ نسخۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب، مملوکہ خواجہ محمد حسن صاحب تک عابدی صاحب کی رسائی، اور اس سے استفادے کی کل حقیقت اور اصلیت بس اتنی ہے۔ اس پس منظر میں، اب عابدی صاحب کا بیان لطف سے خالی نہ ہوگا۔ مقدمے میں فرماتے ہیں:

> "خواجہ صاحب موصوف کے دولت کدے پر دسمبر ۱۹۶۸ء کی ایک مبارک شب میں اس گراں بہا مخطوطے کو جی بھر کر دیکھنے اور غور سے پڑھنے کا موقع ملا جس میں محترم خواجہ صاحب کی عنایت شامل لیکن دسترخوانی گفتگو اور مہمان نوازی حائل رہی۔ چونکہ اس سے پہلے راقم کو خاندانِ شریفی کی جلیل القدر اور جمیل الشیم شخصیت نبیرۂ حکیم اجمل خانِ اعظم محبِ مکرم جناب حکیم محمد نبی خاں جمال سویدا کے ذاتی کتب خانے میں موصوف کے لطفِ خاص سے "گلِ رعنا" کے اس نسخے کی نقل لے لینے کا موقع ملا تھا جو غالب کے ایک معاصر عزت اللہ دہلوی نے خود مصنف کے نسخے سے تیار کی تھی اور اس سے بھی بہت پہلے اس نسخے کے بارے میں جو مالک رام کو بھارت میں ۱۹۵۷ء میں اُن کے ایک دوست کی طرف سے تحفتہً ملا تھا، موصوف کے دو مقالے میری نظر سے گزر چکے تھے اس لیے خواجہ صاحب کے نسخے میں ضروری مقامات کو میں نے جلد دیکھ لیا لیکن مزید مطالعے کے لیے خواجہ صاحب نے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک نقل بھی چند دن کے لیے مجھے دی جس سے

استفادے کے لیے موصوف کا ممنون اور سپاس گزار ہوں'

(مقدمہ : ص ا و ما بعد)

اس بیان کو درج ذیل صراحتوں کی روشنی میں دیکھنا مفید ہوگا :

۱- کیونکر باور کرلیا جائے کہ دسمبر ۱۹۶۸ء کی محض ایک مبارک شب کے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں عابدی صاحب کو اس گراں بہا مخطوطے کو جی بھر کر دیکھنے کا موقع مل گیا" جبکہ خود ہی فرماتے ہیں کہ اس مختصر سی نشست میں "خواجہ صاحب کی دستر خوانی گفتگو اور مہمان نوازی حائل رہی -"

۲- عابدی صاحب کا بیان ہے کہ دسمبر ۱۹۶۸ء سے پہلے انھیں غالب کے معاصر عزت اللہ دہلوی کے مکتوبہ اس نسخے کی نقل لینے کا موقع مل چکا تھا جسے عزت اللہ نے خود غالب کے نسخے سے تیار کیا تھا[1]۔

۳- اور دسمبر ۱۹۶۸ء سے بھی "بہت پہلے" عابدی صاحب کا بیان ہے "کہ گلِ رعنا" کے بارے میں مالک رام صاحب کے دو مقالے ان کی نظر سے گزر چکے تھے جب کہ "گلِ رعنا" کے بارے میں مالک رام صاحب کے دو مقالوں میں سے ایک تو پہلی بار چھپا ہی "نذرِ ذاکر" میں ہے اور یہ مجموعۂ مقالات (مطبوعہ: دہلی) ۱۹۶۸ء کے آخر تک شائع بھی نہیں ہوا تھا۔ مالک رام دسمبر ۱۹۶۸ء میں لکھتے ہیں کہ :

"گلِ رعنا" ... سے متعلق میں دو مفصل مضمون لکھ چکا ہوں

---

[1] عزت اللہ دہلوی کی مکتوبہ "گلِ رعنا" کی نقل کے بارے میں عابدی صاحب نے سرسری ایک بات کہہ دی ہے کہ یہ نقل کاتب نے مصنّف (یعنی غالب) کے نسخے سے تیار کی تھی کس بنیاد پر انھوں نے یہ رائے قائم کی اس بارے میں ۲۶ صفحات پر مشتمل اپنے مقدمے میں کوئی اشارہ تک نہیں کیا اور ایسی کوئی شہادت پیش نہیں کی جس سے ان کے اس بیان کی تصدیق ہوتی - خود کاتب کے حالاتِ زندگی معروف ہیں یا نامعلوم، اس پر بھی کچھ روشنی نہیں ڈالی گئی -

اُردو حصّے والا مضمون ابھی تک شائع نہیں ہوا، "تذکرِ ذاکر" میں شامل ہے۔"
(فروغِ اُردو، لکھنؤ، غالب نمبر، دسمبر ۱۹۶۸ء، حصّہ، ص ۴۳)

یہ بات قابلِ غور ہے کہ عابدی صاحب کو دسمبر ۱۹۶۸ء سے پہلے نسخۂ عزت اللہ کی نقل مل چکی تھی اور" اس سے بھی بہت پہلے" اُنھوں نے "تذکرِ ذاکر" کا مطالعہ کر لیا تھا حالانکہ اس وقت تک یہ کتاب حلیۂ طبع سے آراستہ نہ ہوئی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ عابدی صاحب کو ۱۹۶۹ء کے اوائل تک اتفاق سے "گلِ رعنا" کے اُردو حصّے کے تعارفی مقالے (از مالک رام) کی اشاعت کے حوالے سے بھی آگاہی نہیں تھی۔ یہاں میرے لیے ایک نجی حوالہ بھی ناگزیر ہو گیا ہے۔ غالب صدی کا چرچا شروع ہو چکا تھا اور میں "اشاریۂ غالب" کی ترتیب و تسوید میں مصروف تھا کہ عابدی صاحب نے یاد فرمایا اور یہ پیغام بھیجا کہ:

"غالب کے مشارٌ الیہ "گلِ رعنا" کے حصۂ اُردو پر مالک رام کے مضمون کے سلسلے میں رہنمائی فرمائیں"

میں عابدی صاحب سے ملا[1] اور "تذکرِ ذاکر" کی نشاندہی کی کہ مالک رام صاحب کی کتاب "ذکرِ غالب" طبع چہارم صفحہ ۲۰۴ کے ایک ذیلی حاشیے میں "تذکرِ ذاکر" کا حوالہ آ چکا تھا۔ دراصل عابدی صاحب نے یہ سب کچھ اس لیے لکھا ہے کہ "مخطوطے کو جی بھر کر دیکھنے" ذرا سی مہلت میں "بغور پڑھ لینے" اور "ضروری مقامات دیکھ لینے اور ان سے نتائج اخذ کر لینے کے لیے "ایک مبارک شب کی چند غیر یکسو ساعتوں" کا کافی جواز پیدا ہو سکے۔

سید وزیر الحسن عابدی کا یہ کہنا بھی صریحاً خلافِ واقعہ ہے کہ:

"مزید مطالعے کے لیے خواجہ صاحب نے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی

---

[1] اس ملاقات میں عابدی صاحب نے از رہِ لطف "باغِ دودر" کا اپنا مرتبہ نسخہ تقدیمی کلمات کے ساتھ مجھے عنایت فرمایا۔ عابدی صاحب کا یہ دستخطی نسخہ میرے ذخیرۂ غالبیات میں محفوظ ہے۔ اس پر ۸۔جنوری ۱۹۶۹ء کی تاریخ ثبت ہے۔

ایک نقل بھی چند دن کے لیے مجھے دی۔" (مقدمہ: ص ۱۸)

واقعہ یہ ہے کہ "چند دن" نہیں بلکہ اس "مبارک شب" کے بقیہ چند گھنٹوں کے لیے وہ اس نقل کو امانتاً خواجہ صاحب سے لے گئے تھے اور اس عرصے میں اس سے جیسا کچھ "استفادہ" وہ کر سکے ہوں گے، کر کے علی الصبح یہ نقل، وہ خواجہ صاحب کو لوٹا گئے۔

سید وزیر الحسن عابدی صاحب نے "عکسِ گل" کے تحت صفحہ ۲۰ اور ۲۱ کے درمیان چار صفحات میں "گلِ رعنا" مکتوبہ عزت اللہ دہلوی کے چند صفحات کے عکس (صفحہ ا۔ب) اور "گلِ رعنا" بخطِ غالب کے دو صفحات کے عکس (صفحہ ج۔د) شائع کیے ہیں اور یہ بہت اچھا ہوا کہ اس بنا پر اس امر کا دستاویزی ثبوت فراہم کرنا مشکل نہیں رہ گیا کہ عابدی صاحب کا پیش کردہ "گلِ رعنا" کا متن نہ تو بخطِ غالب پر مبنی ہے، نہ نسخۂ سویدا ہی کے مطابق ہے۔

صفحہ ۲۰ اور ۲۱ کے درمیان صفحہ ج پر دیباچۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب کے آخری صفحے کا عکس شائع کیا گیا ہے۔ یہ عکس راقم الحروف کی کتاب "اشاریۂ غالب" سے ماخوذ ہے۔[۱] لطف کی بات یہ ہے کہ عابدی صاحب نے نہ صرف یہ کہ اس عکس کو "اشاریۂ غالب" سے لیا ہے بلکہ اس عکس کے اسی بلاک کو اپنی مرتبہ کتاب "گلِ رعنا" میں استعمال کیا ہے جس بلاک سے یہ عکس "اشاریۂ غالب" میں چھپا تھا۔[۲] پھر کتنی عبرت کی بات یہ ہے کہ

---

[۱] دیکھیے اشاریۂ غالب، ناشر: پنجاب یونیورسٹی، لاہور، فروری ۱۹۶۹ء، ص ۳۰۲

[۲] یہ اس طرح اور اس وجہ سے ممکن ہوا کہ اتفاق سے راقم الحروف کی کتاب "اشاریۂ غالب" اور سید وزیر الحسن عابدی کی مرتبہ "گلِ رعنا" لاہور کے ایک ہی مطبع میں چھپی ہیں۔ "گلِ رعنا" بخطِ غالب کے چار صفحات کے عکس میں نے "اشاریۂ غالب" میں اشاعت کے لیے مطبع کے سپرد کیے تھے، مطبع نے اس کے جو بلاک تیار کرائے عابدی صاحب نے انھیں سے "فائدہ" اٹھایا اور مطبع کے مہتمم صاحب کی عنایت سے لے جا سکے چار میں سے دو کے عکس اپنی مرتبہ کتاب "گلِ رعنا" میں شامل کر لیے تاکہ یہ تاثر دیا جا سکے کہ اپنی تصحیح و تحقیق سے انھوں نے جو متن پیش کیا ہے وہ نسخۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب پر مبنی ہے۔

عابدی صاحب نے اس عکس کے اصل ماخذ یعنی "اشاریۂ غالب" کا حوالہ دیے بغیر اپنی کتاب میں استعمال تو کر لیا لیکن اپنے مرتبہ متن کو وہ اس صفحے کی حد تک بھی اصل کے مطابق پیش نہیں کر سکے۔

ذیل میں محولہ بالا عکس کا متن پیش کیا جاتا ہے۔ یہ عبارت سید وزیر الحسن عابدی کی مرتبہ "گلِ رعنا" کے صفحۂ سات کی سطرِ دس کے آخری لفظ سے شروع ہو کر صفحۂ آٹھ پر پوری ہوئی ہے۔ اغلاط و اختلافِ نسخ کو ذیلی حواشی میں ظاہر کیا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے دیباچۂ "گل رعنا" بخطِ غالب کے آخری صفحے کا متن مطابقِ عکس و اصل:

"دایرۂ ہر حرف سر از حلقۂ دامے بر[1] آرد و کلکم از عجز تحریر در کسوتِ ہر نقطہ پشت دستے بر زمین میگزارد[2] اما[3] خون گرمی انداز مہر بانیش را نازم کہ آتش افسردۂ مرا شعلہ در ساخت و خاک زمین گیر مرا علم رعنائی غبار ارزانی داشت فرمان دادہ است کہ منتخبے از دیوانِ ریختہ و غزلے چند از پارسی در یک سفینہ باہم درآمیزم و این پردۂ دو رنگ بہ پیشِ طاق بینش نظارگیان یک رنگ آویزم از وے بزبان گفتنی

---

[1] عابدی صاحب کے مرتبہ دیباچۂ "گل رعنا" کے متن (ص ۷) میں "بہ" بجائے: بر "پنج آہنگ، طبع دوم، دہلی، ۱۰ اپریل ۱۸۵۳ء (= پ) میں بھی "بہ" بجائے: بر کلیاتِ نثرِ غالب، طبع اوّل، لکھنؤ، جنوری ۱۸۶۸ء (= ک) میں بھی "بہ" بجائے: بر مطبوعہ عکس "گلِ رعنا" مکتوبہ قاضی عزت اللہ دہلوی، نسخۂ سویدا (= س) میں مطابقِ اصل "بر" ہی ہے۔

[2] غالب ذال معجمہ فارسی کے قائل نہیں تھے "میگزارد" کا املا غالب نے "ز" سے کیا ہے۔ عابدی صاحب نے اسے "ذ" سے لکھا ہے اور حاشیے یا تعلیقات میں اس کی کوئی صراحت بھی نہیں کی۔ نسخۂ سویدا (= س) کے عکس میں اس کا املا 'ز' ہی سے دکھائی دے رہا ہے۔

[3] عابدی صاحب کے ہاں "اما" ندارد، پ اور ک میں بھی یہی صورت ہے، س میں "اما" موجود۔

وازمن بجان پزرفتنی[1] بر دل سخن پزیر[2] سخن دلپزیر[3] جوی دیده دران
دانشمند شفتہ همانا[4] دکه چون در آغاز خار خار جگر کاوی شوقم
همه صرف نگارش اشعار اُردو زبان بود در مسلک[5] این تحریر نیز[6]
همان جاده گزارده[7] آمد[8] و همان را سپرده شد که مباد سر رشته از
کف رود و کار از پرکار افتد هر آئینه این چمنستان را دود ور رو[9]د برده
هم کشودم[10] و نخستین در را به اشعار هندی بگوهر آمودم در دوم[11] چون
آغوشِ شوق بروے پارسیان واست و نام این سفینه بزبان اداشناسان

---

[1] تا [3] پزرفتنی، سخن پزیر، اور دلپزیر کا املا غالب کے برعکس عابدی صاحب کے ہاں 'ز' کے بجائے "ذ" سے کیا گیا ہے۔

[4] عابدی صاحب نے "تصحیح و تحقیق کے بعد جو متن پیش کیا ہے اس میں (ص ۸) "مباد" بجائے: همانا، متن میں بمطابق اصل: "همانا د"

[5] بہ تصحیح و تحقیقِ عابدی جو متن مرتب ہوا ہے اُس کے مطابق "سلک" بجائے: مسلک

[6] عابدی صاحب کے مرتبہ متن میں "هم" بجائے: نیز، عابدی صاحب کی اس قرأت کی تائید پ اور ک سے نہیں ہوتی۔

[7] بخطِ غالب کے برعکس عابدی صاحب نے بلا صراحت "گزارده" کا املا 'ز' کے بجائے: 'ذ' سے کیا ہے۔

[8] عابدی صاحب کے متن میں "آمد" محذوف۔ پ اور ک میں بھی یہی معاملہ ہے۔ متن میں "آمد" موجود۔

[9] عابدی صاحب کے ہاں 'رو' ندارد۔ پ اور ک میں بھی یہی صورت ہے۔ متن میں 'رو' موجود۔

[10] عابدی صاحب کے مرتبہ متن میں "د" محذوف۔ پ اور ک میں بھی 'د' محذوف۔ متن میں 'د' موجود۔

[11] عابدی صاحب کے متن میں "دومین در" بجائے: در دوم۔ پ اور ک میں "دومین در" بجائے در دوم، جبکہ متن، مر، مطابق اصل: "در دوم" ہی ضبط میں آیا ہے۔

گلِ رعنا۔ الٰہی ایں گلِ رعنا را بگوشہ دستار قبول[1] جا دہے و ہر کرا ایں[1] گرامی شد، سپاسے از دے بر من نہی، اللہ بس[2] و ما سویٰ ہوس۔
محررہ غرہ ربیع الاوّل ۱۲۴۴ھ ہجری[3] ۵

اب لیجیے دوسرے عکس کی بات ـــــ عابدی صاحب کے مقدمہ "گلِ رعنا" کے صفحہ ۲۱ سے اوّل متصل صفحہ "د" کے تحت خاتمہ "گلِ رعنا" کے آخری صفحے بخطِ غالب کا عکس شائع کیا گیا ہے۔ یہ عکس بھی راقم الحروف کی کتاب "اشاریۂ غالب" سے ماخوذ و منقول ہے (دیکھیے: اشاریۂ غالب، ص ۳۰۶)۔ اس عکس کے بھی اسی بلاک کو عابدی صاحب نے اپنی کتاب میں استعمال کیا ہے، جس بلاک سے یہ عکس "اشاریۂ غالب" میں چھپا تھا اور فاضل مرتب، اس صفحے کی حد تک بھی اپنے متن کو مطابق اصل و عکس پیش نہیں کر سکے۔ ذیل میں اس محولہ بالا عکس سے خاتمہ "گلِ رعنا" کی اصل عبارت درج کی جاتی ہے۔ عابدی صاحب کے مرتبہ متن میں خاتمہ "گلِ رعنا" کی اس عبارت کے ساتھ جو سلوک ہوا ہے، اسے ذیل حواشی میں ظاہر کیا جا رہا ہے:

طبع مرہم دارد کہ گرد ملال[4] حال مرا در ہم[5] و دل کم حوصلہ زدہ مرا از سواد عالم کردہ
احکم الحکام و صمد العلام سر دو سر گردہ[6] اہل کرم عمدۂ امرا، مدار المہام والا ہمم را

---

[1] عابدی صاحب کے متن میں "قبول" ندارد، "ت" میں اصل کے مطابق "قبول" موجود۔
[2] عابدی صاحب کے متن میں "و" محذوف، "ت" میں موجود۔
[3] عابدی صاحب کے ہاں لفظ "ہجری" کے بعد "فقط" کی مخفف صورت "۵" محذوف۔ عابدی صاحب نے حاشیے یا تعلیقات میں بھی اس کی صراحت یا نشاندہی نہیں کی۔
[4] عابدی صاحب کے مرتبہ متن (ص ۱۲۸) میں "کساد" بجائے "ملال"، "ت" اور "ک" میں بھی یہی صورت ہے۔
[5] عابدی صاحب کے مرتبہ متن نیز "ت" اور "ک" میں: دارد۔ ما مول کہ سرکار والا سحر حلال و گوہر کمال مرا در سلک مطالعہ درآوردہ اصلاح حال حوصلہ دہد، نگر دل گرہ در گرہ دام مدعا گردد کہ سہا ہم طالع ماہ و مگس ہمسر ہما گردد" بجائے: "و دلِ کم حوصلہ مرا از سواد عالم کردہ"۔
[6] عابدی صاحب کے مرتبہ متن میں "سر گروہ" بجائے "سر گردہ"، "ک" میں بھی یہی صورت ہے۔

عمر ودوام اساس و امر عالم مطاع و حکم عدو کاہ[۱] و دل آسودہ و طالع مسعود عطا دارد - محرر دعا گو محمد اسد اللہ"[۲]

خاتمۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب کے آخری صفحے کے عکس میں دیکھا جا سکتا ہے کہ خاتمے کی چار سطروں کے بعد، سطر سے قدرے ہٹ کر ترچھا، دستخط نما انداز میں غالب نے "محرر دعا گو محمد اسد اللہ" لکھا ہے اور اس سے ذرا نیچے دائیں طرف "ولہ" کا عنوان قائم کر کے "مثنوی بادِ مخالف" یا "آشتی نامہ" شروع ہو جاتی ہے۔ عکس میں اس مثنوی کے بہ ترتیب ذیل یہ پندرہ شعر آئے ہیں:

اے تماشائیانِ بزمِ سخن	۱	وے مسیحا دمانِ نادرِ فن	۱[۳]
اے گراں مایگانِ عالمِ حرف	۲	خوش نشینانِ این بساطِ شگرف	۲
اے سخن را طرازِ جاں دادہ	۳	صفحہ را سازِ گلستاں دادہ	۸
عطر بر مغزِ گیتی افشانان	۴	پہلوانانِ پہلوی دانان	۹
اے گرامی فنانِ ریختہ گو	۵	نغز دریا کشانِ عربدہ جو	۱۰
اے سخن پرورانِ کلکتہ	۶	وے بلند اخترانِ کلکتہ[۴]	۳
ہر یکے صدرِ بزمِ بارگہے	۷	شمعِ خلوت سرای کارگہے	۴
ہر یکے پیش تازِ قافلۂ	۸	ہر یکے کدخدای مرحلۂ	۵

۱؎ عابدی صاحب کے ہاں "مال" بجائے: "کاہ"، بٓ اور کٓ میں بھی یہی صورت

۲؎ عابدی صاحب کے ہاں "محرر دعا گو محمد اسد اللہ" کے بجائے: طٓ، محرر محمد اسد اللہ محررۂ دوم محرم الحرام (۱۲۴۴ھ)

بٓ اور کٓ میں سر اسم "محمد" محذوف۔ عابدی صاحب کے ہاں بھی متن (ص ۱۲۸) میں "محمد" موجود نہیں ہے لیکن "غلط نامے" کے تحت (ص ۲۷۱) عابدی صاحب نے سر اسم "محمد" کا اضافہ کرا دیا ہے۔ سنہ ہجری اضافۂ عابدی ہے۔ بٓ میں "محرر" سے پہلے "فقط" کی مخفف شکل "ط" خلاد۔

۳؎ مطبوعہ "گلِ رعنا" (عابدی) میں اشعار کی ترتیب یہ ہے۔

۴؎ مطبوعہ "گلِ رعنا" (عابدی) میں مصرعۂ ثانی کی شکل: وے زبان آورانِ کلکتہ۔

اے بہ شغلِ وکالت آمادہ	۹	دادِ غم خواری جہان دادہ	۶
اے شگرفانِ عالمِ انصاف	۱۰	بہ سفارت رسیدہ از اطراف	۷
اے رئیسانِ این سوادِ عظیم	۱۱	وے فراہم شدہ ز ہفت اقلیم	۱۱
ہمچو من آرمیدۂ این شہر	۱۲	ہر کارے رسیدۂ این شہر	۱۲
اسد اللہ خان ہیچ مدان	۱۳	جادہ پیمائے وادیِ حرمان [۵]	۱۳
گرچہ ناخواندہ میہمانِ شماست	۱۴	بے سخن ریزہ چینِ خوانِ شماست	۱۴
بہ تظلم رسیدہ است این جا	۱۵	بہ امید آرمیدہ است این جا	۱۵

عابدی صاحب نے اپنی مرتبہ "گلِ رعنا" میں بطورِ ضمیمہ "مثنوی آشتی نامہ" شامل کی ہے (ص ۲۵۴ - ۲۶۴) لیکن اس کا ماخذ بیاں "ناچہائے فارسی غالب" (مرتبہ: سید اکبر علی ترمذی) ہے۔ یہ ترتیبِ اشعار کے اعتبار سے بھی اور بہ لحاظِ قرأتِ متن بھی نسخۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب کے مشمولہ عکس سے مختلف ہے لیکن عابدی صاحب نے یہ اختلافِ نسخ ظاہر نہیں کیے۔ اول تو بخطِ غالب کا عکس چھاپنے اور نسخۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب سے استفادے کے دعوے کی صورت میں کسی ثانوی ماخذ کو متن میں جگہ دینے کا کوئی جواز نہیں تھا، اور کسی معنی اہمیت کے باعث یہ مثنوی کسی دوسرے ماخذ سے نقل کر بھی لی گئی تھی تو نسخۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب کے مقابلے میں اختلافِ نسخ ظاہر نہ کرنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ یہی کہ دراصل نسخۂ "گلِ رعنا" نوشتۂ غالب فاضل مرتب کے پیشِ نظر رہا ہی نہیں۔ اس کے دو مختلف صفحات کے جو عکس انھوں نے شاملِ اشاعت کیے ہیں، وہ بلا حوالہ چلتے چلتے "اشاریۂ غالب" سے لے لیے گئے ہیں۔

نسخۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب کے مقابلے میں، سید وزیر الحسن عابدی کے مرتبہ متن کے ان الحاقات، اغلاط اور اختلافات سے بدیہی طور پر ایک نتیجہ تو یہی نکلتا ہے کہ ان کی "تصحیح و تحقیق کے ساتھ" "گلِ رعنا" کا جو متن منظرِ عام پر آیا ہے وہ کم از کم نسخۂ

---

۵ مطبوعہ "گلِ رعنا" (عابدی) میں شعر کی صورت: اسد اللہ بخت برگشتہ
در خم و پیچ عجز سرگشتہ

"گلِ رعنا" بخطِ غالب ہے، یہ تو بالکل نہیں ہے اور نہ یہ تمام و کمال نسخۂ سویدا ہی کے مطابق ہے۔

دوسری بات جو وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ "گلِ رعنا" کا دیباچہ اور خاتمہ عابدی صاحب نے "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" سے نقل کیا ہے، اس لیے کہ عابدی صاحب کے پیشِ نظر رہے "دیباچۂ گلِ رعنا" اور خصوصیت سے خاتمے کی نثر اور مطبوعہ "پنج آہنگ" اور "کلیاتِ نثرِ غالب" کے اس کی ہو بہو اور حیرت انگیز حد تک مطابقت سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جانا ممکن ہے۔

سید وزیر الحسن عابدی کو نسخۂ سویدا مکتوبہ قاضی عزت اللہ دہلوی سے استفادے کا بھی دعوی ہے لیکن نسخۂ سویدا میں "خاتمۂ گلِ رعنا" کی نثر تو سرے سے موجود ہی نہیں اور "دیباچۂ گلِ رعنا" کے متنی تقابل سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ عابدی صاحب نے نسخۂ سویدا کے متن کی سختی سے پابندی نہیں کی۔ تحریفات یہ بھی بتاتی ہیں کہ نسخۂ سویدا سے استفادے کے لیے جس احساسِ ذمہ داری کی ضرورت تھی اُسے روا نہیں رکھا گیا اور اصلاً "گلِ رعنا" کے خاتمے اور دیباچے کی نثروں کے لیے "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" کو سامنے رکھا گیا ہے۔

عابدی صاحب نے دیباچے کی زائد عبارت کا ذکر کیا ہے:

> "گلِ رعنا" کے دیباچے کا جو اصل متن ہمیں ملا ہے وہ "پنج آہنگ" والے مطبوعہ متن سے نہ صرف چند لفظوں کے لحاظ سے مختلف ہے بلکہ اصل متن اور بعد کے مطبوعہ متن میں پوری دو عبارتوں کی بیشی کا فرق ہے جو بہت اہمیت رکھتا ہے۔" (مقدمۂ گلِ رعنا، ص ۲۰)

لیکن انھوں نے "خاتمۂ گلِ رعنا" کے بارے میں کچھ صراحت نہیں کی۔ اپنے مرتبہ متن کے صفحہ 119 تا آخر صفحہ ۱۲۸ تک "خاتمۂ گلِ رعنا" پر ایک حاشیہ تک نہیں لکھا اور تعلیقات میں بھی کوئی اشارہ نہیں ہے اس لیے میرے نزدیک انھوں نے دیباچے کی حد تک تو متن کو "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" سے نقل کیا اور نسخۂ سویدا سے

اس کا سرسری مقابلہ کر کے زائد عبارت کو دیکھ لیا لیکن "خاتمۂ گلِ رعنا" کی طویل نثر بالکلیہ "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" سے ماخوذ و منقول ہے۔ اس سلسلے میں سید قدرت نقوی کا بیان ملاحظہ ہو:

> "خاتمۂ گلِ رعنا کا متن .... (اور اس[1]) کی ترتیب (گلِ رعنا کے نسخۂ عابدی میں مطبوعہ (متن) کے مطابق ہے .... اور عابدی کے متن میں نسخۂ خواجہ (بخطِ غالب) کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ نسخۂ سویدا میں خاتمہ ہے نہیں کہ یہ اس کا متن خیال کر لیا جاتا۔ عابدی میں خاتمۂ (گلِ رعنا) غالباً "پنج آہنگ" سے لیا گیا ہے۔ فاضل مؤلف (؟) نے 'دیباچے' کی زائد عبارت کا ذکر تو کیا ہے لیکن خاتمے کے متعلق کچھ بھی معلومات فراہم نہیں فرمائیں۔ کلیات (نثرِ غالب) مطبوعہ میں شامل خاتمے کا جب (خاتمۂ گلِ رعنا مرتبہ عابدی سے) مقابلہ کیا گیا تو حیرت انگیز طور پر (عابدی صاحب کے متن کو) اس سے منقول پایا اور بعض غلطیاں بھی (عابدی صاحب کے ہاں) بعینہٖ نقل ہو گئیں۔ مثلاً:
>
> "با جبینے چون گلِ خود رو شگفتہ" میں کلیات کے کاتب کے سہو سے جیم کا نقطہ یائے مجہول کی کشش سے مل کر مبہم ہو گیا ہے یعنی اس طرح (یا۔ جیبنے) لکھا ہے۔ اس روش میں فاضل مرتب (جناب عابدی) نے بالائی کشش کو "ش" کر کے "با جبینے" داخلِ متن کر لیا (ملاحظہ کیجیے نسخۂ عابدی، صفحہ ۱۱۹ سطر ۹)۔ اسی طرح "بجنبشِ نسیم تبسم غنچۂ نیم شگفتہ اش صد چمن گل بالید" کلیات میں "نیم" کاتب نے غلط لکھ کر درستی کی ہے۔ نون کا نقطہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنی مبہم حالت "سیم" سے ملتبس ہو گیا ہے چنانچہ عابدی میں "سیم" ضبط کر لیا گیا ہے (دیکھیے: ص ۱۲۰، س ۳)

---

[1] جو حرف ہلالین ( ) میں ظاہر کیے گئے ہیں وہ توضیح کی غرض سے راقم الحروف نے بڑھائے ہیں (م۔ا۔)

بیشتر وہ باتیں جو مطبوعہ کلیات (نثر غالب) میں ہیں۔ (عابدی کے مرتبہ متن) میں بھی ہیں، حالانکہ مخطوطات میں نہیں ہیں۔ مثلاً خاتمے کی عبارت کے خاتمے پر "ط" (علامتِ فقط) دونوں میں ہے اور پہلی نثر در صنعتِ تعطیل کے القابی جملے کے خاتمے پر بھی "ط" (علامتِ فقط) دونوں میں ہے۔ (ملاحظہ کیجیے نسخۂ عابدی ص ۱۲۳، س ۸)

(سہ ماہی، اُردو، کراچی، شمارہ ۱، ۱۹۷۱ء مستقل مضامین ص ۲۴-۲۵)

مختصر یہ کہ عابدی کے پیش کردہ "گلِ رعنا" کے دیباچے اور خاتمے کی حقیقت اور کیفیت تو بس یہ ہے۔ رہ گئی منظوم حصّوں کی تکمیل کی بات، تو میرا اندازہ یہ ہے کہ عابدی صاحب کی یہ مشکل "گلِ رعنا" کے سلسلے میں مالک رام کے تعارفی مضامین نے آسان کی جن میں اہم اختلافاتِ متن کے ساتھ، اُردو کلام کے مشمولات اور فارسی مندرجات کی نشاندہی کردی گئی ہے اس کے علاوہ عابدی صاحب نے دیوانِ غالب اُردو، نسخۂ عرشی سے بھی فائدہ اٹھایا ہے:

"مالک رام صاحب نے اپنے ایک مقالے میں جو اعزازی مجموعے "نذرِ ذاکر" میں شائع ہوا ہے، "گلِ رعنا" کے اُردو کلام کی نشاندہی کی ہے اور نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ شیرانی اور مروجہ دیوانِ غالب کے حوالے سے بعض اہم اختلافاتِ متن بھی بتائے ہیں۔ پھر اپنے دوسرے مقالے میں جو "نگار" لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا، فارسی مندرجات کی نشاندہی کی ہے۔ جناب عرشی صاحب نے بھی اپنے مرتبہ دیوانِ غالب (اُردو) میں "گلِ رعنا" کی غزلیات اور اشعار کو حواشی اور تعلیقات میں مشخص کردیا ہے۔ (مقدمۂ گلِ رعنا، عابدی، صفحہ ۱۹-۲۰)

"مالک رام صاحب کے قیمتی مقالوں سے پہلے غالبیات میں "گلِ رعنا" کی صرف دو چیزیں دیباچہ اور خاتمہ معلوم اور محفوظ تھیں جنھیں غالب نے "پنج آہنگ" میں شامل کرلیا تھا۔" (مقدمۂ گلِ رعنا، عابدی، ص ۱۸)

واقعہ یہ ہے کہ عابدی صاحب نے مالک رام کے مضامین اور دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کے حواشی اور تعلیقات کی مدد سے "گلِ رعنا" کا متن تعمیر کیا ہے۔ ان کا یہ ادعا کہ انھوں نے گلِ رعنا" کے نسخۂ غالب، بخطِ غالب (نسخۂ خواجہ محمد حسن) کو بامعانِ نظر دیکھا ہے، کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

سید وزیر الحسن عابدی نے نسخۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب کے علاوہ "گلِ رعنا" کے ایک اور معاصر قلمی نسخے (نسخۂ سویدا) مکتوبہ قاضی عزت اللہ دہلوی سے بھی استفادے کا دعویٰ کیا ہے "عکسِ گل" کے زیرِ عنوان انھوں نے نسخۂ سویدا کے چھ صفحات کے تین نمونے شائع کیے ہیں۔ پہلا نسخۂ سویدا میں دیباچے کے پہلے دو صفحات کے عکس پر مبنی ہے۔ نمونہ ۲، دیباچے کے باقی حصّے یعنی تیسرے اور چوتھے صفحے کے عکس پر مشتمل ہے اور نمونہ "۳" کے تحت عابدی صاحب نے نسخۂ سویدا کے دو آخری صفحات کے عکس دیے ہیں۔

ان چھ صفحات کے عکسوں کی بنا پر اس نسخے (نسخۂ سویدا) کے بارے میں کچھ باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ ان میں دیباچۂ "گلِ رعنا" کی عبارت، بڑی حد تک نسخۂ غالب بخطِ غالب کے مطابق ہے۔ اس نسخے میں دیباچے پر جو تاریخ درج ہے، وہ عکس میں اتنی مدھم آئی ہے کہ اس کا پڑھ لینا ممکن نہیں۔ عابدی صاحب نے اسے ۱۶۔ ذی قعدہ ۱۲۴۵ھ مطابق ۹۔ مئی ۱۸۳۰ء (مقدمہ گلِ رعنا ص ۲۱) گویا یہ نسخہ "گلِ رعنا" کے اصلی نسخے بخطِ غالب کے تقریباً پونے دو سال بعد لکھا جانا شروع ہوا۔

نسخۂ سویدا کے دیباچے کے متن کی بنیاد پر عابدی صاحب کے مرتبۂ دیباچۂ "گلِ رعنا" میں بعض زائد عبارتیں ضبط میں آئی ہیں لیکن جیسا کہ اس سے پہلے اختلافِ نسخ میں نشاندہی کی جاچکی ہے، نسخۂ سویدا کے دیباچے کی عبارت کو عابدی صاحب نے پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا اور شاید یہ دیباچہ "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" کے کسی مطبوعہ نسخے سے نقل کیا ہے۔ اسی لیے "پنج آہنگ" اور کلیاتِ نثرِ غالب" کے مطبوعہ نسخوں میں جو غلطیاں تھیں وہ عابدی صاحب کے

متن میں بھی در آئی ہیں۔ ان میں بعض صریحاً ایسی ہیں کہ نسخۂ سویدا کو توجہ سے دیکھ لیا جاتا تو اُن سے بچا جاسکتا تھا۔

دوسری بات یہ کہ نسخۂ سویدا "گلِ رعنا" کا کوئی مکمل مخطوطہ نہیں ہے، یہ ناقص بھی ہے اور ناتمام بھی۔ اسے چند اشعار یا زیادہ سے زیادہ صرف چند غزلوں پر مشتمل "گلِ رعنا" کا ایک بے حد مجمل انتخاب کہا جاسکتا ہے۔ دیباچۂ "گلِ رعنا" کو نقل کر چکنے کے بعد، جو چوتھے صفحے کی چھٹی سطر پر تمام ہوا ہے، اسی سطر کے بقیہ حصے میں کاتب نے "چند اشعار نوشتہ شد" کی عبارت کا اضافہ کرکے اگلی سطر سے نثر نویسی کے انداز میں مسلسل شعر نقل کرنا شروع کر دیے ہیں۔ نسخۂ سویدا کے چوتھے صفحے پر دیباچے کے بعد ساتویں سطر سے آخری یعنی چودھویں سطر تک کل آٹھ سطروں میں تیرہ اُردو شعر نقل ہوئے ہیں اور یہ اس ترتیب سے آئے ہیں:

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ	۱	جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز	۲	لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا
ڈھانپا[۱] کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی	۳	میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

○

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا	۴	زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا[۲]

---

[۱] عابدی صاحب کے مرتبہ متن (ص ۱۱) میں "ڈھانکا" بجائے: "ڈھانپا"۔ عابدی صاحب نے حاشیے میں ظاہر کیا ہے کہ "ڈھانپا" عام مطبوعہ متن میں ملتا ہے لیکن ہمارے متن میں "ڈھانکا" ہے لیکن نسخۂ سویدا کے اس صفحے کا جو عکس عابدی صاحب نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے اُس میں موصوف کے اظہار کے برعکس متن میں "ڈھانپا" موجود ہے۔

[۲] اس شعر کے بعد عابدی صاحب کے مرتبہ متن (ص ۱۲) میں یہ دو شعر زائد ہیں:

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک	ق	ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرماویں گے کیا
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یوں سہی		یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا

عابدی صاحب نے حاشیے یا تعلیقات میں کہیں اس کی نشاندہی نہیں کی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں ۵ ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبراویں گے کیا

○

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں ۶ کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا[۱]

○

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے ۷ کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

○

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ۸ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز ۹ میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا
ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے ۱۰ ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا
تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسد ۱۱ سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

○

پاؤں میں جب وہ حنا باندھتے ہیں ۱۲ میرے ہاتھوں کو جدا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ۱۳ ہم بھی یک[۲] اپنی ہوا باندھتے ہیں

ان اشعار سے نسخۂ سویدا کے حصۂ اردو کی جو کیفیت نظر کے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ نسخۂ سویدا کا آغاز، دیوانِ غالب کے معروف مطلع اول "نقشِ فریادی ہے..."

(حاشیہ گذشتہ صفحے کا بقیہ) ... کہ یہ دو شعر نسخۂ سویدا سے محذوف ہیں۔ نیز مصرعِ اول میں 'گزری' کا املا عابدی صاحب کے مرتبہ متن میں 'ز' کے بجائے ذال معجمہ فارسی سے کیا گیا ہے۔

۱؎ اس شعر سے پہلے عابدی صاحب کے مطبوعہ متن (ص ۱۲) میں یہ شعر، بمقابلہ نسخۂ سویدا بغیر کسی تصریح کے زائد:

دل نہیں، تجھ کو دکھاؤں ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا، کروں کیا، کارفرما جل گیا

۲؎ عابدی صاحب کے متن میں 'یک' کے بجائے 'اک' لکھا ہے لیکن حاشیے یا تعلیقات میں اس کا اختلاف ظاہر نہیں کیا۔

سے نہیں ہوا۔ نسخۂ سودا کے پہلے تین شعر "گلِ رعنا" (عابدی) کی دوسری غزل سے ہیں جو "گلِ رعنا" میں تین اشعار ہی پر مشتمل ہے۔ شعر ۴ اور ۵ عابدی صاحب کے متن میں باعتبارِ ترتیب تیسری غزل سے ہیں۔ متداول دیوان میں اس غزل کے اشعار کی تعداد سات ہے۔ "گلِ رعنا" میں اس کے چار شعر منتخب ہوئے، نسخۂ سودا میں صرف دو نقل ہوئے ہیں۔

نسخۂ سودا کا چھٹا شعر "گلِ رعنا" (عابدی) کی پانچویں غزل سے ہے جس میں شعر ہیں۔ ساتواں شعر، دسویں غزل کا واحد شعر ہے۔ شعر ۸ تا ۱۱ "گلِ رعنا" (عابدی) کی گیارہویں غزل پر مشتمل ہے اور نسخۂ سودا کا بارھواں تیرھواں شعر، اُس غزل کے پہلے دو شعر ہیں "گلِ رعنا" (عابدی) میں جس کا ترتیبی شمارہ اکسٹھ ہے۔ گویا "گلِ رعنا" عابدی کے حصۂ اُردو کی پہلی ساٹھ غزلوں میں سے (جن کے اشعار کی مجموعی تعداد ۲۴۲ ہے)، نسخۂ سودا میں چھ متفرق غزلوں کے صرف گیارہ شعر نقل ہوئے ہیں۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اصل کے مقابلے میں نسخۂ سودا کے حصۂ اُردو کے بقیہ مندرجات کا تناسب بھی ایسا ہی مجمل اور قلیل ہوگا۔

نسخۂ سودا کے حصۂ فارسی کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ نسخۂ سودا کے آخری دو صفحات کے عکس، عابدی صاحب نے نمونہ "۳" کے طور پر شائع کیے ہیں۔ ان میں اشعار کی کتابت سہ کالمی انداز میں ہوئی ہے۔ آخری صفحے سے متصل صفحے کا پہلا شعر یہ ہے :

رازدارِ تو دیدہ تام کُن تقدیرم
ہم سپاس از تو و ہم شکوہ ز اختر دارم

اس صفحے پر بائیس شعر آئے ہیں۔ آخری شعر یہ ہے :

از وہم قطرگیست کہ در خود گمیم ما
اما چو وارسیم ہمان قلزمیم ما

آخری صفحے پر "گمیم ما، قلزمیم ما" والی اس غزل کے بہ ترتیب ذیل تین کالموں میں یہ چھ شعر آئے ہیں :

در خاک از ہوائے گل و شمع فارغیم — از توسنِ تو طالبِ نقشِ سمیم ما
از حد گزشت شملۂ دستار و ریشِ شیخ — حیران این درازیِ بال و دمیم ما
تمکینِ ما ز چرخِ تنک سر بباد رفت — خوش دستگاہِ انجمنِ انجمیم ما[1]
پنہاں بہ عالمیم ز بس عینِ عالمیم — چون قطرہ در روانیِ دریا گمیم ما
ما را مدد ز فیضِ ظہوری ست در سخن — چون جام بادہ را تہ خوار خمیم ما
غالب ز ہند نیست نوائے کہ می کشیم — گوئی ز اصفہان و ہرات و قمیم ما

"گلِ رعنا" (عابدی) میں غالب کی ستائیس فارسی غزلیں ہیں، یہ باعتبارِ ترتیب نویں غزل ہے۔ نسخۂ سویدا اسی غزل پر تمام ہو جاتا ہے۔ ان اشعار سے عین متصل وسطی کالم میں ترقیمہ ہے جس کی پہلی سطر یہ ہے:

"تمام شد گل رعنا بتاریخ . . . . سنہ ہجری"[2]

گویا نسخۂ سویدا میں حصۂ فارسی کی کم از کم آخری اٹھارہ غزلیں اور خاتمۂ "گلِ رعنا" کی نثر سرے سے نقل ہی نہیں ہوئی۔ خود عابدی صاحب کے بقول:

"نسخۂ جمال سویدا کی منظومات میں جابجا غزلیں یا بعض اشعار ساقط ہیں اور صفحات کو بیاض (یعنی: سادہ) چھوڑ دیا گیا ہے۔ قاضی عزت اللہ نے شروع میں خود بھی لکھ دیا ہے: بعضی[3] اشعار نوشتہ شد"

(مقدمۂ گلِ رعنا، ص ۳۴)

---

[1] اس شعر کے بعد عابدی صاحب کے مرتبہ متن (ص ۱) میں بمقابلہ نسخۂ سویدا بلا صراحت یہ دو شعر زائد ہیں:

مردم بہ کینہ تشنۂ خون ہمند و بس — خون می خوریم چون ہمہ ازیں مردمیم ما
دستت ز نارسیِ مسیحا کہ زیرِ خاک — آب از تفِ نہیب صدائے قمیم ما

[2] اس تاریخ کا عکس اتنا دھندلا ہے کہ عکس کی مدد سے اس کا پڑھ پانا ممکن نہیں۔ عابدی صاحب نے نسخۂ سویدا کی کتابت کی تاریخِ تکمیل ۲۰ ذی قعدہ ۱۲۵۲ھ مطابق ۲۶ فروری ۱۸۳۷ء بتائی ہے۔ (مقدمہ، ص ۲۱)

[3] "بعضی" عابدی صاحب کا سہوِ قلم ہے اس لیے کہ اصل میں "بعضی" کے بجائے لفظ "چند" ہے۔ دیکھیے: "گلِ رعنا" (عابدی) میں نسخۂ سویدا کے دیباچے کا عکس، صفحہ ۴، سطر ۶۔

لیکن عابدی صاحب نے "متنِ کتاب" میں 'بیاض' کی نشاندہی نہیں کی[۱] کیونکہ نسخۂ خواجہ بخطِ غالب کے کتابیاتی کوائف دینے پر وہ قادر نہیں تھے، انھوں نے نسخۂ سویدا کے کتابیاتی کوائف سے بھی چشم پوشی کی ہے۔ اس سلسلے میں عذر انھوں نے یہ کیا ہے کہ:

"نسخۂ خواجہ اور نسخۂ سویدا کے کتابیاتی کوائف ہم یہاں اس لیے درج نہیں کرتے کہ اُمید ہوتی ہے کہ خواجہ صاحب محترم اور محبِ مکرم جناب حکیم صاحب اپنے اپنے نسخے کی عکسی طباعت و اشاعت کا کبھی نہ کبھی اہتمام فرمائیں گے[۲]۔ پھر یہ چیزیں ایک حد تک "اشاریۂ غالب" (شائع کردہ مجلس یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور) میں محفوظ ہو گئی ہیں، جو جناب سید معین الرحمٰن صاحب[۳] نے مرتب کیا ہے"

(سید وزیر الحسن عابدی، مقدمہ گلِ رعنا، ص ۳۴)

---

[۱] سید قدرت نقوی، سہ ماہی اُردو، کراچی، شمارہ ۱، ۱۹۷۱ء مستقل مضامین ص ۲۳۔

[۲] "کیا ہی اچھا ہوتا کہ موصوف اس امید سے قطع نظر کرتے ہوئے کتابیاتی کوائف تحریر فرما دیتے تو اہلِ تحقیق کو ان دونوں نسخوں کے متعلق مکمل کر اظہارِ رائے کا حق مل جاتا۔ صفحات کے عکس اور متن مطبوعہ کا ہم نے بڑی دشواری سے مقابلہ کیا تو ہمیں اختلاف نظر آیا اور یہ بات سمجھنے سے قاصر رہے کہ آخر یہ اختلاف دور کرنے اور نشاندہی کرنے میں کونسا امر مانع ہوا؟ مقدمہ میں بھی عابدی صاحب نے ان اُمور کے متعلق کوئی بات نہیں لکھی جس سے یہ گتھی سلجھ سکتی۔"

(سید قدرت نقوی، اُردو، کراچی، شمارہ ۱، ۱۹۷۱ء، مستقل مضامین ص ۲۶)

[۳] "نسخۂ خواجہ (بخطِ غالب) کے متعلق سب سے پہلے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اطلاع بہم پہنچائی"۔ وزیر الحسن عابدی صاحب نے بھی اس سے استفادہ کرنے کا ذکر کیا ہے مگر اس کا تعارف نہیں کرایا، نیز اپنی مرتبہ "گلِ رعنا" کے متن میں اس سے کام لینے کا اعتراف کیا ہے لیکن اختلافِ نسخ میں اس کے متن کا بدل نہیں دکھایا۔ افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ عابدی صاحب کے محققانہ دیباچے میں اس نسخے کے تعارف کا نہ ہونا بڑی شدت سے محسوس کیا گیا۔

(سید قدرت نقوی، اُردو، کراچی، شمارہ ۱، ۱۹۷۱ء، مستقل مضامین ص ۲۲)

نسخۂ خواجہ اور نسخۂ سویدا کے کتابیاتی کوائف درج نہ کرنے کے بارے میں عابدی صاحب کا یہ بیان محض عذر بارد ہے۔ اصل یہ ہے کہ نسخۂ خواجہ بخطِ غالب کے کتابیاتی کوائف وہ اس لیے درج نہیں کر سکے کہ یہ نسخہ انھیں میسر ہی نہیں آیا۔ اس کے کتابیاتی کوائف وہ راقم کی کتاب "اشاریۂ غالب" کے حوالے سے درج کرتے تو یہ تاثر کہ انھیں اصل خطی نسخے سے راست استفادے کا موقع ملا ہے، اور یہ کہ ان کا پیش کردہ متن بخطِ غالب پر مبنی ہے زائل ہو سکتا تھا۔

نسخۂ سویدا کے کوائف وہ دے سکتے تھے لیکن یہ بدیں مصلحت نہیں دیے کہ دو قلمی نسخوں سے استفادے کا دعویٰ ہے، صرف ایک کے کتابیاتی کوائف درج کرنا دوسرے کے نہ دیں تو اس ناہمواری کا کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا تھا، یوں بھی نسخۂ سویدا کا تعارف کرانا اور اس کے کوائف درج کرنا اپنے کام کو ہلکا کرنا تھا۔ اس لیے کہ یہ مخطوطہ، جیسا کہ عرض کیا جا چکا "گلِ رعنا" کا کوئی مکمل مخطوطہ نہیں ہے۔ یہ ناقص بھی ہے، ناتمام بھی۔ اس میں جا بجا غزلیں کی غزلیں محذوف اور اشعار ساقط ہیں۔ خاتمے کی نثر، سرے سے موجود ہی نہیں۔

نسخۂ سویدا کا ذکر "اشاریۂ غالب" میں ضمناً صرف دو مقامات پر آیا ہے:

> "گلِ رعنا" کا ایک خطی نسخہ لاہور میں حکیم محمد نبی خاں جمال سویدا صاحب نبیرۂ حکیم اجمل خاں مرحوم کے پاس محفوظ ہے۔" (اشاریۂ غالب ص ۲۹۶)
>
> "اس مخطوطے کا کاتب مجہول الاسم ہے، لیکن اس کی کتابت بہر طور معاصر ہے" (اشاریۂ غالب ص ۳۹۹)

ظاہر ہے، یہ ایسی شافی اور کافی معلومات نہیں ہیں کہ عابدی صاحب کو اس نسخے کے کتابیاتی کوائف دینے میں مانع ہوتیں۔ اس لیے نسخۂ سویدا کے کتابیاتی کوائف کے بارے میں عابدی صاحب کے اس بیان سے کہ:

> "یہ چیزیں ایک حد تک "اشاریۂ غالب" میں محفوظ ہو گئی ہیں"۔
>
> (مقدمہ گلِ رعنا (عابدی) ص ۲۲)

غالب کا کوئی طالب علم مطمئن نہیں ہو سکتا۔

سید وزیر الحسن عابدی کا بنیادی موقف یہ ہے کہ:

گلِ رعنا کے بارے میں ہماری معلومات کا ماخذ کتاب کے تین نسخے ہیں:

۱۔ نسخۂ مالک رام ۲۔ نسخۂ غالب (نسخۂ خواجہ)

۳۔ نسخۂ قاضی عزت اللہ دہلوی (نسخۂ سویدا)

.... لاہور کے دو قلمی نسخوں کو دیکھ کر اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ "گلِ رعنا" کا اصل متن وہی ہے جو مالک رام کے مقالوں سے صورت پذیر ہوتا ہے۔" (مقدمۂ گلِ رعنا، عابدی، ص ۱۹-۲۰)

لیکن عابدی صاحب کی یہ بات کہ "ہماری معلومات کا ماخذ کتاب کے مندرجہ تین نسخے" ہیں محض برائے بیت ہے، حقیقت اس کے برعکس وہ ہے جو پیشِ نظر ماخذ سے برآمد ہوتی ہے یعنی سید وزیر الحسن عابدی نے "تصحیح و تحقیق" کے ساتھ "گلِ رعنا" کا جو متن شائع کیا ہے، اس کا:

۱۔ دیباچہ: "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" مطبوعہ سے ماخوذ ہے۔ نسخۂ سویدا سے اس کا سرسری مقابلہ کر کے زائد عبارتوں کو ضبط کر لیا گیا ہے۔

۲۔ خاتمہ: یہ من و عن "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" مطبوعہ سے منقول ہے۔

۳۔ منظوم حصے: منظوم حصوں کی تکمیل جناب مالک رام کے اُن مقالات کی مدد سے کی گئی ہے جن میں اہم اختلافاتِ متن کے ساتھ ساتھ اُردو کلام کے مشمولات اور حصۂ فارسی کے مندرجات کی واضح طور پر نشاندہی اور صراحت موجود ہے اس ضمن میں دیوانِ غالب (اُردو) نسخۂ عرشی (۱۹۵۸ء) سے بھی فائدہ اُٹھایا گیا ہے جس میں "گلِ رعنا" کی غزلیات

اشعار کو مولانا امتیاز علی عرشی نے حواشی اور تعلیقات میں
متعیّن کر دیا ہے۔

۴ - آغازِ فارسی کی نثر: فارسی کلام کے آغاز میں جو پنج سطری نثر بطور "گریز" یا "تمہید" آئی ہے اُسے "گلِ رعنا" کے حصۂ فارسی کے تعارفی مقالے از: مالک رام، مطبوعہ: نگار لکھنؤ جولائی ۱۹۶۰ء سے حاصل کیا گیا ہے۔

۵ - دو عکس: "گلِ رعنا" (عابدی) میں "گلِ رعنا" نسخۂ غالب بخطِ غالب کے دو متفرق صفحات کے عکس بھی شاملِ اشاعت کیے گئے ہیں، یہ مغالطہ انگیز ہیں: انھیں بلا حوالہ راقم الحروف کی کتاب "اشاریۂ غالب" (۱۹۶۹ء) سے لے لیا گیا ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ سید وزیر الحسن عابدی کی "تصحیح و تحقیق" کے ساتھ "گلِ رعنا" کا جو متن شائع ہو کر سامنے آیا ہے، اُس کی کوئی معتبر اور واقعی بنیاد نہیں ہے۔ یہ اُن کے اِدّعا کے برعکس "گلِ رعنا" کے اصلی اور نادر نسخے، نسخۂ خواجہ محمد حسن بخطِ غالب پر مبنی نہیں ہے، اس لیے اس متن کو نوشتۂ غالب کے بمنزلہ سمجھ کر اس سے استفادہ کرنا اپنے آپ کو مغالطے اور تاریکی میں رکھنا ہوگا۔

عابدی صاحب کی یہ کتاب 'ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان' پنجاب یونیورسٹی' لاہور کی طرف سے 'متروکہ اوقاف بورڈ'، حکومتِ پاکستان کی مالی امداد سے معروف غالب شناس ڈاکٹر شیخ محمد اکرام[۱] کے اس "پیش لفظ" کے ساتھ شائع ہوئی:

---

[۱] شیخ محمد اکرام مرحوم پر بعنوان: "ایس۔ایم۔اکرام — بطور غالب شناس" بہ تفصیلِ ذیل ایک اچھا کام ہوا ہے:
تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے امتحان (۱۹۷۴ء) ایم۔اے۔ اردو، پنجاب یونیورسٹی' لاہور
صفحات ۲۱۸، مقالہ نگار: قمر النساء شیخ، نگرانِ کار: پروفیسر ڈاکٹر معین الرحمٰن

"غالب کے منتخب اُردو اور فارسی کلام کا اولین مجموعہ "گلِ رعنا" اب تک
تصانیفِ غالب کا گوہرِ گم شدہ اور غالبیات کا حلقۂ مفقودہ رہا ہے
البتہ کچھ مدّت پہلے ہندوستان میں "ذکرِ غالب" کے نامور مصنف
مالک رام صاحب کو اس کا خطی نسخہ ملا تھا جس کا انھوں نے اپنے دو
گراں قدر مقالوں میں تعارف کرایا ہے ۔۔۔۔ زیرِ نظر نسخے کے مرتّب
سید وزیر الحسن عابدی دقیقہ رس اور صاحبِ نظر محقق ہیں۔ نوادرِ غالب
کی انھیں خاص طور پر تلاش رہتی ہے۔ لیکن ان کا فرمانا ہے کہ محض
قسمتی تھی کہ انھیں لاہور میں "گلِ رعنا" کے دو ایسے مستند نسخوں
تک رسائی حاصل ہو گئی، جن میں سے ایک غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا
ہے اور دوسرا غالب کے ایک دوست کا تحریر کردہ ہے جس نے
غالب سے کتاب لے کر اسے نقل کیا تھا ۔۔۔۔ مجھے دلی مسرت ہے
کہ غالب کی صد سالہ برسی کی تقریب میں ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان،
دلدادگانِ غالب کی خدمت میں ایک ہدیۂ نادر پیش کرنے کا شرف
حاصل کر رہا ہے ۔" (پیش لفظ : صفحہ ۳)

سید وزیر الحسن عابدی نے اپنے مقدمے کو ان کلمات پر ختم کیا ہے :

"آخر میں "غالب نامہ" کے نامی مصنف مخدومی جناب ڈاکٹر شیخ محمد اکرام
صاحب ستارۂ پاکستان کی خدمت میں یہ حقیر مرتب سپاس کے گلہائے
اخلاص نذر کرتا ہے کہ قوم کے تہذیبی سرمائے سے قیمتی موتیوں کے
انتخاب میں موصوف کی دیدہ وری اور علم پروری کی بدولت پورے ڈیڑھ سو برس میں[1]

---

[1] پورے ڈیڑھ سو برس کی گم گشتگی" کا ٹکڑا محلِ نظر ہے۔ "گلِ رعنا" ستمبر ۱۸۲۸ء میں مدون ہوئی
اس واقعے کو ستمبر ۱۹۷۸ء میں ڈیڑھ سو برس پورے ہوں گے۔ پھر "گلِ رعنا" بدستِ غالب
مدون اور مرتب ہوتے ہی "گم" نہیں ہو گئی تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں مولانا حسرت موہانی
نے دیوانِ غالب کی شرح لکھی تو "گلِ رعنا" اُن کے پیشِ نظر تھی۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

• کی گم گشتگی کے بعد ہمارے ادب کا یہ مٹا ہوا نقش اہلِ علم و ادب
کے ذوقِ نظر کے لیے پھر نمودار اور محفوظ ہو سکا........"

[مقدمہ، ص ۸۱]

بشکلِ موجودہ، یہ کتاب طباعتی حسن و صحت کے معیار کے لحاظ سے ہی قابلِ اطمینان ہے۔ کاش یہ متنی ترتیب و تحقیق کے اعتبار سے بھی ایسی ہوتی! اس صورت میں یقیناً یہ "دلدادگانِ غالب" کے لیے "ہدیۂ نادر" قرار پاتی ۔

○

"گلِ رعنا"

نسخۂ مالک رام

(۱)

غالب صدی "گلِ رعنا" کے مختلف نسخوں کو منظرِ عام پر لانے کے سلسلے میں بڑی زرخیز اور یادگار ثابت ہوئی - ۱۹۶۹ء میں راقم الحروف نے غالب دوستوں کو "گلِ رعنا" کے دو مخطوطوں، نسخۂ سویدا، اور نسخۂ غالب بخطِ غالب مرقومہ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحے سے آگے) ... ۱۹۴۲ء تک کم از کم اس کا حصۂ اُردو ان کے پاس موجود اور محفوظ تھا (دیکھیے: انتخابِ غالب، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ۱۹۴۲ء دیباچہ صفحہ ک) یہاں تک کہ ۱۹۵۷ء میں اس کا ایک مکمل خطی نسخہ بھی نمودار ہو گیا (مخزونہ کتب خانۂ مالک رام دہلی) اس لیے عابدی صاحب کا یہ کہنا کہ:

"ادب کا یہ مٹا ہوا نقش، پورے ڈیڑھ سو برس کی گم گشتگی کے بعد
پھر نمودار اور محفوظ ہو سکا۔"

زیادہ صحیح نہیں ہے۔

۱۱- ستمبر ۱۸۲۸ء کا پتا دیا ہے۔[1]

مئی ۱۹۷۰ء میں مالک رام (دلّی) نے اپنے نسخے کو جو ۱۹۵۷ء سے اُن کے پاس تھا، مرتب کر کے شائع کیا ــ ۱۹۷۰ء کے آخر میں لاہور سے "گلِ رعنا" کا ایک متن شائع ہوا جسے سید وزیر الحسن عابدی نے "ترتیب" دیا ہے۔

سہ ماہی اُردو، کراچی، شمارہ ۱، جنوری، مارچ ۱۹۷۱ء سے "گلِ رعنا" کا ایک اور نسخہ قسط وار چھپنا شروع ہوا، ۱۹۷۵ء میں یہ انجمن ترقی اُردو، کراچی کی جانب سے کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ اس نسخے کی دریافت کا سہرا مشفق خواجہ کے سر ہے جنھوں نے اس کی ترتیب کا کام سید قدرت نقوی سے لیا۔

یہاں مالک رام کے مرتب کردہ نسخۂ "گلِ رعنا" پر اظہارِ خیال مقصود ہے۔

(۲)

مالک رام، اپنی سرکاری ملازمت کے دوران میں چند سے (۵۸-۱۹۵۶ء) مرکزی حکومتِ ہند کے شعبۂ تجارت درآمد و برآمد میں رہے ہیں، یہیں اُن کے افسر اعلیٰ سید نقی بلگرامی نے اُنھیں اپنے دادا مرحوم نواب عماد الملک[2] کے کتاب خانے (حیدر آباد دکن) کا نسخہ تحفۃً دیا۔ یہ نسخہ "گلِ رعنا" کا تھا، یعنی غالب کے اُردو فارسی اشعار کا اولین انتخاب، جو نایاب ہو چکا تھا! مالک رام لکھتے ہیں:

"یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے۔ میں اس کے چند مہینے بعد اپریل ۱۹۵۸ء میں

---

[1] "۱۹۶۹ء میں جب غالب کی صد سالہ برسی منائی جا رہی تھی تو "گلِ رعنا" کے نسخۂ مالک رام کے علاوہ دو اور مخطوطوں کا علم ہوا اور ان کا تعارف سید معین الرحمٰن نے "نقوش" کے غالب نمبر، حصہ دوم میں کرایا۔ یہ دونوں نسخے لاہور میں ہیں۔"

(سید قدرت نقوی، اُردو، کراچی، جنوری، مارچ ۱۹۷۱ء، مستقل مضامین ص۱)

[2] نواب صاحب کے حالات میں رجوع کیجیے چند ہم عصر، مولوی عبد الحق، کراچی جولائی ۱۹۷۳ء ص ۳۲۰ - ۳۳۵

اپنی ملازمت کے سلسلے میں پھر ملک سے باہر چلا گیا۔ روانگی سے قبل میں نے ایک مبسوط مضمون اس کے بہرۂ اُردو سے متعلق "نذرِ ذاکر" کے لیے تیار کیا جو زیرِ ترتیب تھی۔ میں بلجیم میں تھا کہ نیاز فتحپوری مرحوم کا خط ملا کہ "نگار" کا غالب نمبر شائع کرنا چاہتا ہوں، غالب کی فارسی تصنیفات سے متعلق ایک مضمون بھیج دو۔ میں نے تعمیلِ حکم میں تو مضمون لکھا ہی، لیکن از خود ایک اور مضمون "گلِ رعنا" کے بہرۂ فارسی سے متعلق بھی لکھ کر انھیں بھیج دیا۔ اُنھوں نے یہ دونوں شاملِ اشاعت کر لیے — میں چھ سال بعد ۱۹۶۴ء کے وسط میں وطن واپس آیا، یہاں غالب صدسالہ یادگار منانے کی داغ بیل پڑ چکی تھی — اب میں نے خیال کیا کہ پوری کتاب کو ٹھیک سے مرتب کر کے شائع کر دینا چاہیے اور اس کے لیے غالب صدسالہ برسی کی یہ تقریب (۱۹۶۹ء) بہت موزوں موقع معلوم ہوا لیکن یادگار کمیٹی کے اربابِ حل و عقد کو بھی میری واپسی کی اطلاع مل گئی اور بتدریج میں اُن کے ساتھ اس تقریب کی تیاریوں اور سرگرمیوں میں اُلجھتا چلا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس موقع پر "گلِ رعنا" شائع نہ کر سکا۔ شکر ہے کہ اب سال بھر بعد (۱۹۷۰ء میں) یہ خواہش پوری ہو رہی ہے —"

(مقدمۂ گلِ رعنا صفحہ ۱۳ و مابعد)

"گلِ رعنا" مرتبہ: مالک رام، علمی مجلس، دہلی سے مئی ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ ۱۸ × ۲۲/۸ سائز کے ۲۰۶ صفحات پر مشتمل ہے، کتاب کے مندرجات اور مشمولات کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ مقدمہ:	مالک رام	صفحہ ۷ - ۴۱
۲۔ دیباچہ:	غالب	۴۵ - ۴۸

۳ - انتخابِ کلامِ غالب:

	(ل) اُردو	۵۱ - ۱۰۶
	(ب) فارسی	۱۰۷ - ۱۴۵
۴ - خاتمہ:	غالب	۱۴۶ - ۱۵۴
۵ - حواشی:	مالک رام	۱۵۵ - ۲۰۴
۶ - کتابیات:		۲۰۵ - ۲۰۶

مالک رام نے اپنے مقدمے میں بتایا ہے کہ "گلِ رعنا" کا یہ نسخہ مکمل ہے - کاغذ کا سائز ½۲۲ × ۱۴ سم ہے اور حوض کا ½۱۹ × ¾۱۹ سم، کاغذ باریک ولایتی ہلکے بادامی رنگ کا ہے۔ کہیں کہیں کرم خوردگی کے آثار ملتے ہیں لیکن اس سے نہ کتاب کو کوئی نقصان پہنچا ہے نہ متن ہی کا کوئی حصہ ضائع ہوا ہے - پوری کتاب کی نظم و نثر ایک ہاتھ میں سیاہ روشنائی سے، نستعلیق خط میں لکھی گئی ہے۔ کاتب اگرچہ بہت خوش خط تو نہیں کہا جا سکتا لیکن بدخط بھی نہیں ہے غلطی بھی کم کرتا ہے، اگرچہ اس سے بالکل عاری نہیں ہے - ہر جگہ تخلص، عنوان، وله وغیرہ الفاظ شنجرفی روشنائی سے لکھے ہیں - ہر ایک صفحے پر دو جدولیں ہیں - باہری جدول صفحے کے کنارے سے کچھ ہی اندر کی طرف اکہرے نیلے خط کی ہے - اس سے ۲ سم اندر حوض کے عین اردگرد جدول تین خطوں پر مشتمل ہے باہر نیلا خط ہے اور اندر کی طرف شنجرفی رنگ کے دو خط ــــ غزلوں کے درمیان کے خطوط بھی شنجرفی ہیں - غرض کہ کتاب اچھے خاصے اہتمام سے لکھی گئی ہے - ہر ایک صفحے پر تیرہ سطریں ہیں. صفحہ ایک خالی ہے - کتاب صفحہ ۲ سے شروع ہوئی ہے اور اس پر نمبر شمار (۱) درج ہے - پوری کتاب ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے" (مقدمہ، ص۱۹)

[۴]

"صفحہ (۱) سے فارسی دیباچہ شروع ہوتا ہے - اس کے عنوان میں صرف یہ لفظ لکھے ہیں" لاموثر فی الوجود الا اللہ"، یہ صفحہ ۷ تک چلا گیا ہے - اس کے آخر میں تاریخ

نامکمل ہے۔ لکھا ہے: "محررہ نہم شوال سنہ ۱۲ ہجری" ۔۔ اب "گلِ رعنا" غالب کا اپنا لکھا ہوا نسخہ بھی لاہور میں دستیاب ہو گیا ہے جس کے آخر میں تاریخ "غرۂ ربیع الاوّل ۱۲۴۴ ہجری" ثبت ہے جو مطابق ہے ۱۱ - ستمبر ۱۸۲۸ء کے ۔ گویا غالب نے اسے اپنے کلکتے میں ورود کے تقریباً آٹھ مہینے بعد مکمل کیا ۔ میرے خیال میں نسخۂ زیرِ نظر کے کاتب نے دیباچے کے آخر میں وہ تاریخ دینا چاہی تھی، جب اس نے اسے نقل کیا ہے، نہ کہ نسخۂ منقول عنہ کی تاریخ (جو میرے نزدیک خود غالب کا لکھا ہوا نسخہ تھا) ۔۔۔۔
اگر میرا قیاس درست ہو تو یہ زیرِ نظر نسخہ شوال ۱۲۴۴ھ کا کتابت کردہ ہے ۔ سال ہجری کی عدم تکمیل غالباً نتیجہ ہے کاتب کے سالِ ہجری سے ناواقفیت کا ۔۔۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے بعد کو مکمل کر لے : لیکن اس کا اسے موقع نہ ملا ۔ سنہ ۱۲ کا لکھنا اور باقی خالی چھوڑ دینے کی اور کوئی توجیہہ نہیں ہو سکتی ۔"

(مالک رام، مقدمہ : ص ۲۰)

نسخۂ غالب، بخطِ غالب مرقومہ غرۂ ربیع الاوّل ۱۲۴۴ھ اور نسخۂ مالک رام کے سرسری تقابلی مطالعے سے بالخصوص خاتمۂ گلِ رعنا کے واضح عبارتی کی بنا پر بالیقین یہ کہا جا سکتا ہے کہ نسخۂ مالک رام، غالب کے خطی نسخۂ مذکور کی نقل نہیں ہے ۔

اگر بفرضِ محال مالک رام کے اس قیاس کو درست بھی مان لیا جائے کہ "نسخۂ منقول عنہ" خود غالب کا لکھا ہوا غرۂ ربیع الاول ۱۲۴۴ ہجری کا نسخہ تھا، تو اِس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ زیرِ نظر نسخہ بھی لازماً ۱۲۴۴ ہجری ہی کا نقل کردہ ہے؟ اور اگر کاتب نے اسی سال غالب کے قلمی نسخے سے جس پر "غرہ ربیع الاوّل سنہ ۱۲۴۴ھ" کی تاریخ موجود ہے ۔ "گلِ رعنا" کو نقل کیا ہے تو پھر اس کے "سالِ ہجری سے ناواقفیت" کی "توجیہہ" کیا یادر ہوا نہیں ہو جاتی ؟

غالب کے عہد میں ہجری سال ہی معاشرے میں رائج تھا۔ شوال کے مہینے، یعنی رواں سال کے دسویں مہینے تک کاتب کا معاشرے میں رائج سنہ سے ناواقف ہونا بدرجۂ آخر بھی مشکل ہی سے قابلِ قبول ہو سکتا ہے ۔

"سنہ ۱۲" کا لکھنا اور بقیہ حصہ اعداد خالی چھوڑ دینے کی "کاتب کے سالِ ہجری سے ناواقفیت" سے کہیں زیادہ قرینِ صواب تعبیر یہ کی گئی ہے[1] کہ وہ سالِ رواں کے ہندسے، تخلص، عنوان اور ولہٗ وغیرہ الفاظ کی طرح شنگرفی روشنائی سے لکھ کر نمایاں کرنا چاہتا ہو اور سوچا ہو کہ بعد میں لکھ دوں گا اور پھر یہ بات ذہن سے اتر گئی ہو۔
ایک قیاس یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کاتب نے اسے کسی ایسے نسخے سے نقل کیا ہو جس میں تاریخ "نہم شوال سنہ ۱۲" مکمل ہو اور وہ سنہ گزر چکا ہو، کاتب روانی میں "نہم شوال سنہ ۱۲" تک تو لکھ گیا، لیکن یہاں پہنچ کر اُسے دھیان آیا کہ یہ سنہ تو گزر چکا۔ اُس نے عمداً تاریخ کو اسی صورت میں نامکمل چھوڑ دیا کہ صاحبِ کتاب سے رجوع کرنے کے بعد، جو سال اُسے بتایا جائے گا وہ لکھ دے گا اور بعد میں وہ پوچھنا اور یا پوچھ چکنے کے بعد لکھنا بھول گیا۔

{۴}

سید قدرت نقوی کا خیال ہے[2] اور یہ بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ مالک رام کا کارِ نقل بالیقین ۱۸۳۵ء (یا اس) کے بعد عمل میں آیا، کیونکہ کاتب نے خاتمے کے بعد یہ لکھا ہے: "خاتمۂ دیوانِ فارسی"
یہ خاتمہ ۱۸۳۵ء میں یا اس کے لگ بھگ جب دیوانِ فارسی مرتب ہوا تو لکھا گیا اور "پنج آہنگ" جب مرتب ہوئی تو اس میں بھی خاتمۂ "گلِ رعنا" کے بعد "خاتمہ دیوانِ فارسی" نقل ہوا ہے ــ اس ضمن میں مالک رام لکھتے ہیں کہ "گلِ رعنا" کے:

> "اس قلمی نسخے کے خاتمے کی نثر کے اختتام پر کاتب نے "تحریر اسداللہ محررہ دوم محرم الحرام" کے الفاظ کے بعد جلی عنوان دیا ہے: "خاتمہ دیوانِ فارسی" لیکن خاتمۂ دیوانِ فارسی کی عبارت

[1] سہ ماہی اُردو، کراچی، شمارہ ۱، جنوری مارچ ۱۹۷۱ء، مستقل مضامین، ص ۲۰
[2] ایضاً

اس کے بعد نہیں لکھی گئی۔ اس وقت مطبوعہ کلیاتِ نثر میں
"خاتمۂ گلِ رعنا" کی عبارت کے خاتمے کی واقعی یہی صورت ہے
اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ کاتب نے شائد یہ عبارت "گلِ رعنا"
کے اصلی خطی نسخے سے نہیں بلکہ کلیاتِ نثر کے کسی قلمی نسخے سے
نقل کی ہو، یہ قیاس درست نہیں ہو گا کیونکہ "گلِ رعنا" کا متنِ انتخابِ
اشعار تو کلیاتِ نثر کے کسی نسخے میں نہیں ملتا ایک بعید سا امکان
یہ ہے کہ متنِ اشعار تو اس نے واقعی "گلِ رعنا" ہی سے لیا اور
خاتمے کی عبارت کلیاتِ نثر کے کسی خطی یا مطبوعہ نسخے سے نقل
کی اور رواروی میں "خاتمۂ دیوانِ فارسی" الفاظ بھی لکھ گیا تو یہ
بات بھی ماننے کی نہیں۔ آخر جب اس نے متن "گلِ رعنا" سے
لیا تھا تو نثری حصہ کیوں نہ وہیں سے نقل کر لیا!" (مقدمہ، ص ۲)

لیکن سید قدرت نقوی کا اصرار ہے کہ مالک رام نے، یہ تمام باتیں اس لیے بیان فرمائیں کہ ان کے زیرِ نظر نسخے کو "گلِ رعنا" کے نسخۂ بقلمِ غالب کی نقل اور اسی عہد کا کتابت شدہ مان لیا جائے[1]"

اس سے قطع نظر کہ نقوی صاحب نے سوئے ظن سے کام لیا ہے اور مالک رام پر ایک طرح سے فتورِ نیت کا الزام دھرا ہے جسے کسی طرح بھی مناسب نہیں کہا جا سکتا اور اس سے بچا جا سکتا تو بہت اچھا تھا۔ مجھے نقوی صاحب کے "حاصلِ کلام" سے بڑی حد تک اتفاق ہے وہ لکھتے ہیں:

"قابلِ غور بات یہ ہے کہ "خاتمۂ دیوانِ فارسی" کے الفاظ کیوں
نقل ہوئے اور کہاں سے نقل ہوئے؟ یہ تو ابھی عرض کیا ہے کہ
خاتمے کی عبارت ترتیبِ دیوان کا عمل ۱۸۳۵ء میں ہوا اس لیے یہ
قیاس بے جا نہ ہو گا کہ یہ الفاظ ۱۸۳۵ء کے بعد لکھے گئے اور

---

[1] سہ ماہی اُردو، کراچی شمارہ ۱، جنوری مارچ ۱۹۷۱ء، مستقل مضامین ص ۲، و بہ بعد

جہاں سے یہ کاتب نقل کر رہا تھا وہاں یہ الفاظ موجود تھے (ممکن ہے)
"گلِ رعنا" کا کوئی ایسا نسخہ ہو جس میں خاتمۂ دیوانِ فارسی بھی نقل
کر لیا گیا ہو اور یہ نسخہ (یعنی نسخۂ مالک رام) اس سے نقل کیا
جا رہا ہو۔ کاتب جب اس مرحلے پر پہنچا تو اسے نقل کرنے سے منع
کر دیا گیا ہو۔ بہرحال اس نسخے میں خاتمے کی نقل (یعنی خاتمہ
دیوانِ فارسی کے جلی عنوان کی نقل) سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ نسخہ
۱۸۳۵ء کے بعد نقل کیا گیا ہے، ۱۲۴۴ ہجری (۱۸۲۸ء) میں نہیں[۱]۔"

میں سید قدرت نقوی کے نکالے ہوئے نتیجے کو اس جزوی ترمیم کے ساتھ قابلِ قبول سمجھتا ہوں کہ نسخۂ گلِ رعنا مخزونہ مالک رام کی کتابت لازماً ۱۸۳۵ء کے "بعد" ہی کی نہیں، یہ نسخہ ۱۸۳۵ء میں یا اس کے بعد کبھی نقل کیا گیا ہے۔ "بعد، کب تک؟" اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

(۵)

زیرِ بحث نسخہ، "گلِ رعنا" کے بارے میں مالک رام کا مشاہدہ ہے کہ:

"— پوری کتاب کی نظم و نثر ایک ہاتھ میں سیاہ روشنائی سے
نستعلیق خط میں لکھی گئی ہے[۲]۔"

"اس قلمی نسخے کے خاتمے کی نثر کے اختتام پر کاتب نے .....
جلی عنوان دیا ہے: خاتمہ دیوانِ فارسی، لیکن دیوانِ فارسی کی عبارت
اس کے بعد لکھی نہیں گئی[۳]۔"

اس وقت مطبوعہ "پنج آہنگ" اور "کلیاتِ نثرِ غالب" میں "خاتمۂ گلِ رعنا" کی عبارت کے خاتمے کی واقعی یہی صورت ہے، اس لیے گو مالک رام نے اس امکان کو رد کر دیا

---

[۱] ایضاً، صفحہ ۲۰ و ما بعد [۲] مقدمہ "گلِ رعنا" علمی مجلس، دہلی، مئی ۱۹۷۰ء۔ ص ۱۹

[۳] ایضاً، صفحہ ۲۰

ہے، لیکن میری رائے یہی ہے کہ کاتب نے کم از کم "خاتمۂ گلِ رعنا" کی عبارت اصلی خطی نسخے سے نہیں بلکہ "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" کے کسی (خطی یا) مطبوعہ نسخے سے نقل کی ہے[1]

نسخۂ "گلِ رعنا" بخطِ غالب (محررہ غرۂ ربیع الاول ۱۲۴۴ھ) میں خاتمے کے بعد "محرر دعاگو محمد اسد اللہ" درج ہے اور "ولہ" کا عنوان دے کر اسی صفحے کے بقیہ خالی حصے سے "مثنوی بادِ مخالف" شروع ہو جاتی ہے نہ کہ "خاتمۂ دیوانِ فارسی" — "گلِ رعنا" کے اصلی خطی نسخۂ غالب (مذکور) سے نقل تیار کرنے کی صورت میں کاتب "خاتمۂ دیوانِ فارسی" کا عنوان قائم کرنے کے بجائے "مثنوی بادِ مخالف" کو لکھنا شروع کرتا، جبکہ "پنج آہنگ" اور "کلیاتِ نثرِ غالب" کی بالکل یہی صورت ہے کہ "خاتمۂ گلِ رعنا" کے ختم ہوتے ہی "خاتمۂ دیوانِ فارسی" شروع ہو جاتا ہے۔

بالفعل میرے پیشِ نظر "پنج آہنگ" اور "کلیاتِ نثرِ غالب" کے مطبوعہ نسخے ہیں۔ "پنج آہنگ" کا وہ نسخہ جو غالب کی زندگی میں دوسری بار دہلی سے اپریل ۱۸۵۳ء میں شائع ہوا اور "کلیاتِ نثرِ غالب" کا پہلا ایڈیشن جو مطبع نولکشور لکھنؤ سے غالب کی زندگی میں جنوری ۱۸۶۸ء میں چھپا۔ "پنج آہنگ" میں "خاتمۂ گلِ رعنا"

---

[1] سید قدرت نقوی نے مالک رام کی اس رائے کے ایک حصے سے اتفاق اور ایک سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہ تو ہمیں بھی تسلیم ہے کہ خاتمہ (یعنی خاتمۂ گلِ رعنا) کلیات (یعنی کلیاتِ نثرِ غالب) سے نقل نہیں ہوا، لیکن جہاں سے نقل ہوا، وہ نسخہ بقلمِ غالب نہیں تھا۔"

(اردو، کراچی، جنوری، مارچ ۱۹۷۱ء، مستقل مضامین ص ۲۱)

مجھے نقوی صاحب کی رائے کے پہلے جزو سے اختلاف اور دوسرے سے اتفاق ہے۔ میرے نزدیک نسخۂ مالک رام میں خاتمۂ گلِ رعنا کی عبارت "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" سے نقل ہوئی ہے اور اسے مان لیا جائے تو پھر یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ "نسخۂ مالک رام" کے خاتمے کی عبارت کاتب نے "گلِ رعنا" کے اصلی خطی نسخے بقلمِ غالب سے نقل نہیں کی۔

صفحہ ۱۴۱ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۵۶ کی تیسری سطر پر ختم ہوتا ہے اسی سطر سے "خاتمۂ دیوانِ فارسی" کا جلی عنوان قائم کر کے چوتھی سطر سے دیوانِ فارسی کے خاتمے کی عبارت شروع ہو جاتی ہے — یعنی تیسری سطر کی بقیہ خالی جگہ میں بقلم جلی "خاتمۂ دیوان" کا ٹکڑا آیا ہے اور چوتھی سطر کا پہلا لفظ بخطِ جلی "فارسی" ہے۔

"پنج آہنگ" مطبوعہ ۱۸۵۳ء کے صفحہ ۱۵۶ کی پہلی چار سطروں کی ہو بہو نقل ملاحظہ ہو:

۱۵۶

پہلی سطر:	مدار المہام و الااہم را عمر دوام اساس و امر عالم مطاع
دوسری سطر:	و حکم عدو مال و دل آسودہ و طالع مسعود عطا دارد و محرر
تیسری سطر:	اسد اللہ محرّرہ دوم محرم الحرام خاتمۂ دیوانِ
چوتھی سطر:	فارسی یزداں را کہ سخن آفرید و زبان را بہ گفتار رنگ

"کلیاتِ نثرِ غالب" (جنوری ۱۸۶۸ء) کی بھی یہی صورت ہے۔ اس میں صفحہ ۲۹ سے "خاتمۂ گلِ رعنا" کا آغاز ہوا ہے (صفحہ ۲۹ پر "خاتمے" کی کل دس سطریں آئی ہیں) اور صفحہ ۳۲ کی پندرہویں سطر پر یہ تمام ہوا ہے۔ مابعد اس سے بالکل متصل "خاتمہ دیوانِ فارسی" کا عنوان نسبتاً جلی قلم سے ہے۔ یہاں "کلیاتِ نثرِ غالب" کے صفحہ ۳۲ سے "خاتمۂ گلِ رعنا" کی سطر ۱۴، ۱۵ اور جلی عنوان "خاتمۂ دیوانِ فارسی" پر مشتمل سطر ۱۶ کی نقل پیش کی جاتی ہے:

سطر ۱۴:	و صمد العلام سرو سر گروہ اہلِ کرم عمدۂ امرا، و الااہم .... طالع مسعود عطا دارد و محرّر
سطر ۱۵:	اسد اللہ محرّرہ دوم محرم الحرام
سطر ۱۶:	خاتمہ دیوانِ فارسے

یہ صوری مشابہت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ نسخۂ مالک رام کے کاتب نے

"گلِ رعنا" کے خاتمے کی عبارت "گلِ رعنا" کے اصلی خطی نسخے نوشتۂ غالب (غرۂ ربیع الاول ۱۲۴۴ ہجری) سے نہیں، بلکہ "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" کے کسی مطبوعہ (یا خطی) نسخے سے نقل کی ہے ـــ اور چونکہ "پنج آہنگ" اور "کلیاتِ نثرِ غالب" میں "خاتمۂ گلِ رعنا" کے مصابعد "خاتمۂ دیوانِ فارسی" آیا ہے، اس لیے کاتب روا روی میں "خاتمۂ دیوانِ فارسی" کے الفاظ بھی لکھ گیا۔

(۶)

اس صوری مشابہت سے قطع نظر بھی، بوجوہ میری رائے یہی ہے کہ نسخۂ مالک رام کے کاتب نے "خاتمۂ گلِ رعنا" کی عبارت اصلی خطی نسخے سے نہیں بلکہ "پنج آہنگ"، یا "کلیاتِ نثرِ غالب" کے کسی (خطی یا) مطبوعہ نسخے سے نقل کی ہے "گلِ رعنا" کے اصلی خطی نسخے نوشتۂ غالب (مذکور) سے تو اس لیے نہیں کہ اس میں "خاتمۂ گلِ رعنا" کی شکل بجنسہٖ وہ نہیں ہے جو مالک رام کے نسخے میں صورت پذیر ہوئی ہے اور "پنج آہنگ" یا "کلیاتِ نثرِ غالب" کے کسی مطبوعہ (یا خطی) نسخے سے اس لیے کہ نسخۂ مالک رام کے "خاتمۂ گلِ رعنا" کی عبارت' ـــ "پنج آہنگ" اور کلیاتِ نثرِ غالب" میں شامل "خاتمۂ گلِ رعنا" کے مطبوعہ متن سے حرف بحرف مطابقت رکھتی ہے۔ مثلاً "خاتمۂ گلِ رعنا" (نسخۂ مالک رام) کی آخری سطور یہ ہیں:

"...... طمع مرہم دارد کہ گرد کسادِ حالِ مرا در ہم دارد۔ مامول کہ سرکارِ والا سحر حلال و گوہر کمال مرا در سلک مطالعہ در آوردہ اصلاحِ حال صلہ دہد، تا گرہِ دلِ گرہ در گرہ دام مدعا گردد کہ سہامِ طالع ماہ و مگس ہمسرِ ہما گردد۔ احکم الحکام و صمد العلام سرور سرکردۂ اہلِ کرم عمدۂ امراء، مدار المہام والا ہمم را عمر دوام اساسِ دوام عالم مطاع و حکمِ عدو مال و دلِ آسودہ و طالعِ مسعود عطا دارد۔ ط محرّرہ اسد اللہ۔ محررۂ دوم محرم الحرام" (ص ۱۵۳)

"پنج آہنگ" (دہلی، اپریل ۱۸۵۳ء) اور کلیاتِ نثرِ غالب" لکھنؤ، جنوری ۱۸۶۸ء کے جو مطبوعہ نسخے میرے پیشِ نظر ہیں، اُن میں "خاتمۂ گلِ رعنا" کی اُن آخری سطور کا متن بالکل یہی ہے[1] جبکہ "گلِ رعنا" کے اصلی خطی نسخے مرقومہ غالب (غرۂ ربیع الاوّل ۱۲۴۴ ہجری) متعارفہ راقم الحروف میں "خاتمۂ گلِ رعنا" کی عبارت کی آخری سطور کا متن نسخۂ مالک رام کے مقابلے میں یہ ہے:

"..... طمع مرہم دارد کہ گرد ملال حال مرا در ہم و دلِ کم حوصلہ در دمرا ارسوادِ عالم کردہ احکم الحکام وصدر العلّام سرو سرکردۂ اہلِ کرم عمدۃ امرا، مدار المہام والا اہم رائمر دوام اساس وامر عالم مطاع و حکم عدو کاہ و دل آسودہ وطالع مسعود عطا دارد۔"
محرر دعاگو محمد اسد اللہ

متن کے اس قدر نمایاں اور بنیادی اختلاف سے میرے اس موقف کی دستاویزی تائید ہوتی ہے کہ نسخۂ مالک رام کے خاتمے کی عبارت "گلِ رعنا" کے اصلی نسخے نوشتۂ غالب غرہ ربیع الاول ۱۲۴۴ ہجری کی نقل نہیں ہے۔

اس توضیح و تجزیے کے بعد مالک رام کی یہ رائے قابلِ قبول نہیں ٹھہرتی کہ اُن کا مخزونہ نسخۂ "گلِ رعنا" خود غالب کے لکھے ہوئے نسخے کی نقل اور شوال ۱۲۴۴ ہجری (۱۸۲۸ء) کا کتابت کردہ ہے۔" (مقدمۂ گلِ رعنا، ص ۲۰)

(۷)

میرے نزدیک یہ نسخہ بوجوہ ۱۸۳۵ء میں یا اس کے بعد ۱۸۸۲ء تک کے زمانے میں کبھی نقل ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ نسخۂ مالک رام کی کتابت کا زمانہ ۱۲۵۱ ہجری (۱۸۳۵ء) سے لے کر حد سے حد ۱۲۹۹ ہجری (۱۸۸۲ء)

---

[1] سوائے اس خفی فرق کے ساتھ کہ "پنج آہنگ" (۱۸۵۳ء) کی آخری سطر میں "عطا دارد" کے بعد لفظ "فقط" کی مخفف صورت "ط" محذوف ہے جو چنداں قابلِ لحاظ نہیں۔

تک کی مدت پر محیط ہو سکتا ہے —— اور یہ سلسلہ ۱۸۳۵ء یا اس کے بعد سے ۱۸۸۲ء تک جن سنین سے ہو کر گزرتا ہے وہ یہ ہیں : ۱۸۳۵ء ، ۱۸۳۷ء ، ۱۸۴۵ء ، ۱۸۴۹ء ، ۱۸۵۳ء ، ۱۸۶۸ء ، ۱۸۷۱ء ، ۱۸۷۵ء ، اور تا بہ امکان ، حدِ آخر ۱۸۸۲ء —— ان مراحل یا منازل کا تعین اس طرح ہوتا ہے :

۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء

اس سال غالب ، دیوان فارسی کو "میخانۂ آرزو سرانجام" کے نام سے مکمل و مرتب کر کے اس پر دیباچے اور خاتمے کی فارسی نثر لکھ چکے تھے " پنج آہنگ " کے دیباچے میں علی بخش نے اس کی نشاندہی کی ہے۔ نسخۂ مالک رام میں خاتمے کی نثر کے بعد کاتب نے "خاتمۂ دیوانِ فارسی" کا جلی عنوان دیا ہے ، گو خاتمۂ دیوانِ فارسی کی عبارت اس کے بعد لکھی نہیں گئی —— بہر حال "خاتمۂ دیوان فارسی" کے جلی عنوان کی نقل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نسخۂ مالک رام ، کم سے کم خاتمۂ دیوانِ فارسی کے سالِ ارقام یعنی ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء میں یا اس کے بعد کبھی لکھا گیا ۔

۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء

دیوانِ فارسی ، غالب ، طبعِ اوّل (۱۸۴۵ء) کے مطابق "خاتمۂ دیوانِ فارسی" کی عبارت غالب نے اکتالیس برس (سالِ چہل و یکم) کی عمر میں یک ہزار و دو صد و پنجاہ و سہ سال ہجری (۱۲۵۳ھ) مطابق ۱۸۳۷ء میں لکھی ۔ اگر اس پر انحصار کیا جائے تو نسخۂ مالک رام کا ۱۸۳۷ء یا اس کے بعد لکھا جانا قیاس کیا جائے گا ۔

۱۸۴۵ء

غالب کا "دیوانِ فارسی" ، جسے علی بخش نے "میخانۂ آرزو سرانجام" کے نام سے ۱۸۳۵ء میں تازہ فراہم آمدہ و پیرایۂ تمام پوشیدہ بود بتایا ہے" اور جسے خود غالب

غالب نے "خاتمۂ دیوانِ فارسی" میں ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں مرتب کرنا لکھا ہے، پہلی بار مطبع دارالسلام، دہلی سے ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا ـــ ممکن ہے نسخۂ مالک رام کے کاتب نے "مطبوعہ دیوان سے" خاتمۂ دیوانِ فارسی" کو پہلی بار دیکھا ہو اور اسے نقل کرنا چاہا ہو۔ اس صورت میں نسخۂ مالک رام کی کتابت کا زمانہ ۱۸۴۵ء یا اس کے بعد کا مانا جائے گا۔

۱۸۴۹ء، ۱۸۵۳ء

"پنج آہنگ" کی اشاعت، غالب کی زندگی میں پہلی بار، اگست ۱۸۴۹ء اور دوسری بار اپریل ۱۸۵۳ء میں روبہ عمل آئی۔ ان دونوں اشاعتوں کے آہنگِ چہارم" میں "خاتمۂ گلِ رعنا" شامل ہے اور اس کا متن اور "آہنگ چہارم" میں اس کا محلِ وقوع نسخۂ مالک رام کے عین مطابق ہے، یعنی "خاتمۂ گلِ رعنا" کی عبارت ختم ہوتے ہی فوراً بعد "خاتمۂ دیوانِ فارسی" کی سرخی اور عبارت شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نسخۂ مالک رام کے کاتب کے پیشِ نظر "پنج آہنگ" کا کوئی قدیم خطی نسخہ نہیں تھا، تو پھر اس نے "خاتمۂ گلِ رعنا" کی عبارت "پنج آہنگ" مطبوعہ ۱۸۴۹ء یا ۱۸۵۳ء سے نقل کی ہے۔ اس صورت میں نسخۂ مالک رام کی کتابت کا زمانہ ۱۸۴۹ء یا ۱۸۵۳ء یا ان سنین کے بعد کا مانا جائے گا۔

۱۸۶۸ء، ۱۸۷۱ء، ۱۸۷۵ء

"کلیاتِ نثرِ غالب" پہلی بار جنوری ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا، جو "پنج آہنگ" "مہرِ نیمروز" اور "دستنبو" پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی "خاتمۂ گلِ رعنا" کے متن اور محلِ اشاعت کی وہی کیفیت ہے جو "پنج آہنگ" کے ضمن میں بیان ہوئی ہے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ نسخۂ مالک رام کے کاتب کے سامنے "کلیاتِ نثرِ غالب" کا کوئی پرانا خطی نسخہ نہیں تھا تو پھر اس نے خاتمۂ "گلِ رعنا" کی فارسی نثر "کلیاتِ

نثرِ غالب" مطبوعہ ۱۸۶۸ء یا اس کی مابعد اشاعتوں، طبع دوم، نولکشور، لکھنؤ ۱۸۷۱ء طبع سوم، نولکشور، کانپور ۱۸۷۵ء میں سے کسی ایک سے نقل کی ہے :

حدِ آخر ۱۸۸۲ء

۱۸۸۲ء کو میں نسخۂ مالک رام کی کتابت کا تا بہ حدِ امکان، سالِ آخر اس بنا پر قرار دیتا ہوں کہ نسخۂ مالک رام میں مندرج نامکمل تاریخ کی شکل یہ بتائی گئی ہے :

" محررہ نہم شوال سنہ ۱۲ ہجری "

اگر " سنہ ۱۲ " کی قرأت صحیح ہوئی ہے، یعنی یہ سنہ "۱۲" (بارہ) ہی ہے "۱۳" (تیرہ) نہیں، تو سنہ بارہ سو ہجری کی حدِ آخر ۳۰ ذی الحجہ ۱۲۹۹، مطابق ہوتی ہے ۱۱ نومبر ۱۸۸۲ء کے — اس طرح " گلِ رعنا " کے نسخۂ مالک رام کی کتابت، مالک رام کے قیاس (شوال ۱۲۴۴ھ / مئی ۱۸۲۹ء کے بجائے، میرے نزدیک ۱۸۳۵ء میں یا اس کے بعد زیادہ سے زیادہ ۳۰ ذی الحجہ ۱۲۹۹ھ / ۱۱ نومبر ۱۸۸۲ء تک کے زمانے میں کسی وقت عمل میں آئی ہے ۔

" گلِ رعنا "

مرتبہ : سید قدرت نقوی

" گلِ رعنا " کا ایک نسخہ سید قدرت نقوی نے متعارف کرایا (سہ ماہی اردو، کراچی شمارہ جنوری مارچ ۱۹۷۱ء) ۔ یہ متن انجمن ترقیِ اردو پاکستان، کراچی کی جانب سے ۱۹۷۵ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس کے مشمولات کی تفصیل یہ ہے :

حرفے چند، جمیل الدین عالی	صفحہ ز — ط
مقدمہ مرتب، سید قدرت نقوی	ص ۱ — ۵۹

متن گُل رعنا :

اِس نسخہ "گلِ رعنا" کی ملکیت کا شرف غالب کے شاگرد سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے پوتے سید وصی احمد بلگرامی کو حاصل ہے جو خود بھی علمی حلقوں میں معروف ہیں۔ وصی احمد بلگرامی سے "گلِ رعنا" کا یہ مخطوطہ جو' ہر نراین عرف امراؤ سنگھ کا مکتوبہ ہے' مشفق خواجہ کو ملا اور انھوں نے اس کی ترتیب کا کام سید قدرت نقوی سے لیا۔

نقوی صاحب کا بیان ہے کہ یہ نسخۂ گلِ رعنا :

"مکمل ہے۔ اصل مخطوطے کے کاغذ کی پیمائش ۲۰ × ۳۰/۱۶ ہے مگر جلد سازی میں کٹتے کٹتے ورق کی پیمائش ۶ ۳/۴ × ۴ ۱/۴ ہو گئی ہے اور مکتوبی حصے کی پیمائش ۵ ۱/۲ × ۲ ۱/۲ ہے۔ کاغذ ساخت اور رنگ کے اعتبار سے یکساں نہیں ہے بلکہ مختلف قسم کے کاغذ استعمال ہوئے ہیں مگر بحساب اجزار۔ کتاب کرم خوردہ ہے، مگر متن خراب نہیں ہوا ہے۔ بعض اجزار میں جلد بندی کی تحتانی طرف کا کونا بقدر نصف انچ مدور کرم خوردگی سے نقصان زدہ ہے جس کی وجہ سے کہیں کہیں

ایک آدھ لفظ کا نقصان ہو گیا ہے ..... تحریر میں سطروں کی تعداد کی پابندی ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے۔ کل اوراق ۶۲ ہیں صفحہ شماری بعد میں کی گئی ہے۔ صفحہ ایک سے متن شروع ہو کر صفحہ ۱۰۴ پر گل رعنا ختم ہو گئی ہے۔ ۱۰۵ تا ۱۰۸ صفحات خالی ہیں ..... (غالباً) ابتدا میں اتنے ہی صفحات کا اندازہ کیا گیا ہو، اور یہ درست بھی تھا کیونکہ ابتدائی پر دس سطروں پر لکھا گیا ہے اور آخری صفحات بالخصوص خاتمہ فی صفحہ ۱۲ سطریں ہیں، درمیان میں بھی بارہ سطریں کئی صفحات پر ہیں، اس طرح یہ چار ورق سادہ بچ گئے۔ صفحہ ۱۰۹ سے بلا عنوان "آشتی نامہ" لکھا گیا ہے اور صفحہ ۱۲۴ پر ختم ہو گیا ہے۔ اس صفحے پر پانچ شعر ہیں اور ترقیمہ تین سطریں حسب ذیل ہے :

"تمام شد بخطِ بے ربط بندہ حقیر کمترین ہیرا سنگھ عرف امراؤ سنگھ عفی اللہ عنہ"

پورے نسخے میں جدول وغیرہ کہیں نہیں، بالکل سادہ ہے۔ روشنائی سیاہ ہے قلم درمیانی باریک ہے۔ روشن خط یکساں، شکستہ نستعلیق خوش خط اور پختہ ہے۔ کاتب بڑی حد تک صحیح نویس ہے..... سارے نسخے میں قدیم اِملا اور وہ بھی دہلی اور دہلی میں بھی غالب کی روش کے مطابق ہے....."

(سہ ماہی اُردو، کراچی جنوری مارچ ۱۹۷۱ء صفحہ ۲۷ و بعد)

زیر بحث نسخہ گلِ رعنا کے صفحہ ۱۶ کے دائیں طرف کے حاشیے پر اُفقاً درج ذیل شعر بڑھایا گیا ہے :

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

سید قدرت نقوی اس شعر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کا "خط غالب کا معلوم ہوتا ہے"[1]

[1] اردو، کراچی جنوری مارچ ۱۹۷۱ء صفحہ ۳۱

میری رائے میں یہ شعر بالیقین غالب کا قلم نوشتہ ہے، اور اس بنا پر، گو اس نسخے پر کوئی تاریخ یا سال درج نہیں، کہا جاسکتا ہے کہ اس مخطوطے کی کتابت معاصرانہ ہے اور غالب کی زندگی ہی میں ہوئی ہے۔

"گلِ رعنا" کے اس نسخے کے ترقیمے میں کوئی تاریخ یا سالِ کتابت وغیرہ درج نہیں لیکن بعض شواہد سے اسے شعبان ۱۲۵۵ ہجری (نومبر ۱۸۳۹ء) یا اس سے قبل کا مکتوبہ خیال کیا جانا چاہیئے۔ سیّد قدرت نقوی لکھتے ہیں کہ:

"مخطوطے کے شروع میں دو سادہ ورق اصل سے زائد لگے ہوئے ہیں ان اوراق پر کچھ مندرجات ہیں ..... ورق ۱۔ الف پر "مجموعۂ اشعارِ غالب علیہ الرحمہ" اور اس کے نیچے "گلِ رعنا" لکھا ہے، ورق ۱۔ب خالی ہے، ۲۔ الف پر "انتخاب نظم ونثر اسداللہ خان غالب" اس کے نیچے "مولا بخش" اس کے نیچے "سی ام شعبان المعظم ۱۲۵۵ ہجری" ..... لکھا ہے۔ اس اندراج سے ظاہر ہے کہ یہ نسخہ ۱۲۵۵ ہجری میں مولا بخش کے پاس آیا۔ مولا بخش کی ذات غالبیات میں بالکل غیر متعارف ہے۔ اس تحریر کے بالمقابل ایک طرف یہ یادداشت دو آڑی سطروں میں ہے:

"در ماہ جمادی الثانی ۱۲۹۵ ہجری روز سہ شنبہ والدہ عزیزی محمد رضا سلمہ، رحلت کرد۔"

اس تحریر کا تعلق بھی اغلب ہے کہ مولا بخش کے خاندان ہی سے ہے کیونکہ پہلی یادداشت کے نیچے دو سطروں میں یہ تحریر ملتی ہے:

"این صفینہ بتاریخ ۱۷۔ ماہ محرم الحرام ۱۳۱۰ ہجری از پسر مولا بخش خرید گشتہ۔"

لکھنے والے نے اپنا نام نہیں لکھا۔ "صفینہ" بالصاد لکھتا ہے تو حیرت کی بات ہے۔ اس کی صرف ایک ہی توجیہ ہوسکتی ہے کہ لکھتے وقت ذہن میں "صحیفہ" ہو گا مگر صاد بنانے کے بعد "سفینہ" ذہن میں آیا۔

اور سفینہ لکھ دیا اور صاد کی صحت نہیں کی۔ اس تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً ۵۵ سال یہ نسخہ مولا بخش کے خاندان کی تحویل میں رہا۔ اس کے بعد کہاں کہاں رہا، اس کے آثار ناپید ہیں.... (اردو، ایضاً صفحہ ۲ و بعدہ)

میر سید عسکری حسن جعفری نے جن کے نانا صفیر بلگرامی کے خاص دوست اور چچا شاگرد تھے، ۱۹۴۵ء میں بمقام پٹنہ "گلِ رعنا" کا یہ مخطوطہ ارمغانِ عید کے طور پر نبیرۂ صفیر سید وصی احمد بلگرامی کی خدمت میں پیش کیا:

"..... اور اب تقریباً ۲۵ سال سے محترمی سید وصی احمد بلگرامی کو اس کی ملکیت و حفاظت کا شرف حاصل ہے۔ اس مخطوطے کی جلد سازی دو مرتبہ ہوئی ہے۔ ایک مرتبہ مولا بخش کی تحویل میں .... دوسری مرتبہ سید وصی احمد بلگرامی صاحب نے ہر دو طرف سادہ اوراق شامل کر کے مجلّد کرایا۔ ان سادہ اوراق پر موصوف نے مندرجات کی فہرست بنائی ہے۔"

(اردو، ایضاً، ص ۴)

یہ نسخہ سی ام شعبان ۱۲۵۵ ہجری کو کسی مولا بخش کی تحویل میں تھا، اگر یہ اندراج بعد کا اضافہ نہیں ہے تو گویا یہ نسخہ ۳۰ شعبان ۱۲۵۵ھ (۸ نومبر ۱۸۳۹ء) سے قبل لکھا جا چکا تھا۔ یہ بہرحال طے ہے کہ اس مخطوطے کی کتابت غالب کے حینِ حیات کسی وقت ہوئی ہے۔"

باغِ دو در

مرتبہ : سیّد وزیر الحسن عابدی

"باغِ دو در" غالب کی آخری ادبی یادگار ہے۔ اس میں فارسی نظم و نثر دونوں شامل ہیں:

"دو در دارد ایں باغ آراستہ   در و بند از ہر دو برخاستہ"

اس لیے غالب نے اس کا نام "باغِ دو در" رکھا۔ "سبد باغِ دو در" سے "یک ہزار و دو صد و ہشتاد و سہ عدد" (۱۲۸۳) نکلتے ہیں جو اس صحیفے کے "آغازِ نگارش" کا سجع ہے،

سال ہے "ایں نام لطفے دیگر دارد"۔ یہ صحیفہ قبل ازیں، آج تک کبھی شائع نہیں ہوا تھا، بلکہ "غالبیات" میں اس کی اطلاع بھی نہیں تھی کہ غالب کے پایانِ عمر "باغِ دو در" کے نام سے کوئی مجموعہ ترتیب بھی دیا گیا تھا۔ سید وزیر الحسن عابدی کو ۱۹۴۱ء میں اس کا ایک خطی نسخہ ملا اور انہوں نے اپنے ایک مقالے مطبوعہ آج کل، دہلی، فروری ۱۹۴۷ء میں اوّل اوّل اس کا ذکر کیا اور مختصر تعارف کرایا۔

"باغِ دو دَر" کا متن پہلی بار دو اقساط میں یونیورسٹی اورئینٹل کالج میگزین، لاہور کے دو شماروں اگست ۱۹۶۰ء اور اگست ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ حصۂ نظم (صفحہ ۱۔۹۲) محولہ میگزین کے پہلے شمارے میں اور حصۂ نثر (صفحہ ۹۳ ــ ۱۸۸) دوسرے شمارے میں شائع ہوا۔ "صفحہ نما" کے عنوان سے فہرست کے چودہ صفحات، "چشم انداز" (دیباچہ) کے چار صفحات اور حصۂ نظم کی طباعتی اغلاط کا ایک صفحہ، متن کے ۱۸۸ صفحات پر مستزاد ہیں۔ "صفحہ نما" میں "خاتمۂ کتاب" کے بعد "تحقیق نامہ از مرتّب" کا اعلان و اظہار درج ہے۔ "چشم انداز" میں بھی مالک مخطوطہ نے بیان کیا ہے کہ:

> "از مطالب و مسائل تحقیقی راجع بہ باغ دو در و محتویات و متعلقات آن در قسمت جداگانہ موسوم بہ تحقیق نامہ کہ آنرا در آخر متن کتاب اضافہ کردہ ایم بطور مفصل بحث شدہ۔۔"

لیکن یہ "تحقیق نامہ" متنِ کتاب کے آخر میں شامل نہیں ہے اور نہ اورئینٹل کالج میگزین لاہور کے کسی اور شمارے ہی میں یہ کبھی شائع ہوا۔ اورئینٹل کالج میگزین ہی کی دونوں قسطوں کے "آف پرنٹس" کتابی صورت میں یکجا بھی شائع کیے گئے۔ سرورق پر صرف اِس عبارت کا اضافہ ہے: "ناشر اظہار سنز، ۵/۱۲۰ ٹمپل روڈ، لاہور، بار اول ۱۹۶۶ء" یہ نسخہ بھی راقم الحروف کے ذخیرۂ غالبیات میں موجود ہے۔

"باغِ دو در" کے اِس نسخے کا ذکر ایک موقع پر قاضی عبد الودود نے "جہانِ غالب" کے تحت کیا ہے۔ اس کا ضروری حِصّہ یہ ہے:

"باغِ دو در: غالب کی نظم و نثرِ فارسی کا مجموعہ، جس کی نثر "کلیّاتِ نثرِ فارسی"

اور نظم، "کلیاتِ نظمِ فارسی" (بہردو نولکشوری) سے خارج ہے مگر اس کی نظم کا بہت بڑا حصہ "سبدِ چین" میں موجود ہے۔ اس کا واحد قلمی نسخہ سید وزیر الحسن عابدی کی ملک ہے اور میں نے مدت ہوئی اسے سرسری طور پر دیکھا تھا۔ مطبوعہ نسخہ انہیں کا مرتبہ ہے اور اس کے پیشِ نظر نسخۂ نظم و نثرِ غالب ...... سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے اس کے لیے تعارف، حواشی تنقیحی اور تعلیقاتِ تحقیقی لکھے تھے اور فہرستیں تیار کی تھیں۔ نسخۂ پیشِ نظر میں تعارف اور تعلیقاتِ تحقیقی مطلقاً نہیں، فہرستیں ہیں اور مختصر حواشی، جن میں صرف اس سے بحث ہے کہ مرتب نے متن میں کیا تبدیلی کی ہے۔ خاتمہ نوشتۂ کاتب، اس پر مقر ہے کہ کاتب علی نے یہ نسخہ ہیرا سنگھ کی فرمائش سے ۱۸۷۰ء میں لکھا تھا۔ کاتب نے کتاب کا نام "سبدِ چین" بتایا ہے۔ غالب کا دیباچہ مختصر بیت ذیل سے شروع ہوتا ہے:

دو در دارد ایں بیت[1] آراستہ　　　دروبند از ہر دو برخاستہ

اس کے بعد "سبدِ چین" کا ذکر ہے اور آخر میں یہ عبارت ہے:

"ناگاہ یاران نثری چند آوردند۔ آں را نیز دریں مجموعہ گنجاندیم و "باغِ دو در" نامیدیم۔ ازاں جاکہ سبد باغ دو در یک ہزار و دو صد و ہشتاد و سہ عدد دارد، و از روی حسنِ اتفاق بآغازِ نگارش ایں[2] صحیفہ مطابق افتادہ[3]، ایں نام لطفی دیگر دارد ...."

مرتب نے سرورق میں "سال گرد آوری" ۱۲۸۳ھ بتایا ہے مگر خود غالب اسے سالِ آغاز کہتے ہیں۔

اس مجموعے میں ایک قطعہ ہے جس کے دو ابیاتِ آخر یہ ہیں:

در غرہ شعبان چو زمن بادہ گرفتند　　　خود غالب پژمردہ نشانی ز سنین بود
روشش بدر آرا ز مہ شعبان کہ دریں جا　　　مقصودِ من از تجربہ البتہ ہمیں بود

---

[1] "بیت" قاضی صاحب کا سہوِ قلم ہے۔ "باغِ دو در" (مذکورہ) میں "باغ" بجائے: بیت

[2] "ایں" بمقابلہ "باغِ دو در" زائد

[3] "باغِ دو در" میں "افتاد" بجائے: افتادہ

"غالب پژمردہ" = ۱۲۹۱ سے بتخرجۂ ۶ مادہ تاریخ نکالا ہے۔ (باغ دودر، صفحہ ۳۱) نظم کا بہت بڑا حصہ "سبد چین" میں ہے .... اس جگہ اس کے متعلق صرف دو باتیں لکھوں گا :

(۱) صفحہ ۲۸ میں ایک قطعہ کے تین مصرعے ہیں۔ چوتھے کی نسبت مرتب (عابدی) نے اطلاع دی ہے کہ "از نظر احساسات مذہبی زندہ بود" چوتھا مصرع میں نے اپنی یاد سے لکھا ہے ... [1]

(۲) صفحہ ۶۲ میں یہ مصرع ہے: نہیب فتنہ بہ آن چوب شسگزی ماند "آن چوب" کی جگہ "الچوب" چاہیے جو رموز حمزہ میں ہے۔"

[شاعر، بمبئی، غالب نمبر، فروری مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۲۷-۲۸]

"باغِ دودر" کی ایک کتابی اشاعت اورینٹل کالج، لاہور کی جانب سے سامنے آئی۔ اس پر سالِ طباعت جولائی ۱۹۲۸ء درج ہے لیکن اسے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے صد سالہ جشنِ تاسیس کے یادگار موقع پر ۱۹۷۰ء میں شائع کیا گیا۔ ضخامت: متن ۱۹۸ صفحات، فہارس از مرتب ۴۴ صفحات، تحقیق نامہ از مرتب ۲۴۰ صفحات (داخل کتاب سے پہلے فہرست مندرجات اور دیباچہ طبع اوّل و ثانی از مرتب وغیرہ کے ۲۲ صفحات اس کے علاوہ ہیں)۔ کتاب کے مرتب سیّد وزیر الحسن عابدی "ترتیب نامہ" (دیباچہ اشاعتِ ثانی) کے تحت لکھتے ہیں :

"اس سے پہلے "باغ دودر" راقم نے مجلۂ دانش کدہ خاور شناسی دانشگاہ (یونیورسٹی اورینٹل کالج میگزین) میں دو قسطوں میں شائع کی تھی .... لیکن

---

[1] قاضی عبدالودود نے "اپنی یاد سے" چوتھا مصرع لکھ دیا ہے، راقم الحروف کے نزدیک حق بجانب مرتب وزیر الحسن عابدی کے ہے۔ احساساتِ مذہبی کے پاس و احترام میں یہ مصرع محذوف ہی رہنا چاہیے تھا، اس لیے راقم الحروف نے "نقلِ کفر، کفر نہ باشد" پر یقین رکھنے کے باوجود قاضی عبدالودود کی پیروی میں، ان کے حوالے سے بھی اس مصرع کا نقل کرنا گوارا نہیں کیا ہے۔

"تحقیق نامہ باغِ دودر" جو تعلیقات پر مشتمل ہے اور تیسری قسط کے طور پر
چھپنا تھا، ابھی مطبع کو نہیں دیا گیا تھا کہ کالج کی طرف سے فیصلہ ہوا کہ
"باغِ دودر" ادارے کے جشن صد مین سالِ تاسیس (بسال ۱۹۷۰ء)
کی یادگار مطبوعات کے سلسلے میں مستقل کتاب کے طور پر شائع کی جائے"
چنانچہ تحقیق نامے کو تیسری قسط کے طور پر چھاپنے کے بجائے کتاب کی
اس دوسری اشاعت میں شامل کر کے پیش کیا جا رہا ہے"

"سبد چین" (ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ / اگست ۱۸۶۷ء) کے دیباچے میں غالب نے اِس ارادے کا اظہار کیا تھا کہ اگر اس کے بعد کوئی کلام ہوا بھی تو وہ اسے قلم بند نہیں کریں گے۔ اس کے باوجود اپنے ایک شاگرد منشی ہیرا سنگھ کھتری کی فرمائش پر انھوں نے "سبد چین کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی اجازت دے دی، حصۂ نظم، ترتیب دیا جا چکا تھا کہ:

"ناگاہ یاران نثری چند آوردند، آنرا نیز دریں مجموعہ گنجاندیم و
باغِ دودر نامیدیم۔ از آنجا کہ "سبد باغ دو در" یک ہزار و دو صد و
ہشتاد و سہ عدد دارد و از روی حسنِ اتفاق با آغاز نگارش صحیفہ مطابق
افتاد، این نام لطفی دیگر دارد..."

گویا "باغِ دو در" غالب کے فارسی نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہے اور اس کی حیثیت ایک طرح سے غالب کے فارسی کلیاتِ نظم و نثر دونوں کے تتمّے کی سی ہے۔ زیرِ نظر نسخے کے اندرونی سرورق کی عبارت کچھ جلی اور کچھ خفی یہ ہے:

"باغِ دودر، مجموعۂ نظم و نثرِ فارسی، میرزا اسد اللہ خاں غالب....
جو میرزا نے ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۷ء میں تالیف کیا تھا، منفرد قلمی نسخے کے
مطابق جس کی کتابت ان کی زندگی میں شروع ہو کر ۷ جولائی ۱۸۷۰ء
کو ختم ہوئی"..... بتصحیح و تحقیق: وزیر الحسن عابدی"

۱۲۸۳ھ از روئے تقویم مطابق ہے "۱۶ مئی ۱۸۶۶ء سے ۴ مئی ۱۸۶۷ء تک"

دوسری بات یہ ہے کہ "خاتمۂ کاتب" سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ، اس کی کتابت مرزا غالب کی زندگی میں شروع ہو گئی تھی۔ خاتمے کے متعلقہ لفظ یہ ہیں :

"…. سبد چین از تصنیف جناب والا شان …. اسد اللہ خان غالب رحمتہ اللہ علیہ، حسب فرمائش منشی ہیرا سنگھ صاحب کھتری ساکن دہلی … کہ یکی از شاگردان حضرت مصنف اند بخطِ بد نمط احقر العباد عنایت علی بتاریخ ہفتم جولائی سنہ ۱۸۷۰ء روز پنجشنبہ صورت اختتام پذیرفت"

مولانا امتیاز علی عرشی کی رائے میں "باغ دو در" کے زیر نظر مخطوطے کی کتابت کا آغاز و انجام دونوں مرزا غالب کی وفات کے بعد کی باتیں ہیں۔

(رسالہ اردو، کراچی غالب نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۴۹۵ و بعد)

زیرِ نظر "باغِ دو در" کے پہلے حصے (صفحہ ۳-۹۳) میں بتفصیل ذیل "منظومات" ہیں:

۱۔ قطعات	تعداد ۴۵	صفحہ ۳ ـ ۳۱
۲۔ ترکیب بند	۱	۳۲ ـ ۳۹
۳۔ ترجیع بند	۱	۴۰ ـ ۴۲
۴۔ مثنویات	۲	۴۳ ـ ۴۶
۵۔ قصائد	۷	۴۷ ـ ۷۱
۶۔ غزلیات	۱۱	۷۲ ـ ۸۱
۷۔ فردات	۱۶	۸۲ ـ ۸۴
۸۔ رُباعیات	۲۰	۸۵ ـ ۸۹
۹۔ تخمیس	۱	۹۰ ـ ۹۲

دوسرا حصہ "منثورات"، مختلف اصحاب کے نام کے غالب کے ساٹھ مکاتیب (صفحہ ۱۱۳-۱۹۷) کے علاوہ مندرجہ ذیل سات نثری تحریروں (صفحہ ۹۳-۱۱۲) پر مشتمل ہے:

۱۔ دیباچہ قاطع برہان　　　۲۔ دیباچہ ثانی جدید

۳۔ تقریظ قاطع برہان　　　۴۔ دیباچہ مثنوی ابرِ گہر بار

۵۔ تقریظ مثنوی ابرگہربار ۶۔ تقریظ سفرنگ دساتیر (نجف علی)
۷۔ تقریظی کہ بر کتاب دری کشا (نجف علی)

"باغِ دودر" کے بعد "فہارس باغِ دردو" کے عنوان سے بشرحِ ذیل، عابدی صاحب کے مرتب کردہ اشاریے ہیں:

(الف) اسامی والقاب اشخاص	صفحہ	۲ — ۱۳
(ب) اسامی جغرافیائی		۱۴ — ۱۶
(ج) اسامی کتابہا و روزنامہ ہا		۱۷ — ۱۸
(د) مطالب مہم در مکاتبات		۱۹ — ۲۸
(ہ) غلط نامہ		۲۹ — ۴۱
(و) اندراجات (جو متن کے حواشی میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے)		۴۲ — ۴۴

اخیر میں سید وزیر الحسن عابدی کی تعلیقات ہیں "تحقیق نامۂ باغِ دودر" کے عنوان سے ان تعلیقات کی صفحہ بندی "باغِ دردو" کے متن سے علیحدہ اور مستقل ہے۔ تحقیق نامے کی ترتیب یہ ہے:

(الف) تلخیص مکاتبات باغِ دودر بزبانِ اردو صفحہ ۲۔ ۱۲۲ شروع کے دو خط تلخیص کے انداز میں ہیں، باقی تمام اردو خطوط، فارسی خطوط کی ہو بہو "ترجمے" ہیں۔ خط میں جو "مذکورات" قابلِ توضیح یا مبہم ہیں، اُن کے لیے قلابین میں توضیحی یا تشریحی الفاظ، اس طرح درج کیے گئے ہیں کہ عبارت کا جزو بنا کر پڑھے جا سکیں۔

مطالعے اور حوالے کی سہولت کے لیے ہر خط کے مضمون کو ترتیب وار مناسب عبارتوں میں تقسیم کر کے عبارت کا ترتیبی شمارہ قائم کیا گیا ہے اور عبارت کے اختتام پر قلابین میں اصل فارسی خط کی سطور کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

(ب) تعلیقات کے تحت صفحہ ۱۴۳ سے ۲۴۰ تک حصۂ نظم سے متعلق تحقیقی
اشارے اور تبصرے ہیں۔ ہر نظم کے مآخذ، متعلقہ یادداشت کے ختم
پر قوسین میں درج کر دیے گئے ہیں۔

اس سلسلے کی آخری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ "باغِ دو در" کے حصۂ نثر کی تعلیقات اور مآخذ کی تفصیلات کتاب میں شامل نہیں ہیں۔

سبدِ باغِ دو در

تعارف، تلخیص، حواشی : مولانا امتیاز علی عرشی

"سبدِ باغِ دو در" کے نام سے مولانا امتیاز علی عرشی کا ایک مختصر کتابچہ سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، کراچی، شمارہ ۲۴۲ کے تحت ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا (صفحات ۵۲) "تعارف" کے تحت اُنہوں نے لکھا ہے کہ:

"میرزا غالب نے کلیاتِ نظمِ فارسی کی طباعت کے بعد "سبد چین" کے نام سے اپنے وہ شعر اکٹھے کیے تھے، جو یا تو سہواً کلیات میں درج نہ ہو سکے یا اس کی طباعت کے بعد کہے تھے۔ خیال تھا کہ یہ تتمہ ان کی آخری فارسی تالیف ہے مگر سید وزیر الحسن عابدی صاحب کو "باغِ دو در" کے نام سے ایسا مجموعہ دستیاب ہوا، جسے غالب کی کلیاتِ نظم و نثر دونوں کا تتمہ کہا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کا کاغذ ولایتی نیلا ہے۔ جدولیں سنہری ہیں، اندرونی دو شنجرفی اور بیرونی لاجوردی۔ باریکا بھی لاجوردی ہے۔ اشعار کو باہم جدا کرنے والی لکیریں شنجرفی ہیں۔ متن کتاب سیاہ بخطِ نستعلیق اور عنوانات اور نظم میں تخلص شنجرفی ہیں جگہ جگہ خطی اصلاحوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مقابلہ بھی کیا گیا ہے مگر پھر بھی اغلاطِ کتابت کہیں کہیں موجود ہیں ... موجودہ نسخے میں یہ (اصلاحیں) بالیقین میرزا صاحب کے قلم کی نہیں ہیں۔

موجودہ ترتیب میں اس کتاب کی تلخیص پیش کر دی گئی ہے، بایں صورت کہ "باغ

"دو در" کا وہ کلام جو "سبد چین" کی اشاعتِ اوّل (۱۸۶۷ء) اور اسی کتاب کی اشاعتِ دوم (۱۹۳۸ء) میں شامل ہو چکا تھا اُس کا صرف پہلا شعر حوالے کے لیے لیا گیا ہے اور دونوں اشاعتوں میں محولہ نظم کے اندراج کا حوالہ، صفحہ نمبر اور تمام اشعار میں جو اختلاف یا سہو تھا، حواشی میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا ان حواشی سے فائدہ اٹھانے کے لیے "سبد چین" کی مذکورہ دونوں اشاعتیں یا کم از کم دوسری اشاعت سامنے ہونا چاہیئے۔ ان دونوں اشاعتوں کے علاوہ بھی اگر وہ کسی مزید قابلِ ذکر جگہ شائع ہوا ہے تو اس کا سہو و اختلاف بھی درج کر دیا ہے۔

"باغِ دو در" کی زیرِ نظر تلخیص کے حواشی مکمل حصّۂ نظم کو محیط ہیں۔ حصّۂ نثر کے اختلافِ نسخ و اغلاط کی نشاندہی اس وجہ سے چھوڑ دی گئی ہے کہ یہ تحریریں مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں جن کا فراہم کرنا قارئین کے لیے دشوار ہے۔ "باغِ دو در" کا آخری حصّہ مکاتیب پر مشتمل ہے جو بیشتر غیر معروف ہیں، البتہ چند خطوط مطبوعہ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ یہ تمام خطوط حقیر عرشی کی مرتبہ آہنگ پنجم میں مع توضیحی حواشی کے شامل ہوں گے۔ آہنگ پنجم کی مذکورہ ترتیب میں غالب کے تقریباً پانچ سو خطوط جو تا حال دریافت ہو سکے ہیں، پیش کیے جا رہے ہیں۔

"باغِ دو در" کی زیارت مجھے صدیق مکرم ڈاکٹر اظہر علی صاحب استاد تاریخ سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی سے ہوئی۔ میں موصوف، نیز مالکِ کتاب کا ممنون و مشکور ہوں کہ مجھے اس نادر کتاب کو استعمال کرنے کا موقع عطا فرمایا۔ (تعارف، ص ۷-۱۲)

زیرِ نظر تلخیص کی ترتیب یہ ہے:

"سبد باغِ دو در" کی تلخیص و حواشی نگاری کا کام کیے اتنی مدت گزر چکی ہے کہ مجھے یاد بھی نہیں تھا کہ یہ کام میں نے کیا تھا۔ چونکہ مالکِ کتاب عابدی صاحب اسے شائع کرنا چاہتے تھے، اس لیے میں نے اشاعت روک دی تھی۔ اب جو عزیزِ مکرم مشفق خواجہ صاحب سلمہ کی فرمائش رسالہ" اردو" کے غالب نمبر کے لیے آئی اور پے در پے تقاضے آئے تو اکبر سلمہ[۱] کو اس کا مسودہ یاد آیا۔ انہوں نے میرے پرانے کاغذات سے اسے تلاش کیا اور اب غالب دوستوں کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے[۲]۔ کئی سال ہوئے خود جناب عابدی نے بھی اس کتاب کا متن اورینٹل کالج میگزین میں شائع کر دیا ہے، اس طرح میرے حواشی کو سمجھنے کے لیے سہولت پیدا ہو گئی ہے۔"

(پس نوشت، تعارف از عرشی، ص ۱۲)

مُتفرقاتِ غالب

مُرتبہ و مقدمہ : سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

غالب کے غیر مطبوعہ اور نادر مکتوبات و منظومات کے اس مجموعے "متفرقاتِ غالب" (مطبوعہ ہندوستانی پریس، رامپور، ۱۹۴۷ء، ص ۱۸۵) میں جو چیزیں شامل ہیں ان کے بارے میں سیّد مسعود حسن رضوی ادیب نے مقدمۂ کتاب میں لکھا ہے کہ :

میرے کتب خانے میں ایک بیاض ہے جس میں مرزا غالب کے اڑتالیس فارسی خط، دو فارسی قطعے، ایک فارسی مثنوی اور ایک اردو غزل بھی شامل ہے۔ یہ کل خط ایسے لوگوں کے نام ہیں جو کلکتے میں مقیم تھے اور یہ سب نظمیں ایسی ہیں جو غالب نے

۱۔ اکبر علی خان عرشی زادہ نے بھی ایک موقع پر اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

امتیاز علی خان صاحب عرشی نے "باغ دو در" پر کتاب کے حجم کے مفصل حواشی قلمبند کیے ہیں، لیکن ابھی شائع نہیں ہوئے۔ (نذرِ عرشی، ۱۹۶۵ء، ص ۴۸)

۲۔ عرشی صاحب کا یہ تعارف رسالہ اردو، کراچی غالب نمبر جنوری مارچ ۱۹۶۹ء میں بھی شائع ہوا (ص ۴۹۳-۵۰۰)

کلکتے کے قیام کے زمانے میں کہی تھیں۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کسی کلکتے کے رہنے والے ہی نے یہ تمام چیزیں اس بیاض میں جمع کی ہیں۔

اس بیاض میں جو خط شامل ہیں وہ ایک کے سوا سب فارسی میں ہیں اور ان میں آخر کے بیس خط مرزا ابو القاسم خاں قاسم کے نام ہیں۔ ان خطوں سے پہلے قاسم کا ایک قطعہ غالب کے نام اور غالب کے دو قطعے قاسم کے نام ہیں . . . . بقیہ خطوں کے مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے اکیس خط مولوی سراج الدین احمد کے نام، چھ خط مرزا احمد بیگ خاں کے نام اور ایک خط ادارہ جام جہاں نما کے نام ہے۔ مولوی سراج الدین احمد کے نام جو خط ہیں ان میں گیارہ ایسے ہیں جو غالب کی کتاب "پنج آہنگ" میں شامل ہیں مگر وہاں ان میں سے بہت سی عبارت حذف کر دی گئی ہے، اور جگہ جگہ لفظ اور فقرے بدل دیے گئے ہیں۔ اس لیے یہ خط بھی اپنی اصل صورت میں شائع کیے جا رہے ہیں۔

اس بیاض میں غالب کی ایک مثنوی بھی شامل ہے جو انھوں نے کلکتے کے قیام میں تصنیف کی تھی . . . . یہ مثنوی غالب کے کلیات نظم میں "بادِ مخالف" کے نام سے شامل ہے مگر اس میں کہیں کہیں لفظی ترمیم کر دی گئی ہے، کہیں کوئی شعر، کہیں کئی شعر گھٹا یا بڑھا دیے گئے ہیں اور کہیں شعروں کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔ مثنوی کے ابتدائی حصے میں یہ تغیرات کم ملتے ہیں، مگر جتنا آگے بڑھیے، تبدیلیاں زیادہ ہو جاتی ہیں اور آخر کے قریب ایک حصہ تو گویا بدل گیا ہے۔ اس بیاض میں اس کی وہی شکل ہے جس میں وہ کلکتہ والوں کے سامنے پیش کی گئی تھی۔[۱] اس لیے وہ مثنوی بھی اس کتاب میں شامل کر لی گئی ہے۔

میرے کتب خانے میں انشائے طاہر وحید کا ایک پرانا قلمی نسخہ ہے، اس کے شروع میں دو سادے ورق تھے جن پر غالب کا ایک طولانی خط شیخ ناسخ کے نام کسی نے

---

[۱]۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ اس بیاض میں مثنوی کی وہی شکل ہے جس میں وہ کلکتہ والوں کے سامنے پیش کی گئی تھی۔" تفصیل کے لیے رجوع کیجیے: تحقیق غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، کراچی ۱۹۸۱ء، ص ۱۳۵ - ۱۳۸

نقل کرلیا تھا اور اس پر یہ عبارت لکھ دی تھی: "نقل خط مرزا اسد اللہ خاں غالب کہ بر شیخ ناسخ مرحوم نوشتہ بودند"... یہ خط اس کتاب کے صفحہ ۹۹ تا ۱۰۲ پر نقل کیا گیا ہے۔

"متفرقاتِ غالب" میں غالب کا ایک اردو "سلام" (سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اسے) بر صفحہ ۱۴۱-۱۴۴ اور ایک مثنوی بے نام منجانب بہادر شاہ (دقیقہ اندیشاں، معدلت کیشاں) بھی شامل ہے۔ (بر صفحہ ۱۴۵-۱۵۵)

یہ مجموعہ "متفرقاتِ غالب" دو حصوں اور دو ضمیموں پر مبنی ہے۔ حصّہ اوّل میں "مکتوباتِ غالب" آئے ہیں اور حصّہ دوم میں "منظوماتِ غالب" شامل ہیں۔ ضمیمہ الف (ص ۱۵۶-۱۶۱) میں غالب کے نام ناطق مکرانی کا ایک خط اور ضمیمہ ب (ص ۱۶۲-۱۶۹) میں اُس مثنوی کا ابتدائی حصّہ ہے جو غالب کی بے نام مثنوی کے جواب میں میر دوست علی خلیل نے کہی تھی۔

"متفرقاتِ غالب" کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۹ء میں کتاب نگر، لکھنؤ سے شائع ہوا (ص ۱۶۸) اس میں طباعتی اغلاط بہت ہیں۔ مقدمۂ کتاب پر فاضل مرتب نے نظرِ ثانی کی ہے اور طبع اوّل (۱۹۴۷ء) کے مقابلے میں اس اشاعت ثانی میں دو چیزیں کتاب کے متن میں اضافہ ہوئی ہیں۔ ایک حصّہ اوّل "مکتوبات" میں آخری خط بنام عزیز صفی پوری (ص ۱۳۱-۱۳۲) اور دوسرے "ضمیمہ ج" عزیز صفی پوری کے قلم سے، غالب سے اصلاح لینے کا حال (ص ۱۷۶-۱۷۸)۔

"متفرقات" کے مندرجات جس قیمتی بیاض پر مبنی ہیں، وہ ایک زمانے میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے پاس رہی ہے۔ "ابھی حال میں یہ قیمتی بیاض مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں آکر محفوظ ہو گئی ہے۔ (رقم فارسیہ ۲، ۱۳۲ یونیورسٹی[لہ])۔

آثارِ غالب / مآثرِ غالب

مرتبہ: قاضی عبدالودود

علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۴۹-۱۹۴۸ء، ۲۷۴ صفحات پر تمام ہو گیا ہے، اس کے بعد،

لہ۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۴۲

صفحات کی نئے سرے سے شمار بندی کر کے قاضی عبدالودود کی کتاب "آثارِ غالب" شاملِ اشاعت ہے۔ سرورق کی عبارت یہ ہے:

زندہ دارد مرد را آثارِ مرد
بوئے گل باقیست چوں گردد گلاب
آثارِ غالب
مرتبہ
قاضی عبدالودود

سرورق کی پشت پر انتساب کی یہ عبارت ہے: "یہ کتاب جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے نام معنون کی جاتی ہے۔" سامنے کے صفحے پر مندرجاتِ کتاب کی بلا اظہارِ صفحات دو کالمی "فہرس" ہے۔ "فہرس" کی پشت پر "عرضِ حال" کے عنوان سے قاضی صاحب نے جو تیرہ سطری عبارت لکھی ہے، اس کا ضروری حصّہ یہ ہے:

"آثارِ غالب" کا بہت بڑا حصہ یا تو قلمی کتابوں سے لیا گیا ہے، یا ایسے مطبوعات سے جو عام دسترس سے باہر ہیں اس سے جو چیزیں مستثنیٰ ہیں، اُن کے شمول کی وجہ اپنی اپنی جگہ پر بیان کی (گئی ہے)۔ فارسی خطوط حکیم حبیب الرحمٰن مرحوم کے کُتب خانے کے ایک قلمی مجموعے سے ماخوذ ہیں۔۔۔۔ "آثارِ غالب" کی ترتیب، بڑی عجلت میں ہوئی ہے بعض امور کی حسب دل خواہ تحقیق، قلت کی وجہ سے نہ ہو سکی۔"

(عبدالودود، ۳۰ مارچ ۱۹۴۹ء)

سرورق، انتساب، فہرس اور عرض حال کے چار صفحات کے بعد (جن صفحات کا نمبر نہیں دیا گیا ہے)، صفحہ ا سے کتاب کا متن شروع ہوتا ہے: "آثارِ غالب" دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّے میں اردو فارسی کی وہ نظم و نثر ہے جو مختلف ماخذوں سے حاصل کی گئی ہے۔ دوسرے حصّے میں صرف وہ فارسی خطوط ہیں جو حکیم حبیب الرحمٰن مرحوم کے کتب خانے کے ایک مجموعے سے لیے گئے ہیں۔" آثارِ غالب ص ۳۱)۔

کتاب کے مشمولات کی تفصیل یہ ہے:

(الف) اردو نثر

(ب) اردو نظم

(ج) فارسی نثر

(د) فارسی نظم

حصّہ دوم میں بتیس خطوط ہیں۔ اِن خطوں میں سے تین خطوط (نمبر ۲۲، ۲۷ اور ۳۲) کچھ "اختلافات" کے ساتھ "متفرقاتِ غالب" (سید مسعود حسن رضوی ادیب) میں بھی موجود

ہیں (صفحہ ۵۷، ۵۸، ۶۲ - ۶۴)۔ باقی اُنتیس نئے ہیں، اس لیے اہم ہیں لیکن بالخصوص دو خط (نمبر ۲۴ اور ۲۹) زیادہ ہی اہم ہیں۔

دونوں حصوں سے متعلق کتاب کے آخر میں بشرح ذیل، مفید اور قیمتی حواشی ہیں:

(حواشی آثارِ غالب) حصہ اوّل:

مستعمل رُموز (در حواشی):	صفحہ ۲۱
(الف) نثرِ اردو	۴۲-۴۵
(ب) نظمِ اردو	۴۵-۴۸
(ج) نثرِ فارسی	۴۸-۵۰
(د) نظمِ فارسی	۵۱-۵۳
(حواشی آثارِ غالب) حصہ دوم:	۵۴-۶۸

"کلیاتِ نظم، کے ایک نسخے (مخزونہ کتب خانہ خدا بخش، پٹنہ) کے ورق ۱۷ اور ۷/۲ پر دو فارسی شعروں کے مطلب خود غالب کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ تحریریں ۱۲۵۴ہجری (۱۷ مارچ ۱۸۳۹ء) کے بعد کی ہیں۔ غالب کی ان قلمی تحریروں کے عکس، قاضی عبدالودود نے خاں صاحب قاسم حسن (ناظم کتب خانہ مشرقیہ، بانکی پور) کے شکریے کے ساتھ "آثارِ غالب" مابین صفحہ ۶ و ۷ اور صفحہ ۴۴ و ۴۵) میں شائع کیے ہیں۔

"یہ مجموعہ پہلے علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع ہوا تھا۔ اُس وقت اِس کا نام "آثارِ غالب" تھا، پھر نیا سرورق چھپوا کر اس کا نام "مآثرِ غالب" کر دیا گیا تاکہ شیخ محمد اکرام کی کتاب "آثارِ غالب" سے التباس نہ ہو۔" (مالک رام، نگار، لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۰)

نامہ ہای فارسی غالب

متعارفہ: سید اکبر علی ترمذی

یہ مجموعۂ مکاتیب، غالب کے اکتیس نادر فارسی خطوں اور پانچ قیمتی ضمیموں پر

مشتمل ہے جو غالب کی زندگی اور بالخصوص اُن کے قیام کلکتہ پر نئی روشنی ڈالتے ہیں اور دربارۂ خاص ایک ناگزیر ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ غالب کے ان فارسی خطوں کو سید اکبر علی ترمذی نے دریافت کیا، ترتیب دیا اور ایک مقدمے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ (مطبوعہ غالب اکیڈمی، دہلی ۱۹۶۹)۔ یہ مقدمہ (۴۶ صفحات) بڑی بصیرت سے لکھا گیا ہے اور اس میں بہت سے سوال اٹھائے گئے ہیں اور بڑی ذہانت سے متعدد سوالوں کے جوابات فراہم کیے گئے ہیں۔

"نامہ ہای فارسی غالب" غالب صدی پر شائع ہونے والی گنتی کی ان چند کتابوں میں سے ایک ہے جو سلسلۂ غالب پر نئے حقائق کی حامل ہیں یا معلومہ اطلاعات کی تکذیب، تصحیح یا توثیق کرتی ہیں۔

غالب کے یہ نئے فارسی خط اور پانچ اہم ضمیمے کتاب کے ۱۲۰ صفحات میں آئے ہیں۔ انگریزی میں ایک صفحے کے مختصر سے "پیش لفظ" میں قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

Mr. S.A.I. Tirmizi's discovery of the Persian letters of Ghalib adds substantially to our knowledge about the poet's sojourn to Calcutta. He has edited these letters with a comprehensive introduction and has taken sufficient pains to compare the statements of the poet with external evidence available in the official records of the Government of India. His attempt to examine different influences working on the mind of the poet is praiseworthy, though I have my doubts about the impact of the Fort William College on the poet's style. Moreover, Mr. Tirmizi has shown sufficient insight in arranging these letters in a chronological order as also in establishing the text and identifying the names of persons and places occurring therein.-- the book, I am sure will open up new vistas of research on Ghalib. I am eagerly looking forward to Mr. Tirmizi's promised book, *Ghalib and the State*.

"پیش لفظ" کے بعد انگریزی ہی میں چار صفحات کا ترمذی صاحب کا دیباچہ، اور

چھیالیس صفحات پر مشتمل "تعارف" (جس میں خطوط اور ان کے پس منظر کا تفصیلی تاریخی جائزہ لیا گیا ہے) دو صفحات میں غالب کے سفر اور قیام کلکتہ کی سلسلہ وار اہم تاریخیں، دو صفحات میں "کتابیات"، چھ صفحات میں کتاب کا "انڈیکس" اور دو میں "غلط نامہ" ہے۔

"اس مجموعے کی غالباً پہلی اطلاع قاضی عبدالودود نے دی: "غالب کے فارسی خطوط کا ایک نیا مجموعہ" کے تحت ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

"غالب کے فارسی خطوط کا ایک نیا مجموعہ دستیاب ہوا ہے، جس میں تین قسم کے خطوط ہیں:

۱۔ بالکل نئے خطوط

۲۔ پرانے خطوط، معتد بہ اختلافِ متن کے ساتھ

۳۔ پرانے خطوط، جن کا متن یا تو وہی ہے جو "پنج آہنگ" میں ہے یا اختلاف ہے تو اتنا کم کہ نہ ہونے کے برابر۔

ایک آدھ کو چھوڑ کر سب خطوط محمد علی خاں کے نام سے ہیں جو سراج الدین علی خاں قاضی القضات کلکتہ کے بھائی تھے اور جن کا فارسی گو شاعر کی حیثیت سے کسی بھوپالی تذکرے میں ذکر ہے .... غالب سے ان کی ملاقات باندہ میں ہوئی اور کل خطوط انہیں وہیں بھیجے گئے۔ سب خطوط، ایک کو چھوڑ کر، دورانِ سفر میں لکھے گئے تھے۔ یہ مجموعہ بدقسمتی سے کرم خوردہ ہے۔ اس کے بعض الفاظ اچھی طرح پڑھے نہیں جاتے۔ اس سے غالب کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ کچھ امور کی جو پہلے سے ہمارے علم میں تھے تصدیق ہوتی ہے اور بعض کی تکذیب..."

(ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۶۲ء ص ۷)

قاضی عبدالودود نے، اپنے اس تعارفی مضمون میں، اس مجموعے کے کچھ مطالب (جو تعداد میں دس ہیں)، بعض عبارات اور دو مکمل خط پیش کیے ہیں[۱]۔

---

[۱] ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۶۲ء

قاضی عبدالودود نے اس مجموعے کا اُردو خلاصہ بھی ترتیب دیا جو ضروری توضیحات اور کچھ حواشی کے ساتھ "مجموعۂ غالب اور دہلی" کے زیرِ عنوان رسالہ اُردو، کراچی (شمارہ خصوصی بیادِ غالب، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء ص ۱۰۲ - ۱۴۰) میں شائع ہوا ہے۔ مقالۂ مذا میں قاضی عبدالودود نے اس مجموعے کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ :

"مجموعہ فارسی، نیشنل آرکائیوز دہلی میں ہے جس کا علم مجھے جناب اکبر علی ترمذی کی مہربانی سے ہوا..... اس میں پہلے غالب کی تحریریں ہیں، ان کے بعد ایک صفحہ سادہ اور پھر تین صفحات میں دوسروں کی تحریریں ہیں۔ کسی صفحے میں ۲۱، کسی میں ۲۰ اور کسی میں اس سے بھی کم سطور ہیں ... کم اوراق ہیں جو ناقص نہیں، کتاب بدون تمہید و خاتمہ ہے۔ اس کا امکان ہے اوّل و آخر اور درمیان کے کچھ ورق ضائع ہو گئے ہوں ..."

(رسالہ اردو، کراچی، جنوری مارچ ۱۹۶۹ء ص ۱۰۳)

"اس مجموعے کے خطوط کی بڑی اکثریت محمد علی خاں کے نام ہے، خواہ ان کا نام آغاز خط میں ہو یا نہ ہو۔ باقی خطوط علی اکبر خاں طباطبائی کے نام ہیں اور ان کے ساتھ بھی ان کا نام لازماً نہیں۔ اس خطوط میں سے چند "پنج آہنگ" میں بھی ہیں بعض میں تو بڑے اختلاف ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مجموعے میں اغلاطِ کتابت سے قطع نظر، اصلی خطوں کی نقلیں ہیں۔ "پنج آہنگ" میں مصلحت کارفرما رہی ہے۔ بعض تحریریں خط نہیں کہی جا سکتیں ..."

(اردو، ایضاً، صفحہ ۱۰۴)

اِس مجموعے میں غالب کی تحریروں کے بعد، تین صفحات میں، دوسروں کی جو تحریریں ہیں، اُن کی مدد سے قاضی عبدالودود نے اس مجموعے کے کاتب اور زمانۂ کتابت کے تعین کی کوشش کی ہے۔ قاضی صاحب کا خیال ہے کہ "یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ (منشی علی حسن) اس مجموعے کے کاتب نہیں ... زمانۂ کتابت ۱۸۲۹ء یا اس کے کچھ بعد معیّن کیا جا سکتا ہے۔ یہ متیقن ہے کہ غالب کی کل تحریریں جو اس مجموعے میں ہیں، اس سے قبل کی ہیں ..." (صفحہ ۱۰۴)

انتخابِ غالب

ترتیب و تصحیح : مولانا امتیاز علی خاں عرشی

"انتخابِ غالب" (ناشر کتاب خانہ ریاست رامپور، ۱۹۴۲ء) کے سرورق کی توضیحی عبارت یہ ہے" یعنی :

"نجم الدولہ دبیر الملک، میرزا اسداللہ خاں بہادر، نظام جنگ دھلوی المتخلص بہ غالب و اسد کے کلام فارسی و اردو کا انتخاب، جسے خود موصوف نے نواب خلد آشیاں کی فرمائش پر سنہ ۱۸۶۶ء میں مرتب کیا ..." واضح رہے کہ "نواب خلد آشیاں" سے مولانا امتیاز علی عرشی کی مراد نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور (مسند نشینی، ۱۰ جون ۱۸۶۵ء وفات، ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء) سے ہے۔ "انتخاب" کے مشمولات و مندرجات کی تفصیل یہ ہے:

اپنے اردو اور فارسی کلام کا یہ انتخاب، غال[illegible] نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور

کے ایما پر کیا تھا۔ مولانا عرشی نے دیباچے میں اِس امر کا اظہار اِن لفظوں میں کیا ہے:

"حسنِ اتفاق سے، نواب خلد آشیاں (کلب علی خاں) نے اساتذۂ اردو و فارسی کے منتخب اشعار کی بیاض ترتیب دینے کا عزم فرمایا۔ اس موقع پر سرکار کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ میرزا صاحب کے کلام کا انتخاب خود انھی سے کرایا جائے۔ ۲۵ راگست ۱۸۶۶ء کو سرکار نے میرزا صاحب کو تحریر فرمایا:

"مطالب دگر جو کہ راقم کو ترتیب بیاض اشعار منتخبۂ اساتذۂ پارسی و اردو کی منظور ہے، اس واسطے حوالہ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ انتخاب دیوان فارسی اور اردو اپنے کا فرماکر ... لطف کریں، تا شاملِ انتخاب کے، جو اس سرکار میں عمل میں آیا ہے، ہو جائے۔"

میرزا صاحب نے ۱۸ ستمبر کو دیوان اردو اور ۲۴ ستمبر کو دیوانِ فارسی کا انتخاب ارسال کر دیا۔" (دیباچہ، صفحہ ک / کا)

اِس مرسلہ انتخاب پر کیا گزری، "تقریب" میں بشیر حسین زیدی نے اِس کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"ستمبر ۱۸۶۶ء میں میرزا صاحب نے (سرکار کے) ارشاد کی تعمیل کی اور یکے بعد دیگرے کلیاتِ اُردو و فارسی کے خود کردہ انتخابات جداگانہ کتابی صورت میں نقل کرا کے، نواب خلد آشیاں کے حضور میں ڈاک کے توسط سے پیش کیے۔ سرکار کے ملاحظے کے بعد، یہ دونوں نسخے کتاب خانے کو بھیج دیے گئے۔ اُس عہد کے منتظمینِ کتاب خانہ نے صرف فارسی انتخاب کو 'شعبۂ دواوین' میں داخل ہونے کا شرف عطا کیا اور رسمِ زمانہ کے مطابق، انتخابِ اردو کو ناقابلِ التفات خیال کر کے، کتاب خانے کے "ردّی گھر" میں گمنامی کی گہری نیند سُلا کر مطمئن ہو گئے۔

حسنِ اتفاق سے، مولوی امتیاز علی خاں عرشی، ناظم کتاب خانہ نے "ردّی گھر" کی متاع کا جائزہ لیتے ہوئے، دوسرے نوادرات کے ساتھ

اردو انتخاب بھی برآمد کرلیا اور میرزا صاحب کی تھکی ہوئی زندگی کا یہ کارنامہ
ملک کے اربابِ ذوق کے لیے محفوظ ہوگیا۔" (صفحہ ہ/و)

مولانا عرشی کی کئی سال کی دیدہ ریزی اور کوشش کے بعد یہ مجموعہ مثالی، صوری و معنوی خوبیوں کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ یہ دیدہ زیب ایڈیشن، دبیز کاغذ پر روشن ٹائپ میں شائع ہوا۔ یہ ڈی لکس ایڈیشن دیکھنے کی چیز ہے۔ اِس کے صوری حسن کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

انتخاب کے اخیر میں مولانا عرشی نے اختلافِ نسخ ظاہر کیے ہیں، ایک "اشاریہ" مرتّب کردیا اور:

"بعض اشعار کی شرح بھی لکھ دی ہے اور اس میں کہیں کہیں بڑے لطیف نکات بیان کیے ہیں۔ شرح کی تائید میں اکثر مرزا غالب کے بیان، اُن کے رُقعات وغیرہ سے نکال کر دیے ہیں۔۔۔"

(مولوی عبدالحق، اردو، اکتوبر ۱۹۴۲ء، صفحہ ۵۵۸)

ابتداً عرشی صاحب نے انتخابِ غالب پر تفصیلی حواشی بھی لکھے تھے مگر جنگِ عظیم کی گرانی کے باعث ان حواشی کو طباعت کے وقت حذف کردیا گیا۔ اکبر علی خاں عرشی زادہ نے راقم الحروف کے نام ایک خط میں تحریر کیا ہے کہ وہ مسودہ جس میں عرشی صاحب کے حواشی بخطِ عرشی درج ہیں، اُن کے ذاتی ذخیرے (پھلوار، رامپور) میں محفوظ ہے۔

انتخابِ غالب

مُرتبہ و متعارفہ: محمد عبدالرزّاق

"۱۸۶۵ء کے لگ بھگ میرزا (غالب) نے اپنے اردو خطوط کا ایک انتخاب شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین خاں کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ اِس کے آخر میں اُنھوں نے اپنے چند اشعار بھی شامل کردیے تھے، بعد میں اس انتخاب کو ڈاکٹر ضیاء الدین خاں نے اپنی مرتبہ

"انشائے اردو" میں استعمال کیا تھا۔[1] بہت دن ہوئے، غالب کے اس انتخاب کا ایک غلط سلط ایڈیشن، لاہور سے "انتخاب غالب" کے نام سے چھپا تھا۔[2] لیکن یہ عنقریب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد) کی تصحیح و تحشیہ سے دوبارہ "انشائے غالب" کے نام سے شائع ہونے والا ہے۔" (مالک رام، مقدمہ دیوانِ غالب (اردو)، دہلی ۱۹۵۷ء، ص ۲۲)

یہ انتخاب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع نہیں ہو سکا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے اپنی مرتبہ کتاب "مجموعۂ نثر غالب اردو" میں اس "انتخاب" کا دیباچہ اور خاتمہ[3] شامل کیا ہے، داؤدی صاحب فرماتے ہیں کہ ان کا پیش کردہ "دیباچہ انتخاب غالب" ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مخزونہ اُس خطی نسخے پر مبنی ہے جو کبھی "غالب کا ذاتی نسخہ" رہا ہے۔[4] دیباچے میں غالب لکھتے ہیں کہ:

> "یہ کتاب جو دو باب کی ہے، حقیقت یہ اس کتاب کی ہے کہ پہلے باب میں دو دیباچے اور کئی لطیفے اور کئی مکتوب ہیں۔ اگر میرے لکھے ہوئے نہ ہوتے تو میں کہتا کہ بہت خوب ہیں۔ دوسرا باب، اشعار کا ہے کہ وہ بھی کلام اس خاکسار کا ہے۔ اگر کوئی خط اُردو زبان میں لکھا جائے، ان اشعار میں سے شعر، محل و مقام کی مناسبت سے درج کیا جائے اور یہ مجموعہ نذر اس جناب رفعت مآب کے ہے، جس سے عزت و توقیر، فنانشل کمشنری پنجاب کی ہے... معلی القاب، حضرت فلک رفعت میکلوڈ صاحب بہادر

---

[1] انشائے اردو، حصۂ دوم، مطبع فیض احمدی، ۱۸۶۶ء

[2] مرتبہ، محمد عبدالرزاق، اقبال اکیڈیمی، لاہور ۱۹۴۳ء، ص ۴۸

[3] دیباچے اور خاتمے کی یہ دونوں مختصر نثری تحریریں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے حوالے سے ڈاکٹر مختار الدین احمد کے توضیحی کلمات کے ساتھ علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء (صفحہ ۹۸ ـ ۱۰۰) میں اور اس کے بعد "غالب کی نادر تحریریں" از خلیق انجم (صفحہ ۱۲۹ـ۱۳۱) میں شامل اور شائع ہو چکی ہیں۔

[4] مجموعۂ نثر غالب اردو، صفحہ ۲۶۱

فنانشل کمشنر بہادر، قلمروِ پنجاب۔ پس یہ کتاب اگر ان کے حکم سے چھپائی جائے گی تو صاحبانِ تازہ واردِ ولایت کے پڑھنے کے کام آئے گی۔"

(مجموعۂ نثرِ غالب اُردو، صفحہ ۲۶۳ و بہ بعد)

غالب نے اس مختصر سی "کتاب" سے اپنے بعض مطالب نکالنے کی فکر بھی کی تھی۔ یہ "فکرِ بلند" دیدنی ہے:

"اس کتاب کا نذر کرنے والا جو اپنی نذر کے قبول ہونے کا طالب ہے، نصراللہ بیگ خان بہادر، رئیس سونک دسونا کا بھتیجا، موسوم بہ اسداللہ خاں متخلص بہ غالب ہے۔ میرے چچا کی سرداری اور ریاست کا حال اور گورنمنٹ بہادر اعلیٰ سے خاص میری ملازمت اور نذر خلعت کی کیفیت، گورنمنٹ اعلیٰ کے دفتر میں مرقوم ہے ۔ ۔ ۔ البتہ میں اس کا مستحق ہوں کہ "کوئینس پوئیٹ" رگنا جاؤں اور اس علاقے سے ایک نیا نام اور نئی عزت پاؤں۔ اگر رتبہ نہ بڑھایا جائے، قدیم عزت میں تو فرق نہ آنے پائے ۔ ۔ ۔"

(مجموعۂ نثرِ غالب، اُردو، صفحہ ۲۶۴)

"خاتمۂ انتخابِ غالب" کی عبارت (مجموعۂ نثرِ غالب، اُردو ص ۲۶۹) بھی لطف سے خالی نہیں:

"خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ یہ مجموعہ مختصر تمام ہوا۔ اب خدا سے یہ دعا مانگتا ہوں کہ یہ تحریر میرے مربّی اور محسن کے پسند آئے۔ تم نے جانا کہ میرے مربّی اور محسن کون ہیں؟ وہ کہ جن کی ہدایت کا شکر گزار اور عنایت کا امیدوار ہوں۔ جب نام نامی اُن کا دیباچۂ کتاب میں مرقوم اور عالم میں مشہور ہے تو بار بار حضرت کا نام لینا ادب سے دور۔ مگر ہاں، خاتمے میں یہ شعر لکھ دینا ضرور ہے:

سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہُوا
مجھ پہ گویا اِک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

غالب نے دیباچہ میں اس کتاب کی حقیقت یہ بیان کی ہے کہ اس کے "پہلے باب

میں "دو دیباچے، اور کئی لطیفے اور کئی مکتوب ہیں۔۔۔۔ میرے لکھے ہوئے۔۔۔۔ دوسرا باب اشعار کا ہے کہ وہ بھی کلام اس خاکسار کا ہے" پہلے باب کے دونوں دیباچے "اردوئے معلّیٰ" میں شامل ہیں ایک "گلزارِ سرور" کا دیباچہ ہے اور دوسرا خواجہ امان دہلوی کی "حدائق انظار" کا۔ مکتوب، تعداد میں بارہ ہیں اور یہ سب کے سب مجروح کے نام ہیں، ان میں سے صرف ایک نیا ہے اور اب یہ خط مالک رامؔ[1] اور مولانا غلام رسول مہرؔ[2] کے مرتبہ خطوطِ غالب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ "پہلے باب میں کئی لطیفے ہیں میرے لکھے ہوئے" اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں دو نقلیں اور ایک لطیفہ ہے۔ "دوسرا باب اشعار کا ہے" اس کی کیفیت یہ ہے کہ متداول اُردو دیوان سے اکتیس (۳۱) شعر لیے گئے ہیں۔ کتاب کے آغاز و انجام کی نثروں "دیباچہ" سے ضروری اقتباس اور "خاتمہ" کی کُل عبارت اوپر پیش کی جا چکی۔

ایک "نقل" سے جدوجہدِ آزادی کے زمانے میں غالب کے احوال پر روشنی پڑتی ہے اور ان کے سوانح کے بارے میں کچھ نئی معلومات میسر آتی ہیں۔ "نقل" یہ ہے:

"غدر کے دنوں میں، میں نہ شہر سے نکلا نہ پکڑا گیا۔ نہ میری روبکاری ہوئی جس مکان میں رہتا تھا، وہیں بدستور بیٹھا رہا۔ بلیماروں کے محلّے میں میرا گھر تھا۔ ناگاہ، ایک دن آٹھ سات گورے دیوار پر چڑھ کے، اس خاص کوچے میں اُتر آئے جہاں میں رہتا تھا۔ اس کوچے میں ہمہ جہت پچاس یا ساٹھ آدمی کی بستی ہوگی، سب کو گھیر لیا اور اپنے ساتھ لے چلے مگر گرفتار نہیں کیا اور کسی کو بے حرمت نہیں کیا، نرمی سے لے چلے۔ راہ میں سارجن بھی آملا۔ اُس نے مجھ سے صاحب سلامت کے بعد پوچھا کہ "تم مسلمان ہو؟" میں نے کہا کہ "میں آدھا مسلمان ہوں"۔ اُس نے کہا "ول! صاحب، آدھا مسلمان کیسا؟" میں نے کہا: "شراب پیتا ہوں، ہیم ہوک نہیں کھاتا"۔ غرض کہ وہ مجھے کرنل برون صاحب کے پاس لے گیا

---

[1] خطوطِ غالب، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، خط نمبر ۳۹۷، صفحہ ۲۲۴ و ما بعد
[2] خطوطِ غالب، لاہور، ۱۹۶۹ء، بنام مجروح نمبر ۴۵، صفحہ ۴۰۳ و ما بعد

وہ چاندنی چوک حافظ قطب الدین سوداگر کی حویلی میں اُترے ہوئے تھے۔ باہر نکل آئے اور میرا صرف نام پوچھا، اوروں سے نام بھی پوچھا اور پیشہ بھی پوچھا۔ نام میرا سُن کر فرمایا کہ "اسداللہ خاں! بڑے تعجب کی بات ہے کہ باڈی[1] پر نہ آئے" میں نے کہا کہ "آپ سُنیں تو کہوں؟" کہا: "ہاں کہو" میں نے کہا کہ تلنگے دروازے سے باہر آدمی کو نکلنے نہیں دیتے تھے۔ میں کیوں کر آتا۔ اگر کچھ فریب کر کے، کوئی بات بنا کے نکل جاتا، تب باڈی کے قریب گولی کی زد پر پہنچتا۔ پہرے والا گورا مجھے گولی مار دیتا۔ یہ بھی مانا کہ تلنگے باہر جانے دیتے گورے گولی نہ مارتے، میری صورت کو دیکھیے اور میرا حال معلوم کیجیے، بوڑھا ہوں، پاؤں سے اپاہج۔ کانوں سے بہرا، نہ لڑائی کے لائق نہ مشورت کے قابل۔ ہاں دُعا کرتا، سو یہاں بھی دُعا کرتا رہا۔" کرنل صاحب ہنسے اور فرمایا: "اچھا تم اپنے گھر جاؤ اور اپنے نوکروں اور اپنے علاقہ داروں کو ساتھ لے جاؤ۔ باقی اہلِ محلّہ سے غرض نہ رکھو۔" میں خدا کا شکر بجالایا اور کرنل براؤن صاحب کو دُعا دیتا ہوا اپنے گھر آیا۔"

(انتخابِ غالب، صفحہ ۴۱، ۴۲)

غالب نے اس واقعے کو "دستنبو" میں بھی بیان کیا ہے لیکن بالاختصار، بعض تفصیلات کے بغیر لیکن کچھ جزئیاتی تفصیلات کے اضافے کے ساتھ:

"۵ اکتوبر (۱۸۵۷ء) کو پیر کا مصیبت آفریں دن (تھا)، دوپہر کے وقت اچانک چند گورے اس دیوار پر چڑھ گئے جو بند کردہ دروازے سے

---

[1] باڈی سے مراد دہلی میں سبزی منڈی کی جانب اور علی پور روڈ پر ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے۔۔۔ "یہ وہ مقام ہے جہاں ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے اپنی فوجیں جمع کی تھیں اور دہلی اور قلعۂ دہلی پر گولہ باری کرنے کے لیے توپیں آراستہ کی تھیں، یہاں انگریزی جھنڈا بھی نصب کیا گیا تھا۔ قلعۂ دہلی سے جب انگریزوں پر گولے پھینکے گئے تو اس پہاڑی پر چند انگریز مارے گئے جن کی قبریں اب تک موجود ہیں۔۔۔" (عبدالرزاق، انتخابِ غالب، صفحہ ۴۲)

ملی ہوئی ہے (وہاں سے) ایک چھت پر (اور پھر چھت سے) کود کر گلی میں آگئے۔ راجہ اندر سنگھ کے سپاہیوں کا روکنا (کچھ) مفید نہیں ہوا (نہیں روک سکے)۔ دوسرے چھوٹے چھوٹے مکانات کو نظر انداز کر کے راقم الحروف کے گھر میں (گھس) آئے۔ (ان گوروں نے) بھلمنسی سے سامان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مجھ کو ان دونوں بچوں، دو تین ملازمین اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ گلی سے دو فرلانگ سے کچھ زیادہ فاصلے پر حقیقت پسند، دانشور کرنل برون[1] کے پاس لے گئے۔ جو چوک سے اسی طرف قطب الدین سوداگر کی حویلی میں مقیم ہے۔ (کرنل برون نے) مجھ سے بہت نرمی اور انسانیت سے بات چیت کی۔ مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا۔ خوش اسلوبی کے ساتھ اسی وقت رخصت کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس خوش اخلاق (کرنل برون) کی تعریف کی چلا آیا۔"

(غالب اور انقلاب ستاون، طبع دوم لاہور، ص ۱۰۰)

حالی نے بھی "دستنبو" کے حوالے سے اسی روایت کو "یادگارِ غالب[2]" میں بیان کیا ہے۔

"اس مختصر سے مجموعے کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اسے خود غالب نے مرتب کیا اور "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" دونوں سے پہلے ۱۸۶۶ء میں شائع ہو گیا تھا۔ ہوا یہ کہ ڈاکٹر مولوی ضیاء الدین خاں (پروفیسر عربی، دلی کالج) انگریز افسروں اور فوجیوں کو اردو پڑھانے کے لیے ایک انشا مرتب کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے میرزا سے مدد کے لیے کہا تو میرزا نے یہ خط وغیرہ جمع کر دیے۔

جانے مولوی صاحب نے اُن سے کیا کہا، لیکن میرزا کا گمان یہ تھا کہ یہ مجموعہ فنانشل کمشنر پنجاب، میکلوڈ صاحب کے پیش ہونے والا ہے۔ اس لیے وہ دیباچے میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب میکلوڈ صاحب کی نذر ہے اور اسے شائع کیا جائے۔ مولوی صاحب نے

---

[1] یہ دراصل کرنل BURN ہے، دیکھیے، غالب اور انقلاب ستاون، طبع دوم، حاشیہ ص ۱۰۰

[2] یادگارِ غالب، مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، لاہور، ۱۹۶۳ء، صفحہ ۵۶

اس کے خطوط، اپنی مرتبہ "انشائے اردو" (حصّہ دوم) میں شامل کر لیے تھے، جو ۱۸۶۶ء میں مطبع فیض احمدی (دہلی) میں چھپی۔

غالب نے جو نسخہ مولوی ضیاء الدین احمد خاں کے لیے لکھوایا اور انھیں دیا تھا، یہ ان کے کتاب خانے سے دستیاب ہوا اور کسی طرح عارضی طور پر جناب عبدالرزاق صاحب کے ہاتھ آ گیا۔ انھوں نے اسے مرتب کر کے پہلی مرتبہ چشتیہ پریس حیدر آباد میں چھپوا کر ۱۹۲۶ء (۱۳۴۵ھ) میں شائع کرا دیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن (اقبال اکیڈمی، لاہور کی جانب سے) دین محمدی پریس لاہور میں ۱۹۴۲ء میں چھپا۔ کتابی صورت میں چھپنے سے پہلے یہ مجموعہ حیدر آباد دکن کے ماہانہ رسالے تحفہ میں بھی بہ اقساط (اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۲۶ء) شائع ہوا تھا۔" (مالک رام، فروغِ اردو، لکھنؤ، غالب نمبر، نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ۸ : ۸۰)

فرہنگِ غالب

مرتّبہ : مولانا امتیاز علی خاں عرشی

فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت، ہندی اور اُردو لغات کی تحقیق و تشریح غالب کے اپنے الفاظ میں[1]۔

"چونکہ اس کا ہر ہر لفظ، غالب ہی کا تراوید‌ۂ قلم تھا، میں نے اس کا نام "فرہنگِ غالب" تجویز کیا ہے ..."

(عرشی، دیباچہ فرہنگِ غالب، صفحہ ۲۱)

"۱۳۶۳ ہجری کے آخر میں (= نصف اوّل دسمبر ۱۹۴۴ء) مجھے خیال ہوا کہ اگر "قاطع برہان" وغیرہ کے صرف تحقیق و تشریح الفاظ سے متعلق حصے غالب کی دوسری کتابوں کے حلِ لُغات کے ساتھ ایک کتاب میں حروفِ تہجی پر مرتب کر دیے جائیں تو ان کی برسوں کی محنت اکارت ہونے سے بچ جائے گی، ورنہ کسے فرصت کہ "قاطع برہان" وغیرہ

---

[1] ناشر: اشاعت خانہ رامپور، ۱۹۴۷ء

کو دیکھے اور تحقیق کی داد دے۔ اور اگر کوئی کرنا بھی چاہے تو یہ کتابیں عام طور پر دستیاب کہاں ہوتی ہیں۔ الحمد للہ کہ چند مہینوں کی کنج کاوی سے یہ مجموعہ مرتب ہوگیا۔۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا عربی و فارسی وغیرہ پر اور دوسرا اُردو الفاظ پر مشتمل ہے۔ ہر لفظ کی تشریح کے بعد قوسین میں ان کتابوں کے رموز لکھ دیے گئے ہیں جہاں سے وہ تشریح ماخوذ ہے لیکن حصہ دوم میں تقریباً ہر جگہ اور "اول" میں جگہ جگہ یہ رموز ترک بھی ہوئے ہیں۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں غالب نے کسی لفظ کو بطور مترادف تحریر کیا تھا مگر میں نے اسے اس لیے مستقل لغت قرار دے لیا ہے کہ جو اصحاب، غالب کے چنے ہوئے الفاظ کو اپنی تحریروں میں استعمال کرنے کے خواہاں ہوں، وہ مشہور اور مستقل لفظ کے ذریعے، اس لفظ تک بآسانی رسائی حاصل کر سکیں جو غالب نے فارسی ذخیرۂ الفاظ میں سے اپنے لیے چنا تھا۔۔" (عرشی، دیباچہ، فرہنگِ غالب، صفحہ ۲۰، ۲۱)

قاضی عبدالودود نے "فرہنگِ غالب" پر ایک سیر حاصل تبصرہ[1] لکھا جس کی غرض یہ دکھانا ہے کہ جناب عرشی نے اپنے فرائض کس طرح ادا کئے ہیں"۔ یہ قرار دیا ہے کہ "فرہنگِ غالب" کا ہر ہر لفظ "لازماً غالب کا تراویدۂ قلم" نہیں -- اور یہ کہ : "عرشی صاحب کے دیباچے میں ایسی باتیں ہیں جو محلِ نظر ہیں"۔ قاضی عبدالودود نے ادائے فرض میں عرشی صاحب کی متعدد کوتاہیوں کی علمی سطح پر نشاندہی کرنے کے بعد اپنے تبصرے کو ان کلمات پر ختم کیا ہے :

> "فرہنگِ غالب" ان نقائص کے باوجود جن کا ذکر، اس تبصرے میں ہے، ادبیاتِ غالبی میں مفید اضافہ ہے۔ جناب عرشی نے اس کی ترتیب میں بڑی عجلت سے کام لیا ہے، کچھ وقت اور اس پر صرف ہوتا تو مفید تر ہو سکتی تھی"
>
> (علی گڑھ میگزین، ۴۹ء، ص ۲۷۲)

مولانا عرشی نے اس عالمانہ جائزے سے استفادہ کیا اور "استدراک" کے تحت آٹھ صفحات میں فرہنگ کی پچاسی سے زیادہ ضروری فروگزاشتوں کی اصلاح کی اور ان آٹھ صفحات کو آغازِ کتاب میں شامل کر دیا گیا۔ "استدراک" کے لفظ یہ ہیں :

---

[1] علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۸-۱۹۴۹ء، صفحہ ۲۵۲-۲۷۳

"فرہنگِ غالب میں جو فردگزاشتیں ہوئی تھیں، اُن کی طرف مُحبِّ مکرم جناب قاضی عبدالودود صاحب (پٹنہ) نے ایک مفصّل تنقید میں توجہ دلائی تھی۔ کچھ باتیں خود مجھے محسوس ہوئی تھیں۔ ذیل کے صفحوں میں ان میں سے زیادہ ضروری کا ذکر کرتے ہوئے مستدعی ہوں کہ مطالعہ کرنے والے حضرات اپنے اپنے نسخوں میں ان کا اندراج فرمالیں۔۔۔"

بصورتِ موجودہ کتاب کے مُندرجات کی تفصیل یہ ہے:

استدراک:	صفحہ ۱ - ۸
دیباچہ:	۷ - ۲۷
حِصّہ اوّل: فارسی وغیرہ	۱ - ۲۶۱
حِصّہ دوم: اُردو	۲۶۲ - ۲۹۰
اشاریہ (اسماء و کتب):	۲۹۱ - ۲۹۷

"غالب کو لُغات سے ہمیشہ دل چسپی رہی، ان کی تصنیفات میں سینکڑوں الفاظ کے معنی سے متعلق بحث ہے۔ مولانا عرشی نے اس کتاب میں یہ تمام معلومات جمع کردی ہیں۔ اس طرح گویا غالب کی ایک نئی کتاب 'مرتب ہو گئی ہے۔ دیباچے میں ہندوستانی لغت نویسوں کی ایک فہرست اور ان کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے۔۔۔"

(اکبر علی خان، 'نذرِ عرشی'، دہلی، ۱۹۶۵ء، ص ۴۲)

اکبر علی خاں عرشی زادہ نے راقم الحروف کو مطلع فرمایا ہے کہ اس "فرہنگِ غالب" کا اصل مسودہ، جو بخطِ مولّف ہے یا جس کے اوراق خود مولانا عرشی نے ٹائپ کیے ہیں، حکیم عبدالحمید کے اصرار پر، غالب اکیڈمی، نئی دہلی کی لائبریری میں محفوظ کردیا گیا ہے۔

آٹھواں باب

غیر مطبوعہ تصانیفِ غالب:

اُردو/فارسی : نظم ونثر

۱۔ مسودہ قاطع برہان، مرتبہ : مولانا امتیاز علی خاں عرشی
۲۔ انشائے غالب، ملوکہ : ڈاکٹر عبدالستار صدیقی
۳۔ مکاتیبِ غالب (فارسی)، مرتبہ : مولانا امتیاز علی خاں عرشی
۴۔ غالب و ذکا کی مراسلت، مرتبہ : حبیب اللہ ذکا
۵۔ نوادرِ غالب، زیرِ ترتیب : ڈاکٹر مختار الدین احمد
۶۔ گنجینۂ غالب، زیرِ ترتیب : ڈاکٹر مختار الدین احمد
۷۔ مکتوباتِ غالب و مجروح، مرتبہ : میرن صاحب، ملوکہ : آفاق دہلوی
۸۔ خطوطِ غالب، مرتبہ : مہیش پرشاد / مالک رام
۹۔ بخطِ غالب، مرتبہ : اکبر علی خاں عرشی زادہ

"کچھ ذخائر غالب کی نظم و نثر کے ایسے بھی موجود ہیں جن کے تلک
کی نشاندہی کو برسوں گزر چکے ہیں لیکن یہ ابھی تک شائع نہیں
ہو پائے ہے"

اگلے صفحات میں اس طرح کے آٹھ دس حوالے یک جا کیے جا رہے ہیں، اس کا امکان بھی ہے کہ کچھ مزید ذخائر بھی غالب کی نظم و نثر کے کہیں پڑے ہوں اور کبھی نہ کبھی، خوبی تقدیر سے منظر عام پر آجائیں :

[۱]

مسوّدہ قاطع برہان

زمانۂ تالیف ۱۸۶۰ء، مرتبہ : مولانا امتیاز علی خاں عرشی

"غالب نے برہان قاطع کے جس نسخے کے حاشیے پر اپنے اعتراضات لکھے تھے، وہ اب کتاب خانہ رضائیہ، رامپور میں آگیا ہے[۱]۔ اسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے "قاطع برہان" میں اپنے تمام اعتراض شامل نہیں کیئے اور حسب ضرورت ان کی زبان وغیرہ میں بھی تبدیلی کی تھی۔ اس کتاب میں (مولانا امتیاز علی عرشی نے) ان تمام

---

[۱] - اس نسخے کے تفصیلی تعارف کے لیئے دیکھیئے مقالات عرشی، مشمولہ :

۱ - آج کل، دھلی مارچ ۱۹۵۸ء، صفحہ ۴ - ۱۳
۲ - آئینہ غالب دھلی ۱۹۶۴ء، صفحہ ۱۹۱ - ۲۱۴
۳ - تحریک، دہلی، اپریل مئی ۱۹۶۱ء، صفحہ ۹ - ۲۹

حواشی[1] کو جمع کر کے ان پر تبصرہ و محاکمہ کیا گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ (اکبر علی خان، نذرِ عرشی، دہلی، ۱۹۶۵ء، صفحہ ۴۸)

یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی ہے ۔ ایک موقع پر مولانا امتیاز علی عرشی نے بتایا کہ،
"میرزا غالب نے نہ صرف محمد حسین دکنی کی "برہان قاطع" پر نہیں، خان آرزو، سیالکوٹی مل وراستہ اور ٹیک چند بہار کی کتابوں پر بھی اختلافی نوٹ لکھے ہیں ۔ ان میں اردو اور فارسی دونوں زبانیں استعمال کی گئی ہیں ۔ نیز ان میں جو کچھ لکھا ہے وہ بیشتر صحیح مگر کمتر نادرست بھی ہے ۔ اس طرح انداز بیان بھی زیادہ تر مہذّب ہے، صرف ایک دو جگہ البتہ جذباتی ہو گئے ہیں ۔[2]" (امتیاز علی خان عرشی، اردوئے معلیٰ، دہلی، فروری ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۰)

"قاطع برہان کا پہلا مسوّدہ" کے عنوان سے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا چالیس صفحات کا ایک مفصل مقالہ اس ضمن میں بالخصوص قابلِ ذکر ہے جس میں انھوں نے قاطع برہان کے ابتدائی مسودے کا آخری حصّہ پیش کیا ہے ۔[3]

---

[1] بعض حواشی کی تفصیل، عرشی صاحب متفرق مضامین کی صورت میں بھی پیش کر چکے ہیں، اس ضمن میں رجوع کیجیے:

۱۔ نیا دور، لکھنؤ، جنوری ۱۹۶۵ء

۲۔ ماہِ نو، کراچی (الف) مارچ ۱۹۶۵ء، صفحہ ۶۵ ۔ ۷۲، ۱۲۱

(ب) جنوری فروری ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۳۳ ۔ ۲۴۲

۳۔ نقوش، لاہور، ستمبر ۱۹۶۵ء، صفحہ ۵۲۵ ۔ ۵۲۷

۴۔ ماہِ نو، کراچی (الف) فروری ۱۹۲۷ء، صفحہ ۹ ۔ ۲۰، ۸۶

(ب) جنوری فروری ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۴۳ ۔ ۲۵۵

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے: اردوئے معلیٰ، دہلی، فروری ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۰ ۔ ۲۹

[3] مشمولہ نذرِ عابد، مجلس نذرِ عابد، دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ۱۸۱ ۔ ۲۱۸

[۲]

انشائے غالب

مرتبہ غالب: ۱۸۶۵ء

خطی نسخہ مملوکہ: ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

"۱۸۶۵ء کے لگ بھگ میرزا غالب نے اپنے اردو خطوط کا ایک انتخاب شمس العلما ڈاکٹر ضیاء الدین خاں کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ اس کے آخر میں انھوں نے اپنے چند اشعار بھی شامل کر دیے تھے۔ بعد میں ڈاکٹر ضیاء الدین خاں نے، اس انتخاب کو اپنی مرتبہ "انشائے اردو" میں استعمال کیا تھا۔ بہت دن ہوئے غالب کے اس انتخاب کا غلط سلط ایڈیشن، لاہور سے "انتخابِ غالب" کے نام سے چھپا تھا[۱]۔ لیکن یہ عنقریب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الٰہ آباد) کی تصحیح و تحشیہ سے دوبارہ "انشائے غالب" کے نام سے شائع ہونے والا ہے"۔

(مالک رام، مقدمہ دیوانِ غالب دہلی، ۱۹۵۷ء صفحہ ۲۲ و بہ بعد)

"رقعاتِ غالب (انتخاب)، میرے پاس بہت مدت سے ہے، جب وہ نسخہ میری ملک میں آ رہا تھا، اسی دوران میں ایک صاحب نے اسے مستعار لے کر نقل کر لیا (چھوٹا سا تو رسالہ ہے) جو شخص میرے ہاتھ بیچ رہا تھا، اُس نے مجھے خبر کی۔ میں نے باوجود اس سانحے کے، اسے لیا۔ بعد کو (۱۹۲۶ء) چھپا ہوا نسخہ دیکھا[۲]۔ غارت کر کے چھاپا تھا۔ پھر ایک شخص نے ان حضرت کی "اجازت" سے لاہور میں چھاپا (۱۹۴۳ء)۔ صورت بہتر، لیکن غلط، جیسا وہ تھا، ویسا یہ۔ اب میں خود چھپوانے کا ارادہ کر رہا ہوں"۔

(ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، بنام: مالک رام، ۸ فروری ۱۹۵۴ء،
نقوش، لاہور/ خطوط نمبر ۱۹۶۸ء، جلد ۲، صفحہ ۲۶)

"میری کوشش یہی ہے کہ "انشائے غالب" کی اشاعت، جلد ہو جائے۔ یہیں الٰہ آباد

---

[۱] مرتبہ محمد عبدالرزاق، اقبال اکیڈمی، لاہور ۱۹۴۳ء

[۲] مرتبہ محمد عبدالرزاق، چشتیہ پریس، حیدرآباد دکن، ۱۹۲۶ء

میں چھپواؤں گا۔" (ایضاً، یکم جون ۱۹۵۶ء، صفحہ ۷۶)

"انشائے غالب" کی اشاعت تاحال منظر عام پر نہیں آئی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے انتقال (۲۸۔۱۹۷۲ء) کے بعد اب اس کا امکان بھی کم رہ گیا ہے۔ بایں ہمہ مرحوم کے صاحبزادے مُسلم صدیقی (الہ آباد) کو اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ مالک رام نے اپنے مرتبہ دیوانِ غالب صدی ایڈیشن کے مقدمے میں یہ لکھا ہے کہ "اس کا اصلی خطی نُسخہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے پاس ہے اور اس کا عکس میرے سامنے رہا ہے۔"[له]

"انشائے غالب" کا اصلی خطی نسخہ معلوم نہیں اب کہاں ہو اور کس حال میں ہو۔ بایں ہمہ مولانا امتیاز علی عرشی کے نام، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے ایک خط مرقومہ ۸ ستمبر ۱۹۴۳ء سے "انشائے غالب" کے اصلی خطی نسخے کے کچھ کوائف احاطۂ علم میں آتے ہیں:

"غالب کو خیال ہوا کہ "صاحبانِ تازہ وارد ولایت کے پڑھنے" کے لیئے ایک اردو کتاب بنائیں۔ چنانچہ اپنے لکھے ہوئے دو دیباچے اور کئی رقعے کاتب سے نقل کروائے۔ شروع میں اس کتاب کا خطبہ لکھ کر لگایا، آخر میں کچھ لطیفے اور کچھ اپنے اردو شعر لکھوائے۔ اس کا جو (قلمی) نسخہ میرے پاس ہے، اس میں تقریباً ہر رقعے کی ابتدائی سطروں کے مقابل حاشیے پر "نوشتہ شد" اور لال روشنائی سے "مقابلہ نمودہ شد" لکھا ہوا ہے۔ کہیں کہیں کوئی عبارت قلمزد کی گئی ہے، کہیں کوئی لفظ، دو (تین) رقعے، سراسر کاٹ دیے گئے ..... اس کتاب میں جہاں کہیں حک اور اصلاح ہوئی ہے، مرزا غالب کے قلم سے معلوم ہوتی ہے۔ اصلاح کے لفظ جو کہیں کہیں آئے ہیں، انھیں کے خط میں ہیں ...."

(نقوش، لاہور، خطوط نمبر ۱۹۶۸ء، جلد ۲، صفحہ ۲۴، ۲۵)

له۔ دیوانِ غالب، دہلی، ۱۹۷۰ء، صفحہ ۳۲

[۳]

مکاتیبِ غالب (فارسی)

مرتبہ : مولانا امتیاز علی خان عرشی

" غالب کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ فارسی خطوط کو تاریخی ترتیب سے جمع کرکے، ان کے متن کی متعدد ماخذ سے تصحیح[۱] کی گئی ہے۔"

(اکبر علی خان، نذرِ عرشی، دہلی ۱۹۶۵ء، صفحہ ۴۸)

کوئی چالیس برس[۲] عرشی صاحب، غالب کے فارسی خطوں کی ترتیب میں لگے رہے وہ بجا طور پر اسے "عمر بھر کی کمائی"[۳] خیال کرتے تھے۔ یہ مجموعہ ابھی منظرِ عام پر نہیں آیا۔ مولانا امتیاز علی خان عرشی کے انتقال (۲۵۔ فروری ۱۹۸۱ء) کے بعد، اب ان کے صاحبزادے اکبر علی خاں عرشی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کام کی اشاعت و طباعت کی طرف دھیان دیں۔

[۴]

غالب و ذکار کی مراسلت (فارسی)

مرتبہ : حبیب اللہ ذکار

زمانۂ تالیف : ۱۸۶۲ء ۔ ۱۹۶۹ء

خطی نسخہ مملوکہ : آغا حیدر حسن

" غالب نے جو خط ذکار مرحوم کو لکھے ہیں اور جو خط ذکار نے غالب

۱۔ نمونۂ "تصحیح" کے طور پر ملاحظہ کیجیے عرشی صاحب کا مقالہ مشمولہ :
ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۵۰ء، صفحہ ۸۔۱۲

۲۔ دیکھیے، عرشی صاحب کے نام ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا خط مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۴۱ء در :
نقوش، لاہور، خطوط نمبر ۱۹۶۸ء، جلد ۲، صفحہ ۹

۳۔ نامۂ عرشی بنام مالک رام، مرقومہ ۱۹ جنوری ۱۹۵۵ء در :
نقوش، لاہور، خطوط نمبر ۱۹۶۸ء، جلد ۲، صفحہ ۱۶۲

کو لکھے ہیں، وہ ذکا رنے ایک کتاب کی صورت میں ترتیب دیے ہیں۔ یہ
سب فارسی میں ہیں۔ ان کا قلمی نسخہ جو ذکا[1] ہی کا مکتوبہ ہے، میرے کتب خانے
میں موجود ہے ...''

(آغا حیدر حسن، آجکل، دہلی، یکم جون ۱۹۴۷ء، صفحہ ۱۲۱)

آغا حیدر حسن نے یہ بات ۱۹۴۷ء میں کہی تھی۔ ۱۵۔ نومبر ۱۹۷۶ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔[2] فارسی خطوں کا یہ مجموعہ چھپا نہیں ہے اور معلوم نہیں آغا حیدر حسن کے انتقال کے بعد یہ قیمتی قلمی نسخہ کہاں گیا ہو۔ ضیاء الدین احمد شکیب نے غالب اور ذکاء کے فارسی خطوط اور ذکار کی اردو فارسی نظم و نثر پر مرزا غالب کی متعدد اصلاحات پر مبنی ایک قابلِ قدر کتاب ''غالب اور ذکاء'' کے نام سے مرتب کی ہے۔ یہ غالب اکیڈمی، دہلی سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ لیکن فاضل مرتب نے مخطوطات کے ماخذ کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ عجب نہیں کہ ان کا ماخذ آغا حیدر حسن کا مملوکہ نسخہ ہی ہو۔

---

[1]۔ ذکا، مولوی محمد حبیب اللہ مدراسی ثم حیدر آبادی:

''۱۸۲۰ء میں اودگیر (ضلع نیلور، مدراس) میں پیدا ہوئے۔ فارسی پر پوری قدرت حاصل تھی اور عربی بھی بقدر ضرورت جانتے تھے۔ فارسی میں نظم و نثر دونوں خوب لکھتے تھے۔ ۱۸۶۲ء میں غالب سے اصلاح لینے لگے۔ وفات سے پہلے نگر کرنول میں تعلقہ دار تھے۔ ۱۸۷۵ء (۱۲۹۱ھ) میں بعارضہ فالج انتقال کیا۔ حیدر آباد کے مشہور محلہ چچل گوڑہ میں مدفون ہیں۔ فارسی دیوان ''ترانہ و خراش'' ان کے بیٹے محمد میران سہا نے ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۹ء) میں طبع کرایا۔ اردو کا کچھ غیر مطبوعہ کلام مالک رام کے پاس محفوظ ہے۔''

(تلامذۂ غالب، ۱۹۵۷ء، صفحہ ۱۰۵ و بہ بعد)

[2]۔ آغا حیدر حسن مرزا — چند یادیں از: فاطمہ عالم
ماہنامہ سب رس، کراچی جنوری ۱۹۸۸ء ص ۲۴ - ۲۹

[۵]

نوادرِ غالب

مُرتّبہ : ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو

"نوادرِ غالب" کے نام سے ..... ایک مجموعہ راقم الحروف کے زیرِ ترتیب ہے جس میں مرزا کے وہ سارے رقعات و مکاتیب، مفید حواشی کے ساتھ جمع کر دیے ہیں جو اب تک کسی مجموعے میں شریکِ اشاعت نہیں، لیکن پرانے اخباروں، بیاضوں یا قدیم مجموعوں میں موجود ہیں۔ اس مجموعے میں خطوط کے علاوہ دوسرے نثری نمونے اور منظومات بھی ہیں۔ منشی حبیب اللہ ذکا، کے نام بھی خطوط کا ایک غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے۔ کچھ خطوط پٹودی میں بھی بتائے جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، تمہید : احوالِ غالب' ۱۹۵۳ء' صفحہ ۳ ،

طبع دوم' ۱۹۸۶ء' صفحہ ۱۱

"نوادرِ غالب کی جمع و ترتیب کا اعلان، اوّل اوّل، آرزو صاحب نے علی گڑھ میگزین' غالب نمبر (۴۸-۱۹۴۹ء) کے اداریے ("شذرات") میں کیا تھا۔ اب اسے چالیس برس ہو چلے۔ آرزو صاحب کے اداریے کا ایک جملہ یہ بھی تھا کہ :

"یہ سارے خطوط صحیح متن اور مفید حواشی کے ساتھ جلد شائع کر دینے چاہئیں۔"

اے بسا آرزو .....

"احوالِ غالب" کا دوسرا ایڈیشن، ڈاکٹر مختار الدین احمد کے دیباچے کے ساتھ انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا ہے۔ طبع دوم کا دیباچہ ان سطور پر تمام ہوتا ہے :

"جن امور کی طرف میں نے طبع اوّل کے دیباچے میں اشارہ کیا ہے ان میں سے بعض پر کام کی اب بھی ضرورت ہے۔"

[۶]

گنجینۂ غالب

مرتبہ: ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو

"گنجینۂ غالب" زیر ترتیب ہے۔ اس میں غالب کے غیر مطبوعہ اور اشعار ہونگے ..... اس کے علاوہ، اس بات کے بھی انتظامات کیے جا رہے ہیں کہ چند نایاب رسالے بھی ایڈٹ کر کے شائع کیے جائیں۔ اس مجموعے میں سارے مشاہیر اہلِ قلم نے حصّہ لیا ہے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعہ، غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بڑا عجیب اور دلچسپ تحفہ ہوگا۔"

(ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، تمہید: احوال غالب ۱۹۵۳ء، ص ۵
طبع دوم ۱۹۸۶ء، ص ۱۲)

"گنجینۂ غالب ــــ میں بہت سے غیر مطبوعہ خطوط اور غیر مطبوعہ اشعار کے علاوہ، غالب کی بعض نادر تصانیف شائع ہوں گی۔"

(رشید احمد صدیقی، احوالِ غالب، ۱۹۵۳ء، صفحہ ۹، طبع دوم ۱۹۸۶ء، ص ۱۷)

"گنجینۂ غالب" کی نوید پر بھی اب پینتیس برس گزر چکے۔ مالک رام کی کتاب ذکرِ غالب" (طبع سوم، ذیلی حاشیہ صفحہ ۱۵۷) کے علاوہ اس کا ذکرِ خیر بعض خطوں میں بھی آیا ہے مثلاً: نقوش، لاہور، خطوط نمبر ۱۹۶۸ء، جلد ۲، صفحہ ۲۰۱ و ۲۰۷ لیکن یہ "گنجینہ" ابھی عام نہیں ہوا۔

مختار الدین احمد نے اپنے ایک مضمون "آثارِ غالب" میں "علی گڑھ میں غالب کی تحریرات و تصاویر اور دوسرے نوادر" کا تعارف کرایا ہے لیکن اپنے موعودہ و مجوزہ مجموعوں "نوادرِ غالب" اور "گنجینۂ غالب" کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ ان کا کیا ہوا، یا ان کی ترتیب و اشاعت کے بارے وہ اب کیا کر رہے ہیں۔

لہ علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳۵-۴۵

[۷]

مکتوباتِ غالب و مجروح (اردو)

مرتبہ : میر افضل علی، عرف میرن صاحب، ماقبل ۱۸۶۹ء
خطی نسخہ مملوکہ : آفاق حسین آفاق دہلوی

"مرزا غالب کے خطوط کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ (ان) کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس سب کا اعادہ کرنا یہاں مقصود نہیں، بلکہ منشا اس مراسلت کی جانب توجہ مرکوز کرانا ہے، جو غالب اور ان کے عزیز ترین شاگرد میر مہدی مجروح کے درمیان ہوئی..... مرزا غالب اور میر مہدی مجروح کی یہ مراسلت ہمارے تمدن کا عزیز سرمایہ اور پچھلی نسل کی امانت ہے جس کے تصرف و تملک کا شرف مجھے حاصل رہا۔ اسے غالباً میر مہدی مجروح کے ایما پر میر افضل علی عرف میرن صاحب نے ترتیب دیا تھا۔

اس مجموعے میں غالب و مجروح کی مراسلت کے علاوہ مرزا کے دیگر خطوط بھی ہیں جن میں ایک نواب یوسف علی خان والئ رامپور، ایک آغا محمد حسین، مالک مطبع حسنی، ایک مولانا محمد علی مرحوم کے والد علی بخش خاں نجیب آبادی اور ایک میرن صاحب کے نام ہے۔

مجروح کے خطوط مرزا غالب کے علاوہ میرن صاحب، نواب خاقان حسین خان عرف لکھنوی اور نواب فرخ مرزا رئیس لوہارو کے نام ہیں۔ ان کے خطوط کی تعداد نسبتاً کم ہے۔

خطوط کے اس مجموعے میں مرزا غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں بھی شامل ہیں۔ اس لیے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اسے مرزا غالب کی زندگی ہی میں ترتیب دیا گیا۔ خطوط کی ترتیب میں یہ بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ پہلے خط، پھر اس کا جواب اور اس کے بعد جواب الجواب ہو۔ لیکن اکثر مقامات پر خطوط کو صرف یک جا کر دیا گیا ہے۔ مجروح نے اپنے کسی خط پر تاریخِ تحریر درج نہیں کی۔ اس لیے ان کے خطوط کی تاریخِ نگارش

کا تعین مرزا کے خطوط کی روشنی ہی میں کرنا پڑا، لیکن اس طرح مرزا کے دیگر خطوط کی تاریخی تدوین میں بھی مدد ملی۔

مجھے خود احساس ہے اس مجموعے کو جسے میں نے "مکتوباتِ غالبؔ مجروح" کا نام دیا ہے، مناسب مقدمہ و حواشی کے ساتھ جلد از جلد شائع ہو جانا چاہیے۔ اس سے مرزا کے بہت سے خطوط کی تاریخی تدوین میں مدد ملے گی، بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے اور مرزا کی عادات پر مزید روشنی پڑے گی۔

میر مہدی مجروح کی یہ تصنیف، کب تک منظرِ عام پر آ سکے گی، اس کا خود مجھے علم نہیں، یہ مستقبل کی بات ہے۔"

(ڈاکٹر آفاق حسین آفاق، ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۶۔۱۸)

افسوس کہ یہ مجموعۂ مکاتیب جسے آفاق صاحب نے "مجروح کی تصنیف" بتایا ہے " بشارت" کے ایک تہائی صدی گزر جانے پر بھی منظرِ عام پر نہیں آ پایا۔۔۔ "ماہِ نو" (محولہ بالا) میں صفحہ ۱۶، ۱۷ کے درمیان غالب کے نام میر مہدی مجروح کے ایک خط کا عکس پیش کیا گیا ہے جسے غیر مطبوعہ بتایا گیا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ مجروح کا یہ خط، کچھ اور خطوں کے بشمول "غالب و مجروح کی مکاتبت" کے عنوان سے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ضروری تمہیدی کلمات کے ساتھ رسالہ الناظر، لکھنؤ، جلد ۱۰، نمبر ۵۹ شمارہ یکم مئی ۱۹۱۴ء میں شائع ہو چکا ہے تفصیل کے لیے دیکھیے: تحقیقِ غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، کراچی ۱۹۸۱ء، ص ۱۷۷-۱۹۹

[۸]

خطوطِ غالب: جلد دوم

ابتدائی ترتیب: مہیش پرشاد

ترتیبِ جدید: مالک رام

"ابھی (غالب کے) خطوط کی خاصی تعداد غیر مطبوعہ ہے۔ منشی مہیش پرشاد کے

پاس معقول ذخیرہ تھا۔ انھوں نے تمام خطوط کو اہتمام کے ساتھ مرتب کرکے چھاپنا شروع کیا تھا، خطوط کی پہلی جلد ۱۹۴۱ء میں ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد کی طرف سے شائع ہوئی[1]۔ انھوں نے اپنے اس مجموعے میں تمام وہ خطوط جو "اردوئے معلّٰی" اور "عودِ ہندی" اور "مکاتیبِ غالب" میں شائع ہو چکے ہیں یا اور بھی جن تک ان کی دسترس ہو سکی، شامل کرلیے تھے۔

اس کی دوسری جلد، شائع نہیں ہوئی تھی کہ ۱۹۵۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انجمن نے پہلی جلد دوبارہ شائع کی[2]۔ اس جلد میں "نادراتِ غالب" والے خطوط بھی شامل ہیں۔ خطوط کی دوسری جلد بھی شائع ہونے والی ہے، اس میں بہت سے خطوط نئے ہیں ...۔"

(مالک رام، فروغِ اردو، لکھنؤ، غالب نمبر، نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء، ۸: ۷۹)

"خطوطِ غالب" کی مذکورہ دوسری جلد، ابھی منظرِ عام پر نہیں آئی۔

[۹]

بخطِ غالب

مرتبہ : اکبر علی خاں، عرشی زادہ

"یوں تو غالب کی تمام تحریریں ہمیں عزیز ہیں، لیکن، اگر وہ خود غالب کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی اصل تحریریں ہوں، یعنی جن پر "بقلمِ خود" کا اطلاق ہو سکتا ہو تو ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایسی بہت سی تحریریں، ادھر ادھر کتاب خانوں میں بکھری پڑی ہیں، کچھ تحریروں کے عکس، کتابی صورت میں شائع کیے جا رہے ہیں، گویا اس کتاب کی ہر ہر سطر "بخطِ غالب" ہو گی ...۔"

(نگار، رامپور، جنوری ۱۹۶۲ء)

---

[1] بنظرِ ثانی : ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مطبوعہ، سٹی پریس، الٰہ آباد، ۱۹۴۱ء

[2] ترتیبِ نو: مالک رام، تعارف: آلِ احمد سرور، ضخامت: ۴۴۸ صفحات، سائز ۱۸x۲۲/۸
مطبوعہ : انجمن ترقیٔ اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء

"غالب سے دلچسپی رکھنے والے حلقے بخوبی واقف ہیں کہ تقریباً ۱۹۵۹ء سے میں غالب کی اصل تحریروں کے عکس جمع کر رہا ہوں اور انہیں "بخطِ غالب" عنوان سے دیباچے اور ضروری حواشی کے ساتھ ایک البم کی شکل میں مرتّب اور شائع کرنا چاہتا ہوں ...... میرے پاس غالب کی سینکڑوں اصل تحریروں کے عکس موجود ہیں مستقبل قریب میں ان کی اشاعت کا سامان متوقع نہیں ہے"

(ڈاکٹر علی خاں عرشی زادہ، نقوش، لاہور، شمارہ ۱۳۴، دسمبر ۱۹۸۶ء، ص ۹۴)

نواں باب

مُعدوم تصانیفِ غالب :

اُردو / فارسی : نظم و نثر

(الف) مُستقل :

۱ - میخانۂ آرزو سرانجام ، ۱۸۳۵ء

۲ - رسالہ درآئینِ پیچپائے بانک ، ۱۸۴۵ء

۳ - اُردو قصّہ کہانی کی کتاب ، ۱۸۵۸ء

۴ - اُردو زبان کے ظہور کا حال ، ۱۸۶۵-۶۶ء

۵ - ناتمام اُردو قصّہ ، فروری ۱۸۶۹ء

(ب) مُتفرق :

۶ - سنینِ فارسیہ کا حال ، ۱۸۶۰ء

۷ - سولہ شعراء کے تراجم ، ۱۸۶۴ء

"بارہ برس کی عمر سے نظم و نثر میں کاغذ مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں باسٹھ برس کی عمر ہوئی، پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے۔"

[— اسد اللہ: نگاشتۂ بست و سوم فروری ۱۸۵۷ء]

قدر بلگرامی کے نام، اس خط کے لکھے جانے کے بعد، غالب بارہ برس اور جیے اور یہ زمانہ بھی شیوۂ قدیم کی ورزش میں گزرا۔ ساٹھ برس سے متجاوز اپنی ادبی زندگی کے طویل دور میں اُنھوں نے بہت کچھ لکھا، طبیعت کی اُپج سے بھی اور فرمائش پر بھی۔ اُردو میں بھی لکھا اور فارسی میں بھی، بہ صورتِ نظم بھی اور بہ پیرایۂ نثر بھی۔

آج، کہ جب آلِ احمد سرور کے بقول غالب کی تحریر کا ایک ایک لفظ اہلِ نظر کی آنکھ کا سرمہ ہے، یہ جان کر بے حد ملال ہوتا ہے کہ غالب کی بعض تصنیفات و نگارشات اب تک پردۂ خفا میں ہیں۔ یہاں، غالب کی کچھ ایسی ہی تحریروں کا "ماتم" مقصود ہے، جن کا جہاں تہاں محض ذکر ملتا ہے لیکن جو تا حال دستیاب نہیں ہو سکی ہیں:

[۱]

میخانۂ آرزو سر انجام

سالِ ترتیب، ۱۸۳۵ء

نواب الٰہی بخش خاں معروف کے صاحبزادے یعنی غالب کے برادرِ نسبتی

میرزا علی بخش رنجور[۱] نے "پنج آہنگ" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے عم مرحوم فخرالدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر کے خلفِ اکبر نواب شمس الدین کے قضائے آسمانی کا شکار ہونے کے بعد ۱۲۵۱ھ کے آغاز میں جے پور سے دہلی پہنچے اور غالب سے ملے۔ انہی ایام (۱۸۳۵ء) میں غالب کا دیوان بعنوان "میخانۂ آرزو سرانجام" تازہ فراہم ہوا تھا۔ اس میں کی نثر کو رنجور نے غالب سے سبقاً پڑھا تو اُن کے دل میں خیال آیا کہ دیوان سے "ہمگی نثر" یک جا کریں لیکن ایک عرصے تک ہجومِ افکار اور وفورِ آلام کے ہاتھوں فرصت میسّر نہ آئی ، یہاں تک کہ . . . .

میرزا علی بخش کے لفظ یہ ہیں :

"در آغازِ سالِ یک ہزار و دو صد و پنجاہ و یک ہجری شمس الدین خان را بقضائے آسمانی آن پیش آمد کہ ہیچ آفریدہ مبیناد و آن خود از غایت شہرت بشرح احتیاج ندارد و بعدِ آن ہنگامہ ہم دران ہنگام از جے پور بہ دہلی رسیدم و بکاشانۂ برادرِ والاشان و آموزگارِ مہربان غالب زاد افضالہ فرود آمدم۔

چون دران ایام دیوانِ فیض عنوان کہ مسمّٰی بہ میخانۂ آرزو سرانجام است تازہ فراہم آمدہ و پیرایۂ اتمام پوشیدہ بود، آنچہ از نثر دران ہمایون

۱؎ میرزا علی بخش ایک طرف غالب کے حقیقی برادرِ نسبتی تھے۔ دوسری طرف اُن کی شادی غالب کی بھانجی (بی) خانم سے ہوئی تھی۔ میرزا علی بخش نے "پنج آہنگ" کے دیباچے میں اس دو آتشہ قرابت کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے :

"درمیان این نحیف (رنجور) و آن سخنور یکتا (برادرِ قدسی اثر جناب اسداللہ خان متخلص بہ غالب) از دو سو پیوندِ قرابت استوار است و محبت و مودت کہ غازۂ رخسارۂ قرابت ہمان تواند بود بسیار است ۔"

صحیفہ صورتِ ارقام داشت، ہمہ را بخدمتِ والاے آن خسروِ اقلیمِ خسروی خواندم۔ بخاطر چناں گزشت کہ ہگی نثر از دیوان برچیدہ یکجا کنم ..... از ہجومِ افکار و وفورِ آلام فرصت میسر نمی آمد تا آنکہ ..."

رنجور کے اس بیان میں غالب کے جس دیوان بعنوان "میخانۂ آرزو سرانجام" کا ذکر آیا ہے، وہ اب معدوم ہے۔ رنجور کا کہنا ہے کہ ۱۲۵۱ ہجری کے آغاز میں نواب شمس الدین خاں کے قضائے آسمانی کا شکار ہونے کے بعد وہ جب پورے غالب کے ہاں دہلی پہنچے تو یہ دیوان تازہ فراہم ہوا تھا۔

اس بیان کی روشنی میں اس معدوم دیوان کے زمانۂ ترتیب کے بارے میں کچھ باتیں کہی جاسکتی ہیں — ایک بات جو قطعی یقینی ہے، یہ کہ زیرِ بحث دیوان ۱۸۳۵ء میں مرتب ہوا — اور دوسری بات یہ کہ اس کی ترتیب ۱۸۳۵ء میں اپریل اور اکتوبر کے زمانے میں کسی وقت عمل میں آئی۔

سالِ ترتیب اس لیے یقینی ہے کہ ۱۲۵۱ ہجری مطابق ہے ۱۸۳۵ء کے — اپریل سے اکتوبر تک کا قرینہ کچھ تفصیل چاہتا ہے — پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھنے کی ہے کہ ۱۲۵۱ ہجری کا آغاز مطابق ہے ۲۹۔اپریل ۱۸۳۵ء کے — "اکتوبر" کی حد نواب شمس الدین کے قضائے آسمانی کا شکار ہونے سے وابستہ ہے، جس کا قصہ یہ ہے کہ اُن دنوں ولیم فریزر (WILLIAM FRASER) دہلی کے کمشنر تھے جو ۲۲۔مارچ ۱۸۳۵ء کی شام چھ اور سات بجے کے درمیان قتل ہوئے[1] اور بوجوہ نواب شمس الدین احمد خاں اس قتل میں ماخوذ ہو کر ۸۔اکتوبر ۱۸۳۵ء کو پھانسی پاگئے۔[2] میرزا علی بخش، نواب شمس الدین احمد خاں کے قضائے آسمانی کا شکار ہونے کے بعد

---

1. MURDER OF COMMISSIONER FRASER — DELHI, 1835. BLACK WOOD'S EDINBURGH MAGAZINE, VOL. CXXIII, No. DCCXLVII, JANUARY 1875, PP. 32.

۲۔ ذکرِ غالب، مالک رام، طبع پنجم، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، فروری ۱۹۷۶ء، ص ۵۳

جے پور سے دہلی پہنچے اور غالب کا تازہ فراہم دیوان "میخانۂ آرزو سرانجام" دیکھا ـــــ قضائے آسمانی کا شکار ہونے سے" میرزا علی بخش کی مراد نواب شمس الدین کے مقدمۂ قتل میں ملوث و ماخوذ ہونے سے ہے، تو یہ اپریل ۱۸۳۵ء کی بات ہے اور اگر قضائے آسمانی کا شکار ہونے" سے اُن کی مراد نواب شمس الدین کے پھانسی پا جانے سے ہے تو یہ ۸. اکتوبر ۱۸۳۵ء کا سانحہ ہے ـــــ حاصلِ کلام یہ کہ" میخانۂ آرزو سرانجام" کا زمانۂ ترتیب ۱۸۳۵ء میں اپریل یا اکتوبر کے پس و پیش قرار پاتا ہے۔

لیکن افسوس ـــــ کہ "میخانۂ آرزو سرانجام" کے نام یا عنوان سے غالب کا کوئی مجموعہ اب دستیاب نہیں ـــــ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ :

" غالب نے اپنے کلیاتِ نظم فارسی کا نام" میخانۂ آرزو سرانجام، رکھا تھا، لیکن اس کا کوئی ایسا نسخہ نہیں ملتا جس میں یہ نام مرقوم ہو۔ علی بخش خاں دیباچہ نگار" پنج آہنگ" کا قول ہے کہ شمس الدین خاں کے ، اوائل ۱۲۵۱ھ میں پھانسی پانے کے کچھ ہی بعد وہ جے پور سے دہلی واپس گئے تو اس زمانے میں تازہ تازہ فراہم" ہوا تھا۔ یہ نسخہ جو اُن کے پیشِ نظر رہا تھا، اب نا پید ہے"

[اردوئے معلّٰی، دہلی، فروری ۱۹۶۰ء، ص۳۰]

مسلم ضیائی کا کہنا یہ ہے کہ :

" غالب کی بیدل پسند اور جدّت طراز طبیعت سے بعید نہیں کہ اُنھوں نے اپنے اوّلین مجموعہ نظم و نثر کا نام" میخانۂ آرزو سرانجام" رکھا ہو ـــ لیکن ابھی تک اُن کا کوئی ایسا مجموعہ دستیاب نہیں ہوا جس پہ یہ نام لکھا ہو۔ "

[اُردو، کراچی، جنوری ۱۹۶۸ء، ص۱۱۵]

سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے میرزا علی بخش کے حوالے سے" میخانۂ آرزو سرانجام" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"یہ دیوان یا کسی دیوان پر یہ نام ابھی تک دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا۔
میرے خیال میں شاید اس نام کی حیثیت "پر توستان" جیسی ہے، یعنی دیوان
پر یہ عنوان نہ لکھا جا سکا۔"

[پیش گفت : دیوانِ غالب فارسی، لاہور، جون ۱۹۶۷ء، جلد ا، ص۱۳]

"میخانۂ آرزو سرانجام" کو قاضی عبدالودود نے "کلیاتِ نظمِ فارسی" اور مسلم ضیائی نے "اولین مجموعۂ نظم و نثر" بتایا ہے۔ فاضل لکھنوی "دیوان" کے اس نام کو محض ہوائی ٹھہراتے ہیں — یہ بہر حال طے ہے کہ "میخانۂ آرزو سرانجام" اب معدوم ہے۔

[۲]

رسالہ در آئینِ پیچپائے بانک

زمانۂ تالیف : ما قبل ۱۰ - مارچ ۱۸۴۵ء

غالب کے مجموعۂ نظم و نثر فارسی "باغِ دودر" (مرتبہ : سید وزیر الحسن عابدی) سے ایک بڑی نادر اطلاع یہ ملتی ہے کہ غالب نے بانک کے داؤ پیچ پر بھی ایک مختصر کتاب تالیف کی! یہ ایک اُردو رسالے کا فارسی ترجمہ ہے جسے غالب نے ٹونک کے نواب وزیر محمد خاں کی خوشنودیِ مزاج کے خیال سے ترتیب دیا۔

یہ رسالہ تا حال دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔ اس نشاندہی اور اطلاع کا واحد ماخذ "باغِ دودر" میں شامل غالب کا ایک خط ہے جو اگست ۱۹۶۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اور ایک اندازے کے مطابق ۱۸۴۵ء کی پہلی سہ ماہی میں کسی وقت لکھا گیا۔

"باغِ دودر" کے دوسرے حصّے "منثورات" میں مختلف اصحاب کے نام غالب کے ساٹھ خط شامل ہیں۔ چوبیسویں خط میں جو تفضّل حسین خاں خیرآبادی کے نام ہے غالب نے اپنی اس تالیف کا ذکر ان کلمات میں کیا ہے :

"...... اغلب کہ حضرت نیز زود نہ دیر از آگرہ بہ ٹونک رہگرای شوند و چون بدان خجستہ منزل رسند، این نامہ کہ بتحویل طالع یارخاں[1] است از نظر گذرد۔ نہفتہ ماناد کہ این بار طالع یار خاں کہ دوستِ دیرینۂ منست بارگرانی بر دوش من نہاد۔ بپارسی ترجمہ کردن بندی عبارتی را کہ بر گزارش آئین سپہائے بانک مشتمل بود از من خواست و سرانجام این خدمت را ذریعہ خوشنودی خاطر خطیر حضرت نواب معلی القاب عالی جناب وانمود۔ چون زلہ خوار خوان جود آن والاجاہ بودم و سپاس میبایست گزارد۔ توسن خامہ را دران گزرگاہ تنگ بجولان آوردم و سفینہ کہ دیباچہ و خاتمہ نیز دارد ترتیب دادہ بہ کار فرما سپردم و عرضداشتی بران افزودم تا روایی آرزوی ورود توقیع را بہانہ تواند بود۔

داد خوبی عنوان دیباچہ از شما اوّلاً و از مطاعی و مخدومی حضرت مولوی ظہور الدین علی دامت برکاتہ، ثانیاً می خواہم کہ تا بنگرند و دریابند کہ ممدوح را دران دیباچہ بکدامی زبان و در ستائش فن بانک کہ حقیقت آن پیداست کہ چیست، سخن را بکدام پایہ بردہ ام: با این ہمہ چہ در دیباچہ و چہ در جریدہ نوی طرزِ نگارش و نوآئینی ہنجار گزارش از دست نرفتہ و گفتار ہم چنان بر روش خاصہ خویش برجای ماندہ است۔ با این ہمہ کہ گفتم دانم کہ نازش من در سحر طرازی آن زمان رواست و داد جانگدازی

---

[1] طالع یار خاں کے کوائف میں: دیکھیے سید جمیل الدین احمد کا مضمون مطبوعہ: نوائے ادب بمبئی جولائی ۱۹۵۵ء

خویش آں وقت یافتہ باشم کہ بندگانِ رفیع الشان نواب سلطان نشان گفتارِ مرا پسندند"

[باغِ دودر، طبعِ ثانی، لاہور، جولائی ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۵-۱۴۰]

تحقیق نامۂ "باغِ دودر" میں وزیر الحسن عابدی نے اُردو میں اس فارسی عبارت کی ترجمانی پیش کی ہے، جس کا بیان نقل کر دینا بے محل اور لطف سے خالی نہ ہوگا:

"..... شاید آپ (تفضل حسین خاں خیرآبادی) بھی جلد ہی آگرے سے ٹونک روانہ ہونے والے ہوں اور وہاں پہنچ کر یہ عریضہ جو طالع یار خاں کو دے رہا ہوں، آپ کی نظر سے گزرے —— اس دفعہ طالع یار خان نے جس سے میرے دیرینہ مراسم ہیں، مجھ سے ایک بڑے مشکل کام کی فرمائش کی۔ بانک کے داؤ پیچ پر ایک مختصر ہندی (اُردو) رسالے کا فارسی میں ترجمہ کرنے کو کہا اور یہ مشورہ دیا کہ اس خدمت کی انجام دہی نواب عالی القاب (نواب صاحب، ٹونک، نواب وزیر محمد خاں) کی خوشنودیٔ مزاج کا سبب ہوگی۔ میں چونکہ ان کے خوانِ جود و کرم کا زلہ خوار ہوں اور سپاسِ نعمت مجھ پر فرض ہے، میں نے اس مشکل کام کے لیے قلم اُٹھایا اور ایک رسالہ دیباچے اور خاتمے پر مشتمل ترتیب دے کر انھیں (طالع یار خاں) کو دے دیا اور ایک عرضداشت بھی لکھ کر ساتھ کر دی تاکہ اس وسیلے سے یہ آرزو بر آئے کہ نواب صاحب کی توقیع میرے نام صادر ہو۔

دیباچے کے مضمون کی داد پہلے آپ سے اور پھر مخدومی (حضرت) مولوی ظہور الدین علی سے چاہتا ہوں کہ ممدوح کا ذکر کن الفاظ میں کیا ہے اور فنِ بانک کی تعریف کس انداز میں کی ہے اور اس کے ساتھ دیباچے اور رسالے کی عبارت میں اسلوبِ بیان کی جدت کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ بیان کا خاص

اسلوب برابر قائم رہا ہے۔ بایں ہمہ جانتا ہوں کہ اپنی جادو بیانی پر فخر اُس وقت کر سکتا ہوں اور مجھے اپنی کاوش کی داد اس وقت ملے گی کہ بندگان نواب صاحب سُلطان نشان میرے انداز کو پسند فرمائیں۔"

[تحقیق نامہ باغِ دودر، مطبوعہ لاہور، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۵۱-۵۲]

تفضل حسین خاں خیرآبادی کے نام باعتبارِ ترتیب، یہ غالب کا دوسرا خط ہے اور اس پر کوئی تاریخ ثبت نہیں۔ تفضل حسین خاں ہی کے نام "باغِ دودر" میں شامل اگلے (باعتبارِ ترتیب تیسرے) خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب ٹونک نے غالب کی اس عرضداشت کا جو رسالہ "در آئین پیچہائے بانک" کے ساتھ بھیجی گئی تھی، کوئی جواب نہیں دیا۔ غالب نے اس رویے کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور بے حد ملول ہوئے[۱]۔ اس خط پر یکم ربیع الاول ۱۲۶۱ھ کی تاریخ درج ہے جو مطابق ہوتی ہے ۱۰۔ مارچ ۱۸۴۵ء کے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بانک کے داؤ پیچ سے متعلق رسالے کے ترجمے اور ترتیب و تالیف کا کام مذکورہ تاریخ (۱۰۔ مارچ ۱۸۴۵ء) سے کچھ پہلے انجام پایا ہوگا۔

بانک کے داؤ پیچ کے فن پر غالب کا رسالہ اب معدوم ہے۔ مالک رام نے اپنے بعض احباب کے ذریعے سے ٹونک میں اس کتاب کے مسودے کی تلاش کی کوشش کی تھی لیکن انھیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی[۲]۔ عجب نہیں کہ غالب کی یہ ادبی یادگار ٹونک میں یا

---

[۱] غالب کے اس خط (مرقومہ ۱۰۔ مارچ ۱۸۴۵ء) کی برگشتگی دیدنی ہے۔ اس سے غالب کے اُفتادِ مزاج پر روشنی پڑتی ہے اور اُن کی خودنگری کی بڑی تیکھی اور منہ بولتی تصویر سامنے آتی ہے۔ خط کے اصل فارسی متن اور اُردو ترجمے کے لیے دیکھیے بالترتیب:

۱۔ باغِ دودر، مرتبہ: وزیرالحسن عابدی، ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۶-۱۲۸

۲۔ تحقیق نامہ باغِ دودر، ص ۵۲-۵۵

[۲] ذکرِ غالب، طبع پنجم، دہلی، فروری ۱۹۷۶ء، ص ۱۵۹

کہیں اور، کسی ذخیرۂ کتب میں محفوظ لیکن دبی پڑی ہو اور حسنِ اتفاق یا تلاش سے کبھی دستیاب ہو جائے۔

[۳]

قصہ کہانی کی کتاب (اردو)

فی بطنِ شاعر، بزمانہ دسمبر ۱۸۵۸ء و بعدہ

غالب کے خطوں میں ایک اور کتاب کا ذکر بھی آیا ہے، لیکن کہیں اس کا سراغ نہیں ملتا اور قیاس کہتا ہے کہ یہ لکھی نہیں گئی، محض تجویز کی حد تک ہی رہ گئی۔ غالب سے اس کی فرمائش ہنری اسٹورٹ ریڈ[۱] نے کی تھی۔ فرمائش یہ تھی کہ وہ اردو نثر میں ایک مستقل کتاب لکھ دیں۔ منشی شیو نرائن آرام کے نام ۱۱۔دسمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے اول اول اس فرمائش کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

"جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکا۔ اُن کی فرمائش ہے: اردو کی نثر...... وہ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں۔ مگر بھائی، غور کرو، اردو میں اپنے قلم کا زور کیا صَرف

---

[۱] ہنری اسٹورٹ ریڈ (ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن صوبہ شمال مغربی) کا ذکر غالب کے خطوں میں سب سے پہلے مرزا تفتہ کے نام ۲۷۔نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں آیا ہے:

"ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب ممالکِ مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے صاحب ہیں۔ امن کے دنوں میں ایک ملاقات میری ان کی ہوئی تھی۔"

گارسین دتاسی نے اپنے خطبات میں ریڈ کا ذکر اکثر کیا ہے۔ خصوصیت سے دیکھیے بارہواں خطبہ، ۲۔دسمبر ۱۸۶۱ء۔

کروں گا ؟ اور اس عبارت میں معانی نازک کیوں کر بھر دوں گا؟ ابھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں ؟ کون سی بات ؟ کون سی کہانی، کون سا مضمون تحریر کروں اور کیا تدبیر کروں ؟ تمھاری رائے میں کچھ آئے تو مجھ کو بتاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

چار روز بعد ہی، ۱۵۔ دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں، اپنے اس خط کے جواب کا تقاضا کرتے ہوئے، غالب لکھتے ہیں :

"بھائی، یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے۔ خیر، دیر سے لکھو، اگر شتاب نہیں لکھتے۔ تمھارا خط آیا، اس کے دوسرے دن میں نے جواب بھجوایا۔ آج تک تم نے اس کا جواب نہ بھیجا۔ حالانکہ اس میں جواب طلب باتیں تھیں یعنی ۔ ۔ ۔ ۔ رڈ صاحب کے باب میں، میں نے یہ لکھا تھا کہ جب کچھ اُردو کی نثر ان کے واسطے لکھ لوں گا تو "دستنبو" کی خریداری کی خواہش[1] کروں گا۔ معہذا تم سے صلاح پوچھی تھی کہ کس حکایت اور کس روایت کو فارسی سے اردو کروں۔ تم نے اس بات کا بھی جواب نہ لکھا۔"

اس یاد دہانی کے تین روز بعد، منشی شیونرائن آرام کا خط آ گیا۔ اسی روز ۱۸۔ اگست ۱۸۵۸ء کو غالب نے اس کا جواب تحریر کیا :

"برخوردار، آج اس وقت تمھارا خط ۔ ۔ ۔ آیا۔ دل خوش ہوا ۔ ۔ ۔

---

[1] شیونرائن، کہ "دستنبو" کے ناشر تھے، اس بات کی فکر میں تھے کہ کتاب پڑی نہ رہ جائے، جلد نکل جائے۔ یہاں "خریداری کی خواہش" سے مراد ہے کہ ہنری اسٹورٹ رِڈ اپنے محکمے یعنی مدارس وغیرہ کے لیے "دستنبو" کی کچھ جلدوں کی اکٹھی خریداری کا انتظام کر دیں، نہ یہ کہ وہ "اپنے لیے" ایک نسخہ خریدیں! اُن کے ذاتی ملاحظے کے لیے تو شیونرائن اور غالب دونوں، الگ الگ "دستنبو" کا ایک ایک نسخہ ہدیہ کر چکے تھے۔ دیکھیے مرزا تفتہ کے نام غالب کا خط، مرقومہ ۲۷۔ نومبر ۱۸۵۸ء

جناب ریڈ صاحب، صاحبی کرتے ہیں۔ میں اُردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں۔ تین مہینے میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے؟ بہت ہو گا کہ میرا اُردو، بہ نسبت اوروں کے اُردو کے فصیح ہو گا۔ خیر، بہر حال کچھ کروں گا اور اردو میں اپنا زورِ قلم دکھاؤں گا ۔۔۔۔۔"

مراسلت کے اس اسلوب سے یہ خیال ہوتا ہے کہ غالب سے اُردو نثر میں قصّے کہانی کی کتاب تالیف کرنے کی یہ فرمائش منشی شیو نرائن کے توسط سے بھی کی گئی ہو گی، جنھوں نے اسی زمانے میں "دستنبو" کا ایک نسخہ، اس کے چھپتے ہی 'اپنے مطبع مفید خلائق' کی طرف سے ہنری اسٹورٹ ریڈ کی نذر کیا تھا۔

کتاب اور اس کے مجوّز، ریڈ صاحب کا ذکر یا اشارہ، غالب کے ہاں' قریب بعد کے صرف ایک خط میں اور آیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اُردو نثر میں قصّے کہانی کی کتاب ترتیب دینے کا وقت نہیں نکال سکے ۔۔۔۔ یا زیادہ صحیح یہ، کہ ذہنی طور پہ وہ اس کے لیے آمادہ ہی نہ ہو پائے۔

اوائلِ جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں، وہ ضمناً ریڈ صاحب کا ذکر کرنے کے بعد منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں:

"میاں، اُردو کیا لکھوں؟ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پہ اُردو کی فرمائش ہو؟ خیر ہوئی۔ اب میں کہانیاں قصّے کہاں ڈھونڈتا پھروں؟ کتاب نام کو میرے پاس نہیں، پنسن مل جائے، حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں۔ پیٹ پڑیں روٹیاں، تو سبھی گلاں موٹیاں۔ زیادہ ۔ زیادہ ۔۔۔۔۔

روزِ سہ شنبہ، ۲۔ جنوری سنہ ۱۸۵۹ء

مابعد، اس مجوّزہ کتاب کا ذکر یا سراغ، غالب کے کسی اور خط میں نہیں ملتا۔ انھوں نے پنشن مل جانے پر، اس کتاب کی "فکر" کو موقوف رکھا تھا ۔۔۔۔ پنشن کی اجرائی، اس

ارادے کے پورے ایک سال چار ماہ بعد، بہت کھکھیڑیں اُٹھانے پر، کہیں ۴ مئی ۱۸۶۰ء کو عمل میں آسکی۔[ل] لیکن تو اس "ٹھکانے ہو جانے" اور "پیٹ پڑیں روٹیاں" والی شرط پھر بھی پوری نہ ہو پائی، اس لیے کہ پنشن کا زرِ مجتمعہ سہ سالہ، یک مشت ملنے پر وہ بہت ضروری قرض ادا کرنے کے بعد (جسے غالب نے "ادائے حقوق" کہا ہے) چار سو روپے ان کے ذمّے دینے باقی رہے، اور ان کے پاس صرف ستاسی روپے گیارہ آنے بچے[۲]..... اور یہ بھی بہت اگر جھگڑ کر انہیں بچے، ورنہ ان کا قرض خواہ اور مختارِ کار خزانے سے روپیہ لے آیا تھا اور اپنا حساب صاف کرائے بغیر، اس کی ہوا تک دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسی زمانے میں مجروح کو لکھتے ہیں :

> "..... خزانے سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی، پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آگئی۔ دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا، ایسا ہی رہوں گا.....[۳]"

اور ایسے میں اُردو نثر لکھنے کی، برس ڈیڑھ برس پہلے کی فرمائش کا انجام معلوم! اور پھر خصوصیت سے ایسی فرمائش جسے وہ اپنے "منصب" سے ویسے ہی فروتر خیال کرتے تھے۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں "منتخباتِ اُردو" کے نام سے مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۶۱ء کی چھپی ہوئی ایک کتاب موجود ہے جس کے سرورق کی عبارت یہ ہے :

"منتخباتِ اُردو..... یونیورسٹی کے داخلے کے امتحان کے واسطے

[ل] خطوطِ غالب، مرتبہ، مالک رام ۱۹۶۲ء، صفحہ ۷۲

[۲] خطوطِ غالب، مالک رام، صفحہ ۳۰۱

[۳] ایضاً، صفحہ ۳۱۵

کلکتہ یونیورسٹی کے جناب وائس چانسلر صاحب بہادر اور صاحبانِ سنڈیکیٹ کے ارشاد کے مطابق بہدایت اور اعانت جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب بہادر ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک مغربی کے، مولوی محمد کریم بخش میر منشی محکمۂ مذکور نے تالیف کی[۱]......"

قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ریڈ صاحب نے غالب سے اسی نصابی کتاب کی تالیف یا اس کے لیے کسی ایک قصے کی تصنیف کی فرمائش کی ہو گی۔

[۴]

اُردو زبان کے ظہور کا حال

زمانۂ تالیف: ۱۲۸۲ھ، ۶۶-۱۸۶۵ء

غالب کے عزیز دوست صاحب عالم مارہروی (۱۷۹۹ء - ۱۸۷۱ء) کے نواسے صفیر بلگرامی[۲] ۱۲۸۰ھ - ۱۸۶۴ء میں مرزا غالب کے شاگرد ہوئے اور دو سال بعد

---

[۱] مؤلف مولوی محمد کریم بخش میر منشی محکمۂ مذکور کے بارے میں معلومات کے لیے رجوع کیجیے مقالہ از ملک احمد نواز مطبوعہ: قومی زبان، کراچی، جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۱۸ - ۲۲

[۲] صفیر بلگرامی، سید فرزند احمد: ۹ - اپریل ۱۸۳۴ء (۲۸ - ذی قعدہ ۱۲۴۹ھ) کو اپنی ننھیال مارہرہ (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے۔ نظم و نثر پر یکساں حاوی تھے۔ متعدد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصنیفات ان کی یادگار ہیں، جن میں تذکرۂ "جلوۂ خضر" اور دس جلدوں میں "بوستانِ خیال" کا اُردو ترجمہ بہت مشہور ہیں۔ اُردو کے آٹھ دیوان تھے، دو زندگی میں چھپ گئے تھے، تین دیوان فارسی کے تھے، چار فارسی کی مثنویاں اور چھبیس اُردو کی۔ قصائد، رباعیات، قطعات اور واسوختوں کے مجموعے ان کے علاوہ ہیں۔ بروز دوشنبہ، ۱۱ - مئی ۱۸۹۰ء (۲۱ - رمضان ۱۳۰۷ھ) کی دوپہر کو پٹنہ میں انتقال کیا اور آرہ میں مدفون ہوئے۔

(مالک رام، تلامذہ غالب، ۱۹۵۷ء، ص ۱۹۳ - ۱۹۵)

مئی ۱۸۶۶ء میں ایک طویل سفر کر کے مرزا غالب کی خدمت میں پہنچے اور بہت دن تک ان کے پاس مقیم رہے۔ صفیر بلگرامی نے اپنی ملاقات کا حال "جلوۂ خضر" میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس روداد سے غالب کی ایک تصنیف اُردو زبان کی ابتدا اور اس کے نشو و نما کی مختصر تاریخ کی نشاندہی ہوتی ہے:

"...... مجھ سے اور حضرت غالب علیہ الرحمۃ سے ایک مرتبہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی اور سبب اس کا یہ ہوا کہ ان دنوں اپنے ایک رسالے کا مسودہ اردو زبان کی تحقیق میں کاتب سے لکھوا رہے تھے، جو میں نے اس کے صاف شدہ اجزاء ہاتھ میں لے لیے۔ حضرت نے دیکھ کر فرمایا، ہاں اس کو دیکھو، یہ ایک چیز میں نے ان دنوں بہ فرمائش ڈائرکٹر[۱] صاحب لکھی ہے۔ اس میں اردو شاعری کی مختصر تاریخ اور کچھ قواعد تھے۔ کوئی پانچ چھ جزو کا رسالہ تھا۔ جناب ڈائرکٹر صاحب نے مؤلف (جلوۂ خضر، صفیر بلگرامی) کے نانا حضرت صاحب عالم کو بھی خط لکھا[۲] تھا کہ

[۱] مُراد ڈائرکٹر میتھیو کیمپسن سے ہے جو علم دوست شخص تھے۔ اُردو اور فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے "فسانۂ مبتلا" کے دیباچے (اگست ۱۸۸۵ء) میں کیمپسن کی معارف پروری کی ستائش کی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے "توبۃ النصوح" ایڈیشن ۱۸۸۶ء کے سرورق کے حوالے سے ایک موقع پر لکھا ہے کہ کیمپسن ۱۸۶۲ء سے ۱۸۷۸ء تک ڈائرکٹر تعلیمات کے عہدے پر فائز رہے (صحیفہ، لاہور، شمارہ ۵۱، اپریل ۱۹۷۰ء، ص ۱۱) — لیکن ایک مُقدّم اور معاصر اطلاع کے مطابق کیمپسن وسط مارچ ۱۸۶۷ء میں رُخصت فرلو پر تشریف لے گئے اور آر۔ ٹی۔ ایچ۔ گریفیتھ (R.T.H. Griffith) نے عہدۂ ڈائرکٹری سررشتہ تعلیم اضلاع شمال و مغرب کا چارج لے لیا۔ دیکھیے، "اخبار سینٹیفک سوسئٹی علی گڑھ" جلد ۲، نمبر ۱۹، جمعہ، ۱۵ مارچ ۱۸۶۷ء، ص ۱۵۵۔

[۲] ڈائرکٹر ایم۔ کیمپسن کا اصل خط ڈاکٹر مختار الدین احمد نے احسن مارہروی کے اخلاف کے یہاں دیکھا اور اسے اپنی تالیف "احوالِ غالب" (۱۹۵۳ء) میں نقل کر دیا ہے (ص ۷۵-۷۶)۔ اس خط سے بعض متعلقہ امور پر روشنی پڑتی ہے اور قیاس غالب ہے کہ مرزا غالب کو بھی اسی خط کی نقل بھیجی گئی ہوگی۔ اس لیے یہاں پورا خط درج کیا جاتا ہے:

(بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

زبانِ اُردو کی تاریخ اور قواعد میں کوئی کتاب لکھ کر بھیج دیجئے۔ چنانچہ حضرت نے اس کا اہتمام میرے سپرد کیا تھا، مگر میں نے اس کا مسودہ درست کر کے بھیج دیا تھا۔ پھر خدا جانے کیا ہوا۔ اس طرح حضرت غالب کو بھی لکھا تھا۔ وہ اسی رسالے کو لکھوا رہے تھے۔ الغرض اسی رسالے کے پڑھنے میں کچھ دہلی و لکھنؤ کی زبان کا ذکر آگیا......" [صفیر بلگرامی "جلوۂ خضر" مطبوعہ نورالانوار، آرہ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء حصہ اوّل، ص ۲۳۵-۲۳۶ در ذکرِ مومن]

(گزشتہ صفحے سے پیوستہ)

عنایت فرمائے دوستاں سید صاحب عالم معانی دارد ، زاد عنایتکم

بعد اظہارِ شوق و مراسمِ عرفیہ کے واضح باشد محبت پیراشے ہو، چونکہ اکثر اوصافِ جمیلہ و محامدِ جلیلہ آپ کی درباب واقفیتِ تاریخ و زباندانی و دیگر فضائل و کمال کے گوش زد ایں جانب ہوئے، اس لیے آپ کو بہ پاسِ دوستانہ اس امر کی تکلیف دی جاتی ہے کہ اگر آپ کو حال مفصل ایجاد زبانِ اُردو معلوم ہو تو اس کی کیفیت تحریر کر کے مجھے ممنون کیجئے اور اس تحقیقات سے وہ دریافت حال زبانِ مسطورہ مطلوب ہے کہ جس سے حال زمانۂ ابتدائے اجرائے اُردو اور نیز تصریح اس امر کی کہ کس عہد سے زبانِ مذکور داخلِ نوشت و خواند اہلِ ہند ہوئی، معلوم ہو جائے اور کن کن استادوں نے زبانِ مذکور میں ابتدا شعر و سخن یا نثر کے مضامین لکھنے شروع کیے اور کتنے محاوراتِ قدیمہ اب تبدیل ہو گئے، اور اس تبدیلی سے اس زبان میں آیا شستگی و رفتگی آئی یا کسی طرح کا نقص پیدا ہوا اور اگر کلام ان اساتذۂ قدیم کے یاد ہوں یا کسی تذکرے میں آپ کی نظر سے گزرے ہوں تو بطور مشتے نمونہ از خروارے، مسلک تحریر فرما کر ممنون کریں اور جو کوئی کتاب حاوی ان امور کی مل سکے اس کو بطور عاریت یا بہ قیمت جیسا مناسب ہو (عطا) فرمائیں، نہایت موجبِ احسان مندی ہوگا — اور چوں کہ جس کتاب کا ایں جانب کو قصدِ تالیف ہے اور جس کی امداد کے لیے آپ کو تکلیف دی گئی ہے، اس میں حال شعراء وغیرہ کا بقیدِ نام و مسکن و زمانہ لکھا جائے گا، آپ جو کیفیت ان اُستادوں کی تحریر فرمائیں تو اس میں امورِ صدر کا ضرور لحاظ رہے۔ فقط

المرقوم ۶؍ جون ۱۸۶۶ء
کیمپ، کوہ منصوری

رقیمۃ الشوق
ایم۔ کیمسن

خود غالب کے ایک خط بنام خواجہ غلام غوث بے خبر سے اس کی توثیق ہوتی ہے کہ غالب نے ڈائرکٹر تعلیمات میتھیو کیمپسن کی فرمائش پر اُردو زبان کے ظہور کا حال لکھا تھا۔ دوشنبہ، ۲۳۔ جولائی ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں غالب لکھتے ہیں :

"جناب کیمسن صاحب بہادر افسر مدارس غرب وشمال کا باوجود عدم تعارف، خط مجھ کو آیا۔ کچھ اُردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا، اس کا جواب لکھ بھیجا نظم ونثر اُردو طلب کی تھی مجموعۂ نظم بھیج دیا، نثر کے باب میں ..... لکھا کہ ..... مجموعہ چھاپا جاتا ہے۔ بعد انطباع وحصولِ اطلاع ..... منگا کر بھیج دوں گا ....."

لیکن ڈاکٹر مختارالدین احمد کا خیال ہے کہ :

"غالب نے اُردو زبان کی تحقیق میں کوئی رسالہ پانچ چھ جزو کا لکھا تھا، یہ محلِ نظر ہے۔ صفیر کے علاوہ اس رسالے کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔ خود غالب کی تحریروں میں اس کا پتا نہیں۔ اس قدر اہم موضوع پر اُن کی کوئی تصنیف ہوتی تو اور معاصرین بھی اس کا ذکر ضرور کرتے اور وہ کتاب اس قدر جلد فنا بھی نہ ہو جاتی۔ خود غالب کے ایک خط (مذکورالصدر) بنام خواجہ غلام غوث بے خبر سے اس کے خلاف مترشح ہوتا ہے ــــ قابلِ غور امر یہ ہے کہ غالب کسی کتاب کی تصنیف کا ذکر نہیں کرتے : "خط مجھ کو آیا ..... اس کا جواب لکھ بھیجا" سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بس اس کے جواب میں ایک خط لکھ دیا۔ ممکن ہے وہ خط کچھ طویل ہو، لیکن پوری کتاب لکھی ہو، یہ قرینِ قیاس نہیں۔" [احوالِ غالب، صفحہ ۴۲ بہ بعد]

غالب کے خط سے "صاف" تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ "بس" کیمپسن کے "جواب میں ایک خط لکھ دیا" ہو۔ کیمپسن کے استفسار تفصیل طلب تھے، ان کے جواب "پانچ چھ جزو" کم میں سما بھی کیا سکتے تھے۔ غالب نے بالصراحت اگر مذکورہ خط میں "کتاب یا رسالے"

کا لفظ استعمال نہیں کیا، تو اس کے لازماً یہ معنی نہیں کہ انھوں نے اس موضوع پر استفسارات کے جواب کی فرمائش میں، کوئی کتاب یا رسالہ تصنیف بھی نہ کیا ہو، الآیہ کہ واقعی خارجاً کسی معتبر ذریعے سے اس کی تردید ہوتی ہو۔ اس کا بارِ ثبوت ابھی باقی ہے، جبکہ اس کے بالعکس ایک معاصر عینی شہادت موجود ہے۔ اس لیے یہ نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں کہ غالب نے اُردو زبان کی ابتدا اور اس کی نشو و نما کی مختصر تاریخ مع اضافہ قواعد اُردو لکھی، وہ کہیں نہ کہیں ضرور پڑی ہوگی، اگر دستِ بُردِ زمانہ کے ہاتھوں تباہ و برباد نہیں ہو چکی۔

قاضی عبدالودود نے ایک موقع پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "صرف و نحو پر ان (غالب) کی کوئی مستقل جامع کتاب نہیں، یا تھی تو اب ناپید ہے ۔ ۔ ۔ ۔ "جلوۂ خضر" میں غالب کے قواعد اُردو کا ذکر ہے مگر مجھے اس کے وجود میں شبہ ہے۔[۱]" کتاب کا وجود قاضی صاحب کے نزدیک مشتبہ لیکن اس کی "ناپیدگی" بہر طور یقینی ہے — دونوں صورتوں میں "جامع" کی قید زائد ہے اور بلا دلیل "شبہ" ایک معاصر عینی شہادت کی موجودگی میں تکلف محض ہے۔

یہاں ایک بات ضرور قابلِ غور ہے۔ صفیر بلگرامی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ معتبر راوی نہیں، مالک رام لکھتے ہیں کہ :

"صفیر نے غالب سے اپنی ملاقات کے جو حالات تذکرہ "جلوۂ خضر" میں درج کیے ہیں، اُن میں بہت غلط بیانیاں اور مبالغہ ہے جس سے ان کے تمام بیانات مشتبہ ہو گئے ہیں۔"

[دیباچہ : غالب اور صفیر بلگرامی، دہلی نومبر ۱۹۸۵ء ص ۱۸]

رشید حسن کا کہنا یہ ہے کہ "مبالغہ پسندی اور سخن سازی صفیر کا عام انداز تھا۔[۲]" "صفیر بہ حیثیت راوی غیر معتبر تھے۔ رنگ آمیزی، مبالغہ آرائی اور سخن آفرینی اُن کے مزاج اور اُن کی تحریروں کی عام خصوصیات ہیں اور ان وجوہ سے اُن کی

---

[۱] علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء، صفحہ ۲۵۵ (متن و حاشیہ)

[۲] غالب نامہ، نئی دہلی جلد ۴، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۸۳ء، ص ۲۳۹

روایتیں خاص طور پر تحقیق اور تنقیح کے بغیر قابلِ قبول نہیں[۵]۔"

اس حوالے سے رشید حسن خاں کا اصرار ہے کہ اُردو زبان کے ظہور کے حال میں غالب نے کوئی رسالہ نہیں لکھا اور :

"یہ رسالہ غالب کے ایک اُستاد ہرمزد ثم عبدالصمد کی طرح وجودِ حقیقی سے محروم ہے۔ عبدالصمد کا وجود غالب کا زائیدۂ فکر تھا اور یہ رسالہ صفیر کی سخن آفرینی اور عبارت آرائی کا تراشیدہ ہے"[۶]

میں اب بھی یہ خیال کرتا ہوں کہ عجب نہیں یہ زیرِ بحث رسالہ کبھی، کہیں نہ کہیں سے، کسی شکل میں ہاتھ آجائے۔

[۵]

ناتمام اُردو قصہ

تالیف : فروری ۱۸۶۹ء

"یادگارِ غالب" میں حالی نے غالب کی "نثرِ اُردو" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"..... مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں ...

اس کے سوا چند اجزا ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔"

لیکن حالی کی اس نشاندہی اور شہادت کے باوجود مجھے اس میں تامل ہے کہ غالب نے مرنے سے چند روز پہلے کوئی اُردو قصہ لکھنا شروع کیا ہوگا۔ اس لیے کہ دوسری

طرف خود حالی ہی کے بقول :

"..... مرنے سے چند روز پہلے بے ہوشی طاری ہو گئی تھی : پہر پہر، دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لیے افاقہ ہو جاتا، پھر بیہوش ہو جاتے تھے...."

O

"..... مرنے سے کئی برس پہلے سے چلنا پھرنا بالکل موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے - غذا کچھ نہ رہی تھی - چھ چھ سات سات دن میں اجابت ہوتی تھی -"

O

"..... آخر عمر میں موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے.... بہت سی باتیں اور حکایتیں ان سے منقول ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ آخر عمر میں مرنے کے کس قدر آرزومند تھے -"

O

"... جس روز انتقال ہوا، اُس سے شاید ایک روز پہلے، میں اُن کی عیادت کو گیا تھا - اُس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا اور نواب علاؤالدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے - اُنھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا، اُس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر جو غالبؔ شیخ سعدی کا تھا، لکھوایا - فقرہ یہ تھا :

"میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو، ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔"

O

"... مرنے سے پہلے، اکثر یہ شعر ورد زبان رہتا تھا :

دم واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

"اخیر عمر اور مرض الموت کی حالت" کے تحت حالی کے یہ بیانات مظہر ہیں کہ آخر آخر، غالب کی حالت اتنی خستہ و خراب ہو چکی تھی کہ خط وغیرہ کا جواب وہ خود نہیں لکھ پاتے تھے، دوسروں سے لکھواتے تھے۔ ایسے میں یہ بات، گو حالی ہی کی لکھی ہوئی ہے، جی کو نہیں لگتی کہ غالب نے کوئی قصّہ "مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا"۔

اس موقف کو حالی سے مقدم ایک نادر اور معاصر ماخذ سے بھی تقویت پہنچتی ہے۔ میری مراد میر مہدی مجروح کے ایک مضمون سے ہے جو غالب کے انتقال کے فوراً بعد ۱۷- فروری ۱۸۶۹ء کے اکمل الاخبار دہلی میں شائع ہوا اور جسے غالب کے بعد غالب کے حالات میں پہلا مضمون خیال کرنا چاہیے۔ مجروح لکھتے ہیں کہ :

"..... جناب مرحوم دو تین مہینے صاحبِ فراش رہے۔ ضعف و نقاہت کے صدمے سہے۔ آٹھ دن انتقال سے پہلے کھانا پینا ترک فرمایا' اس دنیائے فانی سے بالکل دل اٹھایا[1]۔"

ایسے میں کہ دو تین مہینے صاحبِ فراش رہے ضعف و نقاہت کے صدمے سہے، آٹھ دن، انتقال سے پہلے کھانا پینا تک ترک ہوا، اس دنیائے فانی سے بالکل دل اٹھیا یاور نہیں آتا کہ انھوں نے کیوں کر "مرنے سے چند روز پہلے" کسی قصّے کی تصنیف کا ڈول ڈالا ہو گا..... اور خصوصیت سے اس صورت میں تو اور بھی کہ اس مُبیّنہ "ناتمام اُردو قصّے کے اجزا" کہیں دستیاب بھی نہیں ہوتے ـــــ

یہاں ایک شبہے کا اظہار کر دینا بے محل نہ ہو گا..... ہو سکتا ہے کہ حالی نے "چند برس" لکھا ہو' اور سہوِ کتابت سے یہ "چند روز" ہو گیا ہو یا "چند برس" کی جگہ روانی میں

---

[1] اکمل الاخبار' دہلی جلد ۴ نمبر ۷' مطبوعہ ۱۷- فروری ۱۸۶۹ء روز چہار شنبہ مطابق ۴- ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ- ص ۵۵

حالی ہی کے قلم ہی سے "چندروز" نکل گیا ہو، گو اس سے مقصود یہ نہ ہو۔

اگر حالی کی اس عبارت : "مرنے سے چند روز پہلے" کو .... چند برس پہلے مان لیا جائے تو اس صورت میں حالی کا اشارہ اس قصّے کی طرف ہو سکتا ہے، ہنری اسٹورٹ ریڈ کے حوالے سے جس کا ذکر غالب نے دسمبر ۱۸۵۸ء کے اپنے بعض مکاتیب موسومہ شیو نرائن میں کیا ہے، لیکن یہ محض تاویل ہو گی۔ اس لیے کہ ریڈ صاحب کی فرمائش پر غالب اپنے انتقال سے کوئی دس گیارہ برس پہلے "قصّہ کہانی" لکھنے کے چکّر میں پڑے تھے۔ دس گیارہ برس کی اچھی خاصی مدّت کے لیے حالی کا "چند برس" لکھنا بھی بجائے خود محلِ نظر ہوتا۔

اب تک غالب کی جن پانچ ناپید تحریروں کا ذکر ہوا، وہ ضخامت کے اعتبار سے کتاب کے حجم کی رہی ہوں گی۔ ان پانچ تصانیف کے علاوہ غالب کے خطوں میں اُن کی بعض دیگر مختصر نگارشات کا ذکر بھی ملتا ہے، جو اب معدومؔ[1] ہیں اور ورق دو ورق کے پھیلاؤ سے زیادہ کی نہ رہی ہوں گی۔ یہاں اس طرح کی ایک دو معدوم تحریروں کا تذکرہ بے محل نہ ہو گا۔

---

[1] اس موقع پر اُن بہت سی معدوم نگارشات کا نام مقصود نہیں جنھیں عرفِ عام میں "خط" کہا جاتا ہے۔ مثلاً یوسف مرزا کے نام غالب کے موجود خطوں میں سے پہلے خط کا جملہ یہ ہے :

"..... میاں میں نے کل خط تم کو بھیجا ہے مگر تمھارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے، اب سن لو ....."

[خطوطِ غالب، مالک رام، صفحہ ۲۱۰]

لیکن "کل" والا خط اب دستیاب نہیں ہوتا۔ اس طرح کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن یہاں خطوط سے قطع نظر صرف دیگر نگارشات سے بحث ہے۔

[۶]

سنینِ فارسیہ کا حال

تالیف : ۱۸۶۰ء

"سنینِ فارسیہ" کے بارے میں خلیفہ احمد علی صاحب[1] احمد رامپوری کے نام ایک خط میں جو جنوری سے مارچ ۱۸۶۰ء تک کے دوران میں کسی وقت لکھا گیا، غالب کہتے ہیں کہ :

"..... فقیر شب کو آپ کا منتظر رہا۔ آپ تشریف نہ لائے۔ ناچار تقریر کو تحریر کا پیرایہ دے کر آپ کی جناب میں بھیجتا ہوں[2]۔ سنینِ فارسیہ کا حال بسبیلِ اجمال ایک دو ورقے پر مندرج ہے، بہ نظرِ اصلاح مشاہدہ ہو۔"

[مکاتیبِ غالب، طبع دوم ۱۹۴۳ء، مرتبہ عرشی، صفحہ ۱۱۴]

---

[1] خلیفہ شیخ احمد علی صاحب احمد تخلص، والد شیخ نادر علی تقریباً ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۵ء) میں پیدا ہوئے۔ رام پور کے اکثر فارسی ادب کے علما کا سلسلہ اُن تک منتہی ہوتا ہے۔ نواب خلد آشیاں (یوسف علی خاں ناظم) اور نواب عرش آشیاں (کلب علی خاں) طاب ثراہما کی اُستادی کا بھی شرف حاصل تھا۔ خلیفہ صاحب نے جمعرات کے دن ۲۹۔ رمضان ۱۳۰۹ھ (۲۸۔ اپریل ۱۸۹۲ء) کو نوّے سال کی عمر میں اپنے مکان واقعہ محلہ بنگلہ آزاد خاں (رام پور) میں انتقال کیا۔ اُن کی فارسی نظم و نثر کا ایک چھوٹا سا مجموعہ "کتاب خانۂ عالیہ رام پور میں محفوظ ہے۔"
[عرشی، مکاتیب غالب، صفحہ ۱۱۳]

[2] میرزا غالب رام پور تشریف لائے اور خلیفہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو موخرالذکر نے اثنائے گفتگو میں عرفی کے کلام پر نکتہ چینی کی..... مرزا نے عرفی کی حمایت کی، لیکن اس وقت بحث ناتمام رہی اور یہ طے پایا کہ خلیفہ صاحب شب کو آ کر گفتگو کریں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس رات کو تشریف نہ لے جا سکے اس لیے میرزا صاحب نے اپنے دلائل لکھ کر ان کی خدمت میں بھیج دیے۔ [عرشی، مکاتیبِ غالب، صفحہ ۱۱۳]

غالب کے اس خط کی بازیافت اور سنینِ فارسیہ سے متعلق اُن کی نگارش کے بارے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی لکھتے ہیں کہ :

"میرزا صاحب کا یہ خط مولوی عبدالحکیم خاں صاحب مُدرّس فارسی، مدرسۂ عالیہ، رامپور سے مبلغ پچیس روپے میں خریدا گیا تھا - خیال تھا کہ سنینِ فارسی کی کیفیت پر مشتمل دو ورقہ بھی موصوف الذکر بزرگ کے پاس ہوگا لیکن باوجود تلاش دستیاب نہ ہوسکا -"

[حواشی، مکاتیب غالب، ص ۱۸۰]

[۷]

سولہ شعرار کے تراجم

تالیف : ۱۸۶۴ء

غالب نے قائم مقام ڈپٹی کمشنر شہر دہلی مسٹر ریٹیگن کی فرمائش پر اپنے سولہ واقفِ حال ہم عصر شعرا، کا مختصر حال قلم بند کیا تھا اور جس طور پر قلم بند کیا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ساری تفصیل ایک دو ورق میں آگئی ہوگی - لیکن یہ نگارش، اب معدوم ہے - منشی ہرگوپال تفتہ کے نام غالب کے ایک خط، روز جمعہ ۹ - دسمبر ۱۸۶۴ء سے اس کا سراغ ملتا ہے - غالب لکھتے ہیں کہ بیماری و ناتوانی کے باعث :

"کمشنر و ڈپٹی کمشنر وغیرہ حکامِ شہر سے ترکِ ملاقات ہے مگر ڈپٹی کلکٹر جو کہ وہ مہتمم خزانہ ہے، ہر مہینے ایک بار ملنا ضرور ہے - اگر نہ ملوں تو مختار کا

کو تنخواہ نہ ملے۔ ڈکرو ور صاحب ڈپٹی کلکٹر چھ مہینے کی رخصت لے کر پہاڑ پر گئے۔ اُن کی جگہ ریٹیگن صاحب[۱] مقرر ہوئے۔ ان سے ناچار ملنا پڑا۔ وہ تذکرہ شعرائے[۲] ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں۔ مجھ سے بھی اُنھوں نے مدد چاہی۔ میں نے سات کتابیں، بھائی ضیاء الدین صاحب سے مستعار لے کر اُن کے پاس بھیج دیں۔ پھر اُنھوں نے بعد میں مجھ سے کہا کہ جن شعرا کو اچھی طرح جانتا ہے، اُن کا حال لکھ بھیج۔ میں نے سولہ آدمی لکھ بھیجے، بہ قید اس کے، کہ اب زندہ موجود ہیں اور اس سواد کی صورت یہ ہے:

۱ؔ اپنے اسی خط مرقومہ ۹۔ دسمبر ۱۸۶۲ء کے اخیر میں لکھتے ہیں کہ:

"ریٹیگن صاحب اب عدالتِ خفیفہ کے جج ہو گئے۔ ڈکرو ور صاحب پہاڑ سے آ گئے۔ اپنا کام کرنے لگے۔ ریٹیگن صاحب شہر سے باہر دو کوس کے فاصلے پر رہا ہے۔"

تفتہ ہی کے نام ۱۲۔ فروری ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں غالب اطلاع دیتے ہیں کہ:

"ریٹیگن صاحب پنجشنبے کے دن، ۱۹ جنوری سنہ حال کو... پنجاب کو گئے۔ ملتان یا پشاور کے ضلع میں کہیں حاکم ہوئے ہیں۔ میں اپنی ناتوانی کے سبب ان کی ملاقات و تودیع کو نہیں گیا۔"

ریٹیگن صاحب لاہور میں بھی "حاکم" رہے۔ چنانچہ لاہور میں ریٹیگن روڈ، اُن ہی کے نام سے منسوب ہے۔

۲ؔ تذکرۃ الشعراء کے تعارف میں رجوع کیجیے مضمون "میرزا غالب کی خودنوشت سوانح عمری کا ایک ورق" متعارفہ:

۱۔ مولوی عبدالحق، رسالہ اُردو، اورنگ آباد، جولائی ۱۹۲۸ء، صفحہ ۳۲۷۔۳۲۹

۲۔ اظہار الحق ملک، احوالِ غالب (آرزو) علی گڑھ، ۱۹۵۳ء، صفحہ ۲۳۔۲۸

۳۔ سعیدہ اوہجی، آج کل، دہلی، فروری ۱۹۵۵ء، صفحہ ۷۔۱۲

○ نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر، رئیس لوہارو :

فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں - فارسی میں نیّر اور اُردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں - اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد -

○ نواب مصطفیٰ خاں بہادر، علاقہ دار جہانگیر آباد :

اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں - اُردو میں مومن خاں کو اپنا کلام دکھاتے تھے -

○ منشی ہر گوپال معزز قانون گو سکندر آباد کے :

فارسی میں شعر کہتے ہیں - تفتہ تخلص کرتے ہیں - اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد -

. . . . . اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے - اشعار ہندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا - صرف شاعر کا اور اس کے اُستاد کا نام اور شاعر کے مسکن و موطن کا نام مع تخلص درج ہو گا -

غرض اس انداز پر غالب نے سولہ شاعروں کا حال لکھا - تین کے کوائف بطور نمونہ غالب نے مذکورہ خط میں درج کیے، یہ محفوظ رہ گئے - بقیہ تیرہ کے اسماء، و احوال کی کیفیت کسی اور ذریعے سے معلوم نہیں ہوتی، لیکن غالب قیاس یہ ہے کہ بقیہ تیرہ اصحاب غالب ہی کے حلقے کے ہوں گے اور ان کے حال میں بھی محض نام تخلص، اُستاد کے نام اور مسکن و موطن کی صراحت ہو گی +

کُچھ بعد اَز کتاب :

زیرِ نظر کتاب کا کچھ نسبتی یا نسبی تعلق میرے پی ایچ ڈی کے مقالے سے ہے۔ اسے اشاعت کے لیے تیار کرنے میں مجھے بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ بیس برس پہلے ۱۹۶۹ء میں غالب پر میری پہلی کتاب "اشاریۂ غالب" چھپی تھی، ۱۹۷۲ء میں جس مقالے پر مجھے ڈاکٹریٹ تفویض ہُوا، اُس کا موضوع تھا "غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ" (ضخامت ۸۸۰ صفحات)۔ یہ مقالہ کہیں اُسی زمانے میں طباعت کے لیے میں نے دے دیا ہوتا تو اُس ساری مشقت اور اذیت سے محفوظ رہتا جو بعد کے برسوں میں اسے اشاعت کے لیے اَز سرِ نو مرتب کرنے میں مجھے اُٹھانا پڑی — ان پندرہ بیس برسوں میں "غالبیات" سے میرا تعلق منقطع یا کمزور تو کیا ہوتا، اُستوار تر ہوتا گیا، "دشواری" کا باعث یہی ہُوا — مقالہ بار بار قطع و برید اور ترمیم و اضافہ کے عمل سے گزرا، بے اطمینانی اب بھی باقی ہے!

"غالب کا علمی سرمایہ" میرے تحقیقی مقالے پر مبنی، لیکن ترتیب و تقسیمِ ابواب کے اعتبار سے تحقیقی مقالے سے بڑی حد تک مختلف، ایک آزادانہ مطالعہ ہے۔ تھیسس میں غالب کے اُردو دیوان کے تذکرے نے چالیس صفحات بھی نہیں لیے تھے، اَب اس بحث نے ستر صفحات گھیرے ہیں۔ غالب کی فارسی کتاب "دستنبو" کی جو بحث تھیسس میں بیس بائیس صفحات کو محیط تھی، وہ اَب پچاس صفحات پر پھیل گئی ہے۔ تھیسس کے بعض ابواب یا مباحث زیرِ نظر کتاب میں سرے سے جگہ ہی نہیں پا سکے۔

اپنے تجربے کی بنیاد پر تازہ واردانِ بساطِ تحقیق کے لیے، بے طلب میرا ایک مشورہ یہ ہے کہ ڈگری کا حصول اگر اُن کی تحقیقی سرگرمی کا آخری ہدف نہیں ہے تو اُنہیں اپنا تحقیقی مقالہ شائع کرانے میں دیر نہ کرنی چاہیے۔ موضوع سے آپ کا پیمانِ وفا باقی اور اُستوار رہا تو پھر گزرانِ وقت کے ساتھ ساتھ "بڑا کام چھوٹا" نکلتا چلا جائے گا! میرے ساتھ یہی ہُوا اور اس نے مجھے بڑا عاجز کیا — بہرحال: "کارِ تحقیق" کسے نہ تمام کرد!

— انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان (کراچی) کے اصحابِ مجاز کا احسان بہر نوع سر آنکھوں پر، جن کی تحریک سے یہ کام اس شکل میں بن آیا۔



فروری ۱۹۸۹ء

کتابیات

○ بُنیادی مآخذ:

۱- آثارِ غالب (مآثرِ غالب)، قاضی عبدالودود، علی گڑھ، ۱۹۴۹ء

۲- اُردوئے مُعلّیٰ: ○ اکمل المطابع، دہلی، مارچ ۱۸۶۹ء

○ مطبع اُردو گائڈ، کلکتہ، مارچ ۱۸۸۳ء

○ اکمل المطابع، دہلی، فروری ۱۸۹۱ء

۳- اُردوئے مُعلّیٰ مع حصہ دوم: ○ مطبع مجتبائی، دہلی، اپریل ۱۸۹۹ء

○ مطبع فاروقی، ۱۹۰۸ء، ۱۹۱۰ء

○ مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۱۴ء

○ مطبع مجیدی، کانپور، ۱۹۲۲ء

○ انوار المطابع، لکھنؤ، ۱۹۲۲ء

۴- اُردوئے مُعلّیٰ (ہر دو حصہ) مع ضمیمہ، مرتبہ: سرخوش، لاہور، ستمبر ۱۹۲۲ء

۵- اُردوئے مُعلّیٰ، صدی ایڈیشن (تین جلدیں)، مرتبہ: فاضل لکھنوی، لاہور، ۱۹۷۰ء، ۱۹۶۹ء

۶- ارمغانِ غالب، ایس ایم۔ اکرام، بمبئی، ۱۹۴۴ء

۷- افاداتِ غالب، سید وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۹ء

۸- انتخابِ غالب (اُردو نثر و نظم):

○ دراتنائے اُردو، حصہ دوم، ضیاء الدین احمد خاں، مطبع فیض احمدی، ۱۸۶۶ء

○ مرتبہ: محمد عبدالرزاق، چشتیہ پریس، حیدرآباد دکن، ۱۹۲۶ء

○ مرتبہ: محمد عبدالرزاق دین محمدی پریس، لاہور، ۱۹۴۳ء

۹- انتخابِ غالب (اُردو، فارسی)، امتیاز علی عرشی، بمبئی، ۱۹۴۲ء

۱۰- باغِ دودر، سید وزیر الحسن عابدی، لاہور ۷۰-۱۹۶۸ء

۱۱- بیاضِ غالب بخطِ غالب، مطبوعہ: رسالہ نقوش، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء

۱۲- پنج آہنگ: ○ مطبع سلطانی، دہلی، اگست ۱۸۴۹ء

○ مطبع دارالسلام، دہلی، اپریل ۱۸۵۳ء

○ آہنگِ پنجم، مطبع انوار السلام، دکن، ۱۹۱۰ء

○ مرتبہ: سید وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۹ء

○ ترجمہ آہنگِ پنجم: محمد عمر مہاجر، کراچی، ۱۹۶۹ء

۱۳۔ تیغ تیز، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۷ء

۱۴۔ خطوطِ غالب، مہیش پرشاد، الہ آباد، ۱۹۴۱ء

۱۵۔ خطوطِ غالب: مولانا غلام رسول مہر: ○ (دو حصے) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۵۱ء

○ (یک جلد) شیخ غلام علی، لاہور، طبع چہارم ۱۹۶۸ء

○ (دو جلدیں) پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء

۱۶۔ خطوطِ غالب، مالک رام، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء

۱۷۔ دُرفشِ کاویانی: ○ اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۵ء

○ مرتبہ: محمد باقر، لاہور، ۱۹۶۹ء

۱۸۔ دستنبو: ○ مطبع مفیدِ خلائق، آگرہ، نومبر ۱۸۵۸ء

○ لٹریری سوسائٹی، روہیل کھنڈ، بریلی، ۱۸۶۵ء، ۱۸۷۱ء

○ مرتبہ شکور احسن، لاہور، ۱۹۶۹ء

۱۹۔ دعائے صباح: ○ نولکشور، لکھنؤ، ۱۸۶۷ء

○ مطبع مظہر العلوم، لکھنؤ، ۱۸۹۵ء

○ در وظائف الابرار، اثنا عشری پریس، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۰۶ء

○ در نظامی جنتری، نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۰ء

○ مرتبہ: کالی داس گپتا رضا، بمبئی، ۱۹۷۷ء

○ انگریزی ترجمہ مشمولہ: ECHO OF ISLAM، تہران
شمارہ جنوری مارچ ۱۹۸۳ء

۲۰۔ دیوانِ غالب (اردو) ○ مطبع سید الاخبار/سید المطابع، دہلی، اکتوبر ۱۸۴۱ء

○ مطبع دارالسلام ، دہلی ، مئی ۱۸۴۷ء

○ مطبع احمدی ، دہلی ، جولائی ۱۸۶۱ء

○ مطبع نظامی ، کانپور ، مئی جون ۱۸۶۲ء

○ مطبع مفید خلائق ، آگرہ ، ۱۸۶۳ء

○ در "نگارستانِ سخن" ، دہلی ۱۸۶۴ء

۲۱- دیوانِ غالب (اردو) : ○ نظامی ایڈیشن ، بدایوں ، ۱۹۱۵ء ، ۱۹۱۸ء ، ۱۹۲۰ء
۱۹۲۳ء ، ۱۹۲۷ء

○ شیخ عبدالقادر ، لاہور ، ۱۹۱۹ء

○ ڈاکٹر ذاکر حسین ، برلن ، جرمنی ، ۱۹۲۵ء

○ آغا محمد طاہر ، دہلی ، ۱۹۳۶ء

○ تاج ایڈیشن ، لاہور/کراچی ، ۱۹۳۸ء

○ علی سردار جعفری ، بمبئی ، ۱۹۵۸ء

○ مکتبہ شاہراہ ، دہلی ، فروری ۱۹۵۸ء

○ مصوّر ، حنیف رامے ، لاہور ، ۱۹۶۵ء

○ غالب یادگار کمیٹی ، بمبئی ، ۱۹۶۹ء

۲۲- دیوانِ غالب (اردو) ، مرتبہ : مالک رام :

○ آزاد کتاب گھر ، دہلی ، ۱۹۵۷ء

○ آزاد کتاب گھر ، دہلی ، صدی ایڈیشن ، ۱۹۶۹ء

○ صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی ، دہلی ۱۹۶۹ء

۲۳- دیوانِ غالب (اردو) ، نسخۂ عرشی ، مرتبہ : امتیاز علی عرشی ، علی گڑھ ، ۱۹۵۸ء

۲۴- دیوانِ غالب (اردو) ، مرتبہ : مولانا حامد علی خان ، لاہور ۱۹۶۹ء ، علی گڑھ ۱۹۸۰ء

۲۵- دیوانِ غالب (اردو) ، عکسی ، مرتبہ : مولانا غلام رسول مہر ، لاہور ، ۱۹۶۷ء

۲۶- دیوانِ غالب (اردو) ، نسخۂ حمیدیہ ، پروفیسر حمید احمد خاں ، لاہور ، ۱۹۶۹ء

۲۷- دیوانِ غالب (اُردو)، نسخۂ شیرانی، لاہور، ۱۹۶۹ء

۲۸- دیوانِ غالب بخطِ غالب، نسخۂ عرشی زادہ، اکبر علی خاں عرشی، رامپور، ۱۹۶۹ء

۲۹- دیوانِ غالب جدید، نسخۂ حمیدیہ، مفتی محمد انوار الحق، آگرہ، ۱۹۲۱ء

۳۰- دیوانِ فارسی: مطبع دارالسلام، دہلی، ۱۸۴۵ء

۳۱- سبدِ باغ دودر، متعارفہ: امتیاز علی عرشی، کراچی، ۱۹۶۹ء

۳۲- سبدِ چین: ○ مطبع محمدی، دہلی، اگست ۱۸۶۷ء

○ مرتبہ: مالک رام، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۳۸ء

○ مرتبہ: وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۹ء

۳۳- سوالاتِ عبدالکریم، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۴ء

۳۴- عودِ ہندی: ○ مطبع مجتبائی، میرٹھ، ۱۸۶۸ء

○ مطبع نارائنی، دہلی، فروری ۱۸۸۸ء

○ مطبع نولکشور، کانپور، ستمبر ۱۸۷۸ء، ۱۸۸۶-۸۷ء، ۱۹۰۰ء

○ مدرسۃ العلوم، علی گڑھ، ۱۹۱۰ء

○ مطبع مفید عام، آگرہ، مئی ۱۹۱۰ء

○ مطبع رام نرائن، الہ آباد، ۱۹۱۲ء، ۱۹۲۶ء

○ مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۲۵ء

○ مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۲۷ء

○ نیشنل پریس، الہ آباد، ۱۹۲۸-۲۹ء

○ مرتبہ: امیر حسن نورانی، لکھنؤ، ۱۹۶۰ء

○ مرتبہ: فاضل لکھنوی، لاہور، ۱۹۶۷ء

۳۵- غالب کا منسوخ دیوان، مرتبہ: مسلم ضیائی، کراچی، ۱۹۶۹ء

۳۶- غالب کی نادر تحریریں، مرتبہ: خلیق انجم، دہلی، ۱۹۶۱ء

۳۷- غزلیاتِ فارسی، مرتبہ: سید وزیر الحسن عابدی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء

۳۸۔ فرہنگِ غالب، مرتبہ: امتیاز علی عرشی، رامپور، ۱۹۴۷ء

۳۹۔ قادر نامہ:
- مطبع سلطانی، دہلی، ۱۸۵۶ء
- مطبع العلوم، دہلی، ۱۸۶۱ء
- محبس پریس، دہلی، ۱۸۶۳ء۔
- مطبع منشی مداری لال، لاہور، اکتوبر ۱۸۷۳ء
- مطبع نظامی، کانپور، ۱۸۷۱ء، ۱۸۹۱ء
- مطبع یوسفی، دہلی، ۱۸۸۲ء
- آئینِ ہند پریس، دہلی، ۱۸۸۵ء
- مطبع فیض محمدی، لکھنؤ، ۱۸۹۲ء، ۱۸۹۷ء
- مطبع انوری، لکھنؤ، ۱۹۰۳ء
- ہلالی سٹیم پریس، سادھواڑہ، ۱۹۰۷ء
- مع فارسی نامۂ کلاں، مطبع مجیدی، کانپور، فروری ۱۹۰۹ء
- مطبع قیومی، کانپور، ۱۹۱۱ء
- مطبع رزاقی، کانپور، ۱۹۱۶ء
- ابوالعلائی الیکٹرک پریس، دہلی، ۱۹۲۷ء
- ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور، مارچ ۱۹۳۸ء
- فیروز سنز پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۴۶ء
- مرتبہ: تحسین سروری، کراچی، ۱۹۵۹ء
- مرتبہ: محمد باقر، لاہور، ۱۹۶۹ء
- مرتبہ: عبدالقوی دسنوی، بھوپال، ۱۹۷۱ء

۴۰۔ قاطع برہان، مطبع نولکشور، اودھ اخبار لکھنؤ، مارچ ۱۸۶۲ء

۴۱۔ قاطع برہان و رسائل متعلقہ، مرتبہ: قاضی عبدالودود، پٹنہ، ۱۹۶۷ء

۴۲۔ قصائد و مثنویاتِ فارسی، مرتبہ: مولانا غلام رسول مہر، لاہور، ۱۹۶۹ء

۴۳۔ قطعات، رُباعیات، ترکیب بند،
ترجیع بند، مُخمّس : مرتبہ، مولانا غلام رسول مہر، لاہور، ۱۹۶۹ء

۴۴۔ قطعہ غالب، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۶ء

۴۵۔ کُلّیاتِ غالب (نظم)، فارسی: ○ مطبع نولکشور، لکھنؤ، مئی جون ۱۸۶۳ء
جنوری ۱۸۷۲ء
جون ۱۸۹۳ء
دسمبر ۱۹۱۴ء

○ شیخ مبارک علی اینڈ سنز، ۱۹۶۵ء
○ مرتبہ: فاضل لکھنوی (تین جلدیں)، لاہور، ۱۹۶۷ء
○ مرتبہ: امیر حسن نورانی، نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۶۸ء

۴۶۔ کُلّیاتِ فارسی (غزلیاتِ فارسی) مرتبہ: سید وزیر الحسن عابدی، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۹ء

۴۷۔ کُلّیاتِ نثرِ غالب (قلمی)، فارسی: مخزونہ پنجاب پبلک لائبریری، لاہور، نمبر "۹۶"، ۸۷۱ پنج
مشمولات: ○ پنج آہنگ، ترقیمہ ۱۰۔ دسمبر ۱۸۶۱ء
○ مہرِ نیمروز، ترقیمہ ۹ر اکتوبر ۱۸۶۲ء
○ دستنبو، ترقیمہ ۱۵۔ جولائی ۱۸۶۳ء

۴۸۔ کُلّیاتِ نثرِ غالب (فارسی): ○ مطبع نولکشور، لکھنؤ/کانپور، جنوری ۱۸۶۸ء، جنوری ۱۸۷۱ء، ۱۸۷۵ء، ۱۸۸۴ء، ۱۸۸۸ء

۴۹۔ گُلِ رعنا (قلمی) بخطِ غالب، مکتوبہ ستمبر ۱۹۲۸ء، مخزونہ خواجہ محمد حسن (لاہور)

۵۰۔ گُلِ رعنا: ○ مالک رام، علمی مجلس، دہلی، مئی ۱۹۶۹ء
○ سید وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۷۰-۱۹۶۹ء
○ سید قدرت نقوی، کراچی، ۱۹۷۵ء

۵۱۔ لطائفِ غیبی، اکمل المطابع، دہلی، اکتوبر ۱۸۶۴ء

۵۲۔ مُتفرقاتِ غالب، مسعود حسن رضوی ادیب، رامپور، ۱۹۴۷ء لکھنؤ ۱۹۶۹ء

۵۳- مثنوی ابرِ گہربار ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۴ء
۵۴- مجموعہ نثرِ غالب (اردو) ، مرتبہ : خلیل الرحمٰن داؤدی ، لاہور ، ۱۹۶۷ء
۵۵- مُرقّعِ غالب ، پرتھوی چندر ، دہلی ، ۱۹۶۶ء
۵۶- مرقّعِ غالب ، مصوّر ، عبدالرحمٰن چغتائی ، لاہور ، ۱۹۲۸ء
۵۷- مکاتیبِ غالب ، مرتبہ : امتیاز علی عرشی ○ طبع اوّل ، بمبئی ۱۹۳۷ء
○ طبع دوم ، رامپور ، ۱۹۴۳ء
○ طبع ششم ، رامپور ، ۱۹۴۹ء
۵۸- مہرِ نیمروز (قلمی باصلاح غالب) ، مکتوبہ ، ۱۸۵۱ء ، مخزونہ خلیل الرحمٰن داؤدی (لاہور)
۵۹- مہرِ نیمروز ○ فخر المطابع ، دہلی ، دسمبر ۱۸۵۴ء
○ مطبع نولکشور ، لکھنو ۱۹۱۵ء
○ مطبع کریمی ، لاہور ، ۱۹۳۷ء
○ مرتبہ : شاداں بلگرامی ، لاہور ، ۱۹۲۵ء ، ۱۹۲۴ء
○ مرتبہ ، عبدالشکور احسن ، لاہور ، ۱۹۶۹ء
○ اُردو ترجمہ : سید عبدالرشید فاضل ، کراچی ، ۱۹۶۹ء
۶۰- نادراتِ غالب ، مرتبہ : آفاق حسین آفاق دہلوی ، کراچی ، ۱۹۴۹ء
۶۱- نامۂ غالب ، مطبع محمدی ، دہلی ، ۱۸۶۵ء
۶۲- نامہ ہائے غالب فارسی ، مرتبہ : اکبر علی ترمذی ، دلّی ، ۱۹۶۹ء
۶۳- نقشِ چغتائی ، مصوّر ، عبدالرحمٰن چغتائی ، لاہور ، ۱۹۳۵ء
۶۴- نکاتِ غالب و رُقعاتِ غالب ، مطبع سراجی ، دہلی ، ۱۸۶۷ء
○ مرتبہ : اکبر علی خاں عرشی زادہ ، سری نگر ، ۱۹۶۲ء

○ دیگر مصادر (کُتب) :

۱- آبِ حیات ، محمد حسین آزاد ، وکٹوریہ پریس ، لاہور ، ۱۸۸۰ء

۲- آثار الصنادید ، سید احمد خاں، سید الاخبار، دہلی ۴۷ - ۱۸۴۶ء

۳- آثارِ غالب (غالب نامہ)، الیس ایم - اکرام ، بمبئی ۴۷ - ۱۹۴۴ء

۴- آئینۂ غالب ، دہلی ، ۱۹۶۴ء

۵- آپ امنگ دی پانڈیز (انگریزی) از: Lieut. Majendie

۶- اٹھارہ سو ستاون کا تاریخی روزنامچہ ، عبداللطیف ،

مرتبہ : ڈاکٹر خلیق احمد نظامی، دہلی، ۱۹۵۸ء

۷- احوالِ غالب ، ڈاکٹر مختار الدین احمد، علی گڑھ ، ۱۹۵۳ء، طبع دوم، دہلی، ۱۹۸۶ء

۸- ادبی تحقیق - مسائل اور تجزیہ ، رشید حسن خان، علی گڑھ، ۱۹۷۸ء

۹- ارمغانِ اُلفت (یادگاری اشاعت خواجہ غلام السیدین)، دہلی، ۱۹۶۴ء

۱۰- اشاریۂ غالب ، سید معین الرحمٰن، لاہور ، ۱۹۶۹ء

۱۱- اشاریۂ کلامِ غالب ، رشید حسن خاں و دیگر، دہلی ، ۱۹۷۰ء

۱۲- افاداتِ مہر ، ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی ، لاہور، ۱۹۷۴ء

۱۳- انتخابِ یادگار، امیر مینائی، تاج المطابع، رامپور ، ۱۸۷۹ء

۱۴- انڈین ایمپائر (انگریزی) از : Barns

۱۵- انڈین اینڈ ھوم میموریز (انگریزی) از: Sir Henry Cotton

۱۶- انشائے آنند رام مخلص ، شمس المطابع، دہلی، ۱۸۵۲ء

۱۷- اے لیڈیز اسکیپ فرام گوالیار (انگریزی)

۱۸- انشائے بے خبر، منشی غلام غوث بے خبر، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء

۱۹- اے ھسٹری آف دی انڈین میوٹنی (انگریزی) از Holmes

۲۰- بُرہانِ قاطع (فارسی) ○ محمد حسین برہان، افضل المطابع، کلکتہ، ۱۸۳۹ء

○ ڈاکٹر محمد معین ، جلد اوّل تا پنجم، تہران، ۱۹۶۳ء

۲۱- تاریخ صحافتِ اُردو ، جلد دوم ، جلد سوم، امداد صابری، دہلی، ۱۹۶۳ء

۲۲- تحقیقِ غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، کراچی، ۱۹۸۱ء

۲۳۔ تلامذۂ غالب ، مالک رام ، نکودر ، ۱۹۵۷ء
۲۴۔ تیغ تیز تر ، عبدالصمد فدا / احمد علی ، مطبع نبوی ، کلکتہ ، ۱۸۶۷ء
۲۵۔ جشن نامہ یونیورسٹی اورینٹل کالج ، ڈاکٹر عبادت بریلوی ، لاہور ، دسمبر ۱۹۶۲ء
۲۶۔ جلوۂ خضر ، حصہ اوّل ، صفیر بلگرامی ، مطبع نور الانوار ، آرہ ، ۱۸۸۴ء
۲۷۔ چار شربت ، محمد حسن قتیل
۲۸۔ چراغ فوائد ، شیخ محمد صابر ، مطبع سفیر دکن ، ۸۸-۱۸۸۷ء
۲۹۔ چند ہم عصر ، مولوی عبدالحق ، طبع دوم ، دہلی ، ۱۹۴۲ء
۳۰۔ حکیم فرزانہ ، ایس ایم ۔ اکرام ، لاہور ، ۱۹۵۸ء
۳۱۔ حیاتِ غالب ، ایس ایم ۔ اکرام ، لاہور ، ۱۹۵۷ء
۳۲۔ دافع ہذیان ، مولوی نجف علی ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۴ء
۳۳۔ دی مسلم اینڈ کرسچین کیلنڈر (انگریزی) از : جی ۔ ایس ۔ پی ۔ فری مین ۔ گرین وائل ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن ، ۱۹۶۳ء
۳۴۔ ذکرِ غالب ، مالک رام ، ○ طبع دوم ، دہلی ، ۱۹۵۰ء
○ طبع چہارم ، دہلی ، ۱۹۶۴ء
○ طبع پنجم ، دہلی ، ۱۹۷۶ء
۳۵۔ رسلز ڈائری (انگریزی) از : سر ولیم رسل
۳۶۔ رقعاتِ بینی پرشاد ، دہلی ، ۱۸۵۲ء
۳۷۔ ساطع برہان ، میرزا رحیم بیگ میرٹھی ، ہاشمی پریس ، میرٹھ ، ۱۸۶۵ء
۳۸۔ سن ستّاون ، پنڈت سندر لال ، علی گڑھ ، دسمبر ۱۹۵۷ء
۳۹۔ شمشیرِ تیز تر ، مولوی احمد علی ، مطبع نبوی ، کلکتہ ، ۱۸۶۹ء ، ۱۸۶۸ء ، ۱۸۶۷ء
۴۰۔ عباس نامہ ، مولانا محمد عباس رفعت شیروانی ، مفید پریس ، آگرہ ، ۸۹-۱۸۸۸ء
۴۱۔ غالب ، مولانا غلام رسول مہر ، لاہور ، طبع اوّل ۱۹۳۶ء ، طبع دوم ۱۹۴۱ء ، طبع سوم ۱۹۴۴ء ، طبع چہارم ۱۹۴۶ء

۴۲- غالب اسٹڈیز، جلد ۱، عابد رضا بیدار، دہلی، ۱۹۷۰ء
۴۳- غالب اور ابوالکلام آزاد، عتیق صدیقی، دہلی، ۱۹۶۹ء
۴۴- غالب اور انقلاب ستاون، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
○ طبع اوّل، لاہور، ۱۹۷۴ء
○ طبع دوم، لاہور، ۱۹۷۶ء
○ طبع سوم، دہلی، ۱۹۸۸ء
۴۵- غالب اور سرود، ایم۔ حبیب خاں، دہلی، ۱۹۷۵ء
۴۶- غالب اور مطالعۂ غالب، ڈاکٹر عبادت بریلوی، لاہور، ۱۹۶۹ء
۴۷- غالب ببلیوگرافی، ڈاکٹر محمد انصاراللہ، علی گڑھ، ۱۹۷۲ء
۴۸- غالب شاعرِ امروز و فردا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، لاہور، ۱۹۷۰ء
۴۹- غالب شناسی (۱۰)، ظ۔ انصاری، بمبئی، دسمبر ۱۹۷۵ء
۵۰- غالب نامہ، ایس ایم۔ اکرام، مطبوعہ لاہور، اشاعت اوّل، سورت، بمبئی ۱۹۳۶ء
مطبوعہ لاہور، اشاعت دوم، بمبئی ۱۹۳۹ء
۵۱- غدر کی صبح و شام، حسن نظامی، دہلی، ۱۹۲۶ء
۵۲- غیاث اللغات، غیاث الدین رامپوری، تالیف ۱۲۴۲ھ، ۱۸۲۶ء
۵۳- فارٹی ایرز ان انڈیا (انگریزی) از: Lord Roberts
۵۴- فرہنگِ انجمن آرائی ناصری، رضا قلی ہدایت، تہران، ۱۲۸۸ھ، ۱۸۷۱ء
۵۵- فغانِ بے خبر، منشی غلام غوث بے خبر، مرتبہ: مولوی امیرالدین احمد، الٰہ آباد
۵۶- فکرِ غالب، پرتھوی چندر، دہلی، ۱۹۶۰ء
۵۷- قاطع القاطع، مولوی امین الدین، مطبع مصطفائی، دہلی، ۱۸۶۶ء
۵۸- قتیل اور غالب، سید اسد علی انوری فرید آبادی، دہلی، ۱۹۳۹ء
۵۹- کارنامۂ سروری، سرورالدولہ آغا مرزا بیگ، مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۳۳ء
۶۰- کلیاتِ قدر بلگرامی،

۶۱- لائف آف لارڈ لارنس (انگریزی)، از: Baswarth Smith

۶۲- مائی ڈائری ان انڈیا ان دی ایئر ۵۹-۱۸۵۶ء (انگریزی)

جلد اوّل، از: سر ولیم رسل

۶۳- مُتعلقاتِ غالب، کالیداس گپتا رضا، بمبئی، ۱۹۷۸ء

۶۴- محرقِ قاطع برُہان، منشی سید سعادت علی، مطبع احمدی، دہلی، ۱۸۶۳ء

۶۵- مرزا غالب کا روزنامچہ، حسن نظامی، طبع سوم، دہلی، ۱۹۴۰ء

۶۶- مُرقّعِ ادب، صفدر مرزا پوری، ○ لکھنؤ، ۱۹۲۰ء

○ حصہ دوم، لکھنؤ، ۱۹۲۷ء

۶۷- مویدِ برُہان، آغا احمد علی احمد، مطبع مظہر العجائب، کلکتہ، ۱۸۶۶ء

۶۸- مذرِ عابد (ڈاکٹر عابد حسین)، مالک رام، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء

۶۹- نقدِ قاطع برُہان، نذیر احمد، غالب نامہ، نئی دہلی، جولائی ۱۹۸۱ء، جنوری ۱۹۸۲ء،

جولائی ۱۹۸۲ء

۷۰- نقوشِ غالب: ابرِ گہربار، رفیق خاور، کراچی، ۱۹۶۹ء

۷۱- نگارستانِ سخن، ظہیر دہلوی، مطبع العلوم / مطبع احمدی، دہلی، اگست ۱۸۶۲ء

۷۲- نیریٹو آف دی انڈین ریولٹ (انگریزی)

۷۳- ہسٹری آف دی انڈین جرنلزم (انگریزی)، از: Natarajan

۷۴- ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی (انگریزی)، جلد اوّل، از: Charles Ball

۷۵- ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی (انگریزی)، جلد دوم، از: Kaye and Malleson

۷۶- ہسٹری آف دی سیپائی وار (انگریزی)، جلد دوم، از: Sir John Kay

۷۷- ہندوستانی اخبار نویسی، محمد عتیق صدیقی، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۵۷ء

۷۸- ہنگامۂ دل آشوب، مطبع سنت پرشاد، آرہ، ضلع شاہ آباد، اپریل ۱۸۶۷ء

۷۹- ہنگامۂ دل آشوب، (حصہ دوم)، مطبع سنت پرشاد، آرہ، ضلع شاہ آباد، ستمبر ۱۸۶۷ء

۸۰- ہنگامۂ دل آشوب، (مرزا دوحصے)، مرتبہ: سید قدرت نقوی، کراچی، ۱۹۶۹ء

٨١- یادگارِ غالب، حالی ○ نامی پریس، کانپور، ۱۸۹۷ء
○ مطبع فیض عام، علی گڑھ
○ مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی، لاہور، دسمبر ۱۹۶۳ء

○ دیگر مصادر (اخبارات و رسائل):

۱- آج کل، دہلی: فروری ۱۹۵۳ء، فروری ۱۹۵۷ء، فروری ۱۹۵۸ء
مارچ ۱۹۵۸ء، فروری ۱۹۶۹ء جولائی ۱۹۶۹ء

۲- اخبارِ عالم، میرٹھ: ۲۲-اپریل ۱۸۶۹ء،

۳- ادبی دنیا، لاہور: دسمبر ۱۹۴۹ء

۴- اُردو، اورنگ آباد: جولائی ۱۹۲۸ء، جولائی ۱۹۳۶ء، اکتوبر ۱۹۳۶ء

۵- اُردو، دہلی: اکتوبر ۱۹۴۲ء، جنوری ۱۹۶۵ء

۶- اُردو، کراچی: اپریل ۱۹۵۲ء، جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر ۱۹۶۶ء،
جنوری، مارچ ۱۹۶۹ء، جنوری، مارچ ۱۹۷۱ء

۷- اُردو ادب، علی گڑھ: شمارہ ۳، سال ۱۹۷۰ء

۸- اُردوئے معلّٰی، علی گڑھ: دسمبر ۱۹۰۷ء

۹- اُردوئے معلّٰی، دہلی: فروری ۱۹۶۰ء، فروری ۱۹۶۱ء

۱۰- اسعد الاخبار، آگرہ: ۱۲-مارچ ۱۸۴۹ء

۱۱- افکار، کراچی: فروری، مارچ ۱۹۶۶ء، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء

۱۲- اکمل الاخبار، دہلی: اکتوبر ۱۸۶۸ء، ۱۷-فروری ۱۸۶۹ء

۱۳- اودھ اخبار، لکھنؤ: یکم جنوری ۱۸۶۲ء، ۲۹-مارچ ۱۸۶۲ء، ۲۰-اپریل ۱۸۶۲ء
۱۳-مئی ۱۸۶۳ء، ۲۰-مئی ۱۸۶۳ء، ۳-جون ۱۸۶۳ء
۳۰-دسمبر ۱۸۶۳ء، ۱۰-اکتوبر ۱۸۶۵ء، ۱۷-اکتوبر ۱۸۶۵ء

۱۴- اورینٹل کالج میگزین، لاہور: فروری ۱۹۵۲ء، فروری، مئی ۱۹۵۸ء، اگست ۱۹۶۰ء

اگست ۱۹۶۱ء، دسمبر ۱۹۷۲ء

۱۵۔ تحریک، دہلی : اپریل مئی ۱۹۶۱ء، جولائی ۱۹۷۰ء

۱۶۔ تصویرِ جذبات : فروری ۱۹۲۳ء

۱۷۔ جامعہ، دہلی : مارچ ۱۹۴۲ء، مئی ۱۹۴۲ء، ستمبر ۱۹۴۲ء

۱۸۔ حریت (روزنامہ)، کراچی : ۱۶۔ نومبر، ۲۳۔ نومبر، ۳۰۔ نومبر ۱۹۶۸ء

۷۔ دسمبر، ۱۴۔ دسمبر، ۲۱۔ دسمبر، ۲۸۔ دسمبر ۱۹۶۸ء

۴۔ جنوری، ۱۰۔ جنوری ۱۹۶۹ء

۱۹۔ دہلی اُردو اخبار : ۲۹۔ مارچ ۱۸۵۲ء

۲۰۔ دی ٹائم، لندن : ۲۵۔ اگست ۱۸۵۸ء

۲۱۔ شاعر، بمبئی : فروری، مارچ ۱۹۶۹ء

۲۲۔ صحیفہ، لاہور : اپریل ۱۹۷۰ء، اپریل ۱۹۷۱ء

۲۳۔ علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) : ۴۸-۱۹۴۹ء، ۱۹۶۹ء

۲۴۔ غالب نامہ، نئی دہلی : جلد ۱، شمارہ ۱، جنوری اپریل ۱۹۷۶ء، جلد ۲، شمارہ ۲-۳، جلد ۱، شمارہ ۳، ۴، جولائی ۱۹۸۱ء، جنوری ۱۹۸۲ء، جولائی ۱۹۸۲ء

۲۵۔ فروغ اُردو، لکھنؤ : نومبر، دسمبر ۱۹۶۸ء

۲۶۔ فکر و نظر، علی گڑھ : جنوری ۱۹۶۱ء

۲۷۔ قومی زبان، کراچی : ستمبر ۱۹۶۵ء

۲۸۔ ماہِ نو، کراچی : فروری ۱۹۶۲ء، فروری ۱۹۶۵ء، مارچ ۱۹۶۵ء

فروری ۱۹۶۷ء، جنوری فروری مارچ ۱۹۶۹ء

۲۹۔ مجلّہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن : جون ۱۹۲۹ء

۳۰۔ معارف، اعظم گڑھ : ستمبر ۱۹۱۸ء

۳۱۔ معاصر، پٹنہ : حصہ ۳، سال ۱۹۵۲ء

۳۲۔ نقوش، لاہور : ستمبر ۱۹۶۵ء، خطوط نمبر جلد ۳، ۱۹۶۸ء، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۹ء

٣٣۔ نگار، لکھنؤ : مئی ١٩٤١، جولائی ١٩٦٠ء

٣٤۔ نگارِ پاکستان، کراچی : جولائی، اگست ١٩٨٢ء

٣٥۔ نوائے ادب، بمبئی : اپریل ١٩٥٠ء، جولائی ١٩٥١ء، اکتوبر ١٩٥١ء،
جنوری ١٩٥٢ء، جنوری ١٩٥٥ء، اپریل ١٩٥٥
جولائی ١٩٥٥ء، جولائی، اکتوبر ١٩٥٦ء

٣٦۔ نیا دور، لکھنؤ : مئی ١٩٦١ء، جنوری ١٩٦٥ء

٣٧۔ ہندوستانی، الٰہ آباد : جنوری ١٩٣٤ء، اکتوبر ١٩٣٥ء

٣٨۔ "ECO OF ISLAM" (انگریزی)، تہران، ایران، شمارہ جنوری مارچ ١٩٨٣ء

○ متفرق اضافات (کتب):

١۔ تاریخِ لطیف، مہدی علی خاں

٢۔ تشریح السنین (قلمی)

٣۔ تلاشِ غالب، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، لاہور مئی ١٩٦٩ء، دہلی مئی ١٩٦٩ء

٤۔ توبۃ النصوح، ڈپٹی نذیر احمد، دہلی ١٨٨٦ء

٥۔ جاگیرِ غالب (پرتھوی چندر، ١٩٦٩ء)، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور ١٩٨٩ء

٦۔ خطباتِ گارساں دتاسی: اشاعت اول ١٩٣٥ء، اشاعت ثانی ١٩٧٤ء

٧۔ دعائے صباح: مرتبہ سید آغا مہدی، صفدر پریس، لکھنؤ دسمبر ١٩٠٦ء

٨۔ دیوانِ غالب : ○ مطبوعہ ١٨٤١ء عکسی:
پیش کش: کالیداس گپتا رضا، بمبئی ١٩٨٦ء
○ نسخۂ حمیدیہ، مفتی انوار الحق، بھوپال، ١٩٨٢ء
نسخۂ حمیدیہ، مرتبہ: پروفیسر حمید احمد خاں، طبع دوم لاہور ١٩٨٣ء

٩۔ عمدۂ منتخبہ (سرور)، مرتبہ: خواجہ احمد فاروقی، رشید حسن خاں، دہلی مارچ ١٩٦١ء

١٠۔ عودِ ہندی (غالب) ○ مطبع دار العلوم، علی گڑھ ١٩١٠ء
○ گلزارِ ہند اسٹیم پریس، لاہور ○ نولکشور، کانپور ١٩١٢ء
○ مطبع انوار احمدی، الٰہ آباد ○ نولکشور لکھنؤ ١٩٤١ء ○ مطبع کریمی، لاہور

۱۱- غالب اور خوکا، ضیاء الدین احمد شکیب، دہلی ۱۹۷۲ء

۱۲- غالب کے خطوط، ڈاکٹر خلیق انجم: ○ جلد اول، دہلی ۱۹۸۴ء
○ جلد دوم، دہلی ۱۹۸۵ء ○ جلد سوم، دہلی ۱۹۸۷ء

۱۳- فسانۂ مبتلا، ڈپٹی نذیر احمد، مرتبہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، لاہور ۱۹۶۲ء

۱۴- محاسنِ کلامِ غالب، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، طبع پنجم علی گڑھ، اپریل ۱۹۵۸ء

۱۵- مکاتیبِ غالب، مرتبہ: امتیاز علی عرشی ○ طبع سوم، رامپور، ۱۹۴۵ء
○ طبع چہارم، رامپور، ۱۹۴۹ء ○ طبع پنجم، رامپور، ۱۹۴۷ء ○ طبع ہفتم، رامپور، ۱۹۴۹ء

○ مُتفرق اضافات (اخبارات و رسائل):

۱- آج کل، دہلی: فروری ۱۹۴۷ء

۲- اخبار سینٹیفک سوسائٹی، علی گڑھ، ۱۷- مارچ ۱۸۶۹ء

۳- اُردو، اورنگ آباد: جنوری ۱۹۲۱ء، اکتوبر ۱۹۲۲ء

۴- اقبال (سہ ماہی)، لاہور: اپریل ۱۹۶۹ء

۵- الجمعیۃ، دہلی: ۷- اپریل ۱۹۶۹ء

۶- اودھ اخبار، لکھنؤ: ۸ جنوری ۱۸۶۲ء، ۹- اپریل ۱۸۶۲ء

۷- ایڈنبرگ میگزین (بلیک ووڈ): جنوری ۱۸۷۵ء

۸- بلٹز (ہفتہ وار)، بمبئی: ۱۵- فروری ۱۹۷۵ء

۹- سب رس، کراچی: جنوری ۱۹۸۸ء

۱۰- غالب نامہ، نئی دہلی: جنوری ۱۹۸۳ء

۱۱- ماہِ نو، کراچی: فروری ۱۹۴۹ء، فروری ۱۹۵۰ء

۱۲- معاصر، پٹنہ: حصہ ۱۲، جنوری ۱۹۴۳ء ۱۳- معیار، پٹنہ: جلد ۱، نمبر ۳

۱۴- نقوش، لاہور: اکتوبر ۱۹۶۹ء، جولائی ۱۹۷۰ء، غالب نمبر ۱۹۷۱ء، دسمبر ۱۹۸۶ء

۱۵- نیا دور، کراچی: شمارہ ۵۵-۵۶، ۱۹۷۱ء

۱۶- ہماری زبان (ہفت روزہ) علی گڑھ، یکم مارچ ۱۹۶۱ء، ۸- اگست ۱۹۶۱ء

۱۷- ہماری زبان (ہفت روزہ)، دہلی: ۸ مارچ ۱۹۷۵ء


الوقار پبلی کیشنز
335-K2 Wapda Town, Lahore.
www.alwaqarpublications.com